

گھر کے ہر فرد کے لئے

# پاکستان

جنوری  
2008

سال نو مبارک

عید مبارک



کشمکش کا نازہ شمارہ شائع ہو گیا ہے



300 24 209

مستقل  
عنوانات

تبدیلی کے  
قائم

صغریٰ زیدی

ادارہ

تحسین اختر

302 279 253

پاکیزہ دوسری

بہنوں کی مفضل

دیا جلا رکھنا

عظمیٰ آفاق سعید

انجم انصار

نگہت اعظمی

306 292 263

بزم پاکیزہ

جلالت رنگ

خصوصی  
مضمون

انجم انصار

انجم انصار

شادستہ زریں

308 296 272

روحانی انشورے

میرا انتخاب

شہزوری

ادارہ

آمنہ حماد

نبیلو فی عباسی

Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi.  
Postal Address: Box No. 662, G.P.O., Karachi-74200  
Phone: (021) 5802552, Fax: 5802551, E-mail address: jdpgroup@h otmail.com

47 214 23

افسانہ

مکمل ناول

اداریہ

رضوانہ پرنس

نورین ظفر خان

انجم انصار

83 62 10

شاہکاراں  
صبح چین

ناولٹ

کارواں اپنا

بنول زہرہ نقوی

اسما قادری

فیض 08

121 100 26

جگنوؤں  
سی محبت

خواتین  
خواہش چہ

سلسلہ  
وار ناول

عالیہ حرا

سائرہ عارف

ناہید سلطانیہ اختر

169 180 138

لمحبت

گراہوا

اپریل

حنا رضوان

عالیہ بخاری

شیریں حیدر

پبلشر پروپرائیٹرز ذرا رسول: مقام اشاعت: 63 سی فیز II (ایکسٹنشن) ڈی ایچ اے کمرشل ایریا۔ مین کورنگی روڈ کراچی 75500  
پرنٹر: جمیل حسن۔ مطبوعہ: انیس سن پرنٹنگ پریس۔ ہائی اسٹیڈیم، کراچی



# مجھے کچھ کہنا ہے.....!

کسی بھی مہذب معاشرے میں انسانی حقوق اور آزادیوں کو تہذیب کے دائرے میں رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اسلام میں بھی اظہار رائے کی لامحدود آزادی نہیں ہے بلکہ اس پر چند قانونی اور اخلاقی پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔

اس لیے کسی بھی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کسی کے عائدان، مذہب یا پیشوا کو نشانہ بنائے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے اور (اے مسلمانو) یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں انہیں گالیاں نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دیتے لگیں۔

آزادی سلب نہ ہو اور وہ معاشرے کے لیے نقصان دہ نہ ہو۔ اسلامی ریاست میں کسی شخص کو ایسی رائے کے اظہار کی آزادی نہیں ہے جو معاشرے میں فتنہ و فساد کا سبب بنے۔

اسلام نے کسی مسلمان کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ دوسرے مسلمانوں کا مذاق اڑائے اور اس کو برے ناموں سے پکارے یا غیبت کرے۔

اسلام نے اظہار رائے کی مکمل آزادی دی ہے اور یہ حدود بھی معاشرے اور فرد کے مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے عائد کی گئی ہیں۔ تاہم ان حدود میں رہتے ہوئے آزادی اظہار رائے کو اسلامی ریاست میں کوئی حکومت روک نہیں سکتی جب تک عملاً کسی باغیانہ سرگرمی کا مظاہرہ نہ ہو۔

اور باغیانہ سرگرمیوں سے دوسروں کا تو نقصان ہوتا ہی ہے مگر اس میں آپ کا بھی نقصان ہوتا ہے۔ کبھی کسی کو نقصان پہنچانے سے پہلے اگر یہ سوچ لیا جائے کہ یہ دنیا مختصر ٹھکانا ہے اور ہمیں اپنے اعمال کی جزا اور سزا دونوں ملیں گی۔ تو شاید ہم سب اپنے فحشی ارادوں کو تکمیل نہ دینے پائیں۔

آئیے نئے مئسوی سال کا سورج طلوع ہوتے وقت ہم اپنے آپ سے یہ وعدہ کریں کہ اپنی ذات سے کسی کو تکلیف نہیں پہنچائیں گے..... کیا خیال ہے؟



فرمانِ باری تعالیٰ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے  
 دین میں زبردستی نہیں ہے (کیونکہ) ہدایت بے شک گمراہی سے ممتاز (اور صاف ظاہر) ہو چکی ہے۔  
 پس جس نے بول کا (جو گمراہ کرتے ہیں) انکار کیا اور اللہ (یعنی) پر ایمان لایا تو (کو یا)  
 نے (اپنے ہاتھ سے) ایک مضبوط رسی پکڑ لی جو (کبھی) ٹوٹنے والی نہیں اور اللہ (یعنی)  
 کی) سزا (اور سب کی نیوٹوں کو) جانتا ہے (۲۵۶) ایمان لانے والوں کا اللہ (یعنی) کا راز  
 ہے کہ انہیں (گمراہی کی) تاریکیوں سے (ہدایت کی) روشنی میں لاتا ہے اور جو (اسلام کے) منکر  
 ہیں ان کے کارساز شیطانی ہیں جو انہیں (ہدایت کی) روشنی سے (گمراہی کی) تاریکیوں میں لاتا  
 ہیں، یہی لوگ دوڑتی ہیں وہ اس میں ابداً باور ہیں گے (۲۵۷) اے محمد ﷺ کیا تم نے اس  
 (یعنی نبرد و کی) حالت پر غور نہیں کیا جس نے ابراہیم سے اس (غور و کی) وجہ سے کہ اللہ نے اس  
 بادشاہی دی تھی ان کے رب کے بارے میں (ان سے) جھگڑا کیا (تھا) جب ابراہیم نے کہا میرا رب تو  
 ہے جو (سب کو) جلاتا اور مارتا ہے (اس کے جواب میں) بولا کہ میں (بھی تو) جلاتا اور مارتا ہوں (آپ کے اللہ کا  
 میں کمال ہی کیا ہوا) ابراہیم نے (اس پر) کہا پس تحقیق اللہ تو مشرق سے آفتاب لاتا ہے، اچھا (جب جانیں) تو اس  
 مغرب سے لے آ، اس پر وہ کافر بھونچکا ہو گیا (سکتہ میں رہ گیا) اور اللہ بے انصافوں کو راہ (حق) نہیں دکھاتا (۲۵۸)  
 ان جیسے بزرگ کہ ایک قریہ پر گزرے اور وہ اپنی چھتوں کے بل گر پڑا تھا، کہنے لگے کہ (اب) اس قصبہ کو اللہ اس  
 ویرانی کے بعد کیونکر آباد کرے گا (اور خود سوز ہے) پھر (ان کی روں قبض کر لی گئی اسی طرح) سو برس تک اللہ نے اس  
 مردہ رکھا پھر انہیں (جلا کے) اٹھایا (اور) پوچھا کہ تم کتنی دیر تک پڑے رہے کیا ایک دن یا دنوں سے کم، ارشاد ہوا (نہیں)  
 بلکہ تم سو برس پڑے رہے پس اپنے کھانے اور پینے کی چیزوں کو دیکھو (جن کو تم نے درخت میں لٹکا دیا تھا) کہ  
 (تک) نہیں اور اپنے گدھے کو دیکھو (کہ اس کی ہڈیوں کا تودہ پڑا ہوا ہے) اور تم جنہیں لوگوں کے لیے نمونہ کیا جا  
 ہیں اور (گدھے کی) ہڈیوں کو دیکھو (کہ) کیونکر تم (ڈھانچہ بنانے کے لیے) ان کو جنش دیتے ہیں اور پھر ان کو گدھے  
 (کا جامہ) پہناتے ہیں پھر جب ان پر یہ ظاہر ہوا (تو) کہنے لگے میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے (۲۵۹)  
 جب ابراہیم نے کہا اے پروردگار مجھے (بھی تو) دکھا کہ تو مردوں کو کیونکر زندہ کرے گا، ارشاد ہوا (کہ) کیا تمہیں (اللہ)  
 کا یقین نہیں (ابراہیم نے) عرض کیا (کہ) کیوں نہیں مگر (آکھ سے دیکھنا چاہتا ہوں کہ) میرے دل کو تسکین  
 جائے فرمایا (اچھا) چار پند لو اور اپنے ساتھ ان کو بلاؤ، پھر (ان کی بوٹی بوٹی کر کے اپنے ہاں کے) ہر پہاڑ پر ان کا  
 ایک ٹکڑا رکھ دو پھر ان کو (اپنے پاس) بلاؤ (تو وہ) تمہارے پاس دوڑتے ہوئے (چلے) آئیں گے اور جان لو کہ  
 (سورہ بقرہ۔ آیت نمبر ۲۵۶ تا ۲۶۰)

فرمانِ رسول اکرم ﷺ

☆ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے  
 مجھے ایک ریشمی حلہ (ایک مرتبہ) پہنے میں بھیجا۔ میں نے اس کو پہن لیا تو میں نے آپ صلی  
 اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرہ مبارک پہ غصے کا اثر دیکھا پس میں نے اس کو پھاڑ کر اپنی  
 (قریبی رشتہ دار) عورتوں میں تقسیم کر دیا۔

(بخاری: کتاب الہبہ)

☆ اُمّ المؤمنین عائشہ صدیقہ طیبہ طاہرہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ نبی کریم  
 صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے گھر میں کیا کیا کرتے تھے۔ وہ بولیں کہ اپنے گھر والوں کی  
 خدمت میں (معروف) رہتے تھے۔ پھر جب نماز کا وقت آ جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ  
 وسلم نماز کے لیے چلے جاتے۔

(بخاری: کتاب الاذان)

☆ سیدنا ابو جہیم سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر نماز پڑھنے والے  
 کے سامنے سے ٹکٹے والا یہ جان لیتا کہ اس پر کس قدر گناہ ہے تو بے شک اسے چالیس دن تک کھڑا رہنا پھلا  
 معلوم ہوتا اس بات سے کہ اس کے سامنے سے نکل جائے۔ ابو نصر (راوی حدیث) کہتے ہیں کہ میں نہیں  
 جانتا کہ چالیس دن کہا یا چالیس مہینے یا چالیس برس۔

(بخاری: کتاب ابواب سترۃ المصلی)

☆ اُمّ المؤمنین عائشہ صدیقہ کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک دن اپنے  
 حجرے کے دروازے پر دیکھا اور حبش کے لوگ مسجد میں کھیل رہے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم  
 مجھے اپنی چادر سے چھپا رہے تھے۔ میں ان کے کھیل کو دیکھ رہی تھی۔ ایک روایت میں ہے وہ اپنے ہتھیاروں  
 کے ساتھ کھیل رہے تھے۔

(بخاری: کتاب الصلاۃ)

☆ سیدنا ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، اگر رشک کرے تو دو  
 چیزوں میں کرے، ایک وہ مرد جسے اللہ نے قرآن دیا اور وہ اسے دن رات میں پڑھتا ہے، اس کا پڑوسی سن کر  
 کہتا ہے، کاش مجھے اس کے مثل نصیب ہوتا پھر میں بھی اسی طرح عمل کرتا، اور دوسرا وہ مرد جسے اللہ نے مال  
 عطا کیا اور وہ اس کو راہ حق میں خرچ کرتا ہے، پھر کوئی کہے، کاش مجھے بھی یہ میسر آتا تو میں بھی اسی کی طرح  
 خرچ کرتا۔

(بخاری: کتاب فضائل القرآن)



## ہوا، بیت اور آئنگن

ناہید سلطانہ اختر

اُن گھروں کی کہانی..... جنہیں مکین محبت، اخلاص، ایثار اور برداشت سے آباد رکھنا چاہتے ہیں..... اور ان گھروں کی کہانی بھی جہاں رشتوں کی بنیاد خود غرضی، لالچ، حرص اور بے صبری پر ہوتی ہے۔۔۔ ان لوگوں کا ماجرا۔۔۔ جو گھروں کی آبپاری خون جگر سے کرتے ہیں اور ان لوگوں کا فسانہ عبرت۔۔۔ جو بسے بسانے گھروں کو اجاڑنے میں لمحہ نہیں لگاتے۔

ہمارے آس پاس کھرے جیتے جاگتے کرداروں کا احوال

رات کے پچھلے پہر سبھی کی آنکھ لگ گئی۔ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے یہ تو درو کی منزل تھی۔  
ای کی آنکھ چمکی اذان کے ساتھ کھلی۔ موزن کی پرسوز آواز انہیں اپنے دیکھے دل کی ترجمان محسوس ہوئی۔  
اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر  
وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھیں۔

کہاں ہے تو؟

اے اللہ کہاں ہے تو؟

”کہاں ہے تو میرے پروردگار!“

سن رہا ہے نا!

بٹی اجڑ گئی ہے میری

میری بچی اجڑ گئی ہے میرے مولا!

کیوں میرے مولا؟

کیوں پروردگار؟

میں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا میرے اللہ جو یہ دکھ دیکھنے کو ملا۔

اے اللہ کہاں پاؤں تھے!

کہاں فریاد کروں تھے!

ای کی آنکھوں سے پھر جھڑی لگ گئی۔

ارفع جو ہاتھ پاؤں پھیلا کر سونے کی عادی تھی کروٹ لیے دونوں گھٹنے اپنے سینے سے لگائے گھڑی بی ٹھہرا





سہمی سی ان کے نزدیک ہی سو رہی تھی۔

ابابھی جاگ گئے۔ اسی کو چہرہ دوپٹے سے ڈھاپے بیٹھے دیکھا تو اپنے بستر سے اتر کر نزدیک آ بیٹھے اور اپنا ہاتھ ان کے شانے پر دھرتے ہوئے دسویں لہجے میں آہستہ سے بولے۔ ”ان اللہ مع الصابرين۔“

امی سکڑ گئیں۔

”ارفع جاگ جائے گی۔“ ابانے دھیمی آواز میں کہا۔

امی کی سسکیاں نکلتی تھیں۔ اپنی آنکھوں پر سے دو چٹا بنا کر انہوں نے ایک نظر گھڑی کی طرح پڑی ارفع پر ڈالی اور ان کا دل کھٹکنے لگا۔

”اس سے تو اچھا تھا ہم نے اسے بیاہا ہی نہ ہوتا۔“ امی کھٹی کھٹی آواز اور دل شکستہ لہجے میں بولیں۔

”بہنیوں کو بیاہے بغیر کوئی چارہ ہوتا ہے۔“ ابابھی آواز اسی طرح دھیمی تھی۔

آپابھی اٹھ بیٹھیں۔ آنکھ کھلتے ہی ان کا دل بے تحاشہ دکنے لگا تھا۔ یہ صبح عام صبحوں سے کتنی مختلف تھی۔ دل کو تڑپاتی اور اداس کرتی ہوئی! کچھ ایسا ہی احساس بہت قریبی رشتے داروں کی اموات پر ہوا تھا۔ یہ بھی تو ایک رشتے کی موت ہی تھی۔

”اٹھو پہلے تم وضو کر لو جماعت میں تو ابھی دیر ہے۔“ ابانے امی سے آہستہ سے کہا۔

آپانے بتی جلانی چاہی مگر امی نے کہا۔ ”رہنے دو، ارفع جاگ جائے گی۔“

آپانے امی کو چپل پہننے میں مدد دی اور ان کا ہاتھ پکڑ کر ہاتھ روم تک پہنچایا پھر تالین پر سے اپنا ستر سمیٹ کر اسے اپنے کمرے میں رکھنے چلی گئیں۔ واپس چائیں تو امی ہاتھ روم میں ہی تھیں۔ ابادھو کے لیے ان کے نکلنے کا انتظار کر رہے تھے۔ آپانے امی کے لیے جا نماز بچھائی اور کمرے کے کھلے دروازوں اور کھڑکیوں پر پڑے پردوں کے پیچھے سے در آتے نکلنے اجیارے میں ارفع کا چہرہ دیکھتے ہوئے ان کا جی بھر آیا۔ ایک ہی دن میں وہ کتنی نحیف دکھائی دینے لگی تھی۔

امی ہاتھ روم سے نکلیں تو ان کے نماز کے لیے کھڑے ہو جانے کے بعد آپا خود بھی نماز کی تیاری کرنے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

امی نماز کے بعد دونوں ہاتھ اٹھائے دعا مانگ رہی تھیں کہ ارفع بھی جاگ گئی۔ آنکھ کھلتے ہی دل پر دھمو کا پڑا کراب وہ اس گھر کی سچت تلے نہیں تھی جو خواب کی صورت ٹوٹ گیا تھا! اس کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب گئیں۔

دھیان مہتاب کی طرف گیا۔ دل مضطرب ہو گیا۔

جانے کیوں مہتاب کی سنگتری کے باوجود اس کا دل مہتاب کے خلاف آمادہ نفرت نہیں ہو پا رہا تھا۔ شاید اس کی محبوبہ شاعرہ بھی درد کی اس منزل سے اسی طور گزری تھی

جو خواب دینے پہ قادر تھا مری نظروں میں

عذاب دیتے ہوئے بھی مجھے خدا ہی لگا

سینے میں درد کا ایک گولہ سا اٹھا اور دھواں بن کر اس کے وجود میں سرایت کر گیا۔ وہ بے قرار ہو کر اٹھ بیٹھی اور ٹانگیں سمیٹ کر اپنی پیشانی دونوں گھٹنوں پر ٹکی اور اپنے دونوں بازو اس نے سر کے گرد باندھ لیے۔

دل دکھ رہا تھا۔

زندگی بہت بے مقصد سی لگ رہی تھی۔

اندر، باہر ہر سونٹا تھا۔

وہ خود کو راہم کر وہ مسافر کی طرح شکستہ پا اور دل گرفتہ محسوس کر رہی تھی۔

کتنی مضبوط اور پندار ذات کا احساس رکھنے والی لڑکی ہوا کرتی تھی وہ۔ کبھی سوچا بھی نہ تھا اس نے کہ کوئی شخص اس کے پندار کو یوں ضرب لگائے گا کہ وہ پارہ پارہ ہو کر رہ جائے گی۔

آہ! دل کتنا دکھ رہا تھا۔

اور اس سائے کا سب سے بڑا الیہ یہی تھا کہ اپنا قاتل اسے قاتل نہ لگ رہا تھا۔ گھائل دل اسی کی چاہ میں تڑپ رہا تھا۔

خدا جانے ظالم کو کبھی احساس خطا تھا کہ نہیں!

ارفع کی چشم تصور میں اس گھر کے بام و درو تو لرزاں تھے ہی جس شامتہ نہ جانے کیوں کرمج سو پرے اس گھر کے کچن کی خوشبو بھی اڑا لاتی۔

پرائیوں کی خوشبو! چائے کی مہک!

”مہتاب میں نے ناشتا بنا دیا ہے ناشتا کر لو۔“ والدہ کہہ رہی تھیں۔

میز پر ماں، بیٹا بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔

وہ خود کہاں کم ہو گئی تھی!

ماں، باپ، بھائی، بہنو جیسے اثوٹ رشتوں کو چھوڑ کر اس کنبے کی فردہ بن جانے کے باوجود وہ وہاں کیوں نہیں تھی!

آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر گود میں گرتے رہے۔

دفعتاً اسے اپنے سر پر ایک شفقت آمیز لمس کا احساس ہوا۔ اس نے بے ساختہ چونک کر سر اٹھایا۔ اباس کے نزدیک کھڑے تھے۔

”نماز پڑھ لو۔“

وہ نماز پڑھنے کی حالت میں نہ تھی مگر قہری حیائے اسے ابابھی بات پر دھڑکے سے اثبات میں سر ہلانے پر مجبور کیا۔

”اچھا! فراموشی! ماں، نماز کے لیے جا رہا ہوں۔“ ابابھی ہمیشہ کی عادت تھی گھر سے دو قدم کے لیے بھی نکلتے نکلتے تو

امی کو مطلع کرنا فرض سمجھتے۔

امی جو رب العزت کے حضور دونوں ہاتھ پھیلائے بڑی دیر سے گز گڑا رہی تھیں اپنے چہرے پر دونوں ہاتھ پھیرتے ہوئے جامناڑے اٹھیں اور انہوں نے ارفع کے نزدیک آ کر اس پر آہستہ سے پھونکا۔

اس کا جی بھر آیا۔

امی تو اسے اور مہتاب کو اکٹھے دیکھ کر بھی زہر لب پڑھ کر چپکے چپکے پھونکے جاتی تھیں۔ کہاں کم ہو گئے تھے ان کے وہ سارے دھانکاف اور دم دھانک!

امی جیسے دینے والوں کی طرح چپ چاپ اس کے نزدیک بیٹھ گئیں پھر اچانک رونے لگیں۔ اسے اپنا غم بھلا کر امی کو صمد دینا پڑا۔

”نہیں امی!..... مت روئیں!..... میری قسمت میں یہی تھا۔“ اس نے اپنی رقت کو دباتے ہوئے کہا۔

”کیوں! کیوں تھا تمہاری قسمت میں یہی۔“ امی ماہی بے آب کی طرح تڑپیں۔ ”کیا گناہ تھا ہم نے کسی کا؟“

”پلیز ایسے مت روئیں!..... ایسے مت روئیں۔“ وہ گز گڑائی اور اس نے امی کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے کر سینے سے لگا لیا۔



بھیا کی عادت تھی بچوں کو ان کے اسکول پہنچانے کے بعد کچھ دیر امی، ابا کے پاس آکر ضرور بیٹھتے مگر اس روز وہ بچوں کے چاہنے سے پہلے ہی امی کے کمرے میں آ بیٹھے۔ آپا مسجد سے ابا کے آنے کے بعد ناشتا بنا کر کمرے ہی میں لے آئی تھیں۔

”رات بھر تم بھی جاگتے ہی رہے۔“ امی نے دلسوز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

بھیا متصل سے امی کے پاس بیٹھ گئے۔

”بہنو! تم سے کچھ پوچھا کچھا؟“ امی نے آہستہ سے پوچھا۔

بھیا نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”طلاق کا انہیں مت بتانا ابھی..... پوچھیں تو کہہ دینا ارفع اور مہتاب میں جھگڑا ہو گیا ہے۔“ امی دھیمی آواز میں بولیں۔

”کیوں جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت!“ ابا نے کہا۔ ”آج نہیں تو کل پتا چل ہی جائے گا سب کو۔“

”ابا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ بھیا نے تائید کی۔

”جب پتا چلے گا، ملے گا خود اپنے منہ سے کسی کو بتانے کی کیا ضرورت۔ مہتاب تو خود بہنوں والا تھا اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس کی اس حرکت سے ہمارے دوسرے سہیلیوں میں کیسی کمی ہوگی ہماری..... واٹ لگا دیا اس نے ہمارے خاندان کو۔“

”فکر نہ کریں بھئیے گا۔“ بھیا بولے۔ ”اللہ زیادتی کرنے والوں سے خود حساب لیتا ہے۔“

”ہاں۔“ ابا نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ”مہتاب نے کی تو ہے زیادتی، اللہ کی حدوں کو توڑا ہے اس نے..... ارفع کا اور اس کا نزاع تو بہت معمولی تھا، عورت بد خو اور بد کردار ہو تب بھی قرآن مجید اصلاح احوال کی ترغیب دیتا ہے۔ مراحل بتا دیے گئے ہیں..... پہلے عورت کو زبانی تنبیہ اور فہمائش کی جائے نہ سمجھے تو ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے مرد اس سے دوری اختیار کر لے پھر بھی نہ سدھرے تو مارے مگر اس طرح کہ عورت کے جسم پر کوئی نشان نہ پڑے۔ کوئی بڑی مضروب نہ ہو۔“

”اس نے تو ایک ہی ہتھکے میں ہم سب کی جان لے لی۔“ امی کی آواز احساس غم سے بوجھل تھی۔

”وٹار بیٹے۔“ ابا نے بھیا کو مخاطب کیا۔ ”کل کا دن تو پریشانی میں گزرا۔ آج وہاں جا کر مہتاب سے پوچھا تو جائے کہ اس نے اپنی انتہائی قدم آخر کیوں اٹھایا۔“

”بالکل جائیں بلکہ مہتاب کا گریبان پکڑ کر یہ سوال کریں۔“ امی نے ایک سرد آہ کھینچی پھر بولیں۔ ”غیر واقعی غیر ہی ہوتا ہے۔“

”بات غیر اپنا ہونے کی نہیں تربیت کی ہے۔“ بھیا نے امی کی بات پر کھپا پھر کچھ توقف سے بولے۔ ”صاقتہ کے لیے ہم لوگ بھی غیر ہی تھے، اگر آپ اور ابا خانگی معاملات میں میری تربیت نہ کرتے، نہ سمجھاتے، بجھاتے مجھے تو کیا صاقتہ کے ساتھ میرا گزارا ہو سکتا تھا۔ کیا کسر چھوڑی تھی اس نے اور اس کے گھر والوں نے اپنی طرف سے میرے اور آپ سب کے دل میں نفرت پیدا کرنے میں..... مگر آپ کی اور ابا کی مصلحت کوئی نے گزارا کر دیا۔ مہتاب کی تو تربیت ہی نہیں ہوئی بلکہ وہ تو گھر کی عورتوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنارہا۔“

ارفع خاموش بیٹھی ان کی باتیں سن رہی تھی۔

کل سے اب تک کتنی مرتبہ اس کے کانوں میں ان گویوں کی پاٹ دار لے کی آوازیں بازگشت گونج چکی تھیں جو

اس کی رخصتی کے وقت ہار سوئم اور ڈھونگی بجاتے اور پر سوز لے میں رخصتی کا گیت گاتے آدھکے تھے۔

رائی بیٹی راج کرے گی

کتنے ارمانوں، کتنی دعاؤں اور کتنی چاہتوں کے ساتھ بیٹیوں والے اپنی بیٹیوں کو رخصت کرتے ہیں مگر بے درد اور بے رحم لوگ انہیں کس بے رحمی سے مٹا ڈالتے ہیں!

کل صبح وہ کچھ اور بھی آج کچھ اور

کل صبح وہ سہاگن بھی آج ابھانگن

کل صبح اس وقت تو اس کے گمان میں بھی تھا کہ اگلی صبح اس وقت ایک ٹوٹی ہوئی عورت ہوگی۔

گھر سے بے گھر ہو گئی تھی وہ۔

مہتاب سے رشتہ ختم ہو گیا تھا۔

زندگی جیسے آدھی، ادھوری، بے روح اور بے رنگ ہو کر رہ گئی تھی۔

کتنی بے کل اور مفلک تھی وہ!

جس گھر میں پیدا ہوئی اور پٹی بڑھی تھی وہاں آج خود کو ”مس فٹ“ محسوس کر رہی تھی۔

بھیا کچھ دیر بیٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ آپا چائے کے برتن سمیٹ کر ارفع کے پاس آ بیٹھیں۔

”ہوا کیا تھا؟“ ابا نے اپنا لہجہ انتہائی حزم و احتیاط میں سوتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

اس کی ہر پٹی جیسی آنکھوں میں سرخی اور آنسو ایک ساتھ اٹھ آئے۔ آپا کو دوبارہ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

اس نے بھرائی ہوئی آواز میں گزشتہ روز پیش آنے والے دلخراش سانچے کی روئیداد آہستہ آہستہ امی، ابا اور آپا کے گوش گزار کر دی۔

”اس کجخت کو تھارے..... پاؤں پڑنے پر بھی رحم نہ آیا۔“ امی روہانی ہو گئیں۔

”میں نے ہاتھ جوڑے، پاؤں پکڑے، خوشامد کی مگر انہوں نے ایک ندی۔“ اس نے آنسوؤں سے میٹھی آواز میں کہا۔

آپا دم بخود تھیں۔

مہتاب کے گھر میں ارفع کی تنہائی اور بے بسی کا تصور ان کے دل کو جیسے اپنی مٹھی میں جکڑ کر ان کی ساری جان چوس لے رہا تھا۔

ہاتھ جوڑتی، بڑھتی، بلوائی، خوشامد کرتی اور مہتاب کے قدموں میں ڈھیر ہوتی ارفع!

خوف اور رنج سے اسے اللہیاں لگ جاتا۔

مہتاب کا بے رحمی سے کہنا۔ ”اپنی تنخواہ نہیں بتاتی تھی..... اب بتاؤ گی اپنی تنخواہ، اب بتاؤ گی اپنا کاؤنٹ نمبر؟“ اذخدا یا! کیسا بے رحم آدمی تھا وہ۔

پھر اندر کے رخ ٹھیک پر لگنا تالا دیکھ کر ارفع کا متوحش ہو جانا۔

مہتاب کی والدہ اور بہن کا سکراتے ہوئے گھر میں داخل ہونا۔

شدید رنج و الم کی حالت میں ارفع کا تنہا گھر سے نکلنا اور شام ہونے تک گھر سے باہر بیٹھ کر روتے رہنا۔

کیسی بے بسی تھی!

یہ ایک بڑھی گئی اور اسے بیروں پر کھڑی لڑکی کی داستان تھی۔

سب بال و پر جو توڑ پر کیا گزرتی ہوئی!

ای احسان شکر گزاری کے ساتھ کہا کرتی تھیں۔ ”اللہ کا شکر ہے میری سب بیٹیاں اپنے گھروں میں سنبھلی



امی کے اس فقر اور طرانت کو اس قدر چپکے سے دکھائی نہ جانے کہاں سے اور کیوں لگ گئی تھی!

\*\*\*

اس روز آپا نے بھی چھٹی کی بھیا بھی گھر پر ہی رہے۔ مہتاب کے گھر جانا تھا مگر مہتاب کی عدم موجودگی میں اس کے گھر جانا فضول تھا۔ ابانے دس بجے کے لگ بھگ اس کی گھر کے کمرے پر فون کیا تو پتا چلا وہ ڈیوٹی لگ چکی تھی۔ امی ابابھیا اور آپا شام کو مہتاب کے گھر گئے۔ گیٹ مہتاب نے کھولا اور انتہائی سردہری سے سلام کیا۔ اس کی آنکھوں میں بیگ لگی تھی اور چہرہ جذبات سے قطعاً عاری۔ نہ غلالت، نہ معذرت، نہ دکھ، نہ بچپناوا۔ انہیں لاؤنج میں بٹھا کر وہ اندر چلا گیا۔

”کون آیا ہے؟“ اندر سے مہتاب کی والدہ کی آواز لاؤنج تک پہنچی۔

”اس کے گھر والے آئے ہیں۔“ مہتاب کی آواز سنائی دی۔

”رومانہ کون کر دیکھ آ جائے۔“

”آپ چلیں میں فون کر کے آتا ہوں۔“

”الحاظ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ زیور اور مہر کی بات صاف صاف کرنا اور صاف کہہ دینا جب تک زیور کا حساب کتاب نہیں ہو جاتا بھیز نہیں اٹھا سکتے۔“

”ٹھیک ہے۔“

چھوٹا سا گھر تھا۔ اندر سے دونوں کی آوازیں لاؤنج تک آ رہی تھیں۔

مہتاب کی والدہ بھی بیٹے کی طرح سپاٹ اور ہر قسم کے جذبات سے عاری چہرے کے ساتھ لاؤنج میں آئیں۔ نہ شرمندگی، نہ دکھ۔

تھوڑی دیر بعد مہتاب بھی آ بیٹھا اور ابھی بات شروع بھی نہ ہوئی تھی کہ رومانہ اور اس کا شوہر بھی آ گئے۔

”مہتاب میاں!“ ابانے بات شروع کیا۔ ”جو ہوا وہ ہمارے لیے انتہائی غیر متوقع اور صدمہ رساں ہے۔ اگرچہ ارفع بتا چکی ہے لیکن پھر بھی میں یہ پوچھ رہا ہوں آپ سے کہ مصالحت کی کوئی گنجائش چھوڑی آپ نے یا.....؟“ ابانے جملہ ادھر اچھوڑ دیا۔

اس سے پہلے کہ مہتاب کچھ کہتا رومانہ نے نفی میں سر ہلایا۔

مہتاب نے چند ثانیے سوچنے کے بعد نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں۔“

بھیا کا چہرہ ہنستا اٹھا۔

”اس انتہائی اقدام کا سبب؟“ بھیا نے مہتاب کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

مہتاب نے پہلو بدلنے ہوئے ٹانگ پر ٹانگ دھری پھر بولا۔ ”ارفع کا رویہ ٹھیک نہیں تھا۔“

”کیا ٹھیک نہیں تھا؟“

”کبھی شیز نہیں کیا۔ اپنی سہیلی راز میں رکھی۔ کبھی گھر کے لیے کچھ خرید کر نہیں لائی تھیں۔ میرے ایک کزن آئے تو ان کو چائے دے پلانے کے بعد دوبارہ چائے کے لیے پوچھنے کو کہا، آپ اور چائے نہیں تو بناؤں۔ کون مہمان یہ کہے گا کہ ہاں اور چائے بناؤ۔ اسے صرف اتنا پوچھنا چاہیے تھا ان سے کہ اور چائے نہیں گے۔“

”اور؟“ بھیا بولے۔

”اور؟“ مہتاب نے پہلو بدلا۔ ”ہمارے ایک اور کزن آئے۔ وہ اور ان کی سسر سائے والے صوفے پر تھے اور ہم لوگ ادھر..... ارفع ہم لوگوں کے ساتھ بیٹھنے کے بجائے ادھر بیٹھ گئی..... یہ ایسی ٹھیکس کے خلاف تھا۔“

”درست!“ بھیا نے تائید کی پھر بولے۔ ”اور کچھ؟“

”اس کا بی بیوہ ٹھیک نہیں تھا۔ مجھ سے نہ ملی ہے۔“

”آپ دونوں سے اس نے بھی بدیزبی کی؟“

”کوئی بات خلاف مزاج ہو جاتی تو بات نہیں کرتی تھی، چپ سا دھ لیتی تھی۔“

”میرے خیال میں یہ تو تو، میں، میں سے تو بہتر تھا۔“

”ایک روز امی نے کچھ کہہ دیا تو ان سے بولی، آپ مجھ سے اس لمحے میں بات نہ کریں۔“

”یہ تو بتائیں مہتاب کہ اس بات کی پاداش میں آپ نے اور آپ کی والدہ نے اس کا مکمل بائیکاٹ کر دیا تھا۔“ آپا نے مداخلت کی۔

”ہماری ایک بھائی ہیں عزیزین بھائی۔ وہ مجھ سے کہنے لگیں مجھے آپ کی بھائی بالکل پسند نہیں آئیں۔“ رومانہ اپنے مخصوص لہجے میں بولی۔

”ضروری نہیں کہ ہر شخص کو ہر ایک پسند آ جائے۔“ آپا کو رومانہ کی بات بری لگی تھی۔

”یہ بتائیں ارفع بھٹرا الوسی، بدکردار تھی یا آپ سے کوئی ایسی لمبی چوڑی فرمائش کرتی تھی جو آپ پوری نہیں کر سکتے تھے۔“ بھیا ذرا تیز ہو کر بولے۔

مہتاب خاموش رہا۔

”عورت بد خو، بد کردار ہو جب بھی قرآن کہتا ہے اصلاح احوال کی کوشش کرو، پہلے مرحلے میں عورت کو زانیہ فہمائش کی جائے، نہ سمجھے تو ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے مرد اپنا بستر اس سے جدا کر لے۔“ علیحدہ سوئے پھر بھی عورت نہ سدھرے تو اسے مارے مگر اس طرح کہ جسم پر کوئی نشان نہ پڑے، کوئی ہڈی نہ ٹوٹے۔“ بھیا نے توقف کیا پھر غصے سے بولے۔ ”یار! آپ نے ارفع کے خلاف جو شکایات کی ہیں وہ اسے اتنا بڑا مجرم تو نہیں ٹھہرائیں کہ آپ اسے قتل کر ڈالتے۔ آپ نے تو اسے زندہ دو گور کر دیا ہے..... کچھ خوف خدا یا..... کچھ دنیا کی شرم ہی تھی..... ارفع کو کہیں سے ہاتھ پکڑ کر نہیں لے آئے تھے تم، ایک بھرے گھر کی عزت تھی وہ اس سے اپنا رشتہ توڑنا ہی تھا تو جن سے تم نے اس کا ہاتھ مانگا تھا پہلے انہیں اطلاع کرتے کہ میں یہ کرنے جا رہا ہوں۔ ہمیں بے خبر رکھتے ہوئے یہ واردات کیوں کی تم نے۔ یاد رکھنا تم نے ہمارے ساتھ بھی زیادتی کی ہے، خدا کے ہاں بھی مجرم ٹھہرے ہو۔“ بھیا کا غصہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتا چلا گیا۔ ”بچو گے نہیں احتساب سے۔“

ابا دھیرے سے کھنکھارے پھر بولے۔ ”سورۃ النساء میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اگر مردوزن آپس میں محبت سے نہیں رہ سکتے ہوں تو ایک متصف مرد کی طرف سے اور ایک عورت کی طرف سے کھڑا کیا جائے اور دونوں کو بات چیت کا پورا اختیار دیا جائے اگر اللہ رب العزت کو منظور ہو گا تو وہ ان دونوں کے توسط سے میاں بیوی میں صلح کے اسباب پیدا فرمادیں گے کیونکہ اللہ سب کچھ جاننے والا خبردار ہے۔“

”آپ لوگوں نے تو اس خدا کی حکم کا پاس بھی نہ رکھا۔“ بھیا کا غصہ فرو نہ ہوا تھا۔

”ہمارے بھائی کا آپ کی بہن سے گزارا نہیں ہو سکتا تھا۔“ رومانہ نے کرخت لہجے میں کہا۔

”آپ چپ رہیے، میں مہتاب سے بات کر رہا ہوں۔“ بھیا بولے۔

”میں بولوں گی، میرے بھائی کا معاملہ ہے۔“ رومانہ نے بدلتی سی بینہ تان کر کہا۔

امی اور ابابھیر اٹھیں۔

مرد مرد کے اور عورت عورت کے دو بدو ہو تو گوارا مگر عورت مرد کے منہ کو آتی اچھی نہیں لگتی اور مرد عورت کے دو بدو ہو تو نامناسب۔ عورت لاکھ ٹرائی رہے مرد ایک بات کہہ دے تو عورت ذلیل اور بھی یوں بھی ہوتا ہے کہ



عورت بہت کچھ کہہ سکتی ہے اور مرد ایک ذرا سی بات میں قابو کر دیتا ہے۔

رومانہ کے تئیں اور اس کا بوجھ دیکھ کر آپ کو یاد آیا۔ مہتاب کو نکاح کا سوٹ خریدوانے کے لیے بازار جاتے ہوئے فرزانہ نے کہا تھا۔ ”باجی ہماری منہ چھٹ ہیں۔ کسی کا خیال نہیں کرتیں جو منہ میں آئے کہہ دلاتی ہیں۔“ اس روز ”کارگر“ جاتے ہوئے فرزانہ نے اپنی والدہ، بھائی اور بہن کے بارے میں جو کچھ کہا تھا شاید اسے خود بھی احساس نہ ہو کہ وہ کیا کہہ رہی تھی اور شاید آپ کو بھی یقین السطور معانی بھی سمجھ میں نہیں آتے اگر وقت کے ساتھ چہروں پر پڑی تھیں بتدریج نہالت گئی ہوتیں۔

فرزانہ کے الفاظ کے معانی اپنی تمام تر گہرائیوں کے ساتھ کھل چکے تھے۔

کاش! نہ کھلے ہوتے۔

زندگی لاعلمی میں ہی چپ چاپ گزر جاتی تو کتنا اچھا تھا۔

کاش!

کاش یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا۔

اسی اس شست کے تئیں بھانپ کر متوحش ہوتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”چلو بیٹا چلو۔“ انہوں نے پہلے بھیا سے کہا پھر باپ کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔ ”چلیے۔“

”ہمارا زیور ہمیں دے دیں اور اپنا سامان اٹھالیں۔“ مہتاب کی والدہ نے کہا۔

بھیا نے روئے سخن ان کی جانب کرنے کی بجائے مہتاب کی طرف کیا۔ ”کل سے زیور کا شور سن رہا ہوں، کتنا زیور ہے آپ لوگوں کا؟“

مہتاب نے اپنی والدہ کی طرف دیکھا۔

”منہ دکھائی میں تمہاری، میری اور تینوں بہنوں کی طرف سے دی جانے والی چیزیں شامل کر کے تقریباً اتنی ہزار

کی مالیت کا زیور ہے۔“ والدہ بولیں۔

”اگر آپ لوگ زیور واپس نہیں کریں گے تو مہر کے پچاس ہزار کاٹ کر باقی رقم نقد ادا کریں۔“ مہتاب نے کسی مہاجن کی طرح جمع تفریق کی۔

”آپ کو زیور بھی مل جائے گا، مہر بھی مت دو۔۔۔۔۔ اور بولو۔“ بھیا کا غصہ برقرار تھا۔ ”اور ہمیں، چیز کی بھی کوئی پروا نہیں، ہزار ہے ہمیں۔“

”بیٹا چلو۔ یہ حساب کتاب بھی ہو جائے گا۔ زیور ہماری عزت اور ارفع کی زندگی اور مستقبل سے بڑھ کر تو نہیں۔ اسے تو جیتے جی ہی مار دیا ہے ان لوگوں نے۔ قصائی بھی جانور ذبح کرتا ہے تو کھال اتارنے سے پہلے ذبیحہ کا جسم

خندہ پڑنے کا انتظار کرتا ہے۔ ان کو اتنا بھی قرا نہیں ہوا۔“ امی نے کہا۔

”ہاں مہتاب۔“ آپ بولیں۔ ”بے بہت انوس ناک بات۔ کل جب آپ نے مجھے فون کیا تو ارفع کو طلاق دے دینے کی خبر سنانے کے بعد آپ نے مجھ سے بھی پہلی بات یہی کی کہ اسی ہزار کا زیور ہے، مہر کے پچاس ہزار کاٹ کر تیس ہزار واپس کر دیں۔ یوں لگتا ہے جیسے آپ کے نزدیک ارفع سے زیادہ اہمیت زیور کی تھی۔۔۔۔۔ صرف اتنی ہزار کا

زیور مہتاب وہ بھی آپ کی والدہ، بہنوں اور خود آپ کی طرف سے ارفع کو منہ دکھائی میں دی جانے والی طلاق کی چیزوں کی قیمت شامل کر کے۔۔۔۔۔ سراسر مادہ پرستی ہے۔ جتنے زیور کے لیے آپ بار بار پریشان ہو رہے ہیں، بے تاب ناظر

کر رہے ہیں، اتنا زیور ارفع پر سے سو بار قربان۔۔۔۔۔ آپ کو صرف زیور کی فکر ہے، یہ نہیں سوچ رہے کہ آپ نے کیا کیا ہے! ایک لڑکی کی زندگی سے کھیل گئے ہیں آپ۔ ہم نے آپ سے کوئی دیماعہ نہیں کی تھی صرف ایک شرط تھی کہ

ارفع شادی کے بعد اسلام آباد ہی میں رہے۔ آپ لوگوں نے اطمینان بھی دلایا تھا کہ اسلام آباد میں گھر ہے مگر۔۔۔۔۔ آپ نے اس گھر سے اس کے جانے تک اسے گھر نہیں دیا۔ ہم گڑ گڑاتے رہے کہ کوئی ایسا ٹھکانا جہاں وہ آرام سے بیٹھ سکے اور اپنی نوکری بھی جاری رکھ سکے۔ اسے اپنے گھر میں بیٹھنے کے لیے وقت ملے مگر آپ نے ہماری نہ سنی۔ شاید گھر کا مسئلہ حل ہو گیا ہو تا تو گھر نہ ٹھکانا۔ آپ اجنبات کی روش میں بولی چلی گئیں۔

”نہیں، نہیں گھر کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔“ مہتاب بولا۔

”تھا۔۔۔۔۔ کیوں نہیں تھا۔“ آپ کو اب بھی مہتاب کی گھر کے مسئلے سے نظر پوشی پر غصہ آ گیا۔ ”شاید آپ لوگ یہاں سے دور کسی اور جگہ کسی اور گھر میں رہ رہے ہوئے تو آپ کی بہن اور ان کے شوہر کو آپ کے گھریلو معاملات میں بات بے بات مداخلت کرنے اور ارفع کو آزار پہنچانے کا اختتام ملتا۔“

”ایسی کوئی بات نہیں۔“ مہتاب نے نفی کی۔

”چلو بیٹی چلو اب ان سب باتوں سے کیا فائدہ۔“ ابا بولے۔

”ابا میں جانے سے پہلے ایک بات ضرور کہوں گی۔۔۔۔۔ جیسی تکلیف ہمیں پہنچائی گئی ہے خدا کرے یہ لوگ بھی اس تکلیف کا مزہ چکھیں۔“ آپ کی آواز بھرا گئی۔ گواہی بات کہنا ان کے مزاج کے بالکل برخلاف تھا مگر شدت جذبات میں وہ خلاف مزاج بات کر گئیں۔ ارفع انہیں اپنی جان سے زیادہ پیاری تھیں۔

جس گھر میں بیٹی دی گئی اس گھر سے امی، ابا، بھیا اور آپ زندگی ہارے ہوئے لوگوں کی طرح دل شکستہ اور سوختہ جاں باہر نکلے۔

راستہ بھرا می، ابا، بھیا، آپ سب خاموش بیٹھے رہے۔ سب صدمے کی کیفیت میں تھے۔ مہتاب اور اس کے گھر والوں کی بیگانگی اور سردمہری بھی کے لیے باعثِ رخِ شہری تھی۔ صدمہ تو تھا ہی مہتاب کے گھر سے واپسی پر شرمندگی بھی ساتھ تھی۔ کیا توہین آ میر سلوک کیا تھا مہتاب اور اس کے گھر والوں نے امی، ابا، بھیا، آپ بھی کو مہتاب اور اس کے گھر والوں کے بدلے ہوئے رویے کو یاد کر کے کوفت ہو رہی تھی۔

”خواہ مخواہ آئے ہم لوگ۔“ امی سوچ رہی تھیں۔

”پوچھنا تو ضروری تھا۔“ ابا دل ہی دل میں خود کو جواز دے رہے تھے۔

بھیا جڑے بچنے بیٹھے تھے۔

اتنی اٹھیک!

ایسی رسوائی!

زندگی میں اس سے پہلے ایسا مشکل مقام کب آیا تھا۔ عزت دار گھرا تھا۔ خاندان کی تاریخ میں دور دور تک طلاق کا کوئی واقعہ نہ تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر طلاق کا ڈرا دیا بیچ بیچ طلاق دے دینا خاندانی لوگوں کا طریقہ نہیں ہوتا، بیچ اور کم ظرف لوگوں کا شیوہ ہوتا ہے۔

مہتاب کے گھر سے اپنے گھر واپس لوٹتے ہوئے آپ کو بار بار مہتاب کی آنکھوں سے جھلکتی بے گامگی اور اس کی والدہ، بہن اور بہنوئی کے چہروں سے مترشح سردمہری یاد آتی رہی۔ یہی سختی اور بے رحمی تھی ان کے چہروں پر! انسانیت سے عاری!

آپ کا احساس دل بری طرح دکھ رہا تھا۔

”اتنے بدل جاتے ہیں لوگ!“ وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھیں۔

یہی لوگ تھے، یہی چہرے۔۔۔۔۔ جب ارفع کا رشتہ لے کر آئے تو ان کا روپ کچھ اور تھا جب رشتہ توڑا تو طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں۔







آیا کوئی کے جواز سے متفق ہوتا ہے۔

والہی ارفع کے چیز کی واپسی نے تو باعث رنج و کلفت ہی ثابت ہونا تھا۔

مصباح، افسی اور ارفع بہن کا گھر ٹوٹنے کا چرسہ دینے کے لیے آگے پیچھے میکے آئیں۔ ارفع کو یوں لئے پئے اور مٹے دیکھ کر قیوں ہی بہت رنجیدہ ہوئیں۔ ارفع ان کی ماں جانی تھی، اس کا دکھ انہیں اپنے دل کی شریانوں میں اتارتا محسوس ہوا۔

\*\*\*

ابانے عدت کی بات چیز کر ارفع کو جس بیس میں ڈال دیا تھا۔ اسے تو اپنے نئے آفس میں ڈیوٹی جوائن کرنی تھی۔ کتنی تک دو دو کے بعد تو ڈیوٹیشن لی تھی۔ دفتر میں وہ کسی کو کچھ نہیں بتاتا چاہتی تھی۔ بقول ابا لوگ رو کر سنتے ہیں نفس کراڑتے ہیں، اپنی زندگی کا نو حسانا کردوسروں کو ہنسنے کا موقع دینے سے کیا فائدہ تھا۔ نوکری بھی ضروری تھی بلکہ اب تو پہلے سے زیادہ اصرار تھا کہ کیا عدت اور ملازمت کے معاملات ساتھ ساتھ چل سکتے تھے۔ وہ اسی سوچ بیمار میں تھی کہ اگلے دن صبح فرزانہ کے شوہر کا فون آگیا۔

”ابھی آپ لوگ سامان مت اٹھائے گا۔“ اس نے ابا سے کہا۔

”کیوں؟“ ابا کو اس کی بات معنی خیز محسوس ہوئی۔

”ہم لوگ ڈاکٹر صاحب کو صبح کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”کیا مطلب؟“ ابا چونکے۔

”مصالحت ہو جائے تو اچھا ہے صاحب۔“

”مصالحت؟“ ابا بولے۔ ”مصالحت کی اب کیا گنجائش۔“

”گنجائش ہے بڑے صاحب جی تو میں کوشش کر رہا ہوں۔ ویسے تو ڈاکٹر صاحب اپنے دامخ کے ہیں دوسروں کی کم ہی سنتے ہیں مگر ہم کوشش کریں گے۔“

ابا تذبذب میں پڑ گئے۔

تین مرتبہ طلاق دے دینے کے بعد مصالحت کی گنجائش کہاں تھی۔

”کیا ہوا؟ کس کا فون تھا؟“

”مہتاب کے بہنوئی کا۔“ ابانے فرزانہ کے شوہر کی بات چیت امی کے گوش گزار کر دی۔

امی کے سمجھنے ہوئے چہرے پر یکساں رنگی رونق آ گئی۔

”اگر گنجائش ہے تو اللہ کرے کوئی سبیل نکل آئے میری بچی کا اجڑا گھر دوبارہ آباد ہونے کی۔“ امی اپنا پلو پیلا کر اُپر دیکھتے ہوئے منہ میں بد بدانے لگیں۔

”بات سمجھ میں آتی نہیں۔“ ابا بولے۔ ”تین مرتبہ طلاق کہہ دینے کے بعد بھلا کہاں گنجائش رہتی ہے۔“

”ارے میاں گنجائش ہوگی یہی تو فون کیا ہے۔ ہو سکتا ہے تین تین دوسرے کہا ہو۔ اپنی ارفع نے غلط سنا ہوا۔ میری بچی اتنی پریشان ہو گئی ہو کہ اسے دو یا تین کا ہوش ہی نہ رہا ہو۔“

”ہاں یہ ہو سکتا ہے۔“ ابانے تائید کی۔

”اگر گنجائش ہے تو اللہ کے واسطے کسی بھی طرح مصالحت کی کوشش کریں۔ مگر بار بار نہیں بستے..... بیٹی ذات ایک بار جس گھر میں جائے وہاں سے مگر ہی نکلے تو بھلی۔“

ابانے اثبات میں سر ہلایا۔

بھیا سے بات ہوئی تو انہوں نے بھی ابا سے وہی سوال کیا۔ ”تین دفعہ طلاق کے الفاظ ادا کر دینے کے بعد

مصالحت کا کیا سوال ابا۔“

”بیٹا کوئی نکتہ ہو گا ایسا جنہوں نے یہ بات کی ہے۔“

بھیا بھی الجھنے لگے۔

فرزانہ کے شوہر نے ارفع کو اس کے موہاں پر براہ راست بھی فون کر ڈالا اور اس سے بھی وہی بات کی جوابا سے کہ تھی۔

”کہیں ایسا تو نہیں کہ مہتاب نے دوسرے کہا ہو اور تمہارے سننے میں غلطی ہوئی ہو۔“ امی نے اس سے کہا۔

”نہیں..... کہا تو انہوں نے تین مرتبہ ہی تھا۔“ اس نے وثوق سے کہا۔

”پھر بھلا کیسے صلح ہو سکتی ہے۔“ امی کا چہرہ دوبارہ بچھ گیا۔

”ایسا کرو بیٹی!“ ابانے کہا۔ ”جو کچھ ہوا میں دیکھ کر دو مجھے..... فتویٰ لے لیتے ہیں۔“

”ہاں، یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔“ امی کی آنکھوں میں ایک نئی جوت جا گئی۔

”اللہ کرے کوئی گنجائش نکل آئے۔“ آپانے دل ہی دل میں دعا کی۔ ہفتا بستہ گھر تین دن سے رنج و سو گواہی میں ڈوبا ہوا تھا۔

دوپہر کو ڈاک سے ارفع کے نام ایک لفافہ موصول ہوا۔ لفافے کی دوسری جانب مہتاب کا نام اور پتے کی موجودگی نے لفافہ کھولنے بغیر ہی زبان حال سے بتا دیا کہ لفافے کے اندر کیا تھا۔

طلاق نامے پر بطور گواہان روانہ اور فرزانہ کے شوہروں کے دستخط تھے۔ کچے کاغذ پر طلاق نامے کی موصولی اس سانچے پر مہر تصدیق تھی گویا۔

”سمجھ میں نہیں آتا ایک طرف تو فرزانہ کے شوہر نے اس طلاق نامے پر بطور گواہ دستخط کر رکھے ہیں اور دوسری طرف وہ مصالحت کی کوشش کرنے کی بات کر رہا تھا۔“ ابا بھیا سمجھنے سے الجھنے میں بولے۔

”ابا یہ ارفع کے خلاف ان سب کی مشیر کہ سازش تھی۔ ان سب نے مل کر اس پر چھری چلائی ہے۔ اب مصالحت کی بات کر کے وہ اپنی آستین سے ارفع کے خون کے چھینٹے صاف کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ بھیا کے لہجے میں کئی تھی۔

ابانے کھٹی کھٹی ایک سر آؤ کھینچتے ہوئے تائید میں سر ہلایا۔

”طلاق نامے میں واضح طور پر تین مرتبہ طلاق لکھ دینے کے بعد مصالحت کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے۔“ بھیا نے کہا۔

”ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ ابا بولے۔

”ہو سکتا ہے فرزانہ کا شوہر سسرال کی شرما حضوری میں طلاق کا گواہ بن گیا ہو مگر بعد میں اسے پچھتاوا ہوا ہو اور اب وہ اس کا ازالہ مصالحت کی کوشش کر کے کرنا چاہتا ہو۔“ امی نے کہا۔

”امی خود کو دھوکا دینے کی کوشش نہ کریں۔ طلاق اچانک نہیں دی گئی ہے۔ اس کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی اور تیاری کی گئی۔ طلاق نامہ لکھنے کے لیے اسٹامپ پیپر پر درج تاریخ بتا رہی ہے کہ یہ آٹھ دن پہلے خرید گیا تھا۔ مہتاب.... کی بہنوں اور بہنوئیوں کو کچھ نہ کچھ سن گئی تو ہوگی۔ فرزانہ کا شوہر اگر ارفع کا ہمدرد یا ہمارا ہی خواہ ہوتا تو اب مصالحت کی بات کرنے کی بجائے اس وقت ہمیں باخبر کر دیتا۔“

بھیا کی بات غلط نہیں تھی۔ واقعتاً یہی ہوا تھا۔ طلاق سے قبل ان سب نے باہم صلاح مشورہ کیا تھا۔ باقاعدہ منصوبے کے تحت ارفع کا گھبراؤ کر کے اسے تاریک راہوں میں مارا تھا۔

”پھر بھی فتویٰ لے لو۔“ امی نیم در جا کی کیفیت میں تھیں۔



”کس بات کا فتویٰ؟“ بھانے امی کو دیکھا۔

”مسلمان تو قرآن کا شوہر بھی ہے نا، ہمارے خاطر وہ اپنے ایمان کو تو خطرے میں نہیں ڈالے گا۔ کوئی نہ کوئی مصلحت تو ہوگی جو اس نے مصالحت کی کوشش کی بات کی ہے۔“

”کوئی مصلحت نہیں امی۔“ بھیا کرے سے جانے کے لیے اٹھے۔  
امی کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔ جب سے ارفع گھر آئی تھی ان کی آنکھوں میں ہمہ وقت جل تھل سی تھی۔ امی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بھیا جاتے جاتے دوبارہ ان کے پاس بیٹھ گئے اور انہیں دلاسا دینے کو اپنا بازو ان کے شانوں پر دراز کرتے ہوئے بولے۔ ”اچھا ٹھیک ہے فتویٰ لیے لیتے ہیں بلکہ ساتھ ہی قانونی مشورہ بھی۔“  
مصالحت کے امکانات کی بات ہو رہی تھی۔ عدت کا معاملہ کچھ اچھ کر رہی رہ گیا۔

36 36 36

فتویٰ لینے کے لیے ابانے محلے کے امام مسجد سے رہنمائی چاہی تو انہوں نے پوچھا ”آپ کس فقہ سے تعلق رکھتے ہیں؟“

”حنفی۔“ ابانے جواب دیا۔

امام مسجد نے ابا کو ایک دینی مدرسے کا پتا دیا اور کہا۔ ”وہاں مولانا عبدالرحمان ہوں گے آپ ان سے مل لیں۔“  
مولانا عبدالرحمان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے ابا کو ایک قلم اور کاغذ کا دستہ لاتھمایا۔ ”تفصیل سے اس پر لکھ دیں تاکہ اسے فتوے کے لیے مفتی محمد عثمان صاحب کے سامنے پیش کیا جاسکے۔“  
”مفتی صاحب سے ملاقات ممکن ہو تو میں زبانی ان کے گوش گزار کر دوں۔“ ابانے بڑے عجز سے کہا۔  
”مسائل تحریر مفتی صاحب کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں، وہ ہر ہر نکتے پر غور و خوض کے بعد فتویٰ دیتے ہیں۔ ضرورت پڑے تو ملاقات بھی کر لیتے ہیں۔“  
”جی بہتر۔“

طلاق نامے کی نوٹو کا پی ابا کی جیب میں تھی۔ انہوں نے مذکورہ کا پی جیب سے نکالی اور اس کی مدد سے تفصیل کاغذ پر لکھ کر مولانا عبدالرحمان صاحب کے حوالے کر دی۔  
”آپ برسوں تشریف لے آئیں۔“  
”کل ممکن نہیں؟“ ابا کے لہجے میں بے تاب تھی۔  
”جی نہیں۔ کل یہاں علما کا اجتماع ہے۔“  
”جی بہتر۔“

غرض مند دیوانہ ہوتا ہے۔ دارالافتا سے نکل کر ابا کچھری جا پہنچے۔ شرمندہ شرمندہ، جھینپے جھینپے سے اور لوگوں سے یوں نظریں چراتے جیسے سبھی کو نافر کی طلاق کی خبر ہو۔ وہ ایک شیدائے ایک وکیل کے روبرو جا بیٹھے۔  
”فرمائیے!“ سیاہ کوٹ والے نوجوان وکیل نے پوچھا۔ ابا سنبھل کر بیٹھ گئے۔  
”وکیل صاحب ایک مشورہ لینے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔“  
”جی کہیے۔“

ابا دھیرے سے کھٹکھٹارے اور یوں متذبذب دکھائی دینے لگے جیسے بات کرنا مشکل ہو۔ ”وکیل صاحب! ایک شخص نے اپنی اہلیہ کو بیک وقت تین طلاقیں دے دیں۔“  
”طلاق مغلط۔“ نوجوان وکیل نے کہا۔  
”جی..... جی..... کیا تین طلاقوں کے بعد مصالحت کی کوئی مصلحت رہ جاتی ہے۔“ ابانے پوچھا۔



درمیانی عمر کا ایک اور وکیل شیڈ تلے بنی اس مشورہ گاہ میں آگیا۔  
 ”آئے سر“ اسے دیکھتے ہی اباسے جو کلام نو جوان وکیل اپنی کرسی سے اٹھ گیا اور اس نے اپنی کرسی آنے والے سینئر وکیل کے لیے چھوڑ دی۔

”بیٹھو، بیٹھو“ نو وارد وکیل نے نو جوان وکیل کے کندھے پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔  
 ”سر! آپ کی عدم موجودگی میں تو آپ کی سیٹ پر بیٹھنے کی غلطی کر لیتا ہوں، آپ کی موجودگی میں اس پر بیٹھنے شرم آتی ہے مجھے۔“  
 ”بیٹھو یا روپیہ اہلہم۔“

”ایڈووکیٹ مس الاسلام“ نو جوان وکیل نے سینئر وکیل کا ابا سے تعارف کرایا۔  
 ابا کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ دوسرے وکیل کی جانب دراز کرتے ہوئے بولے۔ ”خاکسار کو شرف الدین کہتے ہیں۔“  
 ”تشریف رکھیے۔“

ابا بیٹھ گئے۔  
 نو جوان وکیل نے ابا کی مخالف سمت میں دیکھتے ہوئے باز بلند کہا۔ ”اقبال تمہیں چائے تو منگو۔“ پھر ہر تن دوبارہ ابا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”جی سر! آپ نے جو سوال کیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں کے بعد شرعی اعتبار سے تو مصالحت کی گنجائش نہیں رہتی تاوقتیکہ مطلقہ حلال نہ کرے البتہ قانونی لحاظ سے گنجائش ہے۔“  
 ابا نے چونک کر نو جوان کو دیکھا۔

”بات یہ ہے بزرگوار کہ صدر ایوب خان کے زمانے میں عالمی قوانین کے نام سے خانگی زندگی کے بارے میں قوانین نافذ کیے گئے تھے، ان کی زد سے تین طلاقیں کے بعد بھی مصالحت کی گنجائش بھی جاتی ہے۔ ایوب خان مرحوم کے نافذ کردہ اس قانون کے مطابق ثالثی کو طلاق کی اطلاع دینا اور کوسل کی جانب سے مصالحت کی کوشش کا انتظار کرنا ضروری ہے۔ اس کوشش میں ناکامی کے بعد ہی طلاق نافذ اہل بھی جاتی ہے لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں ایسی کوئی بات یا شرط نہیں بلکہ جب شوہر نے طلاق دے دی تو وہ واقع ہوگئی خواہ مصالحتی کوسل کو اطلاع کی ہو یا نہ کی ہو۔“

”آپ کا کیا خیال ہے یہ درست ہے۔“ ابا جو نو جوان وکیل کی بات پر شش و پنج میں دکھائی دینے لگے تھے مذہب لہجے میں بولے۔

”بات میرے درست یا غلط سمجھنے کی نہیں۔ میں نے آپ کو سادہ الفاظ میں آپ کے سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔“  
 ”کسی انسان کے نافذ کردہ قانون کو خدا کے قانون سے تو تصادم نہیں کیا جاسکتا۔“ ابا نے کہا۔

”درست..... میں سو فیصد آپ سے متفق ہوں۔“ نو جوان وکیل نے کہا۔  
 ”ایکسیکو ریزی“ سینئر وکیل نے انتہائی نرم لہجے میں مداخلت کی اور ابا اور نو جوان وکیل دونوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ”خانگی معاملات کے سلسلے میں ایوب خان مرحوم کا نافذ کردہ قانون جسے ہم عالمی قوانین کے نام سے جانتے ہیں کسی فرد واحد کا نافذ کردہ قانون نہیں بلکہ ایوب خان نے اس کے لیے تمام مکتبہ ہائے فکر کے لوگوں سے رائے لی تھی۔ ایسا ہرگز نہیں تھا کہ ایک شخص بیٹھا اور اس نے ایوب خان کی خواہش پر راتوں رات عالمی قوانین کا مسودہ تیار کر دیا۔ میں سمجھتا ہوں اس سلسلے میں انتہائی عرق ریزی سے کام کیا گیا ہوگا۔ ایوب خان گورنمنٹ نے جید عالموں سے مشاورت کی ہوگی۔ دنیا بھر سے علمائے اسلام کی رہنمائی لی ہوگی۔ مینگنز، کانفرنسز، مشاورت، رہنمائی غرض سبھی

کچھ نہ کیا ہوگا اور ان علمائے انتہائی باریک بینی سے عالمی قوانین کا مسودہ بھی دیکھا ہوگا۔ کیا ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جو اسلامی شریعت سے تصادم کسی قانونی مسودے کی مخالفت کی جرأت نہ رکھتا ہوگا۔ اگر عالمی قوانین اسلامی شرع سے تصادم ہونے والا قانون ہے تو کیا کوئی شخص اتنی ہمت بھی رکھتا ہے یا اتنا ناقتہ اندیش ہو سکتا ہے کہ اس تصادم کا وبال رہتی دنیا تک کے لیے اسے سر لے سکے۔ کم از کم میں تو ایسا نہیں کر سکتا۔“

سینئر وکیل کے لہجے میں اتنا زور و کلام اور پختی گفتگو نے ابا کو خاصا متاثر کیا۔ شاید اس لیے بھی کہ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا ابا اس وقت اس ہی باتیں سنتا چاہتے تھے۔ امید دلانی اور ارفع کو دوبارہ اس گھر میں بسانے کی راہ دکھانی باتیں! نو جوان وکیل مسکرایا۔ ”سوری سر، آپ سے اختلاف کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ صدر اسلام سے موجودہ صدی تک تمام مسلمان اپنے تمام تر فقہی اختلافات کے باوجود ایک ساتھ تین طلاقیں کو قرآن و سنت کی رو سے طلاق مغلطہ مانتے آئے ہیں۔ تین طلاقیں بلغظ واحد کو رجعی قرار دینا پوری امت مسلمہ کے خلاف بغاوت ہے۔“

”ایسی بات نہیں۔“ سینئر وکیل نے مدبرانہ انداز میں کہا۔ ”اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس میں سختی نہیں۔ یہ اعتدال اور آسانیاں کا دین ہے۔ اسلام خود کہتا ہے دین میں سختی نہیں۔“

”لیکن اس کا یہ مطلب کب ہے کہ لوگوں کو آسانیاں فراہم کرنے کی خاطر اس کی اصل روح اور اصل شکل کو بدل دیا جائے۔ طلاق تمام حلال امور میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہے۔ گھر برباد ہو جاتا ہے۔ عورت اور بچے در بدر ہو جاتے ہیں مگر اس اجتماعی مرض کا علاج یہ ہرگز نہیں کہ طلاق کو مذاق بنالینے والے مریضوں کو آسانی فراہم کرنے کے لیے یہ کہہ دیا جائے کہ تین مرتبہ طلاق ایک ہی ہوتی ہے۔“

”تم جذباتی ہو رہے ہو۔“ سینئر وکیل نے پھر اسی قدر مدبرانہ سے کہا۔ ”گھر ٹوٹنے کی ہلاکت کا اندازہ نہیں ہے تمہیں۔“  
 ”سر! یہ دنیا عارضی ہے۔ عارضی ہلاکت سے بچنے کے لیے دائمی ہلاکت کو گلے لگا لینا کہاں کی عقلندی ہے۔“  
 ”اچھا خیر۔“ سینئر وکیل نے اپنے تیوروں کو قطعاً گراں نہ ہونے دیا۔ ”بحث طویل ہو جائے گی، تم ان بزرگوار سے بات کرو میں آتا ہوں۔“  
 ”چائے آرہی ہے۔“

”ہوسکتا ہے چائے آنے تک میں بھی واپس آتی جاؤں۔“  
 ”جی!“ نو جوان وکیل نے روئے سخن ابا کی طرف کیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔  
 ”ہماری بحث میں آپ کا خاصا وقت ضائع ہوا۔“

”کوئی بات نہیں..... ریٹائرڈ آدمی ہوں۔ ریٹائرڈ آدمی کے پاس وقت کے سوا اور ہوتا ہی کیا ہے۔“  
 نو جوان وکیل نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم پیوست کر کے ہاتھ میز پر رکھ لیے اور دھیرے سے کھٹکھٹا کر بولا۔ ”ہر شخص اپنے اعمال کے لیے جوابدہ ہے۔ آپ نے مجھ سے مشورہ طلب فرمایا، میں نے آپ کو اپنے مشیر کے مطابق جواب دے دیا۔“

”شکر ہے۔“ ابا نے کہا پھر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالے ہوئے بولے۔ ”اس مشورے کی فیس وکیل صاحب۔“  
 ”ارے نہیں، بڑے صاحب شرمندہ نہ کیجیے۔“

”نوازش۔“ ابا اٹھ کھڑے ہوئے۔  
 ”چائے منگوائی ہے میں نے۔“  
 ”شکر یہ بیٹے، اجازت چاہوں گا..... ویسے بھی چائے کم ہی پیتا ہوں میں۔“  
 ”پہلیے پیجیے آپ کی مرضی۔“



”ہاں۔“ ابا جاتے جاتے پلٹے اور ہچکچاتے ہوئے بولے۔ ”آپ نے عائلی کونسل کا ذکر کیا تھا۔“

”جی..... جی.....“

”وہ کہاں ہوئی ہے۔“

نوجوان وکیل شیدے چپوترے کے انتہائی کنارے پر آکھڑا ہوا اور اس نے ہاتھ کے اشارے سے ابا کو بتایا۔  
”آپ یہاں سے سیدھے جائیں، بائیں ہاتھ پر مڑ جائیں۔ پہلا پلازہ چھوڑیں دوسرے پلازہ کے سینٹر فلور پر۔“

چیمبر مین عائلی کونسل کا دفتر ہے۔“

”مہربانی۔“

ابا چپوترے سے اتر کر پختہ روش پر آگئے اور نوجوان وکیل کی بتائی ہوئی سٹ میں آگے بڑھنے لگے۔ کچھری میز پر طرف لوگ ہی لوگ تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ساری دنیا مقدمات و مسائل اور قانونی مشکلیوں ہی میں تو ابھی ہوئی تھی۔ پختہ شیدے رتے، روشوں پر، راہداریوں میں، کمروں میں، برآمدوں میں، فوٹو کالنی ٹکالنے والی مشینوں کے نزدیک، کمپیوٹر کے آس پاس، پرانے دھرائے ٹائپ رائٹرز پر کھٹ پٹ کرتے ٹائپسٹوں کے اطراف میں، اسٹامپ وینڈرز کے سامنے، نوٹری پبلک کے چوٹی تختوں پر، چائے خانوں کے باہر، غرض ہر سوانسوں کی بھیڑ تھی۔ ابا نے جھکائے نظر اس چرائے جتنا طرہی سے آگے بڑھتے چلے گئے۔ دل میں ایک خوف سا تھا۔ کوئی شناساں کیا تو! تو اسے اپنے پچھری آنے کا کیا سبب بتائیں گے۔

حالانکہ یہ پریشان ہونے والی بات نہ تھی۔ آدمی صرف جرم و سزا کے حوالے سے ہی تو نہیں سو دوسری ضرورتوں کے تحت بھی تو پچھری آ سکتا ہے۔ جائیداد کے کاغذات تیار کروانے، وصیت نامہ بنوانے، کوئی درخواست ٹائپ کروانے، کسی دستاویز کی تصدیق کروانے مگر شریف آدمی نہ پریشان ہونے والی بات پر بھی کبھی کبھی یونہی پریشان ہوتا ہے جیسے اس وقت ابا تھے۔

نوجوان وکیل کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے ابا بالآخر چیمبر مین عائلی کونسل کے دفتر تک جا پہنچے۔

”جی فرمائیے۔“ کرسی پر بیٹھے ہماری تن و دوش والے ایک شخص نے ابا کو کمرے کی دہلیز پر دیکھ کر کہا۔

ابا نے دزدیدہ نظروں سے ان دو خواتین کو دیکھا جو کمرے میں بڑی ایک چوٹی پر بیٹھی تھیں۔ ایک محرم دوسری نوجوان۔ دونوں کے چہروں پر بے رونق تھی۔

”چیمبر مین عائلی کونسل تشریف رکھتے ہیں۔“ ابا نے پوچھا۔

”آپ حکم کیجیے، میں چیمبر مین صاحب کا ریڈر ہوں۔“

ابا کو بات کرنا مشکل محسوس ہونے لگا۔

ان دونوں خواتین کی طرف اپنی پشت کر کے ابا مذکورہ شخص کی میز پر جھکتے ہوئے آہستہ سے بولے۔ ”یہ دیکھا گیا۔“

آفس ہے نا جہاں..... شوہر اور بیوی میں صلح کرانی جاتی ہے۔“

”جی بالکل وہی ہے۔“

”میں..... میں پوچھ سکتا ہوں..... آپ لوگوں کا کیا طریقہ کار ہوتا ہے۔“ ابا نے کمرے میں خواتین کو

موجودگی کے خیال سے اپنی آواز نہایت دھیمی رکھی۔

”آپ بیٹھیے..... جتنا تاہوں۔“

ابا بیٹھ گئے۔

”دیکھیے صاحب عائلی قوانین کے تحت ضروری ہے کہ جب کوئی مرد اپنی زوجہ کو طلاق دے تو وہ عائلی کونسل کو اس

بات کی اطلاع دے اور کونسل کی مصالحتی کوشش کا انتظار کرے۔ جب کوئی شخص ہمیں اطلاع دیتا ہے کہ اس نے اپنی

زوجہ کو طلاق دے دی ہے تو ہم فریقین کو بذریعہ کونسل یہاں بلا تے ہیں اور دونوں کو سمجھا بھجا کر مصالحت کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔“

”مصالحت ہو جاتی ہے؟“

”کبھی ہو جاتی ہے کبھی نہیں ہوتی مگر آپ..... یہ ساری انکوائری کیوں کر رہے ہیں؟“ ریڈر نے ابا کو شک سے

دیکھا۔

ابا تذبذب میں پڑ گئے۔ بتائیں یا نہ بتائیں۔

مسائل بن کر پہنچے تھے تو دست سوال دراز کرنا ہی تھا۔

”میری بیٹی کو اس کے شوہر نے طلاق دے دی ہے۔ ان کی طرف سے مصالحت کی گنجائش ہونے کی بات نکلے تو

میں قانونی مشورے کے لیے یہاں بھی آیا۔ ایک وکیل صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے عائلی کونسل کا تذکرہ

کیا۔“ ابا کی آواز مستقل دھیمی تھی۔

”کیا نام ہے آپ کی بیٹی اور ان کے شوہر کا؟“

”شوہر تھا..... اب پتا نہیں رہا یا نہیں رہا۔“ ابا دل گرفتگی سے بولے۔

”نام؟“

”ڈاکٹر مہتاب۔“

”مہتاب فاروقی؟“

ابا نے چونک کر ریڈر کی طرف دیکھا۔ ”آپ کو کیسے معلوم؟“

”طلاق نامے کی کاپی ہمیں آج ہی ملی ہے.....“ اس شخص نے ایک فائل کھولی اور اس پر نظر مرکوز کرتے ہوئے

انتظار یہ لہجے میں بولا۔ ”اربع شرف نام ہے آپ کی بیٹی کا؟“

”جی..... جی۔“

”ٹھیک ہے ہم فریقین کو مصالحت کے لیے عائلی کونسل بلائیں گے۔“

”کب؟“ ابا کے لہجے میں بے تابی تھی۔

”یہ آپ کو میرے دوسرے ساتھی بتا سکیں گے کیونکہ پارٹیز کونسل وہی ایڈوکیٹ کرتے ہیں۔ آج وہ چھٹی پر ہیں۔“

”میں کل آ جاؤں؟“

”جیسے آپ کی مرضی۔“

”مصالحت ہو جائے تو اچھا ہے۔“ ابا کو اپنی آنکھوں کے کنارے سیلتے محسوس ہوئے۔ ریڈر ان کی کیفیت تاڑ

”اللہ بہتر کرے گا۔“ اس نے ابا کو تسلی دی۔

”ویسے ایک بات بتائیے۔“ ابا کے لہجے میں حد درجہ احتیاط تھی۔

ریڈر پھر ہمہ تن ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”کیا..... تین طلاقیں کے بعد ہونے والی صلح..... اسلامی نکتہ نگاہ سے درست ہوتی ہے؟“

”بڑے صاحب الحمد للہ اس دفتر کا ادھر سے پہنچے تک سارا عملہ مسلمان ہے ماسوا سوچ کر کے۔“

”صاحب! مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ شرعی مسائل کے سلسلے میں ہم پاکستانی مسلمان خاصے

ہندوستانی ہیں، اپنے جارحانہ مزاج کے باعث ہم دین اسلام کو اس کی اصل گہرائی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے،

بلکہ ایک دوسرے کو سننے اور برداشت کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔“



”کل پھر حاضر ہوتا ہوں۔“ ابانے اٹھنے کا قصد کیا۔ ”دارالافتا بھی گیا تھا انہوں نے پرسوں بلایا ہے۔“

”فتویٰ کہاں سے لے رہے ہیں آپ؟“ ریڈر نے پوچھا۔

ابانے اس دینی مدرسے کا نام لیا جہاں سے وہ ہو کر آرہے تھے۔

”ان کا فتویٰ تو یہی ہو گا کہ طلاق ہو چکی۔“ ریڈر نے ایک پرچی پر کچھ لکھا اور ابا کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”آپ یہاں سے بھی فتویٰ لیں۔“

ابانے پرچی لے کر اٹھ گیا تھا۔ ”دارالافتا مرکزی جامع مسجد الجہدیت“ ابانے ابھی ابھی نظروں سے ریڈر کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”مگر میاں، ہم تو فقہ حنفیہ کے ماننے والے ہیں۔“

”محترم! اگر اسلام شدید بھوک میں بقدر ضرورت مردار کھانے کی اجازت دیتا ہے تو یہ طلاق کا مسئلہ ہے۔ ضرورت میں ایک مسلک کا دوسرے مسلک پر عمل کرنا جائز ہے۔“

ابا کا دل مطمئن ہو گیا۔

”کل کتنے بجے آ جاؤں؟“

ریڈر چند لمحوں کو سوچ میں پڑ گیا پھر ابا کو ہر دو اند نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ اس عمر میں کہاں زمین کریں گے۔ اطمینان رکھیے میں اپنے سامنے سے کہہ دوں گا کہ وہ آپ کی بیٹی اور داماد کو کسی قریبی تاریخ میں طلاق کر دے گی۔“

”بہت شکریہ..... بہت بہت شکریہ..... مہربانی۔“

ابا سر اپا تشکر بن گئے۔ آخری لفظ پر ان کی آواز بھرا گئی۔

یہ کیا کہہ دیا تھا ریڈر نے!

اس عمر میں!

ابا کا دل پھوڑے کی طرح دھکنے لگا۔

سوچا بھی نہ تھا کہ اس عمر میں ایک بیٹی کا گھر اجڑ جائے پر اس طرح کچھری میں آ کھڑے ہوں گے۔ وہ تو جو کرتے تھے، ارفع کا گھر آباد ہو جائے پھر اطمینان! سکون! پھر جائے اللہ دنیا میں رکھے یا اپنے پاس بلا لے۔ ارفع شادی کے ابتدائی دنوں میں وہ اور امی کتنے خوش رہا کرتے۔ شلے سبک بار لگتے، دل ٹھنڈا رہتا، افسوس پھر وہی چل پڑی تھی بلکہ اب تو زیادہ شدت کے ساتھ!

اس عمر میں ایسا ہو گا کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

ابانے اپنے دونوں ہاتھ چہرے پر ڈھانپ لیے۔ ہچکیاں، سسکیوں میں بدلیں اور پھر یکذرت وہ پھوٹ پھا کر رو دیے۔

اس عمر میں یہ کیا ہو گیا تھا!

مہتاب نے یہ کیوں نہیں سوچا تھا کہ صرف ارفع کا معاملہ نہیں تھا اُسے طلاق دے کر وہ پورے خاندان کو اذیت سے دوچار کرنے جا رہا تھا۔

ابا رو رہے تھے

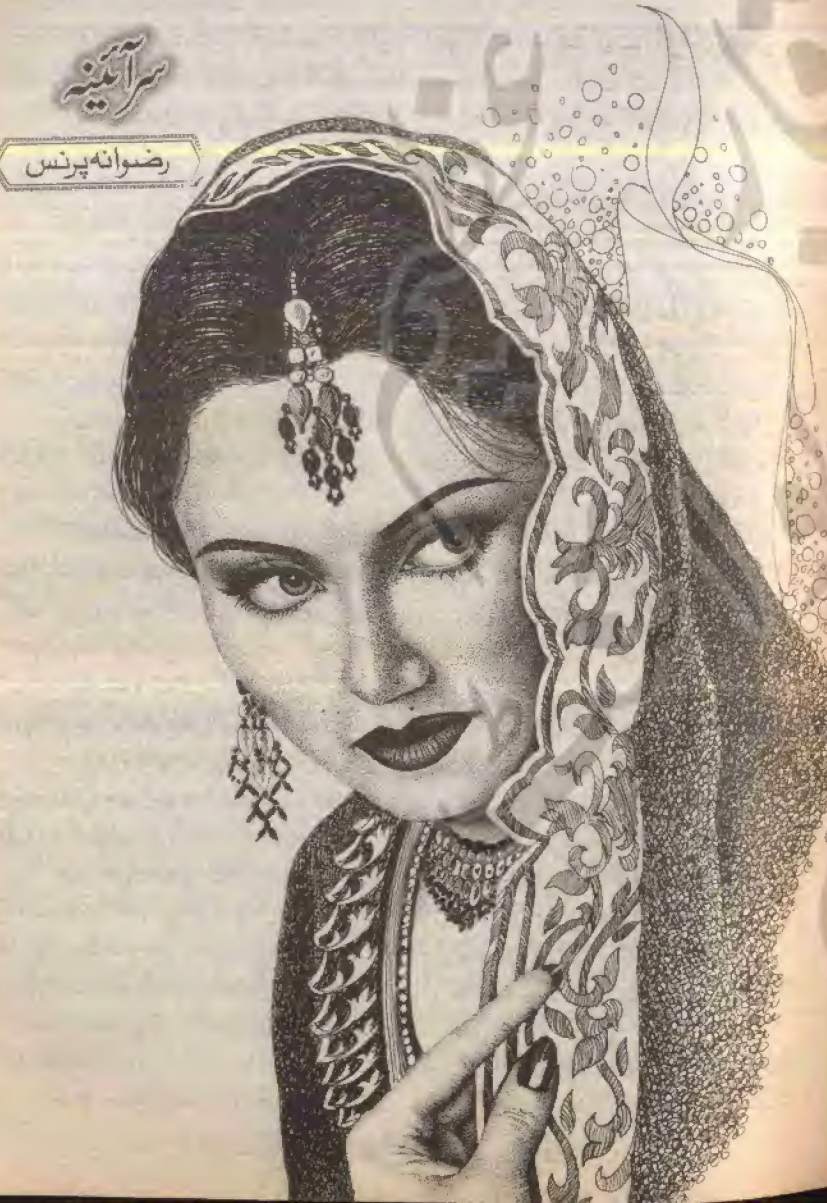
پھوٹ پھوٹ کر، بلک بلک کر

یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ آج کے بعد پھر کبھی نہیں روئیں گے۔

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں

خزاں کے مانند اتر رہا تھا۔ اس کی پلکیں بھیٹنے لگیں۔

وقت انسان کے دل سے کیسے اس کی خواہشات، اس کی پستہ، اس کی خوشیاں، اس کی مسکرائیں اپنی ظالم گرفت میں لے کر دل کو جیسے بالکل خالی کر دیتا ہے۔ کیوں ہوتا



سرآئینیہ

رضوانہ پرنس



ہے یہ وقت اتنا تنگ دل، اتنا سفاک۔ اس نے بڑی بے بسی سے سوچا۔ تبھی لاؤنج میں رکھے فون کی بجتی ہوئی پینل نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ گھر میں پہلے ہوئے بکھیر سنانے میں فون کی تیز آواز اسے بہت عجیب سی محسوس ہوئی۔ اس نے جلدی سے ریسیور اٹھا لیا۔

”ہیلو عمیرہ! کسی ہو گزرا؟“ شہروز بھائی کی شفیق آواز نے جیسے اس کی ساری اداسی اپنے اندر سمولی۔

”ہائے شہروز بھائی، یہ اچانک آپ نے کیسے فون کر لیا۔“ مارے خوشی کے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”بس تم اتنی یاد آ رہی تھیں اور پھر عید جوں جوں نزدیک آتی جا رہی ہے ہم لوگوں کو تمہاری ہی اتنی ہی زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔ تم کہاں اتنی دور چلی گئی ہو۔“ وہ بے غار ہنستے ہوئے کہہ رہے تھے لیکن ان کے ہر لفظ میں اس کی جدائی کا دکھ دور ہوا تھا۔

”میں خود سے تھوڑا ہی آئی ہوں۔ آپ سب نے مجھے اتنی دور بھیج دیا۔“ وہ یہ کہتے ہوئے بے اختیار ہی رو پڑی کہ دل ویسے ہی بہت بھرا ہوا تھا۔

”ارے ارے بھئی! اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ اتنے پیارے سے دو لہا میاں کے ساتھ بھیجا ہے تمہیں اس پر یوں کے دیں میں۔ کوئی اکیلی تو نہیں ہو تم، وہاں تمہارا شہزادہ تمہارے ساتھ ہے۔“ شہروز بھائی اس کے رونے سے خاصے گھبرا گئے لیکن وہ اپنی بھراہٹ اس پر ظاہر کیے بغیر اسے بہت پیارے سمجھانے لگے۔

”لیکن شہروز بھائی میرا یہاں بالکل بھی دل نہیں لگ رہا۔ آپ سب بہت یاد آ رہے ہیں۔“ وہ رندگی ہوئی آواز میں بولی۔

”شہروز بھائی کو اپنا دل کتنا ہوا محسوس ہوا۔“ عمیرہ بیٹا، اب وہی تمہارا گھر ہے۔ تم کو ہر حال میں وہاں دل لگانا ہے۔ سب سے بڑھ کر وہاں ارباز ہے تمہارے پاس، تمہارے ساتھ۔ عمیرہ اب تمہاری ساری خوشیاں اسی کے دم سے ہونا چاہئیں۔“ وہ بڑے پیار سے اسے سمجھانے لگے۔

”میں یہ سب جانتی ہوں شہروز بھائی لیکن پھر بھی

مجھے یہاں بہت تنہائی محسوس ہوتی ہے۔ تین دن بعد عید ہے اور یہاں اس ملک میں کچھ بڑی باتیں چل رہی ہیں۔ اس وقت وہاں کتنی رونق، کتنی جھمکاہٹ ہو گئی۔ کتنا مزہ آ رہا ہوگا عید کی تیاری کرنے میں اور یہاں تو کچھ جہاں نہیں چل رہا کہ عید آنے والی ہے۔ آپ یقین کریں شہروز بھائی اس وقت میرے چاروں طرف اتنا گھرا سنا اور خاموشی چھا چکی ہوئی ہے جیسے عید نہیں محرم کے دن شروع ہونے والے ہیں۔“ وہ ایک بار پھر سسک کر رو دی تو شہروز ایک لمحے کو بالکل خاموش ہو کر رہ گئے۔

وہ ان کی بہت تہیتی چھوٹی بہن تھی، وہ ان سے نو برس چھوٹی تھی۔ وہ اس سے اپنے بچوں سے بڑھ کر پیار کرتے تھے۔ اماں اور بابا کی ایک ایک کیڈنٹ میں اچانک موت کے بعد انہوں نے اپنی اپنی چھوٹی سی معصوم بہن کو جیسے اپنے کلیجے میں چھپا لیا تھا۔ حالانکہ وہ بھی اس وقت محض اٹھارہ برس کے تھے جب ان لوگوں کی زندگی میں یہ بدترین سانحہ رونما ہوا تھا لیکن بس اس دن اس بھیا تک لمحے کے بعد ہی اس اٹھارہ سالہ نوجوان نے اپنے آپ کو ماں اور باپ دونوں کے روپ میں ڈھال کر اپنی ننھی سی بہن کی گویا تمام تر ذمے داریاں اپنے سر لے لی تھیں۔

روپے پیسوں کی ایسی کوئی کمی تھی کہ بابا کی ٹھیک ٹھاک جائیداد بھی اور پھر آفس کی طرف سے بھی بہت کچھ ملا تھا۔ چچا اور ماموں سب ہی خلص اور ہیلپ فل تھے، سوان کی گائیڈنس اور موڈل سپورٹ کی وجہ سے انہوں نے بہت آرام سے اپنی تعلیم مکمل کر لی۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی چھوٹی بہن کی بھی اتنے ناز و نم اور پیار کے ساتھ پرورش کی کہ سب ہی حیران رہ گئے۔ رشتے کی ایک خالہ ان لوگوں کے ساتھ ہی رہتی تھیں لیکن شہروز بھائی کو عمیرہ کی چھوٹی سی چھوٹی بات کا اتنا خیال رہتا کہ بقول خالہ، ماں بھی ہوتی تو شاید شہروز جیسی محبت نہ کر پاتی کہ انہوں نے عمیرہ کی کسی بات پر نہ کہنا تو سیکھا ہی نہیں تھا۔

یوں تو عمیرہ کو پورے خاندان کی بے پناہ محبت اور توجہ حاصل تھی لیکن بھائی کی محبت تو جیسے اس کے لیے

دنیا کی سب سے انمول نعمت تھی۔ اماں اور بابا کی جدائی کے گھرے گھاؤ کو شہروز بھائی کی محبت ہی نے تو بھرا تھا ورنہ وہ تو جیتے جی مر گئی ہوتی۔ ابھی اس نے میٹرک ہی کیا تھا کہ گھر میں شہروز بھائی کی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے۔

وہ ان جلدی شادی نہیں کرنا چاہ رہے تھے لیکن خالہ کا بی بی بونٹی اور کزنہ رونی جاری تھیں اور پیار بھی رہنے لگی تھیں۔ سو بہن کے اکیلے پن، اس کی تنہائی اور اس کی ذمے داری کے احساس نے انہیں مجبور کر دیا کہ جلد از جلد وہ اس گھر کے لیے ایک ذمے دار اور حساس لڑکی کو اپنی بیوی کے روپ میں لے آئیں جو ان کے دکھ سکھ کی ساسھی ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی بہن کو بھی پیار اور تحفظ دے سکے اور شہروز بھائی پھر گھر کی طرف سے بالکل بے فکر ہو جائیں۔

شرہ نے واقعی ان کی زندگی میں آ کر ساری فکریں اپنے دامن میں سمیٹ لیں۔ اس کے خوب صورت سے وجود نے شہروز کی زندگی میں پھول ہی پھول بکھیر دیے۔ وہ ایک بہت اچھی شریک زندگی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہت ہی اچھی بھالی بھی ثابت ہوئی۔

عمیرہ کو اس کے روپ میں ایک ماں، بہن اور دوست سبھی کا تو پیرا مل گیا اور پھر مہرزد اور ننھی ٹوپہ کی دوسال کے اندر اندر آمد نے جیسے ان لوگوں کی خوشیوں کو چار چاند لگا دئے۔

شہروز بھائی کی نظر میں عمیرہ ہمیشہ ان کے بچوں ہی کی طرح رہی تھی۔ انہوں نے اس میں اور اپنے دونوں بچوں میں بھی کوئی فرق محسوس نہیں کیا تھا بلکہ کبھی کبھی تو شرہ کو عمیرہ کا پلڑا زیادہ بھاری محسوس ہوتا لیکن وہ کچھ دار لڑکی تھی، شہروز کے جذبات کو سمجھتی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ جلد ہی عمیرہ اپنے گھر کی ہو جائے گی، سو وہ جیسا جیسے جذبات سے اپنے آپ کو دور رکھ کر اپنے جنت جیسے گھر کو درخ بنانے سے محفوظ رہی تھی۔ پھر ایسا ہی ہوا۔ عمیرہ کی شادی چٹ مفتی پٹ پٹا کے مصداق اچانک ہی طے پا گئی۔ رشتہ بے حد اچھا تھا۔

ارباز ایک بہت اچھی فیملی کا بڑا بھائی تھا۔ اس کا پورٹ ایکسپورٹ کا بزنس تھا، جو خوب چل رہا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ شہروز کے بھائی دوست جمال کا فرسٹ کزن تھا۔

جمال کے بیٹے کی سالگرہ میں اتفاق سے ارباز اور اس کے مٹی ڈیڑی بھی لندن سے آئے ہوئے تھے۔ ارباز کی مٹی ان ہی دنوں ارباز کے لیے بڑی شد و مد کے ساتھ لڑکیاں دیکھنے میں مصروف تھیں۔ سالگرہ میں معصوم سی صورت والی عمیرہ انہیں دل و جان سے بھاگتی۔ جمال کے جانے بوجھے لوگ تھے چھان بین کی بھی ضرورت نہیں تھی۔

ادھر شہروز بھائی بھی اس رشتے سے بے حد خوش تھے۔ ارباز کی شخصیت، اس کا کردار، اس کی قابلیت سب چیزوں سے اچھی طرح آگاہ تھے کہ جمال کے ساتھ وہ ایک دوبار لندن اپنے آفس کے کام کے سلسلے میں جا چکے تھے۔

ارباز کی مٹی لندن جانے سے پہلے ان دنوں کا نکاح کر دینا چاہ رہی تھیں تاکہ ویزا وغیرہ کی فارمیٹری پوری کی جا سکے۔ فیملی پر پرسوں جمانے کے مصداق پندرہ دن کے اندر اندر شادی کی تاریخ ٹھہر گئی۔ ارباز کی ایک بہن کینیڈا میں اور ایک بھائی شارجہ میں سیشن تھے۔ دونوں ہی کو ہنگامی طور پر بلوایا گیا۔ امیر بھتیجی میں بھی بہت اچھی شادی ہوئی۔

ارباز خود بھی اس شادی سے بہت خوش تھا۔ پیاری سی شکل کی یہ بھولی بھالی لڑکی پہلی ہی نظر میں اس کے دل میں اتر گئی تھی اور یوں عمیرہ آنکھوں میں خاموش احتجاج لے کر ارباز کی بنادی گئی۔

شہروز بھائی نے خود اس سے اس رشتے کے بارے میں اس کی مرضی پوچھی تھی۔ تب اس نے آنسو بھری نگاہوں سے ان کو دیکھ کر صرف اتنا ہی کہا تھا۔ ”شہروز بھائی میں اتنی دور جانا نہیں چاہتی۔ مجھے اپنے آپ سے جدا مت کریں، پلیز۔“

شہروز بھائی نے بے اختیار اسے گلے سے لگایا۔ ”گزرا آج کل فاصلے سٹ کر رہ گئے ہیں۔ تمہارا جب



وہ اپنی امی کے ساتھ لاہور اپنے خالہ زاد ولی شادی میں گیا تھا۔ ہفتے بھر بعد جب وہ لوگ لوٹے تو دروازے کے نیچے بڑے ہوئے اس سنبھرے لٹافے نے جیسے اس کی زندگی سے سارا سنبھرا پن پھین لیا۔ ایک لمبے کوتوہ بالکل شاکد رہ گیا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا۔ لڑکھڑا کر اس نے ماں کا سہا ریا جو اس کے نزدیک ہی کھڑی تھیں۔

وہ ماں تھیں لمحوں میں بیٹے کا دکھ جان گئیں۔ وہ فوراً ہی شہروز کے گھر روانہ ہو گئیں۔ بچے آنسوؤں کے ساتھ انہوں نے شہروز کے آگے عمیرہ کے رشتے کے لیے دامن پھیلا دیا۔ ان کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اتنی جلدی عمیرہ کی شادی طے پا جائے گی۔ ابھی تو اس نے کالج میں اینڈیشن کیا تھا۔

شہروز نے ول ہی دل میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ عمیرہ کی شادی صرف ہفتہ بھر بعد ہے اور کارڈ بھی بیٹ چکے ہیں۔ اگر تاریخ طے ہونے سے پہلے ہی تائی اماں دست سوال دراز کر دیتیں تو ان کی پوزیشن کتنی اکورڈ ہو جاتی۔ رشتے داری اور ادب لحاظ کے ناتے انکار کرنا کتنا مشکل کام ہو جاتا لیکن اب تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا، سو انہوں نے بڑی سہولت سے کارڈ بیٹ جانے کا جواز بنا کر انکار کر دیا اور وہ مایوس دل برداشتہ واپس لوٹ گئیں۔

تائی اماں کے منع کرنے کے باوجود ہشام نے دل پر پتھر رکھ کر شادی میں شرکت کی۔ اپنی محبت کو ہمیشہ کے لیے کسی اور کے ساتھ رخصت ہوتے دیکھا۔ اس وقت اس نے اپنے آپ کو بے بسی کی اس انتہا پر کھڑے دیکھا جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ بھی بھی انسان زندہ ہوتے ہوئے بھی مر جاتا ہے، اندر سے بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ یہ احساس اسے عمیرہ کی رخصتی کے وقت شدت سے ہوا۔ عمیرہ کی خوبصورت آنکھوں سے بہتے بے بس آنسو اسے اپنے دل پر گرتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ یوں ایک خاموش محبت کی کہانی بہت خاموشی سے ہی ختم ہوئی۔

اس وقت شہروز بھائی سے بات کرتے ہوئے تھا

دل گھبرائے آجایا کرتا، میں ٹکٹ بھیج دیا کروں گا لیکن بیٹا یہ رشتہ بہت ہی اچھا ہے۔ میں اس سے بہت مطمئن ہوں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میں اماں بابا کی روح کے سامنے سرخرو ہو جاؤں گا۔ تم وہاں بہت خوش رہو گی۔“

کتنی خوشی اور کتنا مان تھا ان کے لیے میں، وہ بس بے بسی سے انہیں دیکھ کر رہ گئی۔ اپنے بھائی کی خوشی، ان کے مان کی خاطر وہ اپنا دل تو کیا اپنی جان بھی قربان کر سکتی تھی۔ ابھی تو اس نے اپنے نازک سے دل میں چھپی اس معصوم محبت کو بہت بے دردی کے ساتھ مار دیا۔ ان روشنیوں کو بجھا دیا جو کسی کے آنے پر اس کی آنکھوں میں جھلکنا اُٹھتی تھیں۔

ہشام اس کا تایا زاویہ نہیں اس کے دل کے سنگھاس پر بیٹھا وہ دیوتا تھا جس کی شاید اس نے بچپن سے ہی پوجا کی تھی اور اس کے جذبوں کی شدتوں کی خاموش زبان کو ہشام بھی بہت اچھی طرح سمجھتا تھا۔ عمیرہ کے لب تو خاموش رہتے لیکن اس کی آنکھیں اس کے دل میں جیسے سب جذبات کچھ اس طرح سے بتا دیتیں کہ ہشام کو کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ وہ عمیرہ کے گھر آنے کے بہانے ڈھونڈا کرتا اور عمیرہ کے دل کی ہر دھڑکن پل پل اس کا انتظار کیا کرتی۔

شہروز بھائی ان دونوں کے معصوم جذبات کو سمجھ ہی نہیں پائے۔ ویسے بھی ہشام ابھی اچھی طرح اسٹیلش نہیں ہوا تھا۔ ابھی تو اس نے جاب شروع ہی کی تھی۔ تایا ابا کے اچانک انتقال کی وجہ سے اسے اپنی ماں اور اپنے بہن بھائیوں کی خاطر تعلیم ادھوری چھوڑ کر جاب کرنی پڑی تھی کہ تایا ابا اپنے پیچھے کوئی قابل ذکر جائیداد یا بینک بیلنس نہیں چھوڑ گئے تھے اور پھر شہروز بھائی نے تو اپنی لاڈلی بہن کو ہمیشہ شہزادی کے روپ میں دیکھنا چاہا تھا۔ انہوں نے ہشام کے بارے میں اس نظر سے سوچا ہی نہ تھا۔ اس بات سے بے خبر کہ ان کی معصوم سی بہن کے دل کی ہر دھڑکن بس ہشام ہی کو پکارتی ہے انہوں نے ار باز سے اس کی بات طے کر دی۔

ہشام کو تو اچانک ہی اس کی شادی کا کارڈ ملا تھا۔



نہیں کیوں ایک دم سے ہی عیسرہ کو ہشام بھی شدت سے یاد آ رہا تھا۔۔۔ بھی تو اس نے وہ بے لفظوں میں تالی اماں کی خیریت پوچھ ڈالی۔

”وہ لوگ ٹھیک ہیں۔ ہشام کا ٹرانسفر لاہور ہو گیا ہے، بروی اچھی تر تھی ہوئی ہے۔“

شہروز بھائی کے اس جواب پر اس کے اندر چھین سے کوئی چیز ٹوٹ گئی۔ تو اب جب بھی وہ اپنے دلیں جائے گی تو ہشام کو دیکھ بھی نہ پائے گی۔ ویسے بھی اس کی شادی کے بعد تالی اماں ان لوگوں سے خاصی بچ سی گی تھیں۔ شہروز بھائی اور بھائی سے کافی دیر باتیں کرنے کے بعد جب اس نے ریسور واپس رکھا تو دل بہل جانے کے بجائے کچھ اور اس ہو گیا تھا۔

ان کا گھر جس علاقے میں تھا وہ کچھ زیادہ ہی پرسکون تھا۔ سب گھر خاموشی کی چادر اوڑھے جیسے سو رہے ہوتے۔ ان کے کمین بھی نہ جانے اندر کہاں روپوش رہتے تھے کہ بس بھی آتے جاتے ہی نظر آ جاتے تھے۔ اس کے دونوں طرف کے پڑوسی انگریز تھے اور وہ بھی اس ٹیگی کی کے جو اپنے آپ میں مگن رہتے ہیں۔ ان فیکٹ جنہیں ایشین پسند نہیں ہوتے ہیں۔

وہ چپ چاپ آ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ عید جب بھی نزدیک آتی تھی تو وہ کتنا ہنگامہ مچایا کرتی تھی۔ اپنی فرینڈز کے ساتھ تو کبھی بھیا بھائی کے ساتھ شاپنگ سینٹرز کے چکر لگ رہے ہیں۔ شاپنگ کے ساتھ رونقوں کو انبوائے کرنا، چائے، فالودہ کھاتے ہوئے لوگوں پر تبصرے کرنا، چوڑیاں پہننے جانا، کتنا مزہ کرتی تھی وہ۔ اس نے پلکوں پر آئے آنسوؤں کو بے دردی سے مسل ڈالا۔

بچپن عید پر اس نے ہشام سے بھی تو زبردستی عید ملی تھی۔ ہشام نے کتنا ستا کر اس کی مہندی لگی تھی۔ پر سو رہے کا نوٹ رکھا تھا۔ اسے یاد آیا، بچپن چاند رات کو وہ سب کز زمزم کر رہی تھیں دیکھنے باہر نکلے تھے۔ ہشام سب کو لیز کر رہا تھا۔ کتنی رات گئے تک وہ لوگ گھومتے پھرتے رہے تھے۔ چھوٹی موٹی شاپنگ اور کھانا پینا بھی چل رہا تھا چونکہ بھائی بھی ساتھ تھیں اس

لیے شہروز بھائی نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ اس رات ہشام نے سب لڑکیوں کو اپنی طرف سے چوڑیاں بھی پہنوائی تھیں اور جب وہ اپنے لیے ایک چوڑیوں کا سیٹ پسند کر دی تھی تو ہشام نے بہت خاموشی سے سرخ اور سبز چوڑیوں کا جھنگٹا ہوا حسین سائیٹ اس کی جانب بڑھا دیا تھا اور عیسرہ نے بھی اتنی ہی خاموشی سے اپنا پسند کیا ہوا سائیٹ واپس رکھ کر وہ سیٹ لے لیا تھا۔

عید کے دن گلابی سوٹ پر وہ سرخ و سبز چوڑیاں پہنے ہر ایک کی تنقید کا نشانہ بنی رہی لیکن اسے تو بس ایک چیز نے سب باتوں سے بے نیاز کر دیا تھا اور وہ چیز بھی ہشام کی آنکھوں سے جھلکتی خوشی اور وارمٹی۔

”آف، اس نے سر کو جھکا۔ اب میری شادی ہو چکی ہے پھر تم کیوں یاد آ کر مجھے پریشان کرتے رہتے ہو۔ اسے یاد آیا حال۔ کتنی تھیں کہ اگر شادی شدہ عورت اپنے شوہر کے ہوتے ہوئے کسی غیر کے متعلق سوچے بھی تو اسے سخت گناہ ہوتا ہے۔ نہیں نہیں اللہ میاں اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں، میں تو چاہتی ہوں کہ وہ بھی بھی یاد نہ آئے لیکن اگر وہ خود بخود یاد آ جاتا ہے تو پھر آپ مجھے

کیوں گناہ دیں گے۔ میں نے تو ہمیشہ اپنے دل پر قابو رکھا۔ زبان سے بھی کبھی اظہار نہیں کیا۔ دیواروں تک کو جاتے ہوئے ڈری۔ اپنے بھائی کی عزت پر کوئی آنچ نہیں آنے دی۔ اپنی ساری خوشیاں قربان کر دیں لیکن اس کی یاد اگر ایک ضدی بچے کی طرح بار بار آ کر مجھے ستاتی ہے تو کیا آپ میری ساری قربانیوں کو نظر انداز کر کے بلا قصور مجھے گناہ دیں گے۔ یہ تو آپ کے ہاتھ میں ہے تاکہ اس کی یاد میرے دل سے منادیں۔ میرے بس ہیں

ہو تو میں کب کا ایسا کر چکی ہوتی۔“ وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رو پڑی۔ تبھی ڈور بیل کی آواز پر اس نے جلدی سے اپنی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو پونچھا۔

اسی وقت ار باز اپنی چابی سے دروازہ کھولتے ہوئے اندر آ گیا۔ اس کی رونی رونی سی آنکھوں کو بغور دیکھا تو وہ نظریں چراغی۔

”کیوں رو رہی تھیں۔ کیا پاکستان یاد آ رہا



ہے؟“ وہ اس کے نزدیک بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”ہاں.....!“ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

آنکھیں ایک بار پھر برے سے کھٹیا ہو گئیں۔

”یار میں ہوں، تاہم ہمارے پاس۔ چلو اٹھو میں

تمہیں کہیں گھملاؤں۔“ ارباز نے پیار سے اس کے

ہاتھ تھام لیے۔

نہیں ارباز اب تو افطار کا وقت ہونے والا ہے۔

میں نے ہلکی پھلکی افطاری اور کھانا بنا لیا ہے۔ آپ

فریش ہو جائیں جب تک میں ٹیبل لگاتی ہوں۔“ وہ اس

کے ان الفاظ بھرے چلے پر کچھ تادم ہو کر بولی۔

”نہیں بھئی آج ہم افطار باہر ہی کریں گے۔ تم

جلدی سے تیار ہو جاؤ، ابھی تو آدھا گھنٹا ہے۔ ویسے یار

لندن کے لوگوں کو روزے کا زیادہ ثواب ملنا چاہیے۔

دیکھو نہ گرمیوں کے اس موسم میں نوبے تک سورج ہی

غروب نہیں ہوتا۔“ وہ بیٹھتے ہوئے باہر کھڑکی سے

جھانکنے لگا جہاں بادلوں کی اوٹ سے سورج جھانک رہا

تھا۔



ہوٹل میں کھانا کھاتے ہوئے وہ ارباز کو پاکستان

میں عید کی رونقوں کے بارے میں بتا رہی تھی۔ ارباز

کے مٹی ڈیڑی اپنی بیٹی کے پاس کنیڈا لگے ہوئے تھے۔

اتفاق سے نواسے کی سالگرہ عین عید کے دن پڑ رہی تھی۔

اس لیے رینا نے بعد اصرار انہیں روک لیا تھا ورنہ وہ تو

اپنی ننھی ٹولی بہو کی پہلی عید اس گھر میں اس کے ساتھ ہی

منانا چاہ رہے تھے۔

ارباز کے ساتھ اتفاق یہ ہوا تھا کہ اس نے آج

تک پاکستان میں کوئی عید نہیں منائی تھی۔ جب بہت

چھوٹا تھا اور اس کے نانا نانی زندہ تھے تو ایک آدھ بار وہ

لوگ عید پر وہاں ضرور گئے تھے لیکن اسے کچھ زیادہ یاد نہ

تھا۔ عیسرہ سے چاند رات کی رونقوں کا حال وہ بڑی

دلچسپی سے سن رہا تھا۔

”جج ارباز مجھے تو چاند رات کو زیادہ مزہ آتا

ہے۔ بس مجھے تو وہی عید ملتی ہے۔ پورے رمضان غضب

کی گہما گہمی اور شور شرابا رہتا ہے۔ شاپنگ سینٹر آؤمی

آؤمی رات تک کھلے رہتے ہیں۔ وہاں پر لوگوں کا

ازدحام ہوتا ہے۔ چاند رات کو تو دکان میں جج چار بیٹے

کھلی رہتی ہیں اور لوگ ایسے گھوم پھر رہے ہوتے

جیسے جج عید کے لیے انہیں اٹھانا ہی نہیں۔ لڑکے بھی

موتے سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں اور چوڑیاں

اسٹال لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔“

اس نے بیٹے ہوئے بتایا تو ارباز بھی بے اختیار

مسکرا دیا۔ ”لیکن ارباز اتنی ڈھیر ساری رونقوں

ہنگاموں کے بعد عید کے دن میرا دل چاہتا تھا کہ بس

جاؤں۔ مجھے تو عید، چاند رات تک ہی زیادہ اچھی

ہے۔“ وہ بڑی معصومیت سے بولی۔

ارباز بے ساختہ ہنس دیا۔ ”نواسل دن تو عید

ہوتا ہے اور وہی تم کو بورنگ لگتا ہے۔“

”نہیں خیر اتنا بورنگ بھی نہیں لگتا۔“ وہ ہر

یادوں میں کھو کر بولی۔

اس دن وہ لوگ تیار ہو کر سب بزرگوں کے

سلام کرنے جایا کرتے تھے کہ اماں بابا کے بعد ان کی

لوگوں کی شفقتوں اور محبتوں کے سائے میں یہ لوگ بے

بڑھے تھے۔ وہ کتنے دل سے تیار ہوا کرتی تھی۔ کسی کی

خاموش نگاہوں کی تعریف، ان میں جھلکتا والہانہ

اسے کتنا اچھا، کتنا خوب صورت لگا کرتا تھا۔ تا یا با کے

گھر جاتے ہوئے دل میں کتنی معصومی خوشی ہلکورے

لینے لگتی تھی۔ اوہ، اس نے اپنی سوچ پر کھرا کر ارباز

جانب دیکھا تھا۔

”میں بہت بری ہوں، میرا اتنا چاہنے والا شو

میرے نزدیک ہی بیٹھا ہوا ہے اور میں پھر اس کے

بارے میں سوچنے لگی ہوں۔ اللہ میاں پلیز ایسا مت

کریں یہ میرے ہاتھ میں نہیں آپ کے ہاتھ میں

پھر آپ کیوں مجھے اسے بھولنے میں مدد نہیں دے

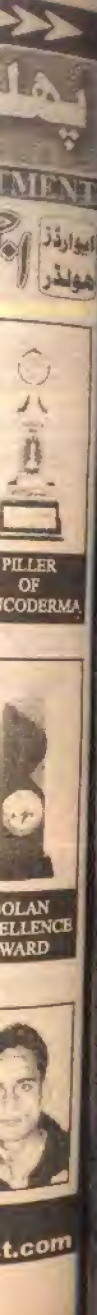
رہے۔“

”ارے بھی کہاں کھو گئیں تم؟“ ارباز نے اس

کے آگے ہاتھ ہلایا تو وہ بس سر جھکا کر خض مسکرا دی۔

”مجھے پتا ہے کہ تمہیں وہاں پر گزری عید میں

آ رہی ہیں۔ یار باہر کے ممالک میں ایک سیبی تو خرا





ہے کہ ہمیں یہاں اپنے جوار کا کوئی مزہ ہی نہیں ملتا۔ چھٹی تک نہیں ہوتی ہے۔ اکثر لوگ نماز پڑھ کر دفتروں کو روانہ ہو جاتے ہیں۔ کچھ پانی نہیں پیتا کہ عید کا دن ہے آج۔“ وہ عیسرہ کی باتیں سن سن کر کچھ کڑھ کر بولا۔ اتنی تفصیل تو مئی نے بھی سمجھی نہیں بتائی تھی۔

”ہاں ارباز یہاں تو کچھ پانی ہی نہیں چل رہا کہ ماہ رمضان آیا بھی تھا اور قسم بھی ہو رہا ہے۔ آج کل تو وہاں کی رونقیں دیکھنے کے قابل ہوں گی۔“ اس کے لہجے میں اداسیاں سمٹ آئیں اور ارباز اس کا اداس چہرہ دیکھ کر نہ جانے کیوں خاموش سا ہو گیا۔

☞☞☞

ارباز کا فون آیا تو وہ کپڑے پر پس کر رہی تھی۔ ”سنو عیسرہ آج شام کو افطار اور کھانا نہیں بناتا ہمیں ایک افطار پارٹی پر جانا ہے۔“

ارباز کے بتانے پر وہ کچھ خوش ہو گئی۔ اس کا دل شدت سے چاہ رہا تھا کہ اپنے کسی ہم وطن کے گھر اپنے جیسے لوگوں سے ملے۔ پورا رمضان گزر گیا تھا لیکن وہ لوگ یہ مشکل ایک آدھ جگہ ہی افطار پر گئے تھے۔ ارباز کے حلقہ دوستی میں مسلمان بہت زیادہ نہ تھے اور تحفے بھی تو وہاں افطار پارٹیوں کا کوئی خاص رجحان نہیں تھا۔

”ٹھیک ہے کتنے بچے جانا ہوگا؟“

”جتنی اصل میں ان کا گھر میرے آفس کے بالکل ہی نزدیک ہے۔ آج ویک اینڈ ہے ٹریفک بہت زیادہ ہوگی، میرا تو آنے اور پھر فوراً واپس جانے میں کبازا ہو جائے گا۔ تم ایسا کرو شام ہونے سے پہلے پہلے میرے آفس آ جاؤ پھر ہم لوگ یہاں سے اسٹف ہی چلے چلیں گے۔“

ارباز کے اس پروگرام پر وہ ایک لمحے کے لیے جھبڑ سی ہو گئی۔ اس کی خاموشی کو محسوس کر کے ارباز ہنس دیا۔

”پاگل لڑکی! اپنے آپ میں کانفیڈنس پیدا کرو۔ یہاں ہر کوئی ایک دوسرے کے آسرے پر نہیں رہتا۔ اپنے سب کام خود ہی کرنے پڑتے ہیں۔ پاکستان کی طرح ٹھوڑا ہی ہے کہ ڈرائیور کو آڈر کر دیا اور خود

شان سے بیٹھ گئیں۔ یہاں تو بڑے سے بڑا آدمی ڈرائیور اور ڈرائیور نہیں کرتا ہے بلکہ ایسا کچھ کونسلٹنٹ ہی نہیں ہے یہاں۔ اب ہمیں خود ہی سب جگہ آنے جانے کی عادت ڈالنی ہوگی۔ کب تک چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے میرا منہ دیکھو گی۔“ اس کے اتنے لیے کچھ پروردہ شرمندہ ہی ہو گئی۔

”ارباز، میں کبھی اسکی نگاہیں نہیں ہوں نا، اس لیے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔“

”ارے جیسی تم دو مرتبہ میرے ساتھ آفس آ چکی ہو۔ یاد ہے جب میں چھٹیوں پر تھا اور اپنے کسی کام سے مجھے آفس جا پڑا تھا تو دونوں مرتبہ تم ساتھ تھیں۔“

”ہاں یاد ہے۔“ وہ ہنسنے ہوئے لہجے میں بولی۔

”اور ہاں ایک بات تو ہم دونوں بس سے گئے تھے کار میں کچھ پرالیم کھی، ہے نا؟“ ارباز نے پرجوش لہجے میں اسے یاد دلایا۔

”جی۔“ ہنوز اس کا لہجہ صم تھا۔

”تو پھر پرالیم کیا ہے۔ گھر سے تھوڑے فاصلے پر بس اسٹاپ ہے۔ بس ڈائریکٹ میرے آفس کے سامنے سے گزرتی ہے۔ آفس تم نے دیکھا ہوا ہے بس اسی اسٹاپ پر اتر جانا۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔ ہاں موبائل ضرور ساتھ رکھ لیتا اور جان اس بہادری کے بدلے میں، میں تم کو انعام کے طور پر ایک خوبصورت سا سرپرائز بھی دوں گا جو آفس میں تمہارا منتظر ہے۔“

”کون سا سرپرائز ارباز؟“ وہ سب بھول کر ایک دم سے خوش ہو گئی۔ ویسے بھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اسے خوش ہونا کچھ زیادہ ہی آتا تھا۔

”بس تم آؤ گی تو تمہیں خود ہی پتا چل جائے گا۔ بی بیو۔“ ارباز نے ہنستے ہوئے فون رکھ دیا۔

☆☆☆

شام کے پانچ بج رہے تھے۔ ارباز کا آفس خاصا دور تھا۔ کم از کم بیسٹا لیس منٹ کا تو راستہ تھا اور بس سے تو وقت اور زیادہ لگتا۔ اس نے جلدی جلدی اپنے کپڑے پر پس کیے۔ آسانی رنگ کے جارجنٹ کے مادہ سے سوٹ کے ساتھ ہم رنگ جیولری نکالی۔ ابھی وہ

کپڑے بدلنے جا رہی تھی کہ کسی نے دروازے کی تیل بجائی۔ یہ اس وقت کون آ گیا۔ اس نے حیرت سے سوچے ہوئے دروازہ کھولا تو سامنے دو چھوٹے چھوٹے بچے کھڑے ہوئے تھے۔ پوچھتے پر پتا چلا کہ ان کی کینڈ سڑک کے پچھلے حصے میں بنے ان کے چھوٹے سے گارڈن میں آ رہا ہے۔ اس کی اجازت ملنے پر ایک بچہ دوڑ کر اندر سے کینڈا نکال لایا۔

ابھی وہ دونوں بچے پلٹے ہی تھے کہ اچانک ایک بچہ کٹھن کر لگی اور وہ منہ کے بل جا گرا۔ اس اچانک افتاد پر عیسرہ بے اختیار اس بچے کی طرف لپکی۔ اس وقت ہوا خاصی تیز چل رہی تھی۔ عیسرہ نے بچے کو بھی اٹھایا ہی تھا کہ دھڑام سے دروازہ بند ہونے کی آواز پر اس نے بے حد گھبرا کر پیچھے دیکھا۔ وہ آٹومیک ڈور ہوا کے زور سے بند ہو چکا تھا۔ عیسرہ بچے کو دوہیں چھوڑ کر دوڑتی ہوئی دروازے کے پاس آئی۔ گھبرا کر اس کو دھکا دیا لیکن دروازہ ہلاک ہو چکا تھا۔

اس نے اکثر لوگوں سے یہ قصے سنے تھے کہ دروازہ ہلاک ہو گیا۔ چابی اندر رہ گئی لیکن آج یہ قصہ خود اس کے ساتھ بھی پیش آ چکا تھا۔ یہ آٹومیک لاک بھی اس کے لیے اتنی بڑی مصیبت بن جائے گا اس نے بھی سوچا بھی نہ تھا۔

وہ دوڑ کر ڈرائنگ روم کی کھڑکیوں کی طرف گئی کہ اکثر وہ انہیں کھول دیتی تھی لیکن آج وہ بھی بند تھیں۔ وہ چند لمحے سکتے کے عالم میں کھڑکی کی کھڑکی رہ گئی۔ دونوں بچے پتا نہیں کب وہاں سے جا چکے تھے اسے کچھ پتا نہیں چلا۔ وہ حواس باختہ سی کھڑکی دروازے کو دیکھے جا رہی تھی۔ پاؤں میں اس کے چپل بھی نہیں تھی کیوں کہ وہ ننگے پاؤں ہی دروازہ کھولنے چلی آئی تھی۔ نیلے رنگ کے ٹریک سوٹ میں (کہ وہ گھر میں یہ پہنا کرتی تھی) ننگے پیروہ حیران پریشان کھڑکی سوچ رہی تھی کہ اب وہ کیا کرے گی۔ علاقے میں وہ کسی کو جانتی بھی نہ تھی۔ کیوں کہ ان کے گھر کے آس پاس زیادہ تر انگریزی ہی رہتے تھے۔ ان تین ماہ میں اس کی کسی سے علیک سلیک بھی اتفاق سے نہیں ہوئی تھی۔ بس ارباز ہی

اکثر ان لوگوں سے آتے جاتے ہائے بیلو کر لیتا تھا۔ اسے ارباز کے آفس کا فون نمبر زبانی یاد نہیں تھا کیوں کہ وہ کبھی آفس کے نمبر پر فون ہی نہیں کرتی تھی۔ ارباز کی ہدایت کے مطابق وہ ڈائریکٹ موبائل پر ہی اس سے بات کر لیتی تھی اور آج ارباز اپنا موبائل گھر پر ہی بھول گیا تھا اور جب ہی تو اس نے خاص طور پر موبائل اپنے ساتھ لانے کی تاکید کی تھی۔

وہ گھبرا کر ادھر سے ادھر گھٹنے لگنے لگی۔ کیا کروں، کہاں جاؤں میرے مالک۔ اگر ہمت کر کے ساتھ والوں کا دروازہ کھٹکھٹاتی بھی ہوں تو اس کا فائدہ کیا ہوگا۔ فون نمبر تو ڈائری میں ہے اور ڈائری اندر گھر میں ہے۔ ٹہل ٹہل کے اس کے پاؤں شل ہو گئے تو وہ وہیں دروازے کے پاس بیٹھ گئی۔

وہ کیسے ارباز کو بتائے کہ وہ مشکل میں پڑ گئی ہے۔ اس طے میں پنا چپل کے، پنا پیسوں کے وہ ارباز کے آفس بھی نہیں جاسکتی تھی۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور وہ بے بسی کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ دل ہی دل میں ان بچوں کو ہزار صلواتیں سنارہی تھی جن کی کینڈ نے اسے اس پریشانی میں لا پھینکا تھا۔

اچانک ہی اسے محسوس ہوا کہ اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی سی پھوار برس رہی ہے۔ اس نے گھبرا کر اوپر دیکھا آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ایک کالے دیو کی مانند اسے ڈر رہا تھا۔ اس لندن کے موسم کا بھی قسمت کی طرح کوئی اعتبار نہیں۔ ایک دم سے اپنا رنگ بدل لیتا ہے۔ یوں بھی شام ہونے والی تھی، اوپر سے کالی گھٹاؤں نے فضا میں کالی اندھیرا سا گھول دیا تھا۔ خوف اور دہشت اسے اپنے رگ و پے میں اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

اس وقت یقیناً چھ سے زیادہ کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ ایک گھنٹے سے باہر کھڑی ہوئی تھی۔ ارباز کتنا پریشان ہو رہے ہوں گے۔ اس وقت تو اسے وہاں پہنچ جانا چاہیے تھا، اس نے دل کر سوچا۔ اندر و قفے و قفے سے فون کی بجٹی تیز تیل اسے صاف سنائی دے رہی تھی اور وہ بے چارگی سے دروازے کو کٹکے جا رہی تھی۔ یقیناً ارباز فون



کر رہے ہوں گے۔ وہ وہاں پر بھی ٹرائی کر رہے ہوں گے اور دونوں جگہ سے کوئی رسپانس نہ ملنے پر کس قدر پریشان ہو رہے ہوں گے۔ وہ بے بسی سے رو پڑی۔ اپنی بے بسی اور ارباز کی پریشانی کے بارے میں سوچ کر اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

یا اللہ کیا منحوس دن تھا آج کا۔ وہ جو صبح سے اپنے وطن کی عید کو یاد کیے جا رہی تھی اب اسے سوائے ارباز کی پریشانی کے کچھ اور یاد نہیں آ رہا تھا۔ اس نے اللہ سے دعا کی تھی کہ وہ ہشام کی یاد اس کے دل سے مٹا دے تو اس وقت اللہ میاں نے ہشام کی یاد مکمل طور پر اس کے دل سے مٹا کر اس میں صرف اور صرف ارباز کی فکر اور اس کی پریشانی بھر دی تھی لیکن کتنے انوکھے طریقے تھے۔ بادل زور سے گر رہے اور ایک دم سے بارش بہت تیز شروع ہو گئی تھی۔ وہ بری طرح سے بیگم رہی تھی لیکن اس کی اتنی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ ساتھ والے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا سکے۔ بھی سامنے سے آتے دو لمبے چوڑے نیگروں کو دیکھ کر اس کا دل بالکل ہی بیٹھ گیا۔

ارباز نے بتایا تھا کہ یہ کالے بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ راہ چلتے لوگوں کو بہت آرام سے لوٹ لیتے ہیں اور ضرورت پڑے تو مارنے سے بھی گریز نہیں کرتے ہیں۔ ان کی قوم کچھ زیادہ ہی خطرناک ہوتی ہے۔ وہ مارتے دل کے ساتھ ان کو نزدیک آتے دیکھتی رہی۔

وہ دونوں اس کے نزدیک آ کر ایک لمبے کو رکے۔ پھر اسے یوں بے سرو سامان اتنی ناگفتہ حالت میں کھڑے دیکھ کر انتہائی حیرت سے ایک نے کوئی سوال کیا لیکن وہ جوان کو دیکھ کر ویسے ہی بہت زیادہ مبہم لگی تھی ان کے اس طرح اپنے پاس کھڑے ہو جانے پر ایک دم سے ہی بہت زیادہ خوفزدہ ہو کر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر زور زور سے رونے لگی۔

وہ دونوں اسے یوں روتا دیکھ کر کافی گھبرا گئے۔ ایک نے فوراً ہی اپنا منہ بالکل نکالا اور کسی سے تیز آواز میں بات کرنے لگا۔

عمیرہ کا تو جیسے دم ہی نکل گیا۔ وہ یقیناً اپنے اور

ساتھیوں کو بلارہا تھا۔ وہ پوری آواز سے چلا چلا کر رونے لگی۔ بارش کی آواز اور اپنے رونے میں مشغول ہونے کے سبب اس نے یہ سننے کی کوشش ہی نہیں کی۔ کس سے اور کیا بات کر رہا ہے۔

وہ دونوں اس کے یوں رونے پر اور حواس باختہ ہو گئے اور پتا نہیں کیا کہتے جھکتے تیز تیز قدموں سے پیچ ہوئے آگے نکل گئے۔

عمیرہ نے آنسو پونچھتے ہوئے تھوڑا سا سکون کا سانس لیا ہی تھا کہ پولیس کی گاڑی کے تیز سائرن کی آواز سے پورا ایریا گونج اٹھا۔ ایک پولیس کار زانے سے اس کے نزدیک آ کر رکی اور اس میں سے دو پولیس والے برآمد ہوئے۔

وہ ہنگاماً سیٹیں دیکھتی رہ گئی۔ کیا وہ لوگ اسے کوئی چور، کوئی خراب عورت تو نہیں سمجھ رہے۔ اس نے ان پولیس والوں کو خوفزدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے سوچا۔ اگر انہوں نے مجھے گرفتار کر لیا تو ارباز کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ میں کہاں گئی۔ وہ ایک بار پھر تڑپ کر رہ دی۔

تب ایک پولیس والے نے بہت نرمی اور ہمدردی سے اس کا مسئلہ پوچھا اور اپنی مدد کی آفر کی تو جیسے اس کی جان میں جان آ گئی۔

اس نے آنسو پونچھتے ہوئے ابھی اپنا مسئلہ بتانا شروع ہی کیا تھا کہ ارباز کی کار بہت تیزی سے پولیس کی کار کے پیچھے آ کر رکی اور وہ بے حد حواس باختہ تقریباً دوڑتا ہوا عمیرہ کے نزدیک آ گیا۔ اسے اچانک ہی اپنے سامنے پا کر عمیرہ کو ایسا لگا گیا تیز چلتی ہوئی زن پر چٹکے پاؤں چلتے ہوئے ایک دم سے کوئی بہت بھٹکا سا سائیل جائے۔

ارباز نے بے پناہ پریشانی کے عالم میں بے اختیار اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا جب کہ وہ بچوں کی طرح رونے جا رہی تھی۔ ”یو لو عمیرہ کیا ہوا، سب خبریت ہے نا۔“ وہ بے قراری سے پوچھ رہا تھا۔

پولیس مین بھی حیرت سے ان دونوں کی طرف متوجہ تھے۔ تب اس نے آنسوؤں اور سسکیوں کے

درمیان ارباز کو ساری بات کہہ سنائی۔

”اوہ گاڈ!“ ارباز نے سکون کی ایک طویل سانس لی اور دونوں پولیس والوں سے بہت معذرت کی۔

وہ دونوں مسکراتے ہوئے اپنی کار کی جانب بڑھ گئے۔ اپنی کی زبانی عمیرہ کو پتا چلا کہ ان کالوں نے پولیس کو نوٹ کر کے اس کی مدد کرنے کو کہا تھا اور وہ ناحق ان پر شک کر رہی تھی۔

☞☞☞

ارباز کی ہنسی نہیں رک رہی تھی اور وہ کھسکی ہوئی سی اسے روشنی ہوئی نظروں سے دیکھے جا رہی تھی۔ ارباز کے اوپر جو ان ڈیڑھ دو گھنٹوں میں گزری تھی اسے بس اس کا دل ہی جانتا تھا۔ وہ پریشانی کی ایک حد کراس کر گیا تھا۔ ایسے برے برے سمیٹک خیالات اس کے دل کو ایک مغریت کی مانند جکڑ رہے تھے کہ اس سے سانس لینا محال ہو رہا تھا۔ پانچ بجے سے گھر اور موبائل دونوں پر عمیرہ کو ٹرائی کر رہا تھا لیکن دونوں فون پر نو رسپانس تھا۔ بہت ٹرائی کرنے کے بعد اور عمیرہ کے آتش نہ بجنے پر اس کی پریشانی عروج پر پہنچ گئی۔ اس کو پکارتیں ہو چلا تھا کہ عمیرہ کے ساتھ کوئی بڑا حادثہ ہو چکا ہے۔ وہ گاڑی اڑاتا ہوا گھر پہنچا تو دروازے پر کھڑی پولیس کار نے تو جیسے اس کے شے کو یقین کی زبان دے دی، اس کی جان ہی تو نکال دی لیکن اب جب کہ ذہن و دل کو سکون حاصل ہوا تھا تو عمیرہ کی حرکات اور حالت زار کا سوچ سوچ کر اس کی ہنسی نہیں رک رہی تھی۔ عمیرہ اس کے یوں لگتا رہنے پر اب بچ بچ روٹھ گئی تھی۔ آنکھوں میں حسب معمول آنسو آ گئے۔

”ارے ارے بھی خفا ہونے کی نہیں ہو رہی ہے، چلو میں تم کو وہ سر پرانز دے ہی دوں جو کہ میں آنسو ش دیتے والا تھا۔“

”کون سا سر پرانز؟“ وہ اپنا غصہ بھول کر بڑے تجسس سے انہیں دیکھنے لگی۔

تب ارباز نے جیب سے پی آئی اے کے دو ایئر کنڈ نکال کر اس کے سامنے لہرائے۔ ”جناب ہم کل

تم بین ساجن

اک اور برس بھی بیت گیا

اب آ جاؤ۔۔۔۔۔

ایسا نہ ہو کہ

جبر میں ڈوب کے

میری سانسیں رک جائیں

شاعرہ: رابعہ اسلم، رحیم یار خان

صبح کی فلائٹ سے پاکستان جا رہے ہیں کہ تم کچھ کالو کٹنگ نے وہاں کی چاند رات کا کچھ ایسا نقشہ کھینچا کہ مابدولت کا دل تہارے ساتھ یہ چاند رات منانے کو بے تاب ہو گیا کہ مجھے بھی تو حق ہے نا اس رات کو انجوائے کرنے کا۔“ وہ شرارت بھری خوشی سے اسے بتا رہا تھا۔

”ہائے بچ۔“ اس سے مارے خوشی کے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

”ہاں بالکل بچ۔ بس اب تمہارے پاس صرف چند گھنٹے بچے ہیں اس رات کے جس میں تمہیں پیکنگ کرنی ہے۔“ صبح نو بجے کی فلائٹ ہے ہماری۔“

”اف ارباز! آپ کتنے اچھے ہیں۔ یہ چاند رات میری زندگی کی سب سے انوکھی اور خوبصورت چاند رات ہوگی۔“ وہ فرط جذبات سے اس کے گلے لگ گئی اور کتنی حیرت کی بات تھی کہ اس وقت ہشام کی یاد اس کا خیال اس کے دل میں کہیں دور دور تک نہ تھا۔

بس ارباز کے ساتھ پاکستان جا کر چاند رات منانے کا خیال، شہر زبہائی، بھائی اور بچوں سے ملنے کی خوشی کے علاوہ اس کے دل میں کچھ نہ تھا۔ ارباز کے بازوؤں کے حصار میں ملنے والے تحفظ نے اسے اس وقت جو سکون دیا تھا، جو خوشی بخشی تھی یہ اللہ کی ہی بخشش ہوئی تھی جس نے اس کے بے کل دل کو ایک انوکھے طریقے سے خوشی بخش کر اس کو یہ بتا دیا تھا کہ جس کی نیت صاف ہو اللہ

ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا ہے۔

☞☞☞



## کارواں اپنا

اسما قادری

ناولٹ



”سوری بھائی! اہم معیو کی خود پر جی سوالیہ نظروں کو دیکھتے ہوئے رفعت نے شرمندگی سے کہا۔  
 ”کیوں نہیں آئی وہ؟“ اہم کے انداز میں دبا دبا غصہ تھا۔ جس کے لیے اتنے ڈھیروں کام چھوڑ کر آیا تھا  
 اسے سامنے نہ پا کر غصہ اور بھنجلاہٹ کا شکار ہونا بڑا افسوسناک عمل تھا۔  
 ”اسے آج اپنے گاؤں جانا تھا اس لیے وہ جلد گھر چلی گئی۔“ رفعت نے بتایا۔





”تو تم مجھے انعام کر دیتیں۔ کم از کم میرا وقت تو ضائع نہیں ہوتا۔“ احمد جس لہجے میں بات کر رہا تھا وہ اس کے مزاج کا حصہ قطعی نہیں تھا لیکن نور العین کو نہ پا کر جو مایوسی ہوئی تھی وہ کسی نہ کسی صورت تو سامنے آئی ہی تھی۔

”میں بہت دیر سے آپ کے موبائل پر ٹرائی کر رہی تھی لیکن آپ کا موبائل آف تھا۔“ زحمت نے صفائی پیش کی تو اسے یاد آیا کہ کسی نئے جھنجھٹ میں پھسنے سے بچنے کے لیے اس نے اپنا موبائل آف کر دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ طے شدہ کاموں کے سوا اسے کچھ ٹائم کسی اور مصروفیت کا شکار ہونا پڑے لیکن اب جیسے ساری بھاگ دوڑ اور جدوجہد بیکار چلی گئی تھی۔

”اچھا چلو، تم تو نیچو گاڑی میں تاکہ میں تمہیں گھر پر ڈراپ کر دوں۔“ اپنے اعصاب کو ٹرسکون کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے زحمت سے نرم لہجے میں کہا وہ بیچاری کوئی قصور نہ ہوتے ہوئے مجرم بنی کھڑی تھی۔ ”شکر ہے آپ کو خیال آ گیا ورنہ میں سوچ رہی تھی کہ مجھے رکشا یا ٹیکسی کر کے خود ہی گھر جانا ہوگا۔“ زحمت نے برابر والی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بھائی کو بتایا۔ ”سوری یار! بس غصے میں غصے میں یاد ہی نہیں رہا کہ ساتھ لٹچ کے لیے جانے کے چکر میں تم اپنی گاڑی تو لے کر ہی نہیں آئی ہو۔“ وہ قدرے شرمندہ ہو کر گاڑی اشارت کرنے لگا۔

”یہ تو بہت خطرناک پوزیشن ہے بھائی! آپ کی طرف سے مستقبل کے لیے کچھ اچھے سنگلز نہیں مل رہے۔“ زحمت نے کہا۔

”اچھا، وہ کیسے؟“ احمد نے دلچسپی سے پوچھا۔ ”میں سوچ رہی ہوں کہ جس کے نہ ہونے پر آپ کا یہ حال ہوا ہے وہ ہوگی تو کیا ہوگا۔ آپ تو اس کے سامنے ہمیں بالکل ہی بھلا دیں گے۔“ زحمت بولی۔ ”یہ تو فیکٹ ہے۔“ زحمت کی بات پر وہ شرارت سے مسکرایا۔

”کیا.....؟ اس کا مطلب ہے میں ماما کے سامنے آپ کی فیور کرنا چھوڑ دوں۔ آپ کے تو ارادے ہی

تیک نہیں ہیں۔“ زحمت نے مصروفی نگاہ کا اظہار کیا۔ ”اب تمہاری فیور کی ضرورت رہی بھی نہیں۔ ڈیڑی ماما کے سامنے میرا مقدمہ جیت چکے ہیں۔“ احمد اسے مسلسل چھیڑ رہا تھا۔

”کوئی مسئلہ نہیں، دوسری پارٹی تو میرے ہاتھ میں ہے۔ آپ کے خلاف ایسے ایسے دلائل ہیں کہوں گی کہ وہ آپ کے لیے ”ہاں“ کہہ ہی نہیں سکے گی۔“ زحمت کی دھمکی بڑی زور دار تھی۔ احمد نے فوراً ہنسنا ہاتھ سے اپنا کان پکڑتے ہوئے اس سے معافی مانگی پھر دونوں بہن بھائی ہنس پڑے۔

”ایک بات پوچھوں بھائی؟“ زحمت نے دیکھا کہ اس کا موزی حال ہو چکا ہے تو مختصر انداز میں اس سے مخاطب ہوئی۔

”پوچھو۔۔۔۔۔“ راؤنڈ اباؤٹ سے گاڑی گھمانے ہوئے اس نے جواب دیا۔

”آپ نے نور العین سے شادی کا فیصلہ کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ تو لیا ہے نا؟ میرا مطلب ہے کہ کہیں بعد میں ایسا نہ ہو کہ آپ کو اپنا فیصلہ غلط لگنے لگے۔“ زحمت نے کہا۔

”تم ایسا کیوں سوچ رہی ہو؟“ اس کی سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے احمد نے پوچھا۔

”بس..... مجھے لگتا ہے کہ نور اور ہماری فیملی کے ماحول میں بہت زیادہ ڈیفرینس ہے۔ وہ لوگ بہت زیادہ کنزرویٹو ہیں۔ اب آج کی مثال ہی دیکھ لیں۔ نور العین نے کچھ پر ساتھ چلنے سے انکار کرتے کے بعد مجھ پر واضح کر دیا کہ اگر اسے گاؤں میں بھی جانا ہوتا تو وہ ہمیں جوائن نہیں کرتی کیونکہ اس کا ماحول اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتا تو میں سوچ رہی تھی کہ کہیں ڈیفرینس وقت کے ساتھ ساتھ مزید بڑھتی ہی نہ جائیں۔“ زحمت نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

”تم پریشان مت ہو میں نے یہ ساری باتیں سوچ لی ہیں اور میرا خیال ہے کہ اس سے کوئی فرق نہ پڑے گا۔ تھوڑا تھوڑا ہم دونوں کمپروماز کریں گے اور ایک دوسرے کے ساتھ ایڈجسٹ کر ہی لیں گے۔“

مجھے اپنی محبت کی طاقت پر بھی یقین ہے۔ میری محبت ہر مسئلہ کو حل کر دے گی۔“ وہ بے حد پریقین تھا۔ ”اور اگر خدا نخواستہ وہاں سے انکار ہو.....“ احمد کے چہرے کا رنگ اتنی تیزی سے بدلا کہ زحمت اپنا جملہ مکمل نہ کر پائی۔

”اس سبب سے دیکھا ہے، اس کے سوا کچھ نہیں سوچا اور یہ تو ہرگز بھی نہیں سوچا کہ وہ میری نہیں ہو سکے گی۔“ وہ بے حد سنجیدہ تھا۔ زحمت کا دل سہم سا گیا۔ اس نے پہلی بار اپنے بھائی کے انداز میں کسی چیز کے لیے اتنی شدت دیکھی تھی۔

”اے اللہ! میرے بھائی کے دل کو آباد رکھنا۔“ اس نے چپکے سے دعا مانگی۔

\*\*\*

”ہم بلائیں تو پڑھائی کا بہانہ ہوتا ہے اور اپنی سہیلی کے لیے دیکھو کیسے پیچی چلی آئی ہے۔“ وہ مطلب شاہ کے ساتھ حویلی چنپی تو زینت اور مہر نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

”ٹھکو بعد میں کر لیجئے گا پہلے مل تو لیں۔“ وہ ہنسی ہوئی زینت آپا کے گلے لگ گئی تو وہ اسے خود سے چمٹا کر پیار کرنے لگیں۔

”تھوڑا سا پیار ہمارے لیے بھی بجا دیں آپا!“ مہر نے نوکا تو زینت نے اسے خود سے الگ کیا۔

”یہ چھوٹی ہے، اس لیے بالکل بچوں جیسی لگتی ہے۔“ زینت نے آنکھوں میں پیار سموتے ہوئے نور العین کے چہرے کو دیکھا۔

”میں بھی آپ لوگوں کو بہت مس کرتی ہوں۔“ مہر کے گلے گلے گئی تھی اس نے کہا۔

”بس رہنے دو یہ مند دیکھ کے باتیں اگر یاد آتی ہوتی تو اتنے اتنے دن بعد اپنی شکل نہ دکھاتیں۔“ مہر نے اسے چھیڑا۔

”آپ جانتی ہیں چھوٹی آپا! میں آپ لوگوں سے اتنی دور رس لیے رہ رہی ہوں ورنہ مجھے بھی اچھا تو نہیں لگتا اپنے گھر اور اپنے لوگوں سے دور رہنا۔“ نور العین نے سنجیدگی سے بہن کی بات کا جواب دیا۔

”بھئی! ہم تو بس یونیورسٹی جھپڑ رہے ہیں ورنہ کیا ہم جانتے نہیں ہیں تمہیں۔“ زینت شاہ فوراً اس کی دلجوئی کو آگے بڑھیں۔

”اور کیا آپا بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں بلکہ کچھ پوچھو تو ہمیں تمہارے شہر جا کر پڑھنے کی اتنی خوشی ہے کہ اپنی زندگی کی عمر وہاں بھی کم ہوتی محسوس ہوتی ہیں۔“ مہر نے بھی زینت شاہ کا ساتھ دیا۔

”اماں! اور بابا جان سے مل چکی ہوتی؟“ نور العین کا ہاتھ پکڑ کر اپنے برابر بٹھاتے ہوئے زینت شاہ نے موضوع گفتگو تبدیل کیا۔

”جی جی سلام دعا ہی ہوئی ہے۔ لالہ کو بابا جان سے کوئی ضروری بات چیت کرنی تھی اس لیے میں نے زیادہ دیر وہاں ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا۔ لالہ کو بابا جان سے ملاقات کے بعد آج ہی شہر واپس بھی جانا ہے۔“ اس نے ان کے سوال کا جواب دیا اور پھر پوچھنے لگی۔ ”آپ لوگوں کے بچے کہاں ہیں؟“

”ہمارے بیٹے صاحب تو اپنے باپ کے ساتھ شکار پر گئے ہوئے ہیں اس لیے تشریف نہیں لائے۔ مہر کی بچیوں کا یہ پڑھائی کا وقت ہے۔ استانی زبیدہ آئی ہوئی ہے انہیں پڑھانے۔“ جواب زینت شاہ نے دیا۔

”آپ کے صاحبزادے سارا وقت ان ہی کاموں میں لگے رہتے ہیں یا کچھ پڑھائی وغیرہ کی طرف بھی دھیان ہے ان کا؟“ نور العین نے بہن سے دریافت کیا۔

”بس سمجھو اب پرکھنے ہی جا رہے ہیں۔ ایڈمیشن ہو گیا ہے کالونیٹ میں کلاسز شروع ہوتے ہی روانہ کر دیے جائیں گے۔ کتنی کے چند ہی دن رہ گئے ہیں اس لیے باپ نے کہا کہ چلو پچھوڑے دن عیاشی کر لے۔“ زینت شاہ نے اسے تسلی دی۔

”شکر ہے معظم بھائی کو اپنے بیٹے کی پڑھائی کا تو خیال ہے ورنہ اداغیاٹ نے تو بچیوں کے ساتھ بے حد زیادتی کر رہی ہے۔ سرے سے انہیں اسکول ہی نہیں جانے دیتے۔“ نور العین نے شکر ادا کرنے کے ساتھ ساتھ چھوٹے بھائی کے رویے پر افسوس کا بھی اظہار



کیا۔

”سارا فرق بٹے اور بٹی کا ہے اگر غفران کی جگہ معظم بھائی کی کوئی بچی ہوتی تو ان کا رویہ بھی غیث جیسا ہی ہوتا یہ تو پھر لالہ کا احسان ہے کہ انہوں نے غیث کو بچپن کو گھر پر تعلیم دینے کے لیے ہی راضی کر لیا ورنہ تو اس کے بھی قائل نہیں تھے۔ لالہ کے احترام میں انہوں نے اتنی بات بھی مان لی۔ میں تو اسی پر اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں۔“ مہر نے افسردگی سے کہا۔

”آپ فکر نہ کریں چھوٹی آنا! آپ کی بیٹیاں انشا اللہ بہت اچھی تعلیم حاصل کریں گی۔ لالہ کوشوں میں لگے ہوئے ہیں اور اللہ نے چاہا تو ایک دن کامیاب بھی ہو جائیں گے پھر دیکھیں گے اس گاؤں کے لوگوں خصوصاً عورتوں کی تقدیر کیسے بدلتی ہے۔“ نورالحین نے بہن کو دلاسا دیا۔

”ہاں، بتایا تو تھا لالہ نے کچھ۔ اب دیکھو بابا جان ان کی بات مانتے ہیں یا نہیں۔“ مہر کچھ بے یقین سی تھی۔

”انشا اللہ مان جائیں گے آخر میری تعلیم کے لیے بھی لالہ نے انہیں راضی کر ہی لیا تھا۔“ نورالحین پر عزم تھی۔

”یہ راضی نامہ کتنی کڑی شرط پر ہوا تھا۔ شاید تم بھول گئیں۔“ مہر کے لہجے میں کئی ابھری۔

”میں کیسے بھول سکتی ہوں بھلا؟“ نورالحین کا لہجہ دھما ہوا گیا۔

”آخر تم دونوں کس حوالے سے گفتگو کر رہی ہو؟ کچھ مجھے بھی تو معلوم ہو۔“ بڑے صبر سے ان کی باتیں سنتی زینت شاہ کوئی سراہا تھ نہ آنے پر بالآخر جھنجھلا کر پوچھ بیٹھیں۔

”لالہ نے گاؤں میں تعلیم، صحت اور روزگار کے معاملات کو بہتر بنانے کے لیے کچھ منصوبہ بندی کی ہے۔ گورنمنٹ کے کئی افسران ان کے اس منصوبے سے متفق ہیں لیکن کیونکہ علاقہ بابا جان کا ہے اس لیے ان کی اجازت کے بغیر کچھ ہو بھی نہیں سکتا۔ لالہ آج کل بابا جان کو اسی سلسلے میں قائل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔“

نورالحین نے مختصر انہیں بتایا۔

”خیال تو اچھا ہے لیکن مشکل ہی ہے کہ بابا جان اس پر راضی ہوں بلکہ جہاں تک میرا خیال ہے چاہا سائیں، معظم اور غیث کو بھی اس پر اعتراض ہوگا۔“ زینت شاہ نے تشویش کا اظہار کیا۔

”آپ فکر مت کریں معظم بھائی اور ادا غیاث سے تو لالہ نے بالائی بالا ہی کچھ بات چیت اور معاہدے کر لیے ہیں۔ اصل معاملہ بابا جان اور چاچا سائیں کا ہے اس کے لیے لالہ بھی بہت اُرا امید ہیں کہ اللہ نے چاہا تو کامیابی انہی کی ہوگی۔“ نورالحین مطمئن تھی۔

”اگر یہ بات ہے تو ہمیں تو خوشی ہی ہوگی۔“ زینت شاہ نے کہا۔

”آپ سچ کہہ رہی ہیں آپا! شاید اسی طرح خوشی ہمارا نصیب بن جائے ورنہ مجھے تو یہی لگتا ہے کہ ہمارے زیر دست رہنے والے تمام مظلوموں کی آپیں سیدھی ہم سید زادیوں کو ہی آکر لگتی ہیں جو خوشی ہمارا نصیب ہی نہیں بن پاتی۔“ مہر آج کل کرب کے جس دور سے گزر رہی تھی اس کے لہجے کی آرزوگی اسی کی دین تھی۔ زینت شاہ اور نورالحین اس آرزوگی کو محسوس کر کے اپنی اپنی جگہ چپ سی بیٹھی رہ گئیں۔

\*\*\*

”تم یہ کن معاملات میں الجھے ہوئے ہو مطیب شاہ! ہماری مرضی اور اجازت کے بغیر تم خود سے اتنے اہم فیصلے کیسے کر سکتے ہو؟“ کاغذات کا پلندہ ایک طرف رکھتے ہوئے قائم شاہ نے غضب ناک لہجے میں پوچھا۔

”آپ غلط سمجھ رہے ہیں بابا جان! میں آپ کی مرضی کے بغیر کچھ کرنے کی گستاخی کر ہی نہیں سکتا۔“ آپ اگر میری بات ٹھنڈے دل سے سنیں تو آپ کو میرا ہر عمل درست محسوس ہوگا۔“ وہ نہایت نرمی سے ان کے ساتھ مخاطب تھا کیونکہ آج اس نے اپنا مقدمہ ہر حال میں ان سے جیت کر جیتا تھا۔

”کیا سنوں میں تم سے.....؟ یہی کہ تم میرے مزار سے اٹھا کر اسکولوں، کالجز میں بھر دو گے۔ دو لوگ جو آج جھک جھک کر ہمیں سلام کرتے ہیں کل



نظر میں ملا کر ہم سے بات کریں گے، عورتیں بے حجاب ہو جائیں گی۔" وہ اپنی ناراضی کا بھرپور اظہار کر رہے تھے۔

"ایسا کچھ نہیں ہو گا آپ میرا یقین کریں۔" مطیب شاہ نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی لیکن پھر اندر داخل ہوتے سید امیر شاہ کو دیکھ کر چپ ہو گیا۔

"السلام علیکم چاچا سائیں۔" وہ احتراماً اپنی جگہ سے اٹھا۔

"علیکم السلام! کیا حال چال ہیں پتر؟ تو، تو بالکل شہر کا ہی ہو کر رہ گیا ہے کبھی آ کر گاؤں میں زمینوں کا حساب کتاب بھی دیکھا کر۔" امیر شاہ نے جیسے سے گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ بڑے بھائی کے چہرے کے بگڑے زانوؤں کا بھی جائزہ لیا۔

"آپ کا پیغام ملے ہی سیدھا آ رہا ہوں۔ یہاں آ کر پتا چلا کہ مطیب شاہ بھی آیا ہوا ہے۔ سب خیر تو ہے نا ادا سائیں۔" بالا خرا انہوں نے بھائی سے پوچھ ہی لیا۔

"ہم کیا کہیں، تم اپنے جیسے سے ہی سونو بلکہ پہلے یہ سب دیکھ لو۔" سید قائم شاہ نے کاغذات امیر شاہ کی طرف بڑھائے۔ امیر شاہ کے کاغذات کا جائزہ لینے تک کمرے میں مکمل خاموشی چھائی رہی۔ وہاں اگر کوئی آواز آتی تو صرف کاغذات کے اٹلے جانے کی ہلکی سی آواز۔

"یہ سب کیا ہے پتر؟" بالا خرا امیر شاہ نے کاغذات سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"یہ بدلتے ہوئے وقت کا تقاضا ہے چاچا سائیں! وہ جواب کے لیے تیار تھا۔

"مطلب.....؟" امیر شاہ نے حیرت سے دریافت کیا۔

ڈھروں جوتلو کھل رہے ہیں جہاں سارا وقت عوام کو ان کے حقوق کے بارے میں خبردار کیا جاتا رہتا ہے۔ لوگ اب پہلے کی طرح مضبوط اور سیدھے نہیں رہے کہ مرگی کے دورے کو جنوں کا سایہ سمجھ کر تو بے بندھواں اور دم کروانے کے لیے حلی کے چکر کاٹنے رہیں۔ شائع ہونے سے شعور رہے ہیں کہ تعلیم کو داغ خراب کرنے والی چیز سمجھ کر اپنی اولادوں کو اسکول، کالج کا رخ نہ کرے دیں۔ اب لوگ یہ سوچنے بھی ہیں اور اپنا حق بھی مانگتے ہیں۔" مطیب شاہ نے کہا۔

"تو کیا ہم خود ساری سہولیات مہیا کر کے ان لوگوں کو اپنے سروں پر چڑھا لیں۔ وہ وقت جو آج سے بیس پچیس سال بعد آتا ہے۔ آئندہ دو تین سال میں لے آئیں؟" وہ سانس لینے کو ذرا سار کا تو سید امیر شاہ نے تندی سے پوچھا۔

"نہیں بلکہ میں چاہتا ہوں کہ آپ آنے والے وقت کے لیے نئی حکمت عملی تیار کر لیں۔ آپ لوگوں کے مطالبہ کرنے اور بغاوت کرنے سے پہلے ہر سہولت ان کو مہیا کر دیں تاکہ وہ آپ کے احسان مند ہوں۔ ظلم اور جبر کے بوجھ تلے دبائندہ احتجاج کر سکتا ہے۔ احسان تلے دبا ہرگز نہیں جو احسان مند ہو گا وہ آپ کی کوشش کے بغیر خود بخود ہی آپ کے آگے جھکتا چلا جائے گا۔" وہ ان کے کمر و پہلوؤں سے خوب اچھی طرح واقف تھا سو اسی سست سے حملہ کر کے انہیں قائل کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔

"بات کچھ، کچھ سمجھ تو آ رہی ہے لیکن اگر نتیجہ اس کے خلاف نکلا تو..." امیر شاہ زیادہ ہی اس کی باتوں کے زیر اثر آ چکے تھے۔

"آپ مجھ سے کھوا لیں، نتیجہ اچھا ہی نکلے گا پھر آپ حکومت کے طرز عمل کی طرف بھی تو دیکھیں۔ بڑے بڑے سرداروں کو وہ لوگ خاطر میں نہیں لا رہے اپنے قبیلوں پر راج کرنے والے اور حکومتوں کو اپنی مرضی سے چلانے والے آج کل تنقید کا شکار ہیں اور آپ دیکھ لیں جب بھی ان کے خلاف فرد جرم سنائی جاتی ہے اس میں سب سے اوپر یہی الزامات ہوتے ہیں کہ یہ لوگ

اپنے زیر نگین افراد کو تعلیم، صحت اور روزگار کے مواقع فراہم نہیں کرتے۔ آپ دیکھیے گا انہی الزامات کو بنیاد بنا کر ایک دن بڑے بڑے طوفان اٹھائے جائیں گے۔ میں چاہتا ہوں وہ طوفان آنے سے پہلے آپ اپنی تیاری کر لیں تاکہ اپنی جڑوں پر کھڑے رہ سکیں ورنہ قصہ پارینہ بننے میں تو بادشاہوں کو بھی دیہ نہیں ملتی۔" وہ بہت پر جوش تھا۔

"تم ہمیں بے وقوف بنا کر اپنی بات بنانے کی کوشش تو نہیں کر رہے ہو مطیب شاہ؟" قائم شاہ اب بھی پوری طرح مطمئن نہیں تھے۔

"میں ایسی برأت کیسے کر سکتا ہوں بابا جان! میں تو صرف آپ کو حقائق بتا رہا ہوں بلکہ اگر آپ میری کئی بات پر عمل کرتے ہیں تو دیکھیے گا آپ کی حکومت سے قربت کیسے بڑھتی ہے بلکہ ہم تو اپنے گاؤں میں آنے والی تبدیلیوں کو مثال بنا کر کرنی وی جوتلو پر دکھائیں گے پھر دیکھیے گا آپ کی شہرت اور مقبولیت میں کتنا اضافہ ہوتا ہے۔ وہ جو ڈھیرے سردمدار ہیں چاچا سائیں کی ایکشن میں سمجھنا پانی چلتی ہے اور کبھی وہ بھی چاچا سائیں کا مایاب ہوتے ہیں تو یہ مسئلہ بھی ہمیشہ کے لیے حل ہو جائے گا۔" وہ ہر طرف سے انہیں ہنر باغات دکھا کر لپکا رہا تھا۔

"دیکھ بھی مطیب شاہ! امیر اور ادا سائیں کا وقت تو بس اب سمجھ کہ ختم پر ہی ہے آگے تو اور سجاد شاہ ہیں اس زمین جانیدار کے وارث بڑا ہونے کی وجہ سے گلدی نشین تو ہی ہو گا یعنی ایک طرح سے جو تو آج پورا ہے وہ کل تو نے ہی کاٹا ہو گا۔ اس لیے جو بھی کرنا سوچ کر کر۔" سید امیر شاہ نے ایک طرح سے اپنی رضامندی کا عندیہ دیا۔

"آپ فکر نہ کریں چاچا سائیں! میں نے سب کچھ بہت اچھی طرح سوچ لیا ہے۔" وہ اتنی آسانی سے ان کے قائل ہو جانے پر دل ہی دل میں خوش ہوتا مودبانہ بولا اور پھر سید قائم شاہ کی طرف متوجہ ہوا۔

"آپ کا کیا فیصلہ ہے بابا جان؟"

"امیر شاہ کی بات ٹھیک ہے کہ ہمیں ہی ایک دن

یہ سب کچھ دیکھنا ہے لیکن اصل بات تو یہی ہے کہ تم واپس گاؤں آؤ اور یہ سب سنبھالو۔" نیم دلی سے رضامندی دیتے ہوئے انہوں نے اپنی خواہش کا اظہار بھی کیا۔

"اس کی آپ فکر ہی نہیں کریں۔ آئندہ ڈھائی تین سال میں جب تک یہ منصوبے مکمل ہوں گے میں بھی گاؤں لوٹ آؤں گا۔" اس نے انہیں تسلی دی۔

وہ اب تک کی گفتگو میں یہی بات سب سے زیادہ عجیب تھی کہ وہ گاؤں واپس لوٹنے کا ارادہ پورے خلوص دل سے رکھتا تھا۔ باقی چاچا سائیں اور بابا جان کو راضی کرنے کے لیے اس نے جتنے بھی دلائل دیے تھے وہ چاہے حقیقت سے جتنے بھی قریب ہوں اس کی اپنی نیت میں ایسا کوئی کھوٹ نہیں تھا کہ وہ گاؤں والوں کو اپنے احسانات تلے دبا کر ان پر حکمرانی کی خواہش رکھتا ہو۔ یہ سب تو بابا جان اور چاچا سائیں جیسی ذہنی اور دلچ رکھنے والوں کو ان کے طریقے سے راضی کرنے کی ایک ترکیب تھی جو قسمت سے کامیاب بھی ہو گئی تھی۔

\*\*\*

"اگر تم نہیں آتیں تو میں خست خفا ہو جاتی تم سے۔" صفری نے نور العین کے گلے لگتے ہوئے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"کیسے نہیں آتی میں؟ تمہاری شادی کی سب سے زیادہ خوشی تو مجھ ہی کو ہے۔" نور العین نے صفری کے چہرے کو محبت سے دیکھتے ہوئے اس کا مان رکھا۔

زرد گونا گے دوپٹے میں ساروئی سلوئی صفری کی چھب ہی آج زرا لی لگ رہی تھی۔ خوشی کے رنگوں نے اس کے چہرے کو جگمگا ڈالا تھا۔

وہ آخر خوش کیوں نہ ہوتی عزیز احمد جو اس کا سگا



نگی اس کی نظروں کا سکوت محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔  
”میں کتنے ہی باقی ڈھیر ساری خوبصورتی کہاں سے چرائی۔“ صغریٰ کی ٹھوڑی کو اپنے دائیں ہاتھ سے تھامے وہ مسکرا کر بولی۔ صغریٰ کے چہرے پر بھی ایک شرمیلی سی مسکراہٹ چھا گئی۔

”اے صغریٰ! بی بی کو بٹھاتی کیوں نہیں۔ تیری مت بالکل ہی ماری گئی ہے کیا؟“ صغریٰ کی ماں اس کی دونوں بہنوں کے ساتھ ہاتھوں میں خاطر مدارت کے لوازمات اٹھائے اندر داخل ہوئی تو نور کو ابھی تک کھڑا دیکھ کر صغریٰ پر ہنسنے لگی۔

”ارے خالہ، جانے دیں۔ اب تو یہ بچاری اس گھر سے رخصت ہونے والی ہے کیا جاتے جاتے بھی اسے ڈانٹ رہیں گی۔“ صغریٰ کا ہاتھ تھام کر وہ اس کے ساتھ ہی اس کے چنگ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”لڑکی ذات ہے بی بی، رنگ ڈھنگ سدھار کر ہی سہاں روانہ کر دو تو ٹھیک ہے ورنہ وہاں اس نے میری ٹاک کنوا دی ہے۔“ اپنی دونوں چھوٹی بیٹیوں کے ساتھ مل کر کھاتے پینے کی اشیاء لکڑی کی ایک میز پر رکھتے اس نے نورالحین کو جواب دیا۔

”آپ فکر نہیں کریں خالہ، ہماری صغریٰ بہت سمجھدار اور نیک دل لڑکی ہے دیکھیے گا دنوں میں سب کے دل اپنی جگہ میں کر لے گی پھر ویسے بھی یہ کون سا کسی غیر کے گھر جانے والی ہے۔ آپ کے اپنے سگے بھائی کا گھر ہے۔“ سمجھیں جیسے وہ آپ کا سکا ہے ویسے ہی صغریٰ کا بھی۔“ نورالحین نے صغریٰ کی ماں کو تسلی دی۔

”بہی تو نہیں ہوتا اس دنیا میں۔ سگے ماں، چاچے کا گھر بھی بیٹی بیٹے کے بعد غیر ہو جاتا ہے لیکن خیر لڑکیاں بالیاں کہاں جھپتی ہیں ان باتوں کو۔ آپ یہ لہو دکھائیں۔“ صغریٰ کی ماں نے بات کا رخ ہی بدل دیا۔

”بہت مزے کا ہے خالہ، یقیناً آپ نے خود ہی بنائے ہیں۔“ تھوڑا سا لہو توڑ کر منہ میں رکھتے ہی نورالحین نے انہیں سراہا۔

”مہربانی بی بی، آپ کو اچھا لگا ورنہ وہی عام سے

لہو ہیں جو اتنے برس سے ہر خاص موقع پر بناتی ہوں۔ صغریٰ کا ابا تو کہتا ہے، انوری، تجھے کچھ اور بنانا ہی نہیں آتا اس لیے جب دیکھو یہ لہو دینا کہ ہمارے آگے کو دیتی ہے۔“ انوری نے سادگی سے کہا۔

”ہائے نہیں خالہ، یہ تو جیج جی بہت مزے سے بناتے ہیں۔ میں تو صغریٰ سے ہمیشہ فرمائش کر کے آپ کے ہاتھ کے بنے یہ لہو منگواتی تھی۔“ نورالحین کی پسندیدگی انوری کا خون بوجھ رہی تھی۔ ایسے میں اسے چھوٹی بیٹی کا بار بار شانہ بھلا کر اپنی طرف متوجہ کرنا بہت برا لگا جو جھڑک کر پوچھنے لگی۔

”کیا مصیبت ٹوٹ پڑی ہے تجھ پر جو میرا موٹا اگ لگ کرنے پر تلی ہے؟“  
”اماں! میری ساری سہیلیاں انتظار میں بیٹھی ہیں۔“ وہ بسوری۔

”ہاں تو بول دے ان سے تھوڑا انتظار کر لیں۔ ابھی تو بی بی آ کر بیٹھی ہیں۔ آتے ہی کیا تیری بے خبری سہیلیوں کے راگ سن کر ان کے کانوں میں درد کرنا دوں۔“ انور نے بیٹی کو گھر کا۔

”خیریت، کیا مسئلہ ہے؟“ نورالحین نے صورت حال کو کچھ، کچھ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

”بس بی بی! دماغ خراب کر رکھا ہے ان دونوں کی سہیلیوں نے، روزانہ شام سے آ کر ڈیرا ڈال لیتی ہیں گانے بجانے کے لیے۔“ انوری نے جواب دیا۔

”تو آپ آج منع کیوں کر رہی ہیں۔ گانے دیکھ انہیں میں بھی تھوڑی دیر سن لوں گی۔“ نورالحین نے فرمائش کی تو صغریٰ کی دونوں بہنوں کے چہرے پر رونق دوڑ گئی۔

”جواب بلا لے اپنی سکھیوں کو۔ بغیر گانے تو ان کا کھانا ہضم نہ ہوگا۔“ انوری نے بیٹی سے کہا تو وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل ڈرا ہی دیر میں کئی لڑکیاں شرمانے لگیں اس کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئیں۔

”سلام بی بی!“ ایک، ایک کر کے نورالحین کو سلام کرتے ہوئے انہوں نے فرش پر پچھی در پی پر بیٹھا شروع کر دیا۔

”اب کچھ سنا بھی دو بی بی انتظار کر رہی ہیں۔“ لڑکیاں کھسک پھسک کر آہیں میں صلح مشورہ کرنے میں مصروف تھیں انوری سے صبر نہ ہوا تو نورانی انہیں ٹوک بیٹھی۔ لڑکیوں کے درمیان بھی شاید اس عرصے میں حالہ طے ہو گیا تھا۔ درمیان میں بیٹھی لڑکی نے ڈھولک پر قاپ لگائی اور رفعا، ”ہولال میری پت رکھیو“ کی آواز سے گونجنے لگی۔ ڈھولک کی قھاپ اور ایک روٹم سے جتنی تالیوں نے سماں سا باندھ دیا تھا نورالحین ٹھوڑی کے نیچے بائیں ہاتھ کی مٹھی ٹکائے اشتیاق سے انہیں گانا دیکھنے لگی۔ حویلی میں کسی تقریب کے موقع پر اس قسم کی روٹی اور گھما گھمی کبھی نہیں لگتی تھی اور گاؤں کے عام گھروں میں ہونے والی تقریبات میں وہ لوگ شرکت نہیں کرتے تھے۔ کسی خاص ملازم کو عزت بخشی بھی ہوتی تو کھڑے کھڑے سرسری طور پر اس کے گھر کی تقریب میں جکر لگایا جاتا ایسے میں نورالحین کو زندگی کے یہ رنگ کہاں دکھائی دے سکتے تھے۔ صغریٰ کی شادی میں شرکت تو اس کی صغریٰ سے قربت اور مٹھی جی کی خدمات کے صلے میں ملنے والی خصوصی رعایت تھی۔ آج ناپاؤں میں بھی اماں نے اسے پابند کر کے بھجوا تھا کہ وہ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں واپس آ جائے گی۔ اماں کی خصوصی ملازمہ رحمت اس کے ساتھ یہاں آئی تھی اور باہر اس کی منتظر بیٹھی تھی۔

”بی بی! حویلی سے گاڑی آ گئی ہے۔“ نورالحین کو رحمت کے آ کر اطلاع دینے پر وقت گزرنے کا احساس ہوا، دل نہ چاہتے ہوئے بھی وہ حویلی واپس جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔

”ابھی سے جاری ہوا بھی تو اماں کے گھر والے بھی نہیں آئے۔“ صغریٰ نے اسے اٹھتے دیکھ کر احتجاج کیا۔ ”جسمیں میری مجبوری کا معلوم تو ہے صغریٰ“ نورالحین نے بے بسی سے کہا ورنہ خود اس کی بھی خواہش تھی کہ صغریٰ کی رسم میں شرکت کرتی۔

”پھر کب آؤ گی؟“ صغریٰ نے اس کا مسئلہ سمجھتے ہوئے دھیرے سے پوچھا۔

”انشاء اللہ! جیسے ہی موقع ملے گا جکر لگاؤں گی۔“

تمہارا تھک بھی رکھا ہے۔ آج میں ساتھ لانا بھول گئی تھی کل آؤں گی تو وہ بھی ساتھ لیتی آؤں گی۔“ نورالحین نے تسلی دیتے ہوئے اسے پیار کیا اور رحمت کے ساتھ باہر نکل گئی۔ کمرے میں موجود تمام لڑکیاں دل ہی دل میں صغریٰ کی قسمت پر رشک کر رہی تھیں جس کو حویلی کے کسی فرد کی طرف سے اتنی عزت حاصل تھی۔

”چھوٹی بی بی! اتنا پوچھتی ہیں صغریٰ آیا کو جیسی تو ان کی گاؤں کی کسی اور لڑکی سے دوستی نہیں۔“ در پی بیٹھی لڑکیوں میں سے ایک نے رشک و حسد سے طے جذبات کے ساتھ اپنے برابر بیٹھی لڑکی سے سرگوشی کی۔ صغریٰ ان کی سرگوشیوں سے بے خبر نور کے آنے کی خوشی اور مستقبل کے رو پہلے خوابوں کے سحر میں کھوئی ہوئی تھی۔

\*\*\*

”سنا ہے جان اور نینسی شادی کرنے والے ہیں۔“ راہد کی زبان سے نکلے اس جملے نے اسے ایک جھٹکے سے اپنا جھکا ہوا سراٹھانے پر مجبور کیا۔ وہ پچھلے پانچ منٹ سے اس کے برابر میں بیٹھی ہوئی تھی لیکن مطیب شاہ اس کی موجودگی کو محسوس کر لینے کے باوجود بھی اس سے لائق سنا بیٹھا ہوا تھا گراں اس کی ساعتوں میں جو کچھ اتر اٹھا وہ اپنی لائق کو ہر گز بھی قائم نہیں رکھ سکتا تھا۔

”تمہیں شاید میری بات کا یقین نہیں آیا؟“ اپنی بات کا رد عمل مطیب شاہ کے چہرے پر دیکھ کر وہ طنز سے مسکرائی لیکن مطیب اسے کوئی بھی جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

”میں نے تو تمہیں بہت پہلے ہی خبردار کر دیا تھا لیکن اس وقت تم نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔“ راہد نے ہمدردی کی آڑ میں ایک اور طنز کا تیر برسا لیکن وہ اب بھی اسے کوئی جواب نہیں دے سکا۔ وہ کہے اسے بتاتا کہ وہ بات جس کا یقین وہ اسے دلانے کی کوشش کر رہی ہے وہ خود اپنے آپ کو باور نہیں کروا پا رہا حالانکہ نینسی نے کتنا صاف کہا تھا۔

”میں تمہارے ساتھ ایک گھر بنانے کا خواب



دیکھنے لگی تھی شاہ! لیکن اب میری آنکھیں کھل چکی ہیں۔ میں تمہاری حقیقت سمجھ چکی ہوں۔ میں جان گئی ہوں کہ میرا انتخاب غلط تھا۔“

اور مطیب شاہ! اس مقام تک لا کر چھوڑے جانے کا شکوہ بھی نہیں کر سکا تھا۔ ”غلط انتخاب“ اپنے لیے الفاظ سننا کتنا تکلیف دہ تجربہ تھا۔ وہ کسی کو بتا بھی نہیں سکتا تھا۔ مینی نے تو بہت آرام سے اسے ”غلط انتخاب“ قرار دے کر اپنے خوابوں سے دامن بھٹک لیا تھا لیکن وہ اپنے خوابوں کی کرجیاں سمیٹتے سمیٹتے بلکان ہو گیا تھا۔

”کیوں اس بے وفا کے لیے خود کو جلاتے ہو۔ میری طرف دیکھو، میں کب سے تمہاری منتظر ہوں۔ میرے بن جاؤ شاہ! میں تمہارا غم بھلا دوں گی۔“ رابعہ نے جذبات سے غمخوار لہجے میں کہتے ہوئے اپنا سر اس کے شانے سے ٹکا لیکن مطیب شاہ کو جیسے کرنٹ نے چھو لیا۔ رابعہ نے پتا نہیں دانت یا نادانت آج مینی کی مخصوص خوشبو لگائی ہوئی تھی لیکن مطیب شاہ جانتا تھا کہ وہ مینی نہیں رابعہ ہے اس لیے بدک کر کھڑا ہوا اور تیز تیز قدموں سے چلتا پارکنگ کی طرف بڑھ گیا۔ وہ فی الحال مینی کی ذات سے جڑی کسی بھی شے کا سامنا کرنے کی ہمت خود میں نہیں پارہا تھا۔ مینی جان سے شادی کرنے والی ہے اس خبر پر اس کا کیا رد عمل ہونا چاہیے وہ نہیں جانتا تھا اس وقت اسے صرف ایک بات سمجھ آ رہی تھی اور وہ یہ کہ وہ خود کو اس طرح سے آکولٹ کر لے کہ اس تک مینی کی کوئی خبر نہ آ سکے۔ زبان سے خواہش ادا ہونے سے پہلے ہر شے پالینے والا مطیب شاہ کو خود اپنی ذات کے رعب تک ہونے کا احساس دغم دغم کر رہا تھا۔

\*\*\*

”میں نے فیصلہ کیا ہے کہ مزید تعلیم کے لیے ملک سے باہر چلا جاؤں۔“ عمر احسان نے ٹیبل کی چمکی سطح پر نظریں ڈکاتے مطیب شاہ کو بتایا۔

”ویری گڈ۔ یہ تو بہت اچھا فیصلہ ہے، لیکن یہ سوچ کر جانا کہ تمہیں واپس نہیں آنا ہے۔ تم جیسے شخص کو کھونا نہ میں انور ڈر کر سکتا ہوں اور نہ ہمارا ملک۔“ مطیب شاہ

نے اسے سرانے کے ساتھ آئندہ کے لیے پابند بھی کیا۔ ”مجھ میں کیا ہے مطیب بھائی! میں تو بہت عام سا شخص ہوں۔ میرے جیسے پتا نہیں کتنے ہوں گے اس ملک میں۔“ وہ کچھ آرزو سا لگ رہا تھا۔

”تم کیا ہو عمر! تمہیں نہیں معلوم۔ ہو سکتا ہے دنیا میں تم جیسے بہت لوگ ہوں لیکن میرے لیے ان میں سے کوئی بھی تم جیسا نہیں ہو سکتا۔ تم سے چودا کا تعلق ہے وہ اپنی جگہ لیکن تم نے میری زندگی کو انجانے میں ہی ایک بالکل نیا رخ دیا ہے میں جب تم سے ملا تھا تو اندر سے بہت ٹوٹا پھوٹا اور کمزور تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ سکون کیسے ملتا ہے لیکن تمہارے ساتھ نے مجھے سکون کا راستہ دکھایا۔ میں نے جانا کہ مقصد زندگی کیا ہے۔ میرے اندر اچھائی تھی لیکن اس اچھائی کو صحیح رہنمائی کہاں سے ملتی ہے میں نے تم سے سیکھا۔ میں تمہیں دیکھ کر حیران ہوتا تھا کہ تم اتنی کم عمری میں اتنے منظم اور سمجھدار کیسے ہو لیکن پھر جب تمہیں فالو کرتے ہوئے میں خود قرآن کی طرف متوجہ ہوا تو میرے لیے زندگی کی راہیں روشن ہوتی چلی گئیں۔ میں نے اپنی اور اپنے بزرگوں کی کوتاہیوں کا ازالہ کرنے کے لیے کچھ پلان بنائے۔ میں نے سوچا کہ لوگوں کی زندگی کی مشکلات دور کر کے اپنی آخرت کو آسان بنانے کی راہ ڈھونڈوں لیکن اس سارے عمل میں تم میرے ساتھ، میرے شانہ بشانہ نہیں ہو گے۔ یہ تو میں نے کبھی نہیں سوچا۔“ مطیب شاہ نے کہا۔

”سوچا تو میں نے بھی کبھی نہیں تھا کہ ابایوں مجھے چھوڑ کر چلے جائیں گے لیکن دیکھیں وہ چلے گئے۔ واپس لوٹنے کا کوئی وعدہ کیے بغیر۔“ عمر احسان کی آنکھوں میں پانی چمکنے لگا تھا۔ مطیب شاہ اس کی حالت پر کڑھ کر رہ گئے۔ عمر احسان جیسا شخص خود کو دنیا کی اتنی بڑی سچائی باور نہیں کر دیا ہے گا، وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

”تم جس کیفیت کا شکار ہو اس میں تمہیں میری کوئی بھی بات سمجھ نہیں آئے گی۔ اس لیے بس اتنا کہو گا کہ باہر جا کر پڑھنے کا جو فیصلہ کیا ہے اسے حصول علم کے لیے خالص کر دو کیونکہ فرار مسائل کا حل نہیں اور کھوٹا بالکل ایسی چیز نہیں جس سے فرار حاصل کرنے کی کوشش



کی جائے۔ یہ تو دل میں بس کر دل کو منور کرنے والا  
چند یہ ہے۔ وہ دل جس کو دکھ کا اندھن جلانے کے لیے  
میسر آ جائے بڑا مہول ہوتا ہے کیونکہ وہ دل خود جل کر  
دوسروں کی راہیں روشن کرنے کا ہنر جانتا ہے۔ مجھے  
یقین ہے تم بھی ایک دن اپنے فرار میں ناکام ہو کر واپس  
یہاں لوٹنے کا سوچو گے اور جب ایسا سوچنے لگو تو پلٹنے  
میں دیر نہیں کرنا کم از کم یہ سوچ کر ضرور کہ ایک شخص بہت  
شدت سے تمہارے لوٹنے کا منتظر ہے۔ ”مطیب شاہ  
نے چند جملوں میں پوری حکایت دل سنا ڈالی تھی۔ عمر  
احسان نے محسوس کیا کہ مطیب شاہ نے اس کے دل کو  
کسی ان دیکھی ڈور سے باندھ کر اپنا پابند کر لیا ہے۔

\*\*\*

”ارے حب! آؤ بھئی بڑے دن بعد چکر لگایا۔“  
اس وقت ڈاننگ ٹیبل پر گھر کے تمام ہی افراد موجود تھے  
کچہرائی میں کی رنگ ٹھماہی وہاں چلی آئی۔ سب سے  
پہلے رفعت کی نگاہ اس پر پڑی تو اس نے خوشدلی سے  
اس کا استقبال کرتے اپنے برابر رکھی خالی کرسی کھسکا کر  
اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔  
”آئی تو پھر بھی میں ہی ہوں۔ تم میں سے تو کسی کو  
زحمت نہیں ہوئی کہ پلیٹ کر میری خیریت ہی پوچھ لو۔“  
جب نہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے شکوہ کیا۔  
”یہ تو واقعی زیادتی کی بات ہے۔ تم لوگوں کو بچی  
کا اتنا خیال تو کرنا چاہیے۔“ معیز احمد نے اس کی  
طرف داری کی۔

”سوری یار! آج کل مصروفیت ہی اتنی ہے۔  
شاہجگ، ٹیلر کے چکر بس اسی میں سارا دن گزر جاتا  
ہے۔ یہ رفعت کی پتی تو اپنی میڈیکل کی پڑھائی کو بہانہ  
بنا کر ایک طرف ہو جاتی ہے اسکیلے مجھے ہی سب کچھ نہیں  
کرنا پڑتا ہے۔“ مدحت نے وجہ بیان کرتے ہوئے  
معذرت کی۔

”تم ان کی باتوں میں مت آؤ جب! مصروفیت کا تو  
بہانہ ہے ورنہ آج کل انہیں تم تو کیا ہم بھی یاد نہیں۔  
دیکھ نہیں رہی ہو کسی چکر رہی ہیں۔“ رفعت نے بہن  
کی توجہ بہرہ ور کرتے جبہ کو نچھوڑ دیا۔

”خیر یہ تو اس کا حق ہے۔ تمہاری شادی ہوئے  
گلے گی تو تمہیں بھی کسی اور کو یاد رکھنے کی فرصت نہیں  
گی۔“ حبیہ نے چڑھائی میں آنے کے بجائے مدحت کی  
سائیڈ لی اور رفعت کی بڑھائی ڈش میں سے ایک کباب  
اپنی پلیٹ میں نکالا۔

”اور مدحت! تم کیوں اتنی غیریت برتی رہیں۔  
اگر یہ بڑھا کوئی بی بی تمہارا ہاتھ بٹانے کے لیے وقت نکال  
تھیں تو تم مجھ سے کہیں۔“ کھیرے کا ٹکڑا منہ میں  
رکھتے اس نے بے حد انصاف سے مدحت سے کہا۔

”تم سے ہی کہے گی بیٹا! ابھی تو بس تیار شدہ  
کی ہے۔ جب تک میری امت سے میں اس کا ساتھ  
دے رہی ہوں آگے جب کام ہو جائے گا تو تمہیں ہی ہاتھ  
بٹانا پڑے گا۔“ صاحبت نے ان کی گفتگو میں حصہ لے  
ہوئے اس کی دلجوئی کی۔ بھلے سے بیٹے کی خواہش اور  
کچھ مادی فوائد کی چاہ نے انہیں اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور  
کر دیا تھا لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ تھی کہ انہیں اپنی اکلوتی  
بھانجی سے بے حد پیار تھا۔

”اور کا تو آگے بہت ہے۔ مدحت کے بعد امر  
کی شادی کی تیاریاں بھی کرنی ہیں، اس کے لیے بھی تو  
تمہاری ہی مدد دیں گے یہ لوگ۔“ معیز احمد کے بھلے نے  
جب کے رخساروں پر شوق سی دوڑادی۔ ٹیبل پر موجود تمام  
افراد شوق کے ان رنگوں سے نظریں چرا گئے۔ امر نے  
ایک شکوہ کناس نظر معیز احمد پر ڈالی لیکن وہ بہت اطمینان  
سے اپنی پلیٹ پر جھکے ہوئے تھے۔ امر جزیرہ سا ہو کر اپنی  
پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن اب اس کی کھانے پر ہنسی  
جیسی توجہ نہیں تھی وہ کسی بہت گہری سوچ میں ڈوبا ہوا  
تھا۔ سوچ کے یہ رنگ اس کے چہرے سے واضح طور پر  
جھلک رہے تھے لیکن وہاں موجود تمام ہی نفوس معیز احمد  
کی بات کے زیر اثر تھیں اس لیے کسی نے امر کی کیفیت پر  
توجہ نہیں دی۔ کھانا بے حد خاموشی سے ختم کیا گیا۔  
کھانے کے اختتام پر رفعت نے ماحول کی سنجیدگی کر  
توڑنے کی کوشش کرتے ہوئے بہ آواز بلند پوچھا۔

”جائے کے بارے میں کیا خیال ہے؟“  
”باقی لوگوں کا جو بھی خیال ہو لیکن میری اور جب کی

جائے مت بنوانا ہم دونوں تھوڑی دیر کے لیے باہر جا  
رہے ہیں۔“ امر کے جواب پر حبیہ کے چہرے پر حیرت  
و درگزی۔ اتنا چاہک سا سننے آنے والا یہ پروگرام اس کے  
لیے قطعی غیر متوقع تھا۔ امر سے باوجود بے تکلفی کے ایسی  
نوبت کبھی نہیں آئی تھی کہ وہ اسے کوئی خصوصی پروٹوکول  
دے۔ اس لیے بھی وہ قدر سے تذبذب کا شکار تھی۔

”امیر کبہ رہا ہے تو چلی جاؤ بیٹی! کوئی حرج تو نہیں  
ہے اس میں۔“ معیز احمد نے اس کی جھجک کو بھانپتے  
ہوئے فوراً ہی اسے حوصلہ دیا تو وہ جانے کے لیے تیار  
ہو گئی۔

”سیف! امیرے بیٹے کی سائیڈ ٹیبل سے گاڑی کی  
چابی اور میرا والٹ لے کر آؤ۔“ حبیہ کو تیار دیکھ کر امر نے  
ملازم لڑکے کو آواز لگا کر ہدایت دی۔ ڈرائیور میں وہ  
مطلوبہ چیزیں لے کر چلا آیا۔

”آ جاؤ حب!“ سیف کے ہاتھ سے چابی اور  
والٹ لیے ہوئے وہ جب سے مخاطب ہوا اور تیز تیز  
قدموں سے چلتا ڈاننگ روم سے باہر نکل گیا۔

”کیا بات ہے تم سب لوگ اتنے عجیب، عجیب  
سے کیوں لگ رہے ہو؟“ حبیہ جو اس کے پیچھے ہی اٹھ کر  
آئی تھی پوریج تک پہنچ کر پوچھنے لگی۔

”میں تم سے کچھ اہم باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اس  
بات کا تعلق صرف میرے اور تمہارے مستقبل سے ہے  
اس لیے میں کسی اور کے سامنے اسے ڈسکس نہیں کرنا  
چاہتا۔“ امر نے سنجیدگی سے اسے جواب دیا اور ڈرائیو تک  
سیٹ سنبھال کر اس کے لیے دوسری طرف کا دروازہ  
کھولا۔ حبیہ خاموشی سے اس کے برابر والی سیٹ پر  
آ بیٹھی۔ امر کے انداز بتا رہے تھے کہ بات کافی سنجیدہ  
نوعیت کی ہے۔ اس لیے وہ باوجود چاہنے کے اپنے دل  
میں کوئی خوش کن تصور قائم نہیں کر پا رہی تھی۔

\*\*\*

”مہر آج کل مستقل نہیں رہ رہی ہیں کیا؟“  
مہر کی بیٹیوں کو سن میں اٹھائے ایک کمرے کی طرف  
جستے دیکھ کر نوراحین نے زینت سے پوچھا۔

”ہاں، کیا کر رہے جا رہی۔“ زینت شاہ نے

ایک سرد آہ بھری اور بولیں۔ ”غیاث آج کل اپنی  
دوسری بیوی کے چاؤ چوٹیلے اٹھانے میں مگن ہے۔ بیٹے  
کی چاہت میں بیٹیاں بالکل بھولی ہوئی ہیں اسے۔ پہلے  
بھی کوئی خاص پیار محبت تو کرتا نہیں تھا بچیوں کے ساتھ  
لیکن آج کل تو مہر بتا رہی تھی بچیاں آنکھوں میں خار کی  
طرح جھلک رہی تھیں۔ بیٹا ابھی آیا نہیں ہے دنیا میں  
صرف آس ہے تو اس پر یہ حال ہے۔ بعد میں پتا نہیں کیا  
کرے گا غیاث بہر حال بچیوں کو ماحول کے تناؤ سے  
بچانے کے لیے مہر کچھ کرے کے لیے یہاں آگئی ہے۔  
بعد میں دیکھو کیا کرتی ہے۔“ زینت آپا نے تفصیل سے  
بتایا۔

”تو بابا جان اور اماں نے بات نہیں کی ادا غیاث  
سے اس سلسلے میں۔ ایک تو پہلے ہی انہوں نے دوسری  
شادی کر کے آیا کا دل دکھایا دوسرے اب ان کی اور  
بچیوں کی حق تلفی چھی کر رہے ہیں۔ ٹھیک ہے انہوں نے  
اپنی خواہش سے مجبور ہو کر دوسری شادی کر لی لیکن  
بیویوں کے درمیان انصاف سے کام تو لیں جو لوگ دو  
بیویوں کے درمیان انصاف کرنا نہ جانتے ہوں ان کے  
لیے تو اللہ نے بھی صاف حکم دے رکھا ہے کہ وہ ایک  
سے زیادہ شادی نہ کریں اور یہاں تو بیوی کے ساتھ  
ساتھ اولاد کا حق بھی مارا جا رہا ہے۔ کیا منہ دکھائیں گے  
ادا غیاث اللہ کو روزِ حشر۔“ نوراحین کے لہجے میں غصہ  
تھا۔

”اللہ کو منہ دکھانے کی یہاں فکر ہی کس کو ہوتی ہے  
بس اسی دھن میں گئے رہتے ہیں کہ برادری میں اپنا  
شملہ اونچا رہے۔ مہر نے تین، تین بیٹیاں کا باپ بنا کر  
غیاث کی کو منجھ پٹی کر دی ہے وہ اس کو نظر انداز کر کے  
اپنی دوسری بیوی کے ناز صرف اسی لیے اٹھا رہا ہے کہ  
اس سے اسے بیٹا ملنے کی امید ہے۔ رہی اماں اور بابا  
جان کے بات کرنے کی تو وہ لوگ تو خود الٹا مہر سے  
ناراض ہیں کہ وہ حالات کے ساتھ سمجھوتا کیوں نہیں کر  
رہی۔“ زینت شاہ کی بات سن کر نوراحین کا منہ حیرت  
سے کھلا رہ گیا۔

”یعنی ظلم بھی آپا پر ہو اور سمجھوتا بھی دہی



کریں۔“  
”دیکھو گڑیا اب یہ تو ازل سے عورت کے نصیب میں لکھا ہے اور ہمارے ہاں عورت جس کی کہیں شہوانی نہ ہوتی ہو اس کا تو احتجاج کرنا بالکل بے معنی سی ہی بات ہے۔ جلد یا بدیر سمجھوتا سہرے ہی کرنا ہوگا۔“ زینت شاہ کے لہجے میں تجر بہ بول رہا تھا۔  
”مگر بڑی آپا ازم از کم ادا غیاث کو اپنے روپے کی بد صورتی کا احساس تو ہونا چاہیے اور آپا کو چھوڑیں لیکن کم از کم اپنی بیٹیوں کو تو پوچھیں۔“ نور العین نے افسوس سے کہا۔

”ہم کیا کہہ سکتے ہیں سوائے دعا کرنے کے۔“  
زینت شاہ نے بات ہی ختم کر دی۔  
”میں لالہ سے کہوں گی کہ وہ ادا غیاث سے بات کریں۔ لالہ سے تو خود اوسنے ہیں وہ۔ ان کی بات سن کر کم از کم بیٹیوں سے تو اپنا سلوک ٹھیک کریں گے۔“  
نور العین بہن کے لیے بے حد دھکی اور جذباتی ہو رہی تھی اور بات بھی بھیج۔ مگر کی بچیاں اپنا گھر چھوڑ کر یہاں رہنے سے گھبرا گئی تھیں ان کا حال ڈال سے الگ ہو جانے والی کلیوں کا ساتھ جن کی لاکھ تمہائی کروٹیں کر ہی نہیں دیتیں۔ ان کو اس عالم میں پہنچانے کا ذمے دار وہ باغیاں تھا جو ان ٹھکی کلیوں کی تمہائی چھوڑ کر کسی اور سمت میں اپنا دھیان لگا چکا تھا۔

\*\*\*

”تعلیم نے ان سب کا کیا بگاڑ لیا ہے جو میں تمہارے بدل جانے کی امید کروں۔ میں جان ہی ہوں کہ میرا انتخاب غلط تھا۔“ نینسی کی باتیں بازگشت بن کر اس کا پیچھا کرتی تھیں۔ کتنا چاہتا تھا اس نے نینسی کو۔ کیا، کیا خواب دیکھے تھے اس کے حوالے سے۔  
”جان اور نینسی شادی کرنے والے ہیں۔“  
راہد کی دی ہوئی اطلاع..... کیا تھا جان میں ایسا جو نینسی نے اس کے مقابلے میں جان کا انتخاب کیا۔ عادی شرابی اور ہر روز ایک نئی تلی کے پیچھے بھاگنے والا جان..... مذہبی اور نسلی تعصب کا شکار شخص..... جس نے نینسی کو فریب کر کے مطیب شاہ سے جدا کر دیا۔

”کیا اسنے عرصے کے ساتھ میں نینسی نے میرے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ میرے کردار کی کچھ عبت، کسی بھی شے کی اس کی نظر میں قدر نہیں۔ اگر وہ مجھ کو نہیں جان سکتی تھی تو کم از کم خود کو تو جانتی رہے گی کہ وہ جان کے ساتھ۔ جان جیسا شخص جو کس عزت ہی کرنا نہیں جانتا۔ اسے کون سا احساس ہوگا دے سکے گا۔“ ہزاروں شکوے اور فکریں میں جو نینسی کی ذات کے حوالے سے اسے دامن گیر تھیں۔ کتنے دن گئے تھے اسے یونہی کیفیت میں بند ہو کر پڑے۔ اس نے باہر نکلتا ہی چھوڑ دیا تھا۔ فون پر مسلسل آسٹریگ مشین کی بھی، اخبار آتا لیکن یونہی جڈول کی صورت میں رہتا۔ ٹیلی ویژن کھولنے کا اسے خیال ہی نہیں آتا تھا۔ مکمل طور پر ہر انسانی رابطے سے کٹا ہوا تھا۔ خوراک کی صورت کافی اور سکنس کے سوا اس نے ان دنوں میں کوئی شے اپنے حلق سے نیچے نہیں اتاری تھی۔ وہ ایک ایسی زندگی گزار رہا تھا جس میں خود اس سے اپنے زمانے ہونے کا احساس چھین گیا تھا۔ اس حالت میں وہ جانے اور کتنا عرصہ رہتا جو اس دن یونہی پاکستان سے آنے والی ٹیلی فون کال وصول نہ کر لیتا۔  
”کب واپس آؤ گے بیٹا! کب تمہاری پڑھ پوری ہوگی۔ یہ نہ ہو کہ تمہاری آس لیے یہ آئیں گے تمہاری مٹی میں جا سوں۔“ وہ اماں تھیں ہمیشہ کی طرح اس کے لیے بے قرار۔ اپنے معمول کے سوالوں سے ہی اس کے وجود جھنجھوڑ کر رکھ دیتا تھا۔  
وہ یہاں کسی کم عقل اور بے وفا کی خاطر اپنا آبرو یاد کر رہا تھا اور وہاں دن رات اس کی خاطر دعاؤں میں مگن رہنے والی ہستی کے جذبے راگناں جا رہے تھے۔ وہ یہاں نینسی کی خاطر تو نہیں آیا تھا۔ بے شک اس نے نینسی کی خاطر بہت سے خواب دیکھے تھے لیکن کچھ خواب وہ اپنے پیچھے رہ جانے والوں کی آکھ میں بھی بٹا کر آیا تھا۔ اماں، بابا جان تینوں بیٹیوں کی کی جدائی کا غم بھی وہ ہمتیاں اسی سلوک کی بھڑک سے وہ اپنی ذات کے غم میں ڈوب کر ان کے خواب

ارمان داؤ پر لگا دیتا۔ وہ جیسے غفلت کی نیند سے جاگا تھا۔ یہ جگا رہا کتنی تھی جس نے اسے ہر بدی مداخلت سے غافل کر دیا تھا۔

نینسی یونیورسٹی میں نظر کیوں نہیں آ رہی۔ راہد کے پاس اس کے لیے کیا اطلاعات ہیں۔ اسے کسی بات سے غرض نہیں رہی تھی۔ وہ پوری نکلن سے اپنے نصیب کے حصول کے لیے کوشاں تھا۔ یہ انتھک محنت اور لگن ہی تھی جس کے سہارے اس نے بہت نمایاں کامیابی کے ساتھ اپنا پانی انچ ڈی مکمل کیا اور اس کے بعد وہ پھر ایک دن مزید وہاں نہیں ٹھہرا تھا۔ نینسی کی باتیں چلتی بن کر اس کے اندر موجود تھیں۔ وہ واپس لوٹنے سے اپنے ساتھ بہت سے عہد کر کے لوٹا تھا اپنے ہر عزم اور عہد کو پورا کرنے کے لیے اسے مسلسل جدوجہد کرنی تھی جس کے لیے وہ پوری طرح تیار تھا۔

\*\*\*

”تم حیران ہو گی کہ میں تمہیں یوں سب کے درمیان سے اٹھا کر یہاں کیوں لے آیا؟“ اوپن ایئر ریسٹورنٹ میں جب کہ سامنے والی کرسی پر بیٹھا وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔ جب نے کوئی جواب نہیں دیا اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ جو کچھ کہتا ہے وہ امر میز کہہ ڈالے۔

”تمہیں معلوم ہے کہ ما اور عالیہ آئی میرے اور تمہارے بارے میں کیا خواہش رہتی ہیں اگر ممما کا بس چلتا تو وہ دھت کے ساتھ ساتھ میری شادی بھی طے کر کے اپنی اس خواہش کی تکمیل کر لیتیں لیکن میرے انکار نے انہیں مجبور کر دیا۔“ امر کی بات نے جبہ کو چونکنے پر مجبور کیا۔

”آئی ایم سوری جب..... لیکن سچ یہی ہے کہ میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔“ امر میز کا انداز بے حد معذرت خواہانہ تھا۔

”کیا میں وجہ جان سکتی ہوں؟“ جب نے خود کو سنبھالتے ہوئے ساٹ انداز میں پوچھا۔  
”بالکل اگر تم نہ بھی پوچھیں تو میں تمہیں وجہ ضرور بتاتا۔ تم یہ مت سمجھنا کہ میرے انکار کے پیچھے تمہارے

لیے ناپسندیدگی کا جذبہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تم ایک آئینڈل لڑکی ہو جس میں اپنی ڈھیر ساری خوبیاں ہیں کہ کوئی بھی شخص تمہیں اپنی شریک حیات بناتے ہوئے فخر محسوس کرے گا۔“

”لیکن تم یہ فخر حاصل نہیں کرنا چاہتے۔“ جب نے آزدگی سے اس کی بات کاٹی۔

”میں مجبور ہوں..... ورنہ حقیقت یہ ہے کہ عام حالات میں، میرا انتخاب تمہارے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ یہاں نہیں یہ سچ تھا یا امر میز اس کی دلجوئی کر رہا تھا۔

”بانی یہ سبب کہ میں کسی کو پسند کرنے لگا ہوں بلکہ پسند کا لفظ تو معمولی ہے سچ یہ ہے کہ میں کسی سے محبت کرنے لگا ہوں۔ اتنی شدید محبت کہ اب اس کے سوا کسی اور کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“ امر میز کی آنکھیں خواب رنگ ہو رہی تھیں۔

”کون ہے وہ؟“ جب نے سر گھٹی میں پوچھا۔  
”رفعت کی کلاس فیلو، نور العین۔“ امر میز کے لبوں نے نور العین کا نام بہت نرمی اور چاہت سے ادا کیا تھا۔ جب ایک ٹک اسے دیکھتی رہی۔ اس کا یہ عقیدہ اور خوبرو سا کرن نرم خو تو ہمیشہ سے تھا لیکن چاہت کے رنگوں نے اس کی فطری نرمی کے ساتھ مل کر اسے اور بھی سنوار دیا تھا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ دل کے قریب محسوس ہو رہا تھا۔ جب نے نظریں چرائیں۔  
”چلو، مگر واپس چلیں۔“ وہ یکدم ہی کھڑی ہو گئی۔

”تم نے ہائڈ تو نہیں کیا جب؟“ امر میز گھبرا کر پوچھنے لگا۔

”واٹ ریش، تم نے مجھے اتنا الحق سمجھ رکھا ہے کہ میں مہذب انداز میں کی جانے والی ایک بات کو سمجھ نہ سکوں۔“ گاڑی کی طرف جاتے ہوئے جب نے قدرے تیز لہجے میں جواب دیا۔

”سوری جب!“ گاڑی میں بیٹھ کر اسے اشارت کرتے امر میز نے آہستہ سہجہ سے کہا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے امر امیں نے تمہاری بات اچھی طرح سن لی ہے اور بھی بھی ہے۔ یہ صورت



کسی کے بھی ساتھ پیش آ سکتی ہے۔ تمہارے بجائے میں بھی ہو سکتی تھی تو کیا ایسی صورت میں تم مجھے اغوا کر لینے کے بجائے بطور کرتے، ایک ایسا معاملہ جو انسان کے اختیار میں ہی نہیں ہوتا اس کے لیے اس پر الزام تراشی کرنا یا اسے مجرم ٹھہرانا کہاں کی عقلمندی ہے اور میرا خیال ہے میں کافی عقلمند لوگوں ہوں اس لیے مجھ سے تمہیں ایسی کسی بے وقوفی کی امید ہونی بھی نہیں چاہیے۔ ”خیر نہ کہا۔

”تم بہت ناس لڑکی ہو جب!“ وہ اس کی باتوں پر ہلکا ہلکا ہونگیا تھا سو بہت دل سے اسے سراہا۔  
”تم تو کہو گے۔ میں نے اتنی آسانی سے تمہیں اس کیس سے باعزت بری جو کر دیا۔“ خیر نے لہجے میں شوخی سموتے ہوئے کہا تو آخر میں وہ جبر کا بلند قہقہہ بھی اس کے ساتھ ہی گونجا۔ ہستے ہستے اس کی آنکھوں میں نمی سی اتر آئی۔ اس نمی کے پیچھے کیا احساس تھا شوخ سی دھن پرستی، بجا تا حرم میز بے خبر رہا۔

\*\*\*

”کب پوری ہو گی تیری پڑھائی۔ اس پڑھائی کے چکر میں جو ملی کے لیے مہمان ہو کر رہ گئی ہے۔ مہینوں کے بعد آئی ہے اور ہوا کے جھوکے کی طرح پلٹ جاتی ہے۔ یہ بھی خیال نہیں آتا کہ اماں کا دل یہاں کتنا بے چین رہتا ہوگا۔ تو نے اپنی پڑھائی کی خاطر ماں کو تنہا کر رکھا ہے اور تیرا لالہ دوسروں کو پڑھائیاں کروانے کے واسطے نہیں بھولا ہوا ہے۔ ساری زندگی گزر گئی اس کی جدائی سب سے سب سے پہلے بورڈنگ میں پھر ملک سے باہر اور اب دوسرے شہر میں۔ اولاد والی ہو کر بھی میں تو سونی ہی ہوں۔ میرے سارے بچے مہمانوں کی طرح یہاں آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔“ نورالعین واپسی کے لیے اپنا بیک بیک کر رہی تھی کہ صالحہ شاہ اس کے کمرے میں چلی آئیں اور اسے سامان باندھتے دیکھ کر شکوہ کرنے لگیں۔

”بس اماں! اب تو تین سال کی ہی بات ہے جہاں اتنا عرصہ ممبر کیا ہے یہ تھوڑا سا وقت اور نکال لیں پھر میں، لالہ اور بھائی سب مستقل یہیں آپ کے پاس

آجائیں گے۔“ نورالعین نے ان کے گلے میں بازو حاصل کرتے ہوئے انہیں تسلی دی۔  
”ہاں، مطیب بھی یہی کہہ رہا تھا۔ پتا نہیں عمل بھی کرتا ہے یا نہیں مجھے تو اس کے واپس آنے کا اعتبار ہی نہیں۔“ صالحہ شاہ بے یقین سی تھیں۔  
”لالہ پر اعتبار نہیں تو مجھ پر کر لیں۔ صرف میں خود واپس آؤں گی بلکہ انہیں بھی اپنے ساتھ لے کر آؤں گی۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔“ نورالعین نے کہا۔

”تمہارا آنا بھی خیر کیا..... آؤ گی تو سسرال روانہ ہو جاؤ گی۔ تمہاری چاچی تو دیے ہی بڑی مشکل سے ممبر کر رہی ہے۔ ہر تیسرے چوتھے روز پوچھتی ہے کہ نور کی پڑھائی کب ختم ہوگی۔“ اماں کی بات پر نور بچھے بچھے انداز میں چبھتے ہٹ گئی۔ زندگی کی یہ تلخ حقیقت ہر بار اس کی خوشی کے ٹھوکوں کو کھاتی تھی۔ اب بھی وہ کتنی خوش تھی اماں کو یوں اپنی طرف متوجہ دیکھ کر۔ اماں کبھی بھی تو یوں محبت کا اظہار کرتی تھیں۔

”مجھ سے کہہ رہی تھی کہ بری کے سارے جوڑے اور زیورہ شہر سے ہٹاؤں گی۔ نور اتنے عرصے سے شہر میں رہ رہی ہے اسے گاؤں کی چیزیں پسند نہیں آئیں گی۔“ صالحہ شاہ اس کے بدلتے تاثرات سے بے خبر دیورانی کی باتیں سناتے جا رہی تھیں۔ نورالعین کو اس اذیت سے دردنازے پر ہونے والی دستک نے نکالا۔

”شاہ جی پوچھ رہے ہیں کہ آپ تیار ہیں؟“ جو ملی کی ایک ملازمہ تھی جو مطیب شاہ کا پیغام لے کر آئی تھی۔

”ہاں..... کیونکہ بس ابھی آتی ہوں۔“ نورالعین نے جواب دیا تو ملازمہ واپس چلی گئی۔  
”اجازت اماں!“ نورالعین نے صالحہ شاہ سے پوچھا۔

”ہاں بچہ! جاؤ، اللہ سائیں خیر سے لے جائے اور خیر سے واپس لائے۔“ انہوں نے نورالعین کی پیشانی پر بوسہ دیا اور اس کے ساتھ ہی باہر نکل آئیں۔  
”اچھا تمہارا پا، چلتی ہوں۔“ نورالعین باہر آ کر

بڑی بہن سے ملنے لگی جب کہ صالحہ شاہ بیٹے کو رخصت کر رہی تھیں۔  
”اللہ تمہارا۔“ مہر نے اسے گلے سے لگاتے ہوئے دعا دی۔  
”اماں! تم بھی آپ بھی تو میرے پاس شہر رکنے کے لیے آئیں۔ میں تو جب موقع ملتا ہے جو ملی کا چکر لگا ہی لیا ہوں لیکن آپ تو وہاں آئی ہی نہیں۔“ صالحہ شاہ نے یتھیا دوری کا شکوہ کیا تھا جس کے جواب میں مطیب شاہ یہ بات کہہ رہا تھا۔

”لالہ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں اماں! آپ شہر آ کر بہت سارے دن ہمارے پاس رہیں اس طرح آپ ہمارے نزدیک بھی رہیں گی اور ہمارے کام بھی چلتے رہیں گے۔“ نورالعین نے فوراً بھائی کی تائید کی۔  
”تمہارے بابا جان سے کہہ کر دیکھوں گی۔ اگر وہ ساتھ چلنے پر راضی ہوئے تو ٹھیک ورنہ تم لوگوں کو تو پتا ہی ہے کہ مجھے کیسے ہر دم ان کے ساتھ لگے رہنا پڑتا ہے میرے سوا کوئی اور ان کے کاموں کی نگرانی نہیں کر سکتا۔“ صالحہ شاہ نے جواب دیا تو وہ سب بہن بھائی مکرانے لگے۔ یہ حقیقت تھی کہ قائم شاہ کے عزائم کا ہر رنگ بس صالحہ شاہ ہی سمجھتی تھیں۔ کب انہیں کس چیز کی ضرورت ہے، انہیں ہی خبر ہوتی تھی۔

”بس تو آپ بابا جان کو راضی کر لیں آئے پر۔“ نورالعین نے شرائط سے کہا اور انہیں پیار کر کے باہر کی طرف بڑھ گئی۔ مطیب شاہ بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔  
”لالہ! اتھوڑی دیر پیشی جی کی طرف لے چلیں۔ صبح صغریٰ نے پیغام بھجوایا تھا کہ وہ آئی ہوئی ہے۔“ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے نورالعین نے بھائی سے فرمائش کی۔  
”تمہارا دل نہیں بھرا صغریٰ سے ملاقاتیں کر کر کے۔“ مطیب شاہ نے اسے چھیڑا۔

”میری اس سے ڈھنگ سے ملاقات ہوئی ہی کہاں؟ کہنے کو میں اس کی شادی میں شرکت کے لیے یہاں آئی تھی لیکن اماں نے کھٹے دو گھنٹے سے زیادہ مجھے وہاں جانے ہی نہیں دیا۔“ نورالعین نے اداسی سے بتایا۔

”اماں بھی اپنی روایات سے مجبور ہیں۔ تمہیں اور مجھے تو پھر بھی سمجھو بہت زیادہ چھوٹی ملی ہوئی ہے۔“ مطیب نے گاڑی میں بیٹھ کر گھر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔  
”ڈرا دیر میں وہ دونوں ان کے چھوٹے سے گھر میں تھے اور وہاں بچپن کی سچائی تھی۔ اماں خاندانی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ ان معزز مہمانوں کی خاطر کس طرح کریں۔“

”کسی تکلف میں پڑنے کی ضرورت نہیں تھی جی! ہمیں ابھی شہر جانا ہے بس نور کو ذرا دیر کے لیے صغریٰ سے ملاقات کروانے کے لیے لے آیا تھا۔“ مطیب شاہ کو بالآخر دخل اندازی کرتا پڑی۔ دوسری طرف نور صغریٰ سے پوچھ رہی تھی۔

”خوش تو ہونا صغریٰ؟“  
”بہت.....“ صغریٰ کی نگاہیں خوشی اور شرم سے جھکی جا رہی تھیں۔

”اپنے میاں جی کو لے کر ہمارے پاس شہر آنا۔ کچھ دن رہنا پھر ہم تمہیں خوب وہاں کی سیر کروائیں گے۔“ صغریٰ سے رخصت ہونے سے پہلے نورالعین نے اسے آفر کی تھی جس کے جواب میں وہ دھیرے سے اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی تھی۔

\*\*\*

”نیوٹن کے پہلے قانون حرکت کے مطابق کسی بیرونی غیر متوازن قوت کی غیر موجودگی میں ساکن جسم ساکن رہے گا اور متحرک جسم یکساں دلائی سے خط مستقیم میں حرکت کرتا رہے گا۔“ مطیب شاہ اس وقت فرسٹ ایئر کو نیوٹن کے قوانین حرکت پڑھا رہا تھا۔ معمول کے مطابق طلباء پورے انتہاک سے اس کی طرف متوجہ تھے۔  
”قانون کے پہلے حصے کو سمجھنا تو آپ کے لیے مشکل نہیں کیونکہ یہ آپ کا عام مشاہدہ ہے کہ ساکن بڑی ہوئی چیزیں اس وقت تک حرکت نہیں کرتیں جب تک ان پر کوئی بیرونی عامل اثر انداز نہ ہو البتہ آپ دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی گیند بھینکی جائے تو وہ تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد رک جاتی ہے۔ بظاہر گیند کو کوئی روکنا بھی نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس گیند پر بہت سے



بیرونی عوامل اثر انداز ہو رہے ہوتے ہیں مثلاً ہوا کی رکاوٹ، کشش ثقل اور رگڑ کا عمل اگر یہ عوامل نہ ہوں تو حرکت کرتی ہوئی گیند یا کوئی دوسرا جسم ہمیشہ خط مستقیم میں یکساں ولائٹی سے حرکت کرتا رہے گا۔ قانون کی وضاحت دیتے ہوئے کلاس پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔

”بات سمجھ رہے ہیں آپ لوگ؟“  
”ہاں سر۔“ کچھ طلباء نے جواب دیا اور کچھ سر کو تھپکی انداز میں ہلانے لگے۔

”اچھا تو بتائیے یہ لاکس نے بتایا؟“ مطیب شاہ نے پوچھا۔

”نیوٹن نے۔“ بیک وقت کئی آوازیں ابھریں۔  
”غلط..... نیوٹن نے تو صرف اسے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ قانون بنانے والی ہستی تو کسی اور کی ہے۔“ مطیب نے مسکراتے ہوئے ان کا جواب رد کیا۔  
”وہ کون ہے سر؟“ طلباء حیران تھے۔ انہوں نے جب بھی قوانین حرکت پڑھے تھے۔ نیوٹن کا نام ان قوانین کے ساتھ جڑایا تھا لیکن اب اس بات کا انکار کر رہے تھے تو تعجب کا مقام تو تھا ہی۔ کسی نئے ہونے والے انکشاف کو سننے کے لیے مضطرب سے ہواٹھے تھے۔

”اللہ تعالیٰ اور کون؟“ مطیب نے ان کے تجسس کو دیکھتے ہوئے ہنس کر سادگی سے جواب دیا۔

”ہاں، وہ تو سب کو ہی معلوم ہے۔“ بچوں کے تجسس کے غبارے میں سے یکدم ہی ہوا نکل گئی اور ایک طالب علم نے یہ آواز بلند اس بات کا اظہار بھی کر دیا۔

”صرف معلوم ہونا کافی نہیں، ہمیشہ ذہن میں رہنا بھی ضروری ہے کیونکہ بات بھی غلطی ہے جب اس بات کو یاد رکھا جائے کہ قانون اللہ کا بنایا ہوا ہے اور اسے توڑنے والا ہمیشہ ٹھوکر کھاتا ہے۔ چاہے اس قانون کا تعلق اخلاقی اقدار سے ہو چاہے طبیعی عناصر سے۔ جہاں انسان نے اللہ کے بنائے ہوئے قانون کو توڑا وہیں اسے سزا ملی۔ ابھی جو ہم نے قانون پڑھا ہے اسے توڑنے کا نتیجہ میں نے بہت بار اپنی سڑکوں پر دیکھا ہے۔“

”یہ آپ لوگوں کا عام مشاہدہ ہو گا کہ کسی بس سے اترتے وقت مرد صرف رفتار کم کر دیا کر بھی اتر جاتے ہیں اور خواتین، رک جانے والی بس اگر معمولی سا جھلکا بھی لے لے تو فوراً گر جاتی ہیں اور لوگ ڈرائیو کو برا بھلا کہتے ہیں لیکن میں کہتا ہوں اس حادثے میں ڈرائیو کے ساتھ ساتھ وہ خاتون خود بھی ذمے دار ہوتی ہیں۔“

”وہ کیسے سر؟“ ایک طالب علم نے پوچھا۔

”قانون کے دوسرے حصے کو غور سے دیکھو، اس کے مطابق متحرک جسم اپنی حرکت قائم رکھتا ہے۔ چلتی ہوئی بس میں ہونے کی وجہ سے انسان اس متحرک بس کا

ایک حصہ ہوتا ہے اور بس کے ساتھ ساتھ خود بھی خط مستقیم میں سفر کر رہا ہوتا ہے لیکن ہماری خواہش یہ کرنی

ہیں کہ جب بس سے اترتی ہیں تو اپنا رخ پیچھے کی جانب رکتی ہیں۔ یعنی حرکت کی سمت سے مخالف سمت میں۔

اب قانون کے مطابق تو وہ اس وقت ایک ایسا جسم نہیں جو حرکت میں تھا اور اسے متحرک رہنا تھا لیکن مخالف سمت

میں رخ کر کے اترنے سے قانون کی خلاف ورزی ہوتی ہے اور جسم کو زور دار جھلکا گرنے کی وجہ سے حادثہ پیش

آ جاتا ہے۔ اس کے برخلاف مرد بس کی حرکت کے سمت برہی اپنا رخ رکھتے ہیں اور ایک دم سے خود کو روک

لینے کی کوشش کرنے کے بجائے بس کی حرکت کی سمت میں ہی دو تین قدم کا فاصلہ طے کرتے ہوئے تکلیف سے

خود کو روک دیتے ہیں۔ ان کی یہ کوشش بیرونی عامل ہوتی ہے جو ان کے متحرک جسم کو روک کر بغیر دخولی بس اسٹاپ پر

اتار دیتی ہے۔ اگر کوئی شخص اس سے ہٹ کر عمل کرے تو اسے قانون قدرت توڑنے کی سزا بھی ملتی پڑے گی

اور سزا بھی ایسی جو موقع پر ہی مل جاتی ہے کسی عدالت اور قیسی کی ضرورت نہیں پڑتی۔“

”انٹرسٹنگ سر۔“ بچوں نے اس کی بات فہم ہونے پر بے ساختہ ہی سین آئیز لہجہ میں کہا۔

”دلچسپ تو ہے لیکن کارآمد اس وقت ہی ہو گا جب اسے عمل کا حصہ بنائے گا۔ اس بات کو اپنا اصول بنا لو کہ جہاں بھی تمہیں کوئی ٹھوکر لگے، نقصان پہنچے، پلٹ کر دیکھو تم نے اللہ کا کوئی قانون تو نہیں توڑا ہے کیونکہ اللہ

اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔ وہ کبھی ظلم نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ اس نے تو کبھی کسی ہستی پر اس وقت تک عذاب بھی نہیں بھیجا جب تک وہاں کوئی ڈرانے والا پہنچ کر وہاں کے رہنے والوں پر اپنی جنت تمام نہ کر دی۔ وہ اپنی جھوٹ سے بے حد محبت کرتا ہے اس لیے اسے بے سبب تکلیفوں میں مبتلا نہیں کرتا۔ ہاں آزمائش کا معاملہ الگ ہے۔ اگر کوئی تکلیف آزمائش کے طور پر انسان کی زندگی میں آ جائے تو اسے صبر سے اس تکلیف کو سہہ کر

اللہ سے مدد کی درخواست کرنی چاہیے۔“ مطیب شاہ یہ بات روانی سے کہہ رہا تھا۔ عمر احسان کا وہ انداز جس پر

بسی وہ حیران ہوا کرتا تھا اب اس کی اپنی شخصیت کا حصہ بن گیا تھا۔ اب وہ بھی دین کو سائنس سے ریلیٹ

کرنے کا ہنر جانتا جا رہا تھا۔

\*\*\*

”آج شام اماں اور بابا جان آ رہے ہیں۔ بابا جان تو خیر پہلے بھی کبھی تھوڑی دیر کے لیے آ جایا کرتے

تھے لیکن اماں پہلی بار آ رہی ہیں۔ تمہیں پتا ہے ان کی شادی کو پچیس برس سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے اور اس

عرصے میں وہ کتنی کی چند بار ہی حویلی سے باہر گئی ہیں۔ شہر تو بھی آئیں ہی نہیں پہلی بار میرے اور لالہ کے

اصرار پر آ رہی ہیں۔“ نور العین بہت جوش و خروش کے ساتھ رفعت کو بتا رہی تھی۔

”یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ میں ماما کو بتاؤں گی تمہارے والدین کی آمد کے بارے میں وہ اور

ڈیلی، مدحت آئی کی شادی کا کارڈ خود دینے آ جائیں گے اس بہانے ان کی تمہارے والدین سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔“ رفعت نے اس کی بات پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تو جواباً وہ بھی خوش دلی سے بولی۔

”معاف کیجیے گا معیز صاحب! ہماری بیٹی کا نکاح میڈیکل میں داخلے سے پہلے ہی اس کے چچا زاد سے ہو چکا ہے۔ تعلیم مکمل ہوتے ہی ہم اسے رخصت کر دیں گے اور اگر ایسا نہ ہوتا تب بھی ہم آپ کو انکار کے سوا کچھ نہیں دے سکتے تھے۔ ہماری بیٹیاں خاندان سے باہر ہرگز بھی نہیں بیایا جاتیں۔ یہ روایت بھی ہے اور اصول بھی۔“ سید قائم شاہ کے بظاہر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کیسا غضب بول رہا تھا یہ وہی لوگ جان سکتے تھے جو ان کے مزاج آ شنا تھے۔ البتہ شک صحبت اور معیز احمد کو بھی خوب لگا تھا۔ نور العین کو اپنی بہو بنانے کے حوالے سے وہ جانے کتنے خواب دیکھ چکے تھے۔ اب اس ناکامی نے ہواؤں کے سنگ اڑتے ان میاں بیوی کو جیسے یکایک زمین پر لا چڑھا تھا، وہ بہت مایوسی کے عالم میں واپس لوٹے تھے۔

## توجہ فرمائیں

فیصل آباد کے بک سیلرز،  
دکان دار اور ہائر حضرات

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت اور ماہنامہ دلکش

کے حصول کے لیے ہمارے ڈسٹری بیوٹر

نیو ملک بک سینٹر

ایم آصف برادر دکان نمبر 8 عرفات بزنس سینٹر

چکھری بازار فیصل آباد سے رجوع فرمائیں

موبائل: 0333-6539585

فون: 041-2610961-2619580

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

63 فیروز الہ سکشنش ویس ہاؤس انٹرنیشنل روڈ کراچی

فون 5895313 فیکس 5802551



دُر شہوار نے باہر آ کر جھانکا۔ آسمان پر بادلوں کا سینہ چیر کر اپنے وجود کا پتا دے رہے تھے۔ تیز ہوا کا جھونکا آیا اور سامنے لگا آلوچے کا درخت دوہرا ہو کر زمین کو چھونے لگا۔ اس کے ساتھ ہی پانی کی بوجھاڑ آئی اور دُر شہوار کے پاؤں بیگ گئے۔ پانچ

## شاہ بہاراں صبح چمن

بلقیس ظفر



بھی فیصلہ کرنے کے لیے تمہارے مشورے کے منتظر نہیں۔“ قائم شاہ نے غیض کے عالم میں کہا۔  
”لیکن نور نے سجاد شاہ سے نکاح صرف شرط پر کیا تھا کہ آپ اسے میڈیکل میں داخلے کی اجازت دیں گے۔“ مطیب شاہ اتنی آسانی سے ماننے والا نہیں تھا۔

”ہم نے اپنا وعدہ پورا کر دیا نور نے نہ صرف میڈیکل میں داخلہ لیا بلکہ دو سال بھی مکمل کر لیے۔ یہ ڈاکٹری کی تعلیم مکمل کرے گی۔ ہم نے یہ وعدہ تو کبھی کیا تھا۔“ وہ قائم شاہ تھے مطیب شاہ کے باپ۔ ان کے پاس اس کی ہر دلیل کا جواب تھا۔

”پلیز بابا جان! آپ ذرا ٹھنڈے دل سے کام لیں۔ نور کا تیسرا سال چل رہا ہے چند سال کی ادویات ہے۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری ہو جائے گی۔ ماں باپ تو بیٹیوں کا مان ہوتے ہیں۔ کیا آپ اپنی بیٹی کی یہ معمولی خواہش بھی پوری نہیں کر سکتے۔“ اس بار زمین شاہ نے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی تھی۔

”تم اچھی طرح جانتی ہو بیٹی! ہمارے ہاں بیٹیوں کی خاطر عزت بھی داؤ پر نہیں لگائی جاتی۔ ہمارے ہاں کی بیٹیاں ہمیشہ عزت کی خاطر قریاں ہوتی چلی آئی ہیں۔“ بہو سے بات کرتے ہوئے قائم علی شاہ کا لہجہ ذرا دھیمہ پڑا تھا لیکن فیصلے کی تختی اپنی جگہ محسوس ہو رہی تھی۔

”میں آپ کو گارنٹی دیتی ہوں بابا جان! نور کو ایسا کوئی قدم نہیں اٹھائے گی جس سے ہمارے خاندان کی عزت پر کوئی حرف آئے۔ میں اسے بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ اگر اس کے کردار میں کوئی بھول ہوتا تو سب سے پہلے مجھے اعتراض ہوتا۔ آخر میں اس کی ہونے والی ہند ہوں۔ یہ میرے بھائی کی عزت ہے، میں کیسے برداشت کر سکتی ہوں کہ میرے بھائی کی عزت پر حرف آئے۔“ زمین شاہ کی دلیل نے سید قائم شاہ کو تذبذب میں ڈال دیا۔

باقی آئندہ

”ایسا کیوں ہوا نور! ان لوگوں کی جرأت کیسے ہوئی یہ سوال لے کر ہمارے در پر آنے کی؟“ صباحت اور معجز احمد کی واپسی کے بعد نور العین کی بابا جان کے سامنے طغی ہوئی تھی۔  
”میں نہیں جانتی بابا جان!“ نور العین نے جھکے سر کے ساتھ جواب دیا۔

”تم جانتی ہو اس لڑکے کو جس کے لیے تمہاری سہیلی کے ماں باپ ہمارے پاس آئے تھے۔“ ان کا یہ سوال بہت نازک تھا لیکن جواب تو نور العین کو بہر حال دینا ہی تھا۔

”وہ کبھی کبھار رفعت کو لینے کالج آتا ہے۔ میں نے صرف دور سے دیکھا ہے کبھی بات نہیں کی۔“ جو کچھ تھا اس نے بتا دیا۔

”اس کی ماں کہہ رہی تھی ہمارے بیٹے کو نور العین بہت پسند ہے۔ ہم اس کی خواہش پر ہی آپ سے آپ کی بیٹی مانگ رہے ہیں۔ اس کی بات سن کر ہمیں لگا کہ کسی نے ہمارے منہ پر ٹانچہ مار دیا ہو۔ لگتا تھا کسی بھی لمحے کوئی اور گستاخ جملہ کہہ دے گی۔ شہر والوں کی یہی بے شری ہے جسے ہم سخت ناپسند کرتے ہیں اور اسی لیے اپنی اولاد کا بھی ان کے درمیان رہنا پسند نہیں کرتے اور اب ہم نے سوچ لیا ہے کہ ہم انہیں اپنے ساتھ واپس گاؤں لے جائیں گے۔ بس ہو چکا تمہارا شوق پورا۔ بہت پڑھا سنا کر لیں تم نے۔“ سید قائم شاہ کے فیصلے نے نور العین کو سناکت کر دیا۔ وہ اپنے دفاع میں کچھ کہنے کے لائق بھی نہیں رہی۔

”یہ زیادتی ہے بابا جان! آپ نور کو ایک ایسی بات کی سزا دے رہے ہیں جس میں اس کا کوئی قصور نہیں اور پھر ہوا ہی کیا ہے؟ صرف ایک رشتہ تو آیا تھا نا۔ آپ نے اپنی مجبوری بنا کر معذرت کر لی۔ اس بات میں کسی انتہائی فیصلے کی گنجائش کہاں نکلتی ہے؟“ مطیب شاہ جواب تک احترازا خاموش تھا۔ بہن پر ہونے والی زیادتی پر چپ نہیں رہ سکا۔

”ہم تم سے کچھ نہیں کہہ رہے مطیب شاہ! نور العین ہماری بیٹی ہے۔ اس کے بارے میں ہم کوئی



اٹھائے وہ اندر کو بھاگی اور طوفان کو دیکھ کر جلدی جلدی در پیچ بند کرنے لگی۔ ٹیمین بیگم نے جتن سے آ کر کہا۔

”موسم برا خراب ہو رہا ہے۔ ڈرائنگ روم کے دروازے تلے بڑا تو لیا ٹھونس دو، کہیں پچھلی بارش کی طرح قاتلین نہ بھگ جائے۔“ دونوں ماں بیٹیاں تیزی سے چڑیں سینے لگیں۔ باہر موسلا دھار بارش شروع ہو گئی تھی۔

اگلی صبح بارش رک چکی تھی۔ نیلے آسمان پر آفتاب اپنی طلائی کرنیں نکھیر رہا تھا۔ بہار کی خوبصورت صبح روشن تھی۔ بکے کھن پر ہر طرف تپتے اور ڈالیاں بکھری ہوئی تھیں۔ جنھیں ملازمہ لڑکی پروین سمیٹ رہی تھی۔ درشہوار اور اس کی امی ٹیمین بیگم باہر پڑے بیچ کو صاف کروا کے اس پر آن بیٹھی تھیں، ہلکی خشک ہوا چل رہی تھی۔ درشہوار اپنی ہتھکڑیاں لٹیں سینے سینے عاجز آ چکی تھی۔

”شکر ہے آج چھٹی ہے ورنہ میرا دل بالکل کالج جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔“ درشہوار نے ماں سے کہا۔

”تم تو ہمیشہ کالج جانے سے کتراتے ہو۔ آج بارش کا بہانہ لیا۔“ ٹیمین بیگم مسکرائیں۔ ”اچھا میں ذرا کچن میں جا رہی ہوں۔ آج کچے قے کے کباب بنائے ہیں۔ آنا چاہو آ جانا۔“ یہ کہہ کر وہ کچن میں چلی گئیں۔ راستے میں پروین کو اچھی طرح صفائی کرنے کی ہدایات دیتی گئیں۔

درشہوار تنھے منے بہار کے پرندوں کو دیکھنے لگی جو ادھر ادھر پھدک کا بیٹیاں بجا رہے تھے۔ اس کی نظر ان پر لگی تھی اور چہرے پر حقیقی خوشی کی مسکراہٹ دکھ رہی تھی۔ بچپن سے ہی اسے پرندوں اور ان کی پیاری آوازیں سے عشق تھا۔ اس نے چنڈول کی آسان کی پنہائیوں میں گونجتی، موسیقیت نکھیرتی آواز، فاختہ کی دسوز کوکو، بلبل کی ترنم ریزیاں، چڑیوں کی چپکار اور کوئل کی شونچ جھپٹی ہوئی پکار ان سب کو کیسیوں میں بھر رکھا تھا۔ جتنی کہ ٹیمین بیگم سے ضد کر کے دروازے پر جوتیل لگوا لی تھی اس میں بھی چڑیوں اور مختلف پرندوں کی آوازیں بھری تھیں اور یونہی نیم وا آنکھوں سے آسمان

کی جانب دیکھتے دیکھتے وہ ماضی کی اٹھارہ واہیوں میں گری۔

وہ ماضی جو اس کے ابو کے ہر شفقت و جود کے پیار سے گندھا تھا، وہ اس میں ٹھونگی۔ اسے ہر کوئی کھد رے سے اپنے باپ کا وجہ سمجھتا تھا اور جاں فزا ایتھم سنائی دے رہے تھے۔ یہ گھرانہ کی جنت تھی جس میں خوشیاں ہی خوشیاں، دل کا سر اور طمانیت تھی۔ خالص محبت کے جگنو جھکتے تھے۔ طرف جیسے رنگین تیلیوں کا رقص تھا۔ یہ ایک بے مثال تھا جس پر کبھی کسی کا سایہ نہ پڑا تھا یہاں کے کینوں کو نہ نا آشنا تھے کہ ایک روز بے خبری میں ان پر قیامت پڑی۔ اس کے ابو ہمیشہ کے لیے چلے گئے اور ان دنوں ماں بیٹی کی خوشیاں، مسکرائیں اور جھگڑا ہٹ سا جھگڑے گئے۔ ٹیمین بیگم کے جب حواس بجا ہوئے تو فرار کشت آنے لگے۔ آمدنی کا ذریعہ صرف پیشکش تھی اور یہ تھا۔ اپنے رشتے داروں سے کسی قسم کی مدد لینے کی غیرت نے روک دیا۔ یہ فیصلہ بھی کہ کبھی انہوں نے مختلف آپشنز پر غور کیا اور آخر اپنی تعلیم کو میں لاتے ہوئے انہوں نے بیچنگ کا فیصلہ کیا۔

تین سال گزر گئے۔ وہ پڑھارہی تھیں، مگر دونوں نے سنبھال رکھا تھا۔ ماں کی ہمت اور مزاجی درشہوار میں بھی تھی وہ گھر کے کام میں مدد کرنی دل لگا کر پڑھتی۔ اسے ادھر ادھر دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔ فراغت کے وقت وہ اپنی بچہ بیز کے بزم کے پاس جا بیٹھی اور انہیں دانہ کھلائی۔ گھر کے چھ سے بکے کھن کے آس پاس جو کپاریاں تھیں ان میں ان کے لگائے ہوئے پھول تھبتہ لگاتے تھے اور.... گلابی پھولوں والی بیکلیں دیواروں پر لہرائی تھیں۔ زندگی کے زبردست جھٹکے سے لڑکھڑانے کے بعد اس قدرے سیٹ ہو چکی تھیں۔

درشہوار نے ایم اے کر کے کمپیوٹر کورس اخبارات میں اشتہارات پڑھنے لگی۔ اس نے اپنے سے مشورہ کر کے ایک حتیٰ فیصلہ کر لیا تھا کہ ملازم کرے گی اور ماں کی روز و شب کی اس مشقت کا

دے گی جو انہوں نے اس کی تعلیم اور پرورش کے سلسلے میں تنہا اٹھائی تھی۔ وہ اپنی ماں سے بے تحاشا محبت کرنے کے علاوہ ان کی احسان مند بھی تھی۔ دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے کی محرم راز اور سہیلیاں بھی تھیں۔ ہر معاملے میں ایک دوسرے کو مشورے دیتیں۔ ان کی ہر بات پر ایک دوسرے کے لیے وقف تھیں۔

کافی دن اخبارات میں سرکھانے کے بعد ایک روز درشہوار کو حسب مشا ملازمت کا اشتہار نظر آ ہی گیا۔ اس شہر کے ایک بہت بڑے کاروباری گروپ کی طرف سے تھا۔ جاب بھی اسٹنٹ سیکریٹری کی۔ شرائط نہایت ہی معقول اور مناسب۔ ماں سے مشورہ کرنے کے بعد درشہوار نے درخواست بھیج دی۔ اسے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا اور انٹرویو کے لیے بلایا گیا۔

شفیع کمال گروپ آف انڈسٹریز کے عالی شان دفتر میں جب وہ داخل ہوئی تو حیران رہ گئی۔ انتہائی قیمتی ڈیکور سے سجایے کمرے کی محل کا حصہ معلوم ہوتا تھا۔ وسیع و عریض کلاس ٹائپ میز پر ایک طرف نہایت ترتیب سے فائل بڑے تھے۔ دوسرے کونے پر سیاہ گلدان میں سرخ اور سفید گلاب مسکرا رہے تھے۔ درشہوار کی نظر پھولوں سے پڑے کاغذات پر پڑے ایک سر پر بڑی جوسیاہ ٹم دار بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ درشہوار کے پاؤں کی آہٹ پر اس شخص نے سر اٹھایا ایک لحظہ آنے والی کو دیکھا اور زپر لب کہا۔ ”بیٹھے جاؤ۔۔۔“ اس پاس رکھی کرسیوں میں سے ایک پر وہ بیٹھی۔ حلق خشک ہو رہا تھا، نہ جانے کیوں، حالانکہ وہ ایک خود اعتماد لڑکی تھی۔ فائلوں پر جھکا ہوا سر اٹھا اور دو دو بین آکھیں اسے دیکھنے لگیں پھر ایک بھاری آواز گونجی۔

”میں نے تمہاری سی دی پڑھ لی ہے۔ زیادہ سوالات کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ تمہیں ہمارا آفس ٹائم آئیڈیہ دکھاتا ہے۔ کل سے آنا شروع کر دو۔“

درشہوار شکر بے کے الفاظ کہنے لگی کہ ایک خاتون چلتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور سارا کمرہ معطر ہو گیا۔ درشہوار نے اسے دیکھا اور اس کی نظر وہاں پلٹنا بھول گئی۔ اس کے سامنے ایک انتہائی اسماٹ خاتون

کھڑی تھی۔ سولہ سنگھار سے آراستہ، سیاہ جینز اور سرخ بلاؤز میں لمبوس، سر کے اکر پرنگے ہوئے سرخ بالوں کی چھتری سی بنی ہوئی تھی، کانوں میں بالشت بھر لیے آدیزے۔ قصہ مختصر وہ کا شاہکار تھی اور بالکل ایکٹریس لگ رہی تھی۔ اس نے درشہوار کو نظر انداز کرتے ہوئے ہاتھ میں پکڑے کاغذات کی طرف باس کی توجہ دلاتے ہوئے کہا۔

”سرا! یہ دیکھ لیجیے، آپ کی مرضی کے مطابق کر دیا۔“ سر، یعنی فرید کمال نے سرسری انداز سے کاغذوں کو دیکھا اور بولے۔

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔“ پھر انہوں نے آنے والی خاتون کا درشہوار سے تعارف کرایا۔ ”یہ ہماری نئی اسٹنٹ سیکریٹری ہیں درشہوار۔۔۔۔۔“ وہ رے ”اودیس شہوار، یہ ہیں میری پی ایس مس نعمانہ قیصر۔“ یہ کہہ کر وہ گویا اپنے فرض سے عہدہ برآ ہو کر پھر سے کاغذات پر جھک گئے۔

نعمانہ نے شہوار کو بغور دیکھا اور دلی زبان سے ”گلیڈ ٹو میٹ یو“ کہہ کر کاغذات سنبھالنے لگی۔ شہوار نے بھی ”سیم ہیئر“ کہہ کر گویا قرض اتار دیا اور اپنے ٹائپ رائٹر کی طرف متوجہ ہو گئی۔

دفتر میں اس کا یہ پہلا دن تھا جو خاصا خوشگوار اور اطمینان بخش تھا سوائے مس نعمانہ کے جو اسے بالکل پسند نہیں آئی تھی۔ اس کے اپنے خیالات کے مطابق وہ آفس سے زیادہ کسی اسٹوڈیو کے لیے مناسب تھی۔ بہر حال اس نے اپنے ذہن سے نکال دیا۔ یہ شکر ہے اس کا کمر انہی الگ تھا جب کہ درشہوار باس کے طویل و عریض کمرے ہی کے ایک کونے میں فٹ ہو گئی تھی۔

فرید کمال کو بھی یہ سادہ سی، تین اور پڑواں اسٹنٹ پسند آئی تھی۔

درشہوار نے تفصیلاً اپنے پہلے دن کا تجربہ امی کے گوش گزار کیا اور آخر میں سادگی سے بولی۔ ”مجھے اس آفس کا ماحول پسند آیا ہے۔ میرے لیے دعا کریں کہ اچھی طرح اسے فراغت مل سکے۔“

”مجھے یقین ہے کہ تم اپنی نئی ذمے داریوں سے



بخوبی عہدہ برآ ہو سکی۔“ اس کی امی نے مچا اعتاد لہجے میں کہا۔ ”مجھے تمہاری صلاحیتوں اور اللہ کی رحمت پر بھروسہ ہے۔“

اور یوں زندگی کا یہ نیا دور اسے ساتھ لیے چلنے لگا۔ وہ نہایت محنت اور دیانتداری سے کام کرتی تھی۔ آفس میں آنے کے بعد جو فائلوں اور ٹائپ رائٹر یا کمپیوٹر پر سر جھکا کر تو اس وقت سر اٹھاتی جب آفس سے جانے کا وقت ہو جاتا۔ خرید کال سے بات چیت نہایت مختصر اور ٹو وی پوائنٹ ہوتی تھی۔ وہ خود بھی کم گو تھے اور کام میں مصروف رہتے۔ نعمانہ اکثر آتی۔ بھی کبھی اس کے ہمراہ فائلوں کا پلندا اٹھائے ایک خوش رو نو جوان بھی ہوتا۔ یہ اس کا اسٹنٹ ایجنٹ تھا جس کے متعلق شہوار کو بعد میں پتا چلا کہ نعمانہ کی ہی سفارش پر اسے رکھا گیا تھا۔ وہ خاموشی سے اپنا کام کرتا رہتا۔ صرف نعمانہ خود انہی تھی جو اپنے قہقروں اور باتوں سے ماحول کو تازہ بندھ رہی تھی۔

چند ماہ گزر گئے۔ در شہوار اپنی جاب سے پوری طرح مطمئن تھی۔ شاندار آفس، معقول تنخواہ، مراعات اور باس کا حسن سلوک۔ یہ سب باتیں ایسی تھیں جن کی وجہ سے وہ آہستہ آہستہ اپنے کام اور ذمے داریوں میں کھتی جا رہی تھی۔ وہ خوب دل لگا کر کام کرتی، جواب میں اسے ایک حوصلہ افزا مسکراہٹ ملی باس کی طرف سے اور صرف یہ ایک تبسم اس کے لیے دنیا کی تمام نعمتوں سے زیادہ تھا۔

نعمانہ بیگم نے ملازمت چھوڑ دی اور اب پوری طرح گھر اور بیٹی میں کھو گئی تھیں۔ وہ بڑی کفایت شعاری سے کام لیتے ہوئے اخراجات کم کر کے بینک میں روپیہ جمع کرتی جا رہی تھیں۔ اپنے شوہر کی یاد میں جو رہتے ہوئے بھی وہ بیٹی کے مستقبل سے غافل نہ تھیں۔ خاندان والوں سے ان کے تعلقات ضرور تھے لیکن سرسری سے۔ وہ اپنی مشکلات اور مصائب کے متعلق کسی سے کچھ کہنے کی قائل نہ تھیں۔ اپنی ذمے داریوں کا بوجھ تنہا وہ اپنے نازک کندھوں پر اٹھائے ہوئے تھیں۔

☆☆☆

نعمانہ بہت کم در شہوار سے بات کرتی۔ یہ باتیں

اکثر طنز و تحقارت میں گنڈھی ہوتیں۔ وہ اس کے لباس کا مذاق اڑاتی اور خود سے نیا لباس جو فیشن کے مطابق ہوتا زیب تن کرتی۔ اس غم میں پوشاک میں لہرائی، مل کھاتی وہ ادھر سے ادھر آتی جاتی۔ اس کی زیادہ تر توجہ اپنے باس پر مرکوز رہتی۔ ان کے سامنے بیٹھ کر اپنی دونوں کہلیاں میز پر سے بالش کیے ناخن والے ہاتھ اٹھا کر باتیں کرتی رہتی۔ لطفی سناٹی۔ اسٹیکس اکثر وہی لاتی جو باس اور خود کے لیے مخصوص ہوتا۔ بھی بھول کر بھی اس نے در شہوار سے صلاح نہیں کی تھی۔ نعمانہ کا حکم آفس کے اندر باہر چلتا تھا اور اسے اپنی اہمیت کا بخوبی احساس تھا۔ در شہوار اس کی خواہ خواہ کی حاکمیت کو پسند نہیں کرتی تھی مگر خاموش رہتی۔ ایک روز وہ معمول سے زیادہ در آفس میں مسکین رہی۔ اس کی مسلسل باتیں جو انہی انگلیں میں ہوتیں، قہقروں جو بلند بانگ تھے فضا میں گونجنے رہے۔ خرید کمال کی دھیمی اور بھاری آواز کبھی کبھی سنا کی دیتی ورنہ وہ صرف سننے پر قناعت کرتے۔ نعمانہ جب واپس تشریف لے گئی تو باس نے دور کونے میں کمپیوٹر میں مصروف اپنی میز پر بیٹھی در شہوار کی طرف نظر اٹھا لی اور پوچھا۔

”اس شور وغل میں تم کام کیسے کر لیتی ہو؟“ در شہوار نے حیرت سے سر اٹھایا۔ انہوں نے بھی آفس کے کام کے سوا اس سے ذاتی سوال نہ کیا تھا۔

”جی.....؟“ اس نے آنکھیں جھپک کر پوچھا۔ ”میں یہ کہہ رہا تھا کہ اتنی باتوں اور بلند آواز پر قہقروں کے درمیان ذہنی یکسوئی ذرا کم ہی حاصل ہوتی ہے۔“ ان کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ در شہوار نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”سر..... گزشتہ چند ماہ میں، میں ان چیزوں کی عادی ہو گئی ہوں۔“

”خوب.....“ تبسم ابھی موجود تھا اور وہ اسے دیکھ رہے تھے۔ ”حالات کے مطابق خود کو ڈھال لینا بہت بڑی بات ہے۔“ انہوں نے کہا۔ در شہوار کو یوں لگا جیسے مارے خوشی کے اس کا دل پھٹ جائے گا۔ یہ الفاظ



تھے شہد کی بوندیں تھیں جو اس کے کانوں میں ٹپک گئیں۔  
 چوہوں کا انبار تھا جو اس کے اوپر آن گرا اور اسے اپنی  
 ٹپک سے معطر کر گیا۔ اس کا دل سر پٹ دوڑنے والے  
 گھوڑے کی طرح بے قابو ہو رہا تھا۔ چہرے پر سرخی کی  
 تپش تھی اور ہاتھوں میں بے ساختہ سی لرزش۔ اس کا پورا  
 بدن سرشاری کی کیفیت میں تھا۔

”اور خاص طور پر جب ماحول کی نفاست اور  
 خوبصورتی ان آن واٹھ باتوں سے بری طرح دشمنی ہو  
 رہی ہو۔“ ذرا نمبر کر باس نے کہا۔

در شہوار نے ایک مرتبہ پھر چونک کر باس کو دیکھا۔  
 یہ کیسا لہجہ تھا؟ یہ کیسے نامانوس سے الفاظ تھے جو پہلے کبھی  
 ادا نہ ہوئے تھے؟ خیر کی شدت اس کے حواس پر غالب  
 آ رہی تھی۔

”تم کبھی آفس سے فارغ ہو کر تفریح بھی کرتی  
 ہو؟ میرا مطلب ہے سیر وغیرہ؟“ آج غالباً باس کا لہجہ  
 اس لیے قدرے مختلف تھا کہ وہ ان باتوں کا بوجھ ذہن پر  
 سے اتارنا چاہتے ہیں جو شاید انہیں پسند نہیں  
 در شہوار نے سوچا اور حوصلہ بحال کر کے یولی۔

”جی سر..... یہ جو قریب ہی پارک ہے کبھی کبھی  
 وہاں چلی جاتی ہوں۔“

”وہ پارک تھوڑا ہے جنگل ہے پورا۔“ فرید کمال  
 نے قدرے بے تکلفی سے کہا۔ ”اس میں درختوں اور  
 جھاڑیوں کی بھرمار ہے۔ پھول کم ہیں درخت زیادہ۔“

”جی..... اور پرندے بھی ہیں۔“ در شہوار نے  
 دہلی آواز میں کہا۔ اتنے میں پیون کا غذاٹ کا پلندا لے  
 کر آ گیا اور گفتگو کا یہ جاں فرسا سلسلہ ختم ہو گیا۔ در شہوار  
 پھر اپنے کام پر جھک گئی، دل کی دھڑکنوں میں اک نئی  
 لہریں۔

اس مٹھے مٹھے لہجے سے

ہوئی ہے دل داری سی

دیکھ دل دروازے پر

بن گئی اک سرشاری سی

دل آگن میں برے موتی

کھل گئی اک پھلوا ری سی

لہجے کی پروائی سے  
 جھٹکی ہے ہریالی سی  
 جگنو جگنو لہجوں کے  
 جگ آٹھی دیوالی سی

تیمچہ دن اور سرک گئے۔ وہ اب آفس جانے کی  
 شدت سے منتظر رہتی، کیوں؟ یہ اسے خود بھی معلوم نہ  
 تھا۔ آفس کی مصروفیات، اشتغال سب ویسے ہی تھے پھر  
 فرق کہاں تھا۔ نعمانہ اپنے ہوشربا انداز سے سارے  
 ماحول کو مٹھی میں لیے تھی۔ اس کا اسٹنٹ امجد برابر اس  
 کا ہاتھ بٹاتا اور دوڑ دوڑ کے کام کرتا۔

”تمہیں معلوم ہے نعمانہ قیصر بھی خاتون کو یہاں  
 کیوں رکھا گیا ہے؟ حالانکہ میں اس قسم کی آزاد روی کو  
 پسند نہیں کرتا۔“ ایک دن فرید کمال نے پھر در شہوار کو  
 مخاطب کیا اور اس کا سارا جسم کان بن کر سننے لگا۔

”اس لیے کہ ان محترمہ کی پی آرز بردست ہے۔“  
 انہوں نے خود ہی جواب دیا۔

”میرے اس کاروبار میں جتنے لوگوں سے کام  
 پڑتا رہتا ہے ان سب سے اس کی واقفیت ہی نہیں اس  
 سے زیادہ کچھ ہے اور بزنس میں ایسے لوگ اہم ہوتے  
 ہیں۔“ انہوں نے بات ختم کر کے اپنی ساحر آنکھوں  
 سے اسے دیکھا اور کاغذوں پر جھک گئے۔ ایک اطمینان  
 سا شہوار کے دل میں اتر گیا۔ وہ نعمانہ کی باتوں کی  
 کرچیوں پر چلنے کو مجبور تھی لیکن ان چند جملوں سے جھین  
 کم ہو گئی۔ وہ کچھ دیر سکون کے جھونکے کا مزہ لیتی رہی۔

گزشتہ مہینوں میں کئی دفعہ نعمانہ اور فرید ہوٹلز میں  
 گئے لیکن نعمانہ اسے کبھی ہمراہ نہ لے گئی۔ لے جانا تو ایک  
 طرف رہا وہ اس سے صلاح بھی نہ کرتی تھی۔ شہوار خود کو نظر  
 انداز کیے جانے پر رنجیدہ تو ہوتی مگر خاموش رہتی۔

نعمانہ کی حکومت ہر طرف تھی۔ اس ویک اینڈ پر بی سی  
 میں ایک زبردست محفل کا انعقاد تھا۔ بیچ کمال گروپ کا  
 اجتماع اور اس کے بعد شاندار ڈنر۔ نعمانہ کا ہوش اڑا  
 دینے والا لباس اور بہترین میک اپ ایسا تھا کہ اس کی  
 طرف سے نظر نہیں ہٹتی تھی۔ جاتے ہوئے خلاف معمول  
 فرید کمال اپنے پروتار انداز اور متوازن چال سے چلتے



اس کو نے میں آئے جہاں شہوار اپنے کام میں منہمک تھی۔ ان کے قریب آنے پر وہ کھڑی ہو گئی۔ شاید کوئی ضروری کام ہو..... وہ منتظر رہی۔

”چلو..... تم بھی ہمارے ساتھ۔“ وہ نرم دہمی آواز شہوار کی طرح برسی۔

”جی.....؟“ شہوار کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ ”میں.....؟“ اس نے اپنی طرف اشارہ کیا اور بے اختیار اس کی نظر اپنے ہلکے کاسی لباس کی طرف لگی۔ فرید اسے غور سے سرتا دیکھتے ہوئے بولے۔

”یہ لباس بالکل ٹھیک ہے۔ ڈھول کی بے ہنگم آواز میں جلتی رنگ کی مترنم نیلیاں بھی ہونی چاہئیں۔“ وہ مسکرا کر نغمہ انداز کی طرف مڑے۔ ”کیا خیال ہے نغمہ انداز کی آواز میں خفیف سا محکم تھا۔

”جیسے آپ کی مرضی۔“ وہ اٹھلائی۔ لباس کا احترام لازمی تھا۔

اور امید و بیم کے درمیان جھولتی شہوار بھی اس لمبی چوڑی کار میں پیچھے جی پی سی جانے کو تیار کھڑی تھی۔

وہ بی سی کی شاندار عمارت کے سامنے رکے۔ اور ققموں سے جھللاتی لفٹ میں داخل ہو گئے۔ ہوٹل کا ڈیکور اس قدر دلکش تھا کہ شہوار مہو بہو رہ گئی۔ وہ پہلے کبھی اس ہوٹل میں نہیں آئی تھی۔ جمجموں کی طرح جھلکے بلورین فانوس، جگمگا تا ماحول، بھینٹیں کرسیاں، دبیز قالین، ادھر ادھر سالیوں کی طرح پھرتے باوردی بیرے۔

شفیع کمال گروپ کے سبھی افراد موجود تھے۔ نغمہ انداز جس میں کرسب سے مل رہی تھی۔ شہوار کی نگاہیں اس پر جمی تھیں۔ اس کے کانوں میں لگتے ہوئے بالشت بھر گئے آوازے اس کے عریاں شانوں پر جموم رہے تھے۔ لباس کا ہر رنگ سرخ گلوں کا گلوبند جھلک کر رہا تھا۔ لباس پر نکلے ستارے اس کی ہر حرکت پر چمک جاتے۔ شوخ قمری لب اسٹاک اور ویسی ہی نیل پائش سے سجی انگلیاں مسلسل حرکت میں تھیں۔ بار بار قہقہوں سے سفید دانت زیادہ جھلکا نظر آتے۔ ایک کلائی میں اس نے مٹوئی کی لڑیوں سے مزین بریسلٹ پہن رکھی

تھی۔ جسم پر لگایا ہوا عطر دھو میں مچا رہا تھا۔ شہوار نے بھی کئی کئی نغمہ انداز کیوں نہیں بنی۔

گروپ کے سب عہدیدار فرید کمال سے گھر کر رہے تھے جو برنس کی کاسیائی کو ظاہر کرتی تھیں۔

سچ میں نغمہ انداز کے قہقہے بھی گونج اٹھتے۔ کاسیائی اور فرید سے اس کا چہرہ کھنکھاتا رہا تھا۔ شہوار قدرے سانس سارے مناظر دیکھ رہی تھی۔ اس کا تعلق خوشحال گھرانے سے ضرور تھا مگر ایلٹ کلاس سے نہیں۔ اب جو اس ماحول کی گہرائی میں جھانکا تو کچھ اچھا نہ لگا۔ یہ ضرورت سے زیادہ بے باکی، عریانی اور مدح و عورت کا اختلاط اسے پسند نہ آیا۔ وہ اپنی فطرت کی سادگی اور حیاداری میں گہری رہتی اور اسی میں ملن رہتی تھی۔ وہ فطرتاً کم گوئی اور اس عادت سے مطمئن تھی۔

محفل اپنے عروج پر تھی۔ بیش قیمت سوٹوں، ٹائیوں اور جواہرات جڑی انگوٹھیاں پہنے، بھاری تن تو ش والے کاروباری لوگ برنس مارکیٹ اور ایشیائی اتار چڑھاؤ کی باتیں کر رہے تھے۔ یہ ایک شاندار اجتماع تھا جس میں ہر وضع کے لوگ تھے۔ محبت میں جڑی روشنیاں کمرے کو منور کر رہی تھیں۔ بڑے بڑے برقی فانوس روشن تھے۔ ہوٹل کا شاندار ڈیکور آنکھوں پر چندھیا گئے دیتا تھا۔ ایک طرف اپنے ساز و سامان سےیت ہوٹل کا موسیقار بیٹھا حاضرین کی فرمائش پر دلوانے لگے ستارہ تھا۔ اب ڈنکا وقت ہو چکا تھا۔ سب معز مہمان ایوان طعام میں چلے گئے۔ ایک بے حد طومبیز کے گرد بھینٹیں کرسیوں پر سب لوگ فروکش ہو گئے۔ بیرے کھانا لالا کر رکھ رہے تھے۔ اشتہار انگیز خوشبود سے کمرہ مہکتے لگا۔ میز پر جگہ جگہ بلورین گلدانوں سے بڑی نفاست سے پھول سجے تھے۔ باتوں کا سلسلہ جاری تھا اور کام و دہن کی خدمت بھی۔ سیٹھ الیاس جن کی فیکٹری بھی اپنی پلیٹ میں بیانی ڈالنے ہوئے بولے۔ ”بھئی فرید، داد دیتا ہوں تمہارے ذوق کی زبردست دشمن بنوا لی ہیں، واہ.....! خوشبو سے آگیا۔“

”تو بس پھر خوشبو سے ہی پیٹ بھرا لو۔“ فرید

والی کرسی پر بیٹھ کر فیکٹری والے میاں سعید نے کہا۔ اس سب میں ہنس پڑے۔ مردانہ قہقہوں میں نغمہ انداز کی سرکشی بھی سب سے نمایاں تھی۔ وہ ایک خوبصورت ڈیکوریشن میں کی طرح سب کی نگاہوں کا مرکز تھی۔ شرابیات کی فیکٹری کے مالک خلیل شیخ اس سے کچھ اداہ میں متاثر نظر آ رہے تھے۔

”اے جہاد، اس بیچنے نے تو معجزہ کر دکھایا۔“ اسپورٹس کے سامان والے سیٹھ ایاز نے فرید کو مخاطب کیا۔

”جھینکس.....!“ متین لہجے میں جواب ملا۔ ”ایاز بھائی جانتے نہیں، برنس میٹھیٹ ہیں۔“ ایک اور صاحب بولے۔ ”شفیع کمال گروپ کو انہوں نے اوج کمال تک پہنچایا۔“

”واہ واہ..... کیا شاعری ہے، کمال اور اوج کمال۔“ شیخ خلیل نے داودی اور شامی کباب شوربے میں ڈبو کر کھانے لگے۔ سیٹھ ایاز مرغی سے نہرو آڑا تھے۔ فرید نے نظر اٹھا کر شہوار کو دیکھا وہ سر جھکا کر پلیٹ میں رکھی تھیں اور مائیز سلا دوکانے سے اٹھا کر منہ میں ڈال رہی تھی۔ دونوں اشیاء کی مقدار کم تھی۔ فرید نے چائیز رائی کی ڈش اس کے قریب سرکا دی۔ شہوار نے چونک کر دیکھا۔

”لے لیجیے، تکلف نہ کریں۔“ وہ آہستہ سے بولے۔ شہوار کا چہرہ گلابی ہو گیا۔

”وہ ہم سے ہوئے ہم مقام اللہ اللہ.....“ یہ مصرع نہ جانے کیوں اس کے ذہن میں آ گیا۔ اس نے تھوڑے سے چاول اپنی پلیٹ میں لے کر ایک منظر نگاہ فرید پر ڈالی۔ ان کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ اس چھوٹی معمولی سی حرکت سے زندگی جیسے سر میں آئی۔ آس پاس کی ہر جاندار اور بے جان چیز گنگناٹے لگی۔ دل کی ہر زکرن میں یہ کیسی دلوانا لگی تھی۔ ہوٹل کی ساری خوبصورتی، موسیقار کی دھنیں، ہشتے بولتے لوگ اچانک اچھے لگنے لگے۔ رات گئے تک یہ محفل جاری رہی۔ اس کے بعد سب اپنے اپنے گھر روانہ ہوئے۔ فرید کمال، نغمہ انداز اور شہوار اکٹھے نکلے۔ راستے میں انہوں

نے شہوار کو اس کے گھر اتار دیا۔ کار فرید کمال، نغمہ انداز اور ڈرائیور کو لے کر فریڈ نے بھرتی غائب ہو گئی۔

یہ پہلا موقع تھا کہ آس کی مصروفیات کے اندر رونقیں بھی شامل ہو گئیں تھیں اور شہوار ان کی وجہ سے دیر میں آئی تھی۔ امی اس کے انتظار میں بھل رہی تھیں۔ پریشانی ان کے چہرے سے ظاہر تھی۔ شہوار دوڑ کر ان سے لپٹ گئی اور فٹنشن کا حال کہہ سنایا۔ وہ اپنی ماں کے گرد بازو لپیٹے انہیں لیے اندر آگئی اور پوری تفصیل سے انہیں ساری باتیں کہہ سنائیں۔ شہینہ بیگم غور سے سن رہی تھیں۔ اب ان کے چہرے پر سکون اور اطمینان کے ساتھ خفیف سا تسک بھی تھا۔

”گو کیا تم اس فٹنشن سے خوب لطف اندوز ہوئیں۔“ انہوں نے بیٹی کے سر پر ہاتھ بھرتے ہوئے کہا۔

”جی امی..... کالج کے چھوٹے موٹے فٹنشنز کی عادی تھی۔ اب یہ بڑی گید رنگ بھی دیکھی، اچھا تجربہ تھا۔“ شہوار کا لہجہ خوشگوار تھا۔ اس نے تقریب کی ایک تفصیل، ہوٹل کی زیب و زینت وہاں کا شاندار ماحول، موسیقی سب کہہ سنائی۔

”چلو ہمارا بیٹا خوش ہو گیا اور یہ بہت بڑی بات ہے۔“ شہینہ بیگم نے محبت سے کہا۔

”امی.....“ شہوار نے قدرے جھجک کر کہا۔ ”سب سے بڑی بات تو مجھے اس تقریب کی یہ لگی کہ اس میں ہر طرف عام نظر آنے والی ونگرینی نہ تھی۔“ اس نے متانت سے بات پوری کی۔ شہینہ بیگم کے چہرے کا سکون گہرا ہو گیا۔ طمانیت سے انہوں نے ایک طویل سانس لی اور بولی۔

”واہی یہ بات انتہائی قابل قدر ہے اور یہی کھٹک میرے دل میں تھی۔“

”ہوئی تو نہیں چاہیے۔ اس لیے کہ فرید کمال یعنی باس خود بڑی اچھی منچر کے مالک ہیں۔“ شہوار نے کہا۔ ”میرا مطلب ہے ایسی باتوں کو پسند نہیں کرتے اور ایک خاص حد میں رہتے ہیں۔ نغمہ انداز کے متعلق میں نے آپ کو بتایا تھا۔ وہ کافی اداہ و انس ہے لیکن یہ اس کی حرکتوں کو



پسند نہیں کرتے۔ صرف کاروباری ضرورت کے تحت اس کو رکھا ہے، جیسے شین کا کوئی پرزہ ہو۔“ شہینہ بیگم اسے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ رات زیادہ ہو چکی تھی۔ وہ سونے کے لیے کمرے میں چلی گئیں۔

شہینہ بیگم کو بیٹی کے مستقبل کی پریشانی بھی تھی۔ انہوں نے کسی مقولہ رشتے کے لیے اپنی کئی دوستوں کو کہہ رکھا تھا مگر شاید حالات کی طرف سے بندش تھی۔ کام بین نہ پارہا تھا۔ رشتے بھی برسات کی بجلی چارپائی کی طرح ہوتے ہیں۔ ایک پائے کو سیدھا کر دو تو دوسرا اٹھ جاتا ہے، یہی لڑکا اچھے عہدے پر فائز ملا تو انتہائی کم رو۔۔۔ خاندان بھی موچی۔ اور اگر خاندان اور صورت اچھی ہو تو لڑکا برس روز گار نہیں۔ غرض کوئی نہ کوئی کی رہ جاتی تھی اور شہینہ بیگم ابتدائی بے صبری کے بعد اب کچھ کچھ صبر کی عادی ہو چکی تھیں۔

ادھر آفس میں نعمان کی حاکمیت اعلیٰ ویسے ہی چل رہی تھی۔ سارے عملے کو اس نے اپنی نگہیں شخصیت سے مشغی میں لے رکھا تھا۔ شہوار کو کئی دفعہ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نظر آتی لیکن وہ اندازہ نہ لگا سکتی کہ یہ چمک کس وجہ سے تھی۔۔۔ عیاری، مکاری، سازش، لالچ یا کسی اور خطرناک وجہ سے۔ اگر وہ اس بزنس گروپ کی چیئر مین ہوتی تو یقیناً اس کا ٹوٹس لیتی لیکن وہ بے اختیار تھی۔ بے بسی سے صورت حال کو دیکھتی اور خاموش ہو رہتی۔ نعمان کی اس سے چمک بھی جاری تھی۔ ایک سرد جنگ جس کا اور کسی کو علم نہ تھا۔ وہ کچھ اس انداز سے شہوار پر فخر کرتی جو صرف اسی کو چھپتے اور کسی کو پتا نہ چلتا۔ دراصل وہ اپنے بے تحاشا میک اپ، زیورات اور شوخ لمبوسات سے بچی خوبصورتی کے باوجود شہوار کے بہوت کردینے والے ملکوتی حسن سے خائف رہتی تھی۔ وہ فرید کمال کو صرف اپنے قابو میں رکھنا چاہتی تھی۔ کسی اور کا عمل دخل اسے منظور نہ تھا۔ حالانکہ اس سلسلے میں شہوار بالکل بے ضرر تھی۔ وہ محض اپنے کام سے کام رہتی۔ اس کی دلکش شخصیت کسی اور پر کس طریقے سے اثر انداز ہو رہی ہے اسے کچھ معلوم نہ تھا۔ جب کہ نعمان اپنی ذکاوت جس سے بہت کچھ جان چکی تھی

اور اس کے مداوے کی ترکیبیں آزمایں تھی۔ شہوار کی طرف اٹھنے والی فرید کمال کی ہر نظر ایک خاموش پیغام ہوتا تھا جسے نعمانہ بخوبی سمجھتی تھی۔ اپنے کام میں مگن، اپنے خیالات میں گم شہوار کچھ اس منزل پر نہ پہنچ پائی تھی۔ البتہ اپنے محسوسات کا بخوبی علم تھا۔ ان بلند یوں پر چڑھتی ہوئی وہ کئی بار ان تک آن پہنچی تھی۔ اسے سوچ کر وہ کانپ جاتی اس کا انجام کیا ہو گا۔ نعمانہ کا حسن اور ادا میں تو کسی پتھر کو کچلا دینے پر قادر تھیں اور ادھر اس کے پاس کیا قدر خاموش احساسات، پندار میں لپٹا الفت، جس میں اظہار تھا نہ نعمانہ کی سی بے باکی۔ وہ اپنی اس ستارہ اپنے وجود میں چھپائے تھی۔۔۔ اور غنچے کو جب تک کیا جائے اس کی خوشبو کہاں پھلتی ہے۔

ان کے جملے اچھے چمکتے چمکتے تھے۔ مگر وہ سب سے نفعی مہر بلب ہیں وہ سارے جذبے وجود خالی ایار جیسا سدا کھلائے تھے جس نے گلشن مہک رہا ہے جو پھول بن کر میرا تصور وہ میرا گل بدن وہ بارغ جیسا وہ بارغ جیسا ہزار باتیں نہ جن کی تھر تھر نہ جن کے معنی نہ جن کی توجہ ضرور تھا کہ تمہیں سنائیں مگر ہے مشکل کہاں سے لائیں وہ نطق ایسا بلاش ایسا عملے کے ارکان سے وقتاً فوقتاً جو باتیں وہ سنتی اس سے فرید کمال کے متعلق اسے پتا چل گیا تھا کہ اپنی والدہ اور بیوہ بین کے ساتھ رہتے ہیں، والدہ جانتیں خاندان کے لوگوں سے ان کا کچھ زیادہ رشتہ نہیں۔ ان کی عادات و خصائل کو وہ خود دیکھ اور سمجھتی تھی۔ قدرتی بات ہے جس سے تعلق خاطر ہو اس باتوں اور عمل سے دلچسپی خود بخود بڑھ جاتی ہے۔ خیالات سے بے خبر مگر اپنے محسوسات کا ادراک

تھی۔ یہ حالات کی عجب ستم ظریفی تھی۔ اس روز وہ جب آفس سے واپس اپنے گھر کی تو دو اجنبی خواتین اس کی اگے کے پاس سے اٹھ کر جا رہی تھیں۔ جب وہ باہر چلی گئی تو شہوار نے سرسری سا پوچھا۔

”ایم یہ کون ہیں؟“

”پہلے انہیں سمجھی نہیں تھیں۔“ وہ مجھ سے سوئٹر کا نمونہ لینے آئی تھیں۔ کسی محل میں مجھے پہننے دیکھا تھا پچھلے سال۔“ انہوں نے سوچ کر جواب دیا۔

”اچھا کچھ کھانے کو بیجیے، بہت بھوک لگی ہے۔“ شہوار نے پرس اور کچھ فائلیں صوفے پر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”آج تو کرائی میں آئی؟“

”وہ کہیں شادی پر گئی ہے۔“ شہینہ بیگم کچن میں جاتے ہوئے بولیں۔ شہوار نزدیک والے بڑے صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔

”یہ لو اپنی پسندیدہ چیز۔“ شہینہ بیگم نے میز پر ٹرے رکھتے ہوئے کہا۔ ”آج میں نے تمہارے لیے تیار کیا۔“

”ارے امی زندہ باد۔“ شہوار نے اچھل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ پوریاں کھاتے ہوئے وہ ان کی تعریف کرتی رہی پھر بولی۔ ”امی جیسا آپ کے ہاتھ میں ذائقہ ہے میرے ہاتھ میں کیوں نہیں؟“

”اس لیے کہ بارہا جیز بنانے سے ٹریننگ مل جاتی ہے اور ہاتھ میں خود بخود ذائقہ آ جاتا ہے۔“ شہینہ بیگم نے محبت سے کہا۔ ”پرکیش کسی بھی ہنر کی تکمیل کے لیے ضروری ہوتی ہے۔“

”ہوں، ہوں۔“ شہوار بھرے منہ سے بولی۔

”پھر کے کھانے کے بعد وہ آرام کے لیے لیٹ گئی۔ زندگی خوبصورت تھی مگر کہیں اس میں کئی تھی۔ شہوار اپنی زندگی میں سوچتی رہی اور پھر سوئی۔



فرید کمال کو فیکٹری وراثت میں ملی تھی جسے اپنی گن اور محنت سے انہوں نے ترقی کے اس مقام پر پہنچا دیا تھا

کہ ان کی فیکٹری کے فرنیچر کی دور دور تک مائیک تھی۔ ان کی فیکٹری میں بننے والی آرائشی اشیاء اپنی خوبصورتی، پائیداری اور نفاست میں بے مثال ہوتی تھیں۔ خوش قسمتی سے انہیں عملہ بھی نہایت دیانتدار اور فرض شناس ملا تھا۔ لہذا کاروبار میں ترقی لازمی تھی۔ اپنی فیکٹری سے ان کی اس محنت اور لگن میں اب ایک نیا اور نوکساخار پیدا ہو گیا تھا۔ ایک نئے جذبے نے دل کے اندر سر ابھار کر انہیں اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ ان کی پوری ہنسی سرشاری ہو گئی تھی۔ زندگی میں ایک درہائی، حسن اور مہک سی آگئی تھی۔ شاید اسی کو محبت کہتے ہیں۔۔۔ وہ سوچتے۔

موسم بدلنے لگا تھا۔ گرمیوں نے سردیوں کو جگہ دے دی تھی۔ رات کو سیاہ آسمان پر سنہرا چاند ملکا تو دن کو گلاب کی کیاریوں میں نومبر کے خوشنما پھول چھوٹے نظر آتے۔ ہواؤں میں خنکی اور مہک دونوں ہوتیں۔ سبزیوں سے بھرے کھیت آنکھوں کو بھلے لگتے۔ پتروں پر لیموں اور ہرے مالے نظر آنے لگے تھے۔ صبح کے وقت سنہری دھوپ کی ہلکی سی حرارت جسموں کو گرما دیتی۔ باغوں میں مقامی پرندوں کی چپک چپک کے ساتھ سرد ممالک سے ہجرت کر کے آنے والے مائی گریٹر برڈز کی سیٹیاں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔ بڑے عرصے کے بعد شہوار اپنے پسندیدہ بارغ میں پہنچی۔ آفس میں آج کسی وجہ سے جلدی چھٹی ہو گئی تھی۔ اس نے بیچ پر بیٹھ کر اپنا بیگ کندھے سے اتارا۔ اس میں ننھا سا رنگارنگ تھا جس میں وقتاً فوقتاً بھری جانے والی پرندوں کی آوازیں تھیں۔ اس نے اسے آن کر دیا بارغ سرلی سیٹوں اور مترنم چپکاروں سے گونج رہا تھا۔ پرندے ادھر سے ادھر اڑا میں بھرتے پھر رہے تھے۔ شہوار انہیں دیکھتی سے دیکھنے لگی۔ سرخ، سبز، سلینی، زرد، سفید غرض ہر رنگ کے پرندے تھے۔ وہ ان میں جو کسی کو اچانک پتیلی کے گھنے جھاڑ کے پیچھے سے اسے انسانی آواز سنائی دی۔ وہ چونک پڑی۔ اس آواز کو وہ اچھی طرح پہچانتی تھی۔ یہ نعمانہ تھی۔ وہ کسی سے گفتگو کر رہی تھی۔ آواز اتنی صاف تھی کہ شہوار کو بخوبی سنائی دے رہی تھی۔ اس نے غور



# بیرون ملک مقیم تارکین

جاسوسی سسٹم سپنس پاکستانیہ

سرگزشت اور کش

## مسالانہ خریدار

بن کر بذریعہ رجسٹرڈ انٹرنیٹ

اپنا پسندیدہ ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کریں

ذاک خراج میں 100% اضافے کی وجہ سے غیر ممالک کے لئے ذرا مسالانہ کی شرح مندرجہ ذیل ہوگی

ایشیا یورپ اور افریقہ کے لئے ڈائجسٹ

مسالانہ ذاک خراج تقریباً 3080/- روپے  
12 شماروں کی قیمت 420/- روپے

ذرا مسالانہ 3500/- روپے

امریکا آسٹریلیا کینیڈا اور نیوزی لینڈ کے لئے ڈائجسٹ

مسالانہ ذاک خراج تقریباً 4080/- روپے  
12 شماروں کی قیمت 420/- روپے

ذرا مسالانہ 4500/- روپے

اپنے ڈرافٹ اور منی آرڈر ادارے کے نام، ذیل میں درج ہے۔  
پتہ پر ارسال کریں۔ یہ کہانی میں قاتل اور ایٹمی ہونا ضروری نہیں۔  
سیردان شہر اور ایٹمی کی صورت میں کوہ پتر چار پتر اور بینک کی بیش 500 روپے سیردان ملک اور بینک والے ڈرافٹ وغیرہ پلاس بدیش 1500 روپے کا اضافہ کر لیں۔

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C PHASE II EXTENSION,  
D.H.A., MAIN KORANGI ROAD,  
KARACHI 75500  
PHONES: (92) (21) 5802552,  
5804200 FAX: 5802551.  
E-MAIL: jdpgroup@hotmail.com

کرنے کے لیے یہ جگہ آئیڈیل تھی۔ یہ نہیں معلوم کر قدرت نے ایک خطرناک سازش کو بھی اس کی حرکت سے فاش کرنے کا ذریعہ بنا دیا تھا۔ دونوں کی آوازیں نہیں آ رہی تھیں۔ شاید چلنے کی اپنی طرف سے انہوں نے ایک نہایت پوشیدہ کی بھی گھر.....

تدبیر کند بندہ، تقدیر کند خندہ! شہوار نے بے خیالی سے ریکارڈ رات کیا۔ بیک میں رکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا پرس بھی اس میں تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ پرندوں کی چپک چپک کے ساتھ ہی غالباً نغمات اور امجد کی باہمی گفتگو بھی ریکارڈ ہو چکی ہے۔ اب وہ جلد سے جلد گھر پہنچ کر اس شپ کو چاہتی تھی۔

گھر پہنچ کر اس نے کھانا کھایا۔ امی سے دن حال پوچھا۔ ان کی اپنی طبیعت دریافت کی اور اس کے انتظار میں رہی کہ کب وہ دوپہر کے کھانے کے آرام کی غرض سے اپنے کمرے میں جاتی ہیں۔ آخر باتیں کرنے کے بعد وہ اٹھیں اور اپنے کمرے میں چنگ پر لیٹ گئیں۔ تھوڑی دیر بعد انہیں نیند آگئی۔ نے دبے پاؤں جا کر ان کے کمرے میں جھانکا۔ خبر سوری تھیں۔ شہوار نے اپنے بیڈروم آ کر دروازہ کر کے اس کی چٹنی چڑھائی۔ میز پر پڑے بیک میں ریکارڈ رکالا اور چنگ پر بیٹھ کر اسے آن کر دیا۔ والیہ رکھی تاکہ آواز باہر نہ جاسکے۔

شپ میں سے پہلے تو چند منٹ پرندوں کی اور سریلی جھکار سنا لی گئی رہی پھر یکھت نغمات کی۔ ابھری..... شہوار پوری یکسوئی اور غور سے سنتی تھی۔ ایک لفظ صاف سنا لی دے رہا تھا۔ اس کے بعد امجد کی آواز سنا لی دی۔ ان کی مکمل گفتگو کو شہوار نے ریکارڈنگ میں کوئی کمی یا خامی نہ تھی۔ اس نے اپنے کی سانس لے کر ریکارڈ آف کر دیا اور خود سوچنے لگی۔

یہ دوائے افراد کی ہمید بھری گفتگو تھی جو اپنے کے خلاف ایک خطرناک سازش تیار کر رہے تھے۔

سے سنا شروع کیا۔  
”میں پوری محنت کر رہی ہوں۔“ نغمات کی آواز ابھری۔ ”نیت ہمیشہ کا پتا بڑی مشکل سے چلا۔ چھ کروڑ ہیں۔ تم ہمارے سائن کی نقل کہاں تک پرکھت ہو سکتی؟“  
”انتہا آسان نہیں ہے یہ کام۔“ دوسری آواز امجد کی تھی۔ جسے شہوار نے بدقت سے ہی پہچان لیا۔ وہ بول رہا تھا۔ ”محنت کے اچھے اچھے ہوئے سے سائن ہیں کہ بس کچھ پوچھو نہیں۔ میں نے ایک ماہر ترین آدمی سے رابطہ کر رکھا ہے جو دستخطوں کی نقل کرنے میں استاد ہے۔ اس نے آج تک جتنے بھی سائن کی نقل کی انہیں کوئی پہچان نہیں سکا لیکن اس دفعہ وہ بے چارہ بھی چکرا گیا ہے، خبر نہیں کس قسم کے سائن ہیں تمہارے پاس کے“ قابو میں ہی نہیں آ رہے۔

”میرا پاس..... اور تمہارا نہیں؟ تم بھی تو اسی کے آفس میں کام کرتے ہو؟“ نغمات نے کہا۔ ”اسی پلان کو مکمل کرنے کے لیے تو میں تمہیں یہاں لائی تھی۔ شکر ہے خریدنے مان لیا۔“ وہ ہنسی۔

”ہاں..... چنانچہ اس فنیک کے کب گلو خلاصی ہوگی۔“ امجد کی آواز آئی۔ ”اور ہم آرام سے کب اپنی دنیا بسائیں گے۔“ سچ تھی! میں تو انتظار کرتے کرتے تھک گیا۔

”تھوڑا صبر کرو۔ اس کا پھل بھی تو میٹھا ہے اور کتنا میٹھا! چھ کروڑ۔ مالی گاڈ! بس امجد تھوڑی دیر اور منزل دور نہیں۔“ نغمات نے نشہ بار لہجے میں کہا۔

”خدا کرے ہم دونوں کی محنت بار آور ہو اور ہم.....“ امجد کی آواز دونوں کے دھیمے قہقہوں میں مکمل مل گئی۔ ”پھر خرید کمال فیکٹری کا سارا اثاثہ ہمارا ہوگا، اور شہوار جیسے نیند سے جاگ اٹھی۔ گو میں بڑا ریکارڈ رچل رہا تھا اور پرندوں کی آوازوں کے ساتھ نہایت صفائی سے نغمات اور امجد کی باہمی گفتگو بھی ریکارڈ ہو چکی تھی وہ فہمیدی بیٹھی رہی۔ اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ وہ مکمل طور پر درختوں اور جھاڑیوں میں چھپی ہوئی تھی۔ اس نے تو یہ جگہ اس لیے ڈھونڈی تھی کہ اس کج میں پرندے کثرت سے تھے اور ان کی آوازیں ریکارڈ



کو کس زبان میں سمجھاؤں کہ مجھے وہ زبان ہی نہیں آتی۔  
شاعر نہیں ہوں کہ کہہ سکوں۔

میرے خوابوں کے بھر دوں کو بجانے والی  
ترے خوابوں میں کہیں میرا گزر رہے کہ نہیں  
پوچھ کر اپنی نگاہوں سے بتا دے مجھ کو  
میری راتوں کے مقدر میں سحر ہے کہ نہیں  
کہیں ایسا نہ ہو پاؤں مرے ٹھہرا جائیں  
اور تری مرمر میں بانہوں کا سہارا نہ ملے  
اشک بہتے رہیں خاموش سیاہ راتوں میں  
اور تیرے ریشی آجکل کا کنارہ نہ ملے  
پیار پر بس تو نہیں ہے میرا لیکن پھر بھی.....

اور یونہی دیکھتے دیکھتے چاند ڈوب گیا۔ فرید اپنے  
کمرے میں آگئے۔ سوچے اور کروش بدلتے رہے۔  
آخر انہیں نیند آگئی۔ ایک ڈسٹر بڈ نیند۔

اگلے روز جب وہ آفس پہنچے تو شہوار پاس آ کر  
خاموشی سے کھڑی ہو گئی۔ اس کے ہاتھ میں بیگ تھا۔  
فرید کمال نے نگاہ اٹھائی۔

”کوئی کام؟“ نرم لہجے میں انہوں نے پوچھا۔  
”جی سر..... لیکن میں..... میں اس کے لیے تہائی  
چاہتی ہوں۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔ آنکھیں بھی  
ہوئی تھیں۔ فرید کمال حیران رہ گئے۔ تہائی! کتنا رنجش  
ساقط تھا۔ وہ کیا کہنا چاہتی ہے آخر؟ انہوں نے سوچا  
اور بولے۔

”ٹھیک ہے۔“ اور انہوں نے اٹھ کر دونوں باہر  
کھلنے والے دروازوں کی چٹخیاں چڑھا دیں۔ وہاں آ  
کر اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ ”اس کرسی پر بیٹھ  
جاؤ اور جو بات کہنا چاہتی ہو کہو۔“ وہ میز پر کہیاں ٹیک  
کر آئے ہو بیٹھے۔

شہوار نے بیگ کھول کر اس میں سے ریکارڈز نکالا  
اور آہستہ سے آن کر دیا۔ پرندوں کی آوازیں سن کر فرید  
متحیر تھے کہ اچانک نعمانہ اور پھر امجد کی آوازیں آنے  
لگیں۔ در شہوار کی نگاہیں ان کے چہرے پر جمی تھیں  
جہاں باری باری شدید حیرت، غصہ، نفرت اور اشتعال  
کے رنگ ظاہر ہو رہے تھے۔ شہوار کا دل انہی کے ساتھ

دھڑک رہا تھا۔ ان کی سوچ اس کی سوچ بن چکی  
ٹھپ ٹھپ ہو گیا۔ انہوں نے اسے آف کیا اور اٹھ کر  
ہوئے۔ انہوں نے اپنی سیاہ آنکھوں سے  
دیکھا۔ ان کے ہنسنے ہوئے لب کھلے اور ان سے  
نکلے۔

”تم نے اتنا بڑا احسان مجھ پر کیا ہے کہ  
پاس شکر ہے کے لیے الفاظ نہیں۔“ انہوں نے ایک  
سانس لی۔ ”تم نے میری عزت، مقام، اگاؤ سب  
بچا دیا ورنہ میں اس سازش سے بے خبر رہ کر سب  
بیٹھتا..... اچھا اب اجازت۔ مجھے اس سلسلے میں  
ضروری اور فوری اقدامات کرنے ہیں  
خدا حافظ۔“ یہ کہہ کر وہ مڑے شہوار بھی اٹھ کھڑی  
اور دے لفظوں میں بولی۔

”اللہ آپ کو ہر نقصان سے بچائے۔“ انہوں نے  
ایک فکڑنگاہ اس پر ڈالی اور باہر نکل گئے۔ ”خدا آپ  
حفظ و امان میں رکھے۔ میرے ہم، میرے آقا  
حافظ۔“ بے صدا دعا اس کے دل سے نکلی اور وہ  
ان کے پیچھے بند ہوتے دروازے کو دیکھتی رہی۔  
کمال نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ یہ آوازیں اس  
کب اور کیسے ٹھپ کیں۔

اگلے روز اسے فون پر آفس بلا کر انہوں نے  
ساری داستان کی اور پھر دس بارہ روز تک ایک سونوار  
چکراتے رہے۔ عدالت، ماہرین سے مشورے،  
اٹاؤں کی دوسری جگہ منتقلی۔ ان دنوں آفس جگہ  
تمام عمل کو بشمول در شہوار ٹاپ کے خطوط لے کر  
سخت ضروری کام کے تحت آفس کو دوہنے کے لیے  
کیے جانے کی اطلاع تھی۔ شہید بیگم کے استفسار پر  
نے سادگی سے خط کے مندرجات بتا دیے۔ اصلیت  
بتا سکی۔ جھج مانع آگئی۔

ان چند دنوں میں وہ جیسے انتظار کی صلیب  
رہی۔ آخر اخبارات کے ذریعے اسے پتا چلا کہ  
امجد کو حراست میں لے لیا گیا ہے۔ امجد نے بیان  
”ہم دونوں (یعنی نعمانہ اور وہ) کافی عرصے سے  
کمال کے پیچھے ہیں، بلکہ ہم نے ان کے ہاں

بھی اسی لیے کی تھی۔ نعمانہ میری معیت پر ہے۔ ہمیں پیسے کی  
ضرورت تھی اس مقصد کے لیے فرید کمال کو تاکا۔ ان  
کے اٹاؤں کا پتا لگایا۔ اس کی مالیت معلوم ہوئی تو جن  
پیسوں میں ان کا اکاؤنٹ تھا ان کا کھون لگایا۔ اب ان  
سے جعلی دستخطوں کی مہم میں مصروف تھے کہ پکڑ لیے  
جائیں۔

امجد کے بیان اور ان دنوں کی ریکارڈنگ کو  
 واضح ثبوت پیش ہو جانے پر دونوں کو چھ ماہ قید اور  
جرمانے کی سزا ہو گئی اس فیصلے کے بعد سارے عمل نے  
سکھ کا سانس لیا۔ مجرم ان کے حسب مشا کیفر کردار کو پہنچ  
چکے تھے۔ سب کی ہمدردیاں اور وفاداریاں عمل طور پر  
فرید کمال کے ساتھ رہیں۔ کیونکہ وہ ایک بے حد اچھے  
پے ماسٹر اور اپنے تمام عمل کی ضرورتوں کا خیال رکھنے  
والے تھے۔ ان سے کسی کو کوئی شکایت نہ تھی لہذا سارے  
لوگ انہیں مبارکباد دینے آئے اور خدا کا شکر ادا کرتے  
رہے کہ انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اس خوشی میں فرید  
کمال نے انہیں بوس دیا۔ آفس اب مکمل چکا تھا، اس کی  
یونٹیں بحال اور کام کی مصروفیات پھر سے شروع ہو گئی  
تھیں۔ سب اپنے اپنے کام میں مگن ہو گئے۔

☆☆☆

”مجھے وہ جگہ دکھاؤ جہاں سے تم نے آوازیں  
ریکارڈ کیں۔“ ایک روز فرید کمال نے شہوار سے کہا۔ وہ  
فوراً اپنا پرس سنہال کر کھڑی ہو گئی۔ وہ خوش تھی کہ اس  
کے آقا کو کوئی گزند نہیں پہنچا۔ اس سلسلے میں خود اس کا کیا  
دول تھا اس کے متعلق اس نے کبھی نہ سوچا تھا۔ دونوں  
باہر کھڑی کار میں آن بیٹھے۔ راستے میں بائیں بھی ہوئی  
رہیں جو شہوار کے کہنے کے متعلق تھیں۔ آخر کار پارک  
آ گیا۔ دونوں اتر آئے۔ شہوار نے انہیں گائیڈ کیا اور  
اس جگہ تک لے آئی جہاں سے اس نے ریکارڈنگ کی  
تھی۔

”اچھا تو یہ مورچہ تھا جہاں سے تم نے میری  
حفاظت کے سامان مہیا کیے۔“ فرید مسکرا کر بولے۔  
شہوار کے ہونٹوں پر تبسم تھا مگر وہ خاموش رہی۔ اس نے  
جماڑیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

## نیا سال مبارک

مہینوں کی پرانی شال اوڑھے  
جھیل کے پرانے کنارے پر کھڑا  
سیٹی بجاکر  
چاند کو نیچے بلارہا ہے  
جنوری کے بدن پر  
ماچی شہنائیاں پیٹ کر رہی تھیں  
اور نیچے  
پہاڑی گاؤں میں  
نئے برس کا جشن تھا

شاعر: ابرار عمر

مرسلہ: نزہت جبین فیاض، کراچی

”اور یہاں وہ دونوں اپنی طرف سے روپوش  
بیٹھے تھے مگر ان کی آوازیں ہوا کے دوش پر تیری جھٹک  
پہنچ گئیں“ فرید کمال نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ بیچ پر  
ممکن تھے۔ یکا یک انہوں نے سر اٹھایا، بالوں کی ایک  
سیاہ لٹ ان کے ماتھے پر آن گری تھی۔ دوسرا چہرے  
شہوار کے چہرے کو اپنے حصار میں لیے تھیں۔ اپنی  
بھاری آواز میں انہوں نے کہا۔

”جانتی ہو شہوار اس سارے سلسلے میں تم میرے  
لیے کیا بن چکی ہو؟ تم جو ازل دن سے میرے دل میں  
آن اتری تھیں۔ میرے ہونٹ نہ جانے کیوں نہ مکمل  
سکے۔ میں کچھ نہ کہہ سکا کہ تم میری زندگی ہو..... میری  
تمام آرزوؤں کا واحد مرکز۔ شہوار..... تمہارے لیے  
واسن پھیلانا چاہتا ہوں۔ تمہیں مانگنے کے لیے تمہاری  
امی سے ملنا چاہتا ہوں، ہے اجازت؟“ شہوار کا گلابی  
چہرہ جھک گیا۔ اس نے آہستہ سے سر ہلا دیا اثبات  
میں۔

دیکھا ایک خواب تو یہ سلسلے ہوئے  
دور تک نگاہ میں ہیں مکمل کھلے ہوئے

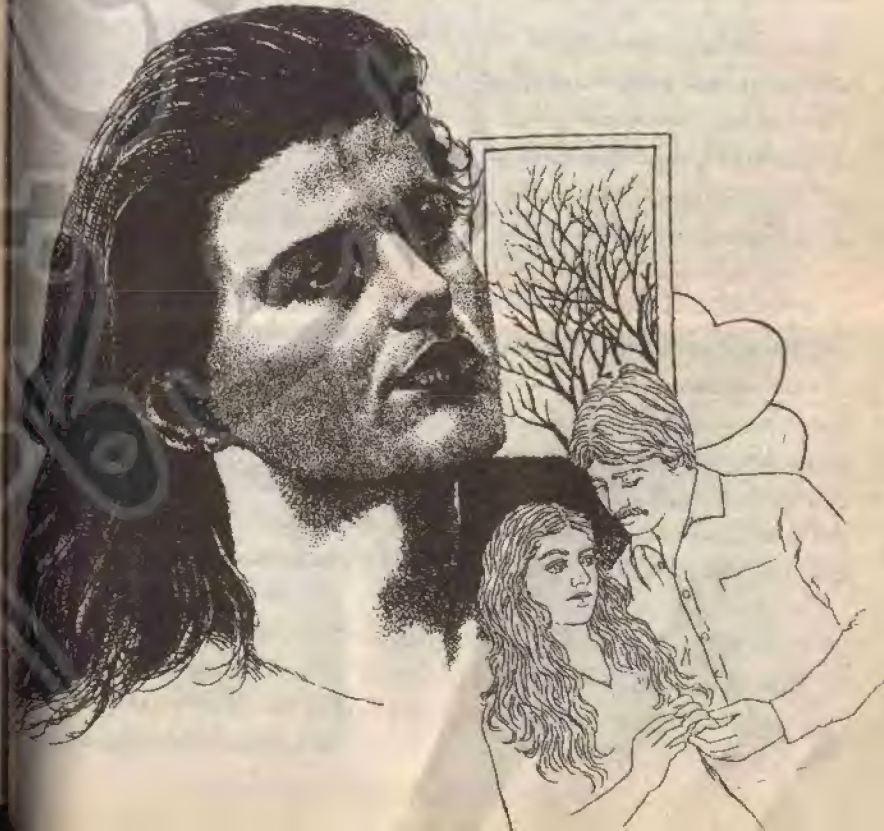




دستکاری اسکول میں بھی وہ سب سے پہلے اسکول پہنچتی تھی، دو کمروں اور ایک برآمدے پر مشتمل اس اسکول کی صفائی ستھرائی اسی کے ذمے تھی۔ دونوں کمروں کا فرش پکا تھا مگر برآمدے کا فرش پکا تھا اور

## خواب آنکھیں خواتش چہرہ

سائبرہ عارف





آنے سے قبل وہ اسکول کو صاف ستھرا کر دیتی تھی۔ یہاں ایک ماسی عنایت بی بی بھی تھی جو لڑکیوں کو بازار سے سوئی، دھواگاہنگی، فریم اور دیگر اشیاء لے کر دیتی تھی، پہلے یہ صفائی ستھرائی اسی کے ذمے تھی مگر اب وہ مزے سے بیٹھی رہتی تھی یا بازار کا بہانہ کر کے صبح صبح غائب ہو جاتی تھی اور جب شینہ سارا کام نہ نکالتی تھی تو آ جاتی تھی۔ اور اب یہاں رخسانہ باجی کے گھر بھی اسی طرح کی روٹیں تھیں۔ ان کا گھر بہت بڑا تھا، بارگھر کے اندر ہی ایک کمرے میں بنایا گیا تھا۔ اسے تو گھر کے کاموں سے فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ وہ پارلر میں جھانک بھی سکے۔ کبھی جو پارلر میں آ بھی جاتی تھی تو دوبارہ گھر کے کسی کام سے بلا لیا جاتا تھا۔ صفائی، برتن دھونا، کپڑے دھونا، کھانا بنانا، وہ قلم نام ملازمہ تھی۔

شروع شروع میں تو اسے سمجھ ہی نہیں آئی کہ یہ کیا ہو رہا ہے وہ پارلر میں کام کیسے آتی ہے یا گھر کا کام کرنے، وہ ہر طرح الجھتی تھی بلکہ الجھادی کی تھی۔ ہر کام محنت سے کرتا، بہتر سے بہتر کرتا اس کی عادت تھی اور اسی عادت کا فیضان تھا کہ رخسانہ باجی کا گھر دنوں میں ہی چمکنے لگا تھا۔ ہر کام وقت پر ہو رہا تھا اور بہت ہی اچھے طریقے سے ہو رہا تھا۔ وہ تو گویا سکھ میں آ گئی تھیں۔ پچھلے چھ ماہ میں سچے سے زیادہ کام والیاں تبدیل کر چکی تھیں، کسی کو بیسوں پر اعتراض تھا تو کسی کو کام کی زیادتی پر کچھ صرف برتن دھونے پر رضامند ہوتی تھیں تو کچھ بچن کے کام پر ہی مان رہی تھیں۔ باقی کاموں کے لیے الگ مایاں رکھنا بھی آسان نہ تھا اور رخسانہ باجی جیسی کبوتر عورت کے لیے پیسہ سب سے بڑی پرواہ ہو رہا ہے۔

اور اب..... مفت کی یہ ملازمہ، بے زبان گائے، جس کی دھکتی رنگ پر انگلیاں جمائے رخسانہ باجی اسے اپنی مرضی سے چلا رہی تھیں۔ ان کی زندگی اتنے سکون میں پہلے بھی نہیں تھی نہ پیسے کی فکر نہ خواہ کارولا..... نہ چوری چکاری کا خوف..... شینہ کا ایک نظر میں انہوں نے پرکھ لیا تھا کہ وہ ہاتھ چالاک جانتی ہے نہ زبان چلانا اسے آتی ہے اور جہاں یہ دونوں ہتھیار کندھیں تو پھر

مقابل کی جیت یقینی کیوں نہیں ہوگی۔ اس سے صرف رخسانہ باجی ہی نہیں بلکہ سبھی گھر والے بہت مطمئن اور خوش تھے۔ اسے پریشان اور شکر کر کے، اس کی آنکھوں کی الجھن اور چہرے کی پریشانی پر نہ مانتے اور دیکھنے کی کسی کو بھی فرصت بھی نہ ضرورت۔ وہ جلدی جلدی سارا کام بننا کر پارلر آئی کہ کچھ کچھ نادیدہ آتی ہے کیسے گی مگر یہاں اسے دیکھتے ہی وہ آؤر دے لگتی تھیں۔

”شینہ ذرا جلدی سے فرش سے یہ سارے بال تو اکٹھے کر دو۔“

”ہاتھ روم میں دیکس کی بنیاں پڑی ہیں وہ دھولو جلدی سے۔“ وہ فرش صاف کر کے فارغ ہوئی تو دوسرا حکم ملتا تب وہ حسرت سے کام کرنی لڑکیوں کو دیکھتی۔ کتنی تیزی سے رخسانہ پلمنگ کر رہی ہے، فائزہ پارلر میک اپ میں مصروف ہے، شاز یہ ایک لڑکی کو مہندی لگا رہی ہے اور وہ..... ہاتھ روم کی صفائی کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، یہاں کے حالات تو سلائی اسکول سے بھی بدتر تھے۔ وہاں علی الصبح صفائی کے بعد بھلے وہ تمام دن تپائی ہی کرتی تھی مگر ساتھ ساتھ کڑھائی، سلائی کے مطلق نمونے بھی تو دیکھتی رہتی تھی، معلومات ہی حاصل ہو جاتی تھیں مگر یہاں تو وہ ایک ملازمہ محض ملازمہ ہی بن کر رہ گئی تھی۔ اسے تو اب تک شیشے کے سامنے کھڑے ہونے کا بھی موقع نہیں دیا گیا تھا۔ اس کی انگلیاں دھواگے سے انجان تھیں۔

”پتا نہیں سارے بے درد، بے رحم لوگ مجھے کیوں ملتے ہیں؟ میری مصیبت میں کمی کیوں نہیں ہو رہی؟ میری آزمائشیں کب ختم ہوگی؟“ اکثر بیشتر وہ یہ گلہ خدا سے ضرور کرتی تھی مگر اسے تو آج کل دھما دھما کر لڑنا پڑ رہا تھا گھر میں بھی سے یہ بات چھپانی پڑ رہی تھی اور یہاں کام کیسے کا کوئی چانس نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہی بات اسے بری طرح پریشان کر رہی تھی۔

اس روز نادیدہ آتی صبح کی صبح کسی کے گھر دلہن میک اپ کے لیے چلی گئی تھیں اور جب رخسانہ باجی اپنے دستکاری اسکول چلی گئیں تو اس نے جلدی جلدی سارا

کام ختم کیا اور پارلر میں آ گئی یہاں صرف رخسانہ بیٹھی ہوئی تھی اور کسی غلطی میگزین کی تصویریں دیکھنے میں مگن تھی۔

”ارے آپ اسکی بیٹھی ہوئی ہیں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا تو وہ چونکی۔

”ہاں، وہ دونوں لڑکیاں نادیدہ آتی کے ساتھ گئی ہوئی ہیں۔“ رخسانہ نے کہا۔

”اور کوئی کلائنٹ بھی نہیں آئی.....“ اس نے بغور تفصیل سے پارلر کا چاروں طرف سے جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ وہ دو ماہ میں آج پہلی بار پارلر میں اتنی دیر تک اور اتنے آرام سے بیٹھی تھی۔ چاروں اطراف کچی ہوئی مختلف ماڈلز کی تصاویر، دلہنوں کے خوبصورت پوز، شیشے کی الماریوں میں بھی میک اپ کی خوبصورت اشیاء سب کچھ کتنا اترکینو تھا۔ گھومنے والی اس کرسی پر بیٹھ کر دیوار گیر آئینے میں خود کو بنا سنورا دیکھنا کسی کی خواہش نہیں ہوئی۔ وہ رخسانہ کو حیرت سے دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی جو اپنے اسٹپس میں کئے بالوں میں برش کرنے کے بعد آئینے میں انہیں مختلف اشکال سے سنوار رہی تھی۔ اس کی بات پر مزکر اسے دیکھا۔

”یہ وقت خواتین کے گھر لوگ کام کاج کا ہوتا ہے۔ اس وقت تو پارلر پر کم ہی رش ہوتا ہے، صرف وہی لڑکیاں آتی ہیں جنہوں نے شادی یا کسی نکاح میں جانا ہوتا ہے یا جن کی اپنی شادی ہوتی ہے۔ صبح رش تو شام میں ہوتا ہے۔“ رخسانہ نے اس کی معلومات میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ بغور اسے دیکھا بھی تھا۔ ”کتنا عرصہ ہوا ہے تمہیں یہاں آئے؟“

”تقریباً دو ماہ ہونے والے ہیں۔“ ایک حسرت کی خود بخود دیکھ میں اتر آئی تھی۔

”اور ان دو ماہ میں تمہیں یہ بھی پتا نہیں چلا کہ پارلر پر کتنا رش کس وقت ہوتا ہے؟“ رخسانہ بولی۔

”مجھے کیسے پتا چلتا۔ میں یہاں رہوں تو پتا چلے نا۔ میں تو گھر میں کام کر رہی.....“ مایوسی اور افسردگی سے کہتے کہتے یکدم ٹھک کر خاموش ہوئی تھی۔ اسے رخسانہ سے یہ سب نہیں کہنا چاہیے۔ رخسانہ، نادیدہ کے

پارلر میں کام کرنے والی لڑکیوں سے سب سے سبتر تھی بلکہ نادیدہ جب کسی کے گھر پر دلہن میک اپ کے لیے جاتی تھی تو اپنے پیچھے پارلر رخسانہ کے حوالے ہی کر جاتی تھی۔ اس طرح وہ اس کی دست راست تھی اور وہ بے وقوف اسی سے نادیدہ کی بات کرنے لگی تھی۔

”کیا ہوا؟ تم ڈر کیوں گئی ہو.....؟ ڈر موت، بے فکر رہو میں تمہاری بات راز رکھوں گی۔“ رخسانہ نے کہا۔

”نہیں..... نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ اس کے حوصلہ دلانے کے باوجود وہ سنبھل گئی تھی۔

”تم بہت بے وقوف ہو، معصوم، سادہ، زمانہ کی چالاکیاں اور عیاریوں سے انجان اور تم جیسی بدھوی رخسانہ نیکم کا شکار ہوتی ہیں۔ میں تمہارے بارے میں سب جانتی ہوں، اس روز جب پہلی بار رخسانہ باجی تمہیں لے کر یہاں پارلر آئی تھیں اور جو کچھ ہم نے ان سے کہا تھا اور انہوں نے تم سے وہ سب میں سن رہی تھی مگر تب مجھے یہ انداز نہیں تھا کہ تم اس قدر بے وقوف ہو گی کہ اتنے دنوں میں اپنے ساتھ ہونے والی واردات کو پہچان ہی نہیں پاؤ گی..... بہت خوش فہم لڑکی ہو تم۔“

رخسانہ کی بات پر وہ منہ کھولے حتیٰ حد دیکھ رہی تھی۔

”یہ رخسانہ باجی کا گھر ہے اور ان کی بیٹی نادیدہ کا پارلر اگر تم یہ سوچ کر یہاں آئی ہو کہ چند ماہ میں ماہر بیویشن بن کر اپنا پارلر کھول لو گی تو تمہاری بہت بڑی خوش بھی بلکہ غلط فہمی ہے۔ بغیر فیس کے یہاں کچھ نہیں سکھایا جاتا ہے اور تم جیسی مفت کی نوکرائی کو بھلا یہ سب سکھا کر اپنے پیروں پر کھڑا ماریں گی رخسانہ باجی۔“

رخسانہ کی بے رحم اور اندر تک چر دینے والی باتوں پر اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آ گئے تھے۔

”دیکھو، میرا مقصد تمہارا دل دکھانا نہیں ہے، میں تو تمہیں سمجھانا چاہتی ہوں، حقیقت ہے باخبر رکھنا چاہتی ہوں، مجھے دلی دکھ ہوتا ہے تم جیسی مصیبت زدہ اور حق لڑکی کا کیسے استعمال کر رہی ہے یہ عورت، میں بہت دنوں سے تمہیں یہ سب بتانا چاہتی تھی کیونکہ میں خود اس دور سے گزر چکی ہوں بلکہ یہاں آنے والی ہر کمزور،







اس سے کم وقت میں، میں ریحانہ جیسی مہارت حاصل کر سکتی ہوں، کوئی مجھے چانس تو دے۔“ اس نے آہ بھر کر اپنے ہاتھ پیچھے ہٹالیے، دائیں طرف والی ایروکمان کی صورت ہو گئی تھی اور اب بائیں طرف وہی عمل ہو رہا تھا۔

اس روز گھر واپسی پر وہ بہت ڈسٹرب تھی۔ بہت سی تکلیف دہ باتوں کا جاننا ہمارے لیے اذیت ناک ہونے کے ساتھ ساتھ ناپسندیدہ بھی ہوتا ہے، نہ جانے کیوں کہوت کی طرح آنکھیں بند کر لینے کو دل کرتا ہے مگر زندگی ایک لمحہ بھی نہ مل کر گزر جاتی اس طرح ایک طویل مسافت اور راہ کی آبلہ پانی..... کیا کرے، کیا نہ کرے۔ اس نے امی سے بات کی اور نتیجہ حسب توقع تھا۔

”پاگل ہوئی ہو کیا؟ اتنی دورا کیلے آ جانا آسان نہیں ہے اور جو کسی کو طم ہو گیا تو.....؟“

”تو.....! تو کیا ہوگا! کیا ہوگا۔ کچھ بھی نہیں ہوگا! آپ خوشخو اور تری ہیں میں، میں سلطان کو ساتھ لے کر چلی جا رہی ہوں گی مگر امی میں خود کو یہاں ضائع نہیں کروں گی۔ اللہ نے مہربانی کی، کرم کیا، ریحانہ کے دل میں جرم آ گیا، اس کی باتوں نے مجھے غصہ سکھادی، میں بے وقوف اسی آس میں بی رہی تھی کہ کل بہتر ہو جائے گا، کل نہیں تو پرسوں ضرور حالات بدل جائیں گے، کچھ دیر بعد، چند مہینوں بعد ضرور میں کام سکھ لوں گی لیکن یہ تو محض میری خوش فہمی تھی، مجھے تو اس مقدمہ کے لیے رکھا ہی نہیں گیا، میں جو کام کر رہی ہوں، وہی انہوں نے مجھ سے کروانا ہے امی اور میں..... میں مزید خود کو بے وقوف نہیں بننے دوں گی، مجھے کچھ کرنا ہے، کچھ غنا ہے۔“ وہ مضطرب تھی، بے انتہا پریشان اس کے اندر کچھ کرنے کا جذبہ اٹھنے کو تیار تھا۔ مجھ نے بغور نیٹی کو دیکھا۔ اس کا لہجہ اس تھا اور ضدی بھی کچھ کر گزرنے کا عزم لیے ہوئے اور اسی رنگ کو دیکھ کر وہ کچھ خوف زدہ سی ہو گئی تھیں۔

”یوں تھیلی پر مسروں نہ جاؤ شمنہ، کچھ پانے کے لیے بہت محنت کرنی پڑی ہے، وقت لگتا ہے اپنے آپ کو

منوانے میں، اس طرح جلد بازی، غصہ اور اشتعال تو بہت نقصان دہ ہے ہمارے لیے، ذرا آرام سے سوچو، سنبھل کر فیصلہ کرو۔ میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا، ہمارا آخری اور اکلوتا ٹھکانا ہے یہاں سے نکال دیا گیا، سڑک پر جا سنبھلیں گے پھر سارے کارنامے کرنا پورے۔“ ماں کی غلطی بھری ڈانٹ پر اس نے ہونٹ کاٹ کر سر جھکا لیا تھا، مجھ نے جو اسے یوں مایوسی سے منہ لٹکائے دیکھا تو دل کو کچھ ہوا۔

”میری معصوم بیٹی، اتنی سی عمر میں کیا، کیا سوچتی ہے کیا کیا کرنا چاہتی ہے۔ ہمارے لیے صرف ہمارے لیے، ہائے رہا یہ دن بھی دیکھنے تھے۔“ انہوں نے آہ بھر کر اپنے سانسے مل کے دوپٹے سے آنکھیں صاف کیں۔

”امی ایک بار..... صرف ایک بار مجھے جانے کی اجازت تو دیں، میں وہاں جا کر ستر رخصانہ سے ملتی ہوں اگر تو وہ بھی رخصانہ باجی جیسی ہوئیں واپس آ کر دوبارہ نہیں جاؤں گی اور اگر وہ مجلس اور چچی ہوئیں تو پھر میں وہاں جانا شروع کر دوں گی۔ دور ہے تو کیا ہوا..... نزدیک والے اگر بے کار ہیں تو پھر دور جانے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ میں نورین کے ساتھ چلی جا رہی کروں گی۔“ اس نے فیصلہ کر لیا تھا اور اب وہ ہر طرح کا رسک لینے پر تیار تھی۔

”میں کیا کہوں، مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہی ہے!“ مجھ ذاتی بری طرح پھنسی تھیں۔ یہ حالت ان کے لیے بھی بے حد تکلیف دہ تھی بہت عذاب سے گزر رہے تھے دن رات۔ وہ بھی اس جہنم سے چھٹکارا چاہتی تھیں یہاں دن رات کام کر کے بھی لعنت ملا، طعنہ اور بددعائیں، نفرت، ناپسندیدگی ملتی تھی جو بچوں کی محسوس سے بڑھ کر دل کو درد دیتی تھی، جسم و جان کو چور چور کر دیتی تھی، وہ تنہا نہیں تھیں، چار بچے بھی ساتھ تھے اور ان چاروں کو بھی یہی رویے اور لہجے خوفزدہ رکھتے تھے، دکھ دیتے تھے۔ بچوں کی کبھی ہوئی شکلیں اور سوکھے کمزور جسم نہ کھانے پینے کو مناسب ملتا تھا نہ پہننے کو ڈھنگ کا بڑھتی عمر تھی اور چاروں ہی بچے اپنی عمر سے بہت کمزور اور چھوٹے تھے۔ شمنہ بڑی تھی، سمجھ دار، با شعور س

سمجھتی تھی، دیکھتی تھی اور اماں سے احتجاج بھی کرتی تھی۔ اس کی اتنا مزید نفس مجروح ہو کر بلبلاتی تھی ایک آگ کی ہر دم بھڑکتی تھی اس کے اندر وہ اس ذلت بھری زندگی سے ٹکنا چاہتی تھی۔ وہ اپنی ماں کو یہاں سے نکالنا چاہتی تھی، اسے بہن بھائیوں کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتی تھی مگر حاکم، سچر بے کی ہر جگہ آڈے رہتی تھی۔ کم عمر تھی لوگوں کی پہچان اور پرکھ بھی نہیں تھی جو چار لفظ ہمدردی کے کہتا تھا اسی کو اتنا نجات دہندہ سمجھ لیتی تھی۔ رخصانہ باجی سے دھوکا کھایا، نادیہ آ پی پر یقین کر لیا، نادیہ سے دھوکا کھا کر اب ریحانہ کے کہنے پر مسز رحمان کو آزمائے چلی گئی۔

”آپ کیوں اتنی پریشان ہیں، فکر نہ کریں صرف دعا کریں مجھے آپ کی دعاؤں کی بہت ضرورت ہے، باقی ہمارا خدا ہمیں دیکھ رہا ہے سب دیکھ رہا ہے۔“ سچھی نہ بھی تو ہمارے حالات بھی بدلیں گے، ضرور بدلیں گے۔“ اس نے ماں کو اتنا الجھا ہوا پریشان دیکھا تو بے ساختہ ان کا ہاتھ تھام کر تسلی دیتے ہوئے کہنے لگی اور مجھ سے جو اپنے خدشات اور فکرات اس سے کہنے والی تھی اس کی بات سن کر یکدم خاموش ہو گئیں۔ اپنی بیٹی کی آنکھوں میں چلی امید کی کرن کو بھٹانائیں بہت تکلیف دہ لگا۔

”ٹھک ہے تم ایک بار جا کر ان سے مل لو، دیکھ لو پھر بات ہوگی۔“ اس وقت وہ اسے اسی طرح بہلا سکتی تھیں۔ مزید بحث مباحثہ مناسب نہیں تھا سو اجازت دے دی اور وہ اپنی امی کی بات سن کر کس قدر خوش ہو گئی۔ اس کے چہرے پر پھیلنے والی مسکراہٹ بہت عرصے بعد نچوڑ آئی تھی۔

”اللہ میری بیٹی کو کامیاب کرنا، اس کی مدد کرنا، اس کے ارادے بہت نیک ہیں اسے اس کے ارادوں میں کامیاب کرنا۔“ وہ بہت دیر تک اس کے لیے دعا مانگ رہی تھیں۔



اگلے روز اس نے جلدی جلدی دو پہر تک رخصانہ باجی کے گھر کا سارا کام ختم کیا اور نورین کو لے کر وہاں

سے نکل پڑی۔ نادیہ آ پی کو اس نے ضروری کام کا کہہ کر آدھی چھٹی ماگک لی تھی، نورین بھی پارہ بچے اسے بلانے پارا آگئی تھی۔

”امی نے تو کچھ نہیں کہا؟“ پارہ سے نکلے ہی اس نے سوال کیا۔

”نہیں..... باجی تو آج صبح صبح نما آ پی کے ساتھ بازار چلی گئی تھیں، صائمہ اپنے کمرے میں تھی انہیں تو پتا ہی نہیں کہ میں تمہارے پاس آئی ہوں، ویسے بھی امی کہہ رہی تھیں میں سنبھال لوں گی تم جاؤ۔“ نورین نے کہا۔

”دعا کرو نورین..... ہم جن سے ملنے جا رہے ہیں وہ بہت اچھے لوگ ہوں، ہمارے کام کے۔“ شمنہ بولی۔

”دعائیں تو بہت کرتی ہوں شمنہ آ پی میں..... آپ کی بہت اور کوشش کی کامیابی کے لیے، اب تو اس جہنم میں رہا بھی نہیں جاتا، مجھے تو لگتا ہے ایک دن ہم اسی تکلیف دہ زندگی گزارتے گزارتے مر جائیں گے۔“ نورین نے ایسے باپوس لہجے میں کہا تھا کہ وہ بے ساختہ ”اللہ نہ کرے“ کہہ اٹھی۔

”نہیں..... مایوسی اچھی نہیں ہوتی نورین، تم دیکھنا ایک دن ہم ضرور یہاں سے نکل کر اپنے گھر جائیں گے جہاں ہم بہت آرام سے، سکون سے اپنی مرضی سے زندگی گزاریں گے، تم دیکھنا وہ دن ضرور آئے گا۔ مجھے یقین ہے۔“ وہ بہت مطمئن اور پُر امید لہجے میں اسے تسلی دینے لگی اور انہی باتوں میں انہیں سفر ختم ہونے کا پتا بھی نہیں چلا۔

”مجھے تو یہی گھر لگتا ہے۔“ اس نے سیاہ گیٹ کے سامنے کھڑے ہو کر اس پر لگی نیم پلیٹ پڑھی اور پھر اپنی مٹھی میں دبے کارڈ کو بغور پڑھا۔

”نہی ہے.....“ اس کی آواز میں جوش اور کپکپاہٹ ابھر آئی تھی اس کا دل یکدم بہت تیزی سے دھڑکنے لگا تھا اس نے بغور گھر کا بیرونی جائزہ لیا۔ سفید ماربل کی یہ خاصی بڑی کوٹھی تھی گیٹ اور اس کی دیواروں پر تیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ باہر بیرونی دیوار کے ساتھ بھی



چھوٹی کیاری میں خوبصورت، خوشنما پھول لگے ہوئے تھے، اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے تیل بچائی نورین گیٹ کے قریب لگے بورڈ کو بغور پڑھ رہی تھی۔

”رابرٹ بیوٹی پارلر اینڈ ٹریٹمنٹ سینٹر.....“ وہ ابھی بدشکل یہی پڑھ پائی تھی کہ گیٹ کا چھوٹا دروازہ زوردار جھٹکے سے کھلا تھا۔

”جی فرمائیے.....“ آنے والی نورین لڑکی نے سر تاپا پا ان دونوں کو دیکھ کر پوچھا تھا۔ اس کے چلیے اور انداز سے لگتا تھا کہ وہ یہاں کی ملازم ہے۔

”وہ ہمیں مسز رحمان سے ملنا ہے۔“ اس نے مدعا بیان کیا تو اس لڑکی کے ماتھے پر ہل مسودا رہوئے۔

”باجی ہوراں ہے، کیا کام ہے؟“ وہ کئی نظروں سے ان کا جائزہ لے رہی تھی۔

”کام ہم انہیں ہی بتائیں گے، ہمیں ریحانہ نے بھیجا ہے تم جا کر انہیں بتا دو۔“ ثمینہ نے اعتماد سے مضبوط لہجے میں کہا۔ ریحانہ کے نام پر وہ چونکی تھی۔

اس کی تفتیش ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ ثمینہ نے جھلاہٹ سے اسے دیکھا۔

”میں ریحانہ کی دوست ہوں..... اب آنے دو گی یا نہیں.....؟“ اس نے غصے سے پوچھا۔

”نہ جی نہ..... میں ایسے مالکوں سے کچھ بغیر کسی اجنبی کو اندر نہیں آنے دیتی ہوں، آپ ادھر ہی انتظار کرو۔ میں باجی سے کچھ کے آتی ہوں۔ ریحانہ کی دوست.....“ آخری جملہ اس نے زیر لب کہتے ہوئے دوبارہ ان دونوں کو دیکھا اور گیٹ اندر سے بند کر کے چلی گئی۔

”آف خدایا..... یہ کیا پولیس والوں کی طرح سوال جواب کر رہی تھی؟“ نورین نے حیرانی سے کہا۔

”اور تفتیش بھی.....“ ثمینہ نے ہنس کر اس کا جملہ مکمل کیا۔

”اب یہ پتھر مدد پا پس آ جائے۔“ کچھ دیر بعد اس نے دعا کی اسے بہت بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔

رحمان کو نہیں بتایا۔“ نورین نے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”دوبارہ تیل دیں“ نورین نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”ضرور..... یہاں آ کر میں ان سے ملے بغیر نہیں جاؤں گی جو ہوتا ہے وہ تو بہت بعد کی بات ہے فی الحال تو ان سے ملنا ہی مشکل ہو رہا ہے۔“ ثمینہ نے بڑبڑاتے ہوئے کال تیل پر ہاتھ رکھا۔

”جی.....“ چند سیکنڈ بعد ہی دروازہ کھل گیا۔ آٹھ نو سال کا صحت مند کول منول بچہ، گورا چٹا منہ نکالے پوچھ رہا تھا۔

”بیٹا ہمیں مسز رحمان سے ملنا ہے۔“ اس نے مدعا بیان کیا۔

”دادو سے.....؟“ اس کے سوال پر وہ حیران ہوئی۔

”ہاں.....“ اس نے یونہی سر ہلادیا۔

”اندرا آ جائیں.....“ وہ پیچھے ہو کر انہیں اندر آنے کا راستہ دے رہا تھا اس نے بس راک پل سوچا پھر پالنگڈ خیر کرنا کہتی اندر داخل ہو گئی۔ سارا راستہ وہ آیت الکرسی، چاروں قل اور دردور شریف کا ورد بھی کرتی آتی تھی۔

”وہ کہاں ہیں.....؟“ بچہ بھاگنے کی تیاریوں میں تھا، اس نے جلد لیے پوچھا۔

”پارلر میں ہیں۔“ اس نے معصومیت سے آنکھیں منکائیں۔

”اور پارلر کدھر ہے؟“ اس کے علاوہ وہ یہ تمام سوالات کسی اور سے نہیں پوچھ سکتی تھی کدھر سے کوئی اور نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔

”ادھر ہے۔“ اس نے کمال مہربانی سے ہاتھ کے اشارے سے کہا اور بھاگ لیا، اس نے تھوڑا سا سبز کر دیکھا، تنگ سی بٹنی گلی یہاں موجود تھی۔

کرتلی ترکیا، نادیدہ پسینہ پونچھا، پارلر میں اسنے لوگوں کی موجودگی میں وہ کیسے مسز رحمان سے بات کرے گی۔ دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا، سارا اعتماد ختم ہو گیا تھا۔ نورین اسے جھادکھ کر اسے گھور رہی تھی۔

”لوہا آئی۔“ اس نے حیرت سے اسے ٹوکا۔

”پلو.....“ اس کے کہنے پر وہ چونکی پھر بے ساختہ ہی کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گئی لکھ بھر کو اندر موجود کئی لوگوں نے ان دونوں کو دیکھا تھا۔

”ہمیں.....“ مجھے مسز رحمان سے ملنا ہے۔“ اسے محسوس ہوا تھا کہ اس کے لہجے میں کپکپاہٹ آ گئی ہے۔

”باجی سے.....“ باجی اندر ہیں۔ کوئی کام ہے؟“ پارلر پر کام کرنے والی لڑکی نے نخوت سے انہیں دیکھ کر پوچھا تھا۔

”خدا یا پھر تفتیش.....“ اس نے چڑ کر سوچا۔

”جی، بہت ضروری ہے کام ہے۔“ اب کے اعتماد سے کہا تھا۔

”اندرا چلی جاؤ.....“ فیشل کرتے اس کے ہاتھ جتنی تیزی سے چل رہے تھے آنکھیں بھی اتنی تیزی سے حرکت کر رہی تھیں۔

”اندرا کہاں.....؟“ وہ پوچھنا چاہتی تھی مگر خاموشی سے پارلر کے اندرونی دروازے کو پار کر کے باہر آ گئی مگر..... باہر ایک اور کمر تھا بڑا سا ہال نما جس میں سرخ قالین بچھا ہوا تھا، ایک طرف خوبصورت آئینہ کا صوفہ لکھا تھا اور دوسری طرف فل سائز ڈریسنگ آئینہ تھا۔

قالین پر کٹن اور نیلے ترتیب سے رکھے تھے اس نے بل بھر میں گمرے کا جائزہ لیا۔ کمر اخالی تھا۔

”ہاں بیٹا، کیا بات ہے۔“ نرم، مہربان، سلجھا لہجہ ساتتوں سے ٹکرایا تو وہ یکدم چلی۔

”آپ..... آپ مسز رحمان ہیں.....؟“ اس نے اپنے گمان کو یقین میں بدلنے کے لیے پوچھا۔

آپ کے پاس بہت ضروری کام سے آئی ہوں۔“ اس نے ان کی منکراہٹ اور نرم لہجے سے خاصا حوصلہ پایا تھا۔

”ریحانہ..... اچھا، اچھا..... کیسی ہے وہ.....؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جی بالکل ٹھیک ہے۔“

”نیٹھو بیٹا، آرام سے بیٹھ کر بات کرو۔“ انہوں نے اسے کہا تو اسے احساس ہوا کہ وہ ابھی تک کمرے کے وسط میں ہی کھڑی ہے۔ جھجکتے ہوئے وہ آئرن کے صوفے پر ٹک گئی، مسز رحمان خود بھی اس کے قریب دوسرے سنگل صوفے پر بیٹھ گئیں۔

”ہاں، اب یو لور ریحانہ تمہاری کیا لگتی ہے؟“

”جی وہ..... وہ جس پارلر پر آج کل کام کر رہی ہیں وہاں میں بھی.....“ اس کے حلق میں لفظ پھنس سے گئے تھے۔

”اچھا اچھا..... ٹریٹنگ لے رہی ہو۔“ انہوں نے خود ہی اس کی ادھوری بات کمر مطلب نکالا۔

”جی مقصد تو یہی تھا مگر.....“ اس نے پل بھر کوسر جھکا کر سوچا پھر آہستہ آہستہ ساری بات انہیں بتا دی، اپنی ساری کہانی ان کے سامنے کھول دی، کئی بار اس کی آنکھوں میں آنسو آئے کئی بار پچھدا لگا کئی بار لفظ لوں سے نکل نہیں سکے، کئی بار چہرے کا رنگ بدلا مگر وہ کہانی جو اسے سنائی تھی سنا کر ہی دم لیا۔

”اوہ..... سچ..... بہت افسوس ہوا تمہاری بات سن کر، اللہ تعالیٰ رحم کرے، سب کے دکھ تکلیف دور کرے۔“ انہوں نے سن کر بہت افسوس اور دکھ سے کہا تھا۔

”آپ میری مدد کریں باجی..... خدا کے لیے آپ میری مدد کریں، میں ساری عمر آپ کی احسان مند رہوں گی۔ میں فیس نہیں دے سکتی ہوں مگر میں اس کا حق ضرور ادا کر دوں گی۔ میں آپ کا..... آپ کے گھر کا سارا کام کر دیا کر دوں گی، بس آپ مجھے کام سکھا دیں، مجھے اپنے گھر والوں کی زندگی کی خاطر کام سیکھنا ہے

باجی، میں.....“ اس سے بات مکمل نہیں ہو سکی تھی، وہ



ضبط کر رہی تھی مگر اب یکدم رو پڑی تھی۔

”ارے ارے..... اوہو بھی رونا تو بند کرو..... رو کیوں رہی ہو، میں نے انکار کیا ہے کیا؟“ ان کے چلنے نے اسے شکا دیا تھا، روتے روتے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

”یہ پانی لو..... خود کو سنبھالو پھر بات کرتے ہیں.....“ انہوں نے چھوٹی سی تپائی پر پھر پانی کا گلاس اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا تو اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے پکڑ لیا۔

”ہاں، اب بات کرو۔“ پانی پی کر اور چہرہ صاف کر کے وہ خاصی حد تک سنبھل گئی تھی۔

”بابی، میں بہت ضرورت مند ہوں میں کام سیکھنا چاہتی ہوں میں محنت سے نہیں گھبراتی ہوں مگر مجھے کوئی اب تک مجلس بندہ ہی نہیں ملا، میں نے آپ کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا ہے آپ بے شک ریحانہ سے پوچھ لیں۔“

”مجھے کسی تصدیق کی ضرورت نہیں ہے بیٹا، میری عمر اور میرا تجربہ اتنا ضرور ہے کہ جھوٹ، سچ کو پرکھ سکے، چہرے دیکھتے ہیں تمام عمر اور چہروں کو ہی پرکھتا ہے اور مجھے اپنی پرکھ پر بھی افسوس ہوا ہے نہ شرمندگی۔ سچ، جھوٹ تم جانے دو.....“ مختصر اور ضرورت مند ہو، حساس اور درمند دل بھی رکھتی ہو، کم عمر ہونے کے باوجود گھر والوں کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ ہے تم میں، تمہاری کہانی سن کر افسوس ہوا۔ بہر حال تم کل سے آ جاؤ۔“ سسر رحمان نے کہا۔

”جی.....!“ ان کے منہ سے آخری بات سن کر تو وہ حیرت سے بے ہوش ہونے والی تھی، اتنی آسانی سے مان گئیں ایک منٹ میں فیصلہ کر لیا۔ نہ احسانات کی فہرست گنوائی، نہ اسے زیر بار کیا، نہ کام کا لالچ نہ فیس کا خوف۔

”یقین کر لو بیٹا..... میں نے تمہاری باتوں سے اندازہ لگا لیا ہے کہ تم میں خودداری اور انسانیت ہے۔ میں تمہاری مدد کسی بھی اور طریقے سے کروں گی تو تمہیں قبول نہیں ہوگی اور یہی وہ پوائنٹ ہے جس نے تمہارے

حق میں مجھ سے فیصلہ کر دیا ہے۔ ایسی خودداری لڑکیاں مجھے بہت اچھی لگتی ہیں اور سختی بھی..... لہذا تمہیں کام دینا، اخلاقی جرم ہوگا، زیادتی ہوگی۔ میں خود کو کوئی بڑا بخی یا حاکم طائی تو نہیں سمجھتی ہوں مگر کوشش ضرور کروں ہوں کہ ضرورت مند مسائل کو خالی ہاتھ نہ لوٹاؤں۔

اللہ مجھے بہت دے اور استقامت دے۔“ اتنی جلدی اتنی انکساری، اور اتنا محبت بھرا عتراف، کس قدر بیکہ سیکھنے انداز میں اس کا حوصلہ بڑھاتا ہوئے اسے اعتماد دیا تھا کہ اس نے اپنا دل کھول کر ان کے سامنے رکھ دیا تھا۔ اس کی داستان بے شک بہت دکھ بھری تھی مگر کھوں کا ازالہ اور اشک ٹوٹی کا حوصلہ بھی تو کسی کسی میں ہوتا ہے۔ شہینہ، سسر رحمان کے پارلر سے نکلی تو ایک بالکل بدلی ہوئی شہینہ تھی۔ یہاں آتا ہے کار نہیں کیا تھا۔ سسر رحمان کی باتوں نے بہت حوصلہ دیا تھا امید بڑھاتی تھی وہ اپنے اسٹوڈیو میں بیٹھی اسے بہت ہی مہمان دوستی لگی تھیں۔ جن کی نرم اور محبت بھری باتوں نے اس کو حوصلہ دیا تھا۔ اسے اپنائیت کا احساس ہوا تھا۔ اس کی حوصلہ افزائی ہوئی تھی وہ اس کی مشکلات کو سمجھ گئی تھیں اور جلد از جلد اسے ٹرینڈ کرنے کی جو بات انہوں نے کی تھی اس نے تو دل کو بہت ہی خوش کر دیا تھا۔ نورین سے واپسی کے تمام راستے میں وہ انہی کی باتیں کرتی آئی تھی۔

\*\*\*

”مگر یہ جگہ دور بہت ہے..... تم روزانہ کیسے آیا جایا کرو گی، پیدل تو خاصی دیر لگتی ہے۔“ نورین نے فکر مندی سے کہا۔

”کوئی بات نہیں نورین، جب کام سیکھنا ہے اور سکھانے والے بھی سچ مل گئے ہیں تو پھر ایسی مشکلات سے کیا ڈرنا، تھوڑا بہت مسئلہ تو ہوگا مگر میں کچھ نہ کچھ کر لوں گی، ہماری طرف کی کوئی لڑکی مل جائے تو ہم اسے ہی چلے جایا کریں گے کیونکہ تمہارا بھی روزانہ میرے ساتھ آنا مشکل ہے۔“ شہینہ نے کہا۔

”میں کیسے آؤں گی..... ماما کو پتا چل جائے گا اور وہ تو قیامت کھڑی کر دیں گی..... فی الحال تو تمہیں بھی آپنی اس بات کو چھپانا پڑے گا۔“ چھوٹی سی نورین

کی بات پر وہ مگھری سوچ میں ڈوب گئی تھی، صبح کبہر ہی تھی وہ بھلا اس کا روزانہ ساتھ آتا کہاں ممکن تھا اور اس طرح تو گھر والوں کو بھی علم ہو جائے گا۔ وہ بری طرح الجھی۔

”خیر اللہ مالک ہے.....“ کوئی حل نہ پا کر اس نے سر جھٹکا اور سب کچھ دبا پر چھوڑ دیا۔

”تم جاؤ گی کیسے؟ کس کے ساتھ۔“ امی نے بھی ساری بات سن کر فوراً انہی سوال کیا تھا۔

”اوہو امی..... نکل آئے گا کوئی نہ کوئی حل اس کا بھی۔ مجھے جانے تو دس ہفتہ دس دن فی الحال تو نورین ہی میرے ساتھ جائے گی۔“ شہینہ نے کہا۔

”نورین کے جانے سے تو بہت مسئلہ کھڑے ہو جائیں گے، نہ نہ تمہاری ماما تو..... ہاں، ایک حل ہے تمہارے ماموں صبح دس بجے دکان پر جاتے ہیں اگر وہ اسکوٹر پر نہیں۔“ امی کہتے کہتے خاموش ہو گئی تھیں، کسی نامکن باتیں وہ سوچ رہی تھیں، پریشانی میں تو انسان کو ان ہونی باتیں سوجھتی ہیں۔

”ہاں، یہ ہو سکتا ہے، یہ ہو جائے تو سارے مسئلے ہی حل ہو جائیں مگر ماموں سے بات کون کرے گا اور ماموں سے کیا بھانہ بنائیں گے، رخسانہ باجی کا بار تو درویش سے جو اسکوٹر پر جانا پڑے، ماما تو بال کی کھال بچتی ہیں۔“ شہینہ نے کہا۔

”ماموں سے بات میں کروں گی بلکہ ساری بات بتا بھی دوں گی۔“ نورین نے ایک بار پھر اسے حیران کر دیا تھا یہ کہہ کر زنگر.....“ وہ چٹکی تھی۔“ ماما سے بات کون کرے گا۔“

”میں.....“ نجمہ کی بات پر دونوں نے چونک کر اچھا امی کو دیکھا۔

”ہاں..... شادو سے بات میں کروں گی۔“ یکدم ہی نجمہ نے فیصلہ کیا تھا ان کی پتی کتنی خوفزدہ تھی، ڈری ہوئی..... اس کا مستقبل داؤ پر لگا ہوا تھا اور وہ اپنی بیٹی کی خاطر اتنی بات تو بھائی سے کر ہی سکتی تھیں، نجمہ نے بہت بے خوف اور بڑھو کر سوچا تھا اور ماں کو اتنا اعتماد دیکھ کر شہینہ کو یکدم یوں محسوس ہوا تھا جیسے منزل بہت قریب

آگئی ہو اور راستے کی ساری رکاوٹیں، پریشانیاں اور مصیبتیں ختم ہو گئی ہوں مگر اس راہ پر خاکی سہو بٹوں سے اتنی آسانی سے چھٹکارا کہاں ملے والا تھا۔

نجمہ نے جو بڑے اعتماد سے اپنی بیٹیوں کو کھلی دی تھی بہت بہادری اور بے خوفی سے شادو سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا، وہ کسی کمزور لمبے کی گرفت تھی ورنہ وہ بھائی سے بھلا اس طرح کی بات اسنے دھڑلے سے کہاں کرنے کی ہمت رکھتی تھی اور یہی ہوا تھا اگلے دو روز شادو کا موڈ نہ جانے کیوں بہت ہی برا اور بگڑا ہوا تھا، وہ بات بے بات نجمہ سے الجھ رہی تھی اور کونے، بد دعاؤں کے ساتھ بچوں پر ہاتھوں کا استعمال بھی ہو رہا تھا۔ سوکھی سڑی کمزوری سی ڈھانچہ سالانہ یہ جو اس گھر کی شاید بے حد بے ضرورت خلق تھی۔ شادو کی زور دار ٹھوکر کھا کر آگے کی طرف گری تو اٹھا چارپائی کے پائے سے جا پکڑا۔ اس کی زور دار چیخ ابھری تھی اور جب نجمہ نے دوڑ کر باہر آ کر اسے سیدھا کیا تو وہ ماتھے سے نکلنے والے خون سے بھری ہوئی تھی نجمہ نے کانپتے ہاتھوں سے اس کے نیم مردہ وجود کو اٹھا کر نکلے کے پیچ کر دیا، پانی کی تیز دھار میں بھی لہو کی آمیزش ہو رہی تھی نجمہ کا میلا دوپٹا جگہ جگہ سے سرخ ہو گیا تھا۔ نورین، بہن کو ایسی حالت میں دیکھ کر زور زور سے رونے لگی تھی۔ اس لمبے شہینہ کا سارا ضبط، ساری برداشت ختم ہو گئی تھی اس نے جھپٹ کر ٹائیہ کو ماں کے ہاتھوں سے چھینا۔

”بہن کریں امی، اس طرح اس کا خون نہیں رکے گا، مر جائے گی یہ اور مرنی جائے تو اچھا ہے، یہ بے چاری کسی کو کیا تکلیف دیتی ہے۔ اس کو بھی تکلیف ہے۔“ وہ غصے سے بولتی ٹائیہ کو لے کر دوسری کھلی میں موجود ڈاکٹر کے کینیک پر لے آئی تھی۔

”اوہو بہت گھبراؤںم ہے یہ تو..... حد ہوگئی، اتنی کمزور بچی ہے اور اتنا خون نکل چکا ہے۔“ ڈاکٹر صاحب نے بہت فکر مندی سے اسے دیکھا تھا اس کی مرہم پٹی کرا کے اور دوئی لے کر ڈاکٹر کا..... ہدایت نامہ برائے خوراک بلکہ اچھی خوراک وہ واپس پٹی تو ماما اپنے تخت پر بیٹھی بڑبڑا رہی تھیں۔

”اوہو بہت گھبراؤںم ہے یہ تو..... حد ہوگئی، اتنی کمزور بچی ہے اور اتنا خون نکل چکا ہے۔“ ڈاکٹر صاحب نے بہت فکر مندی سے اسے دیکھا تھا اس کی مرہم پٹی کرا کے اور دوئی لے کر ڈاکٹر کا..... ہدایت نامہ برائے خوراک بلکہ اچھی خوراک وہ واپس پٹی تو ماما اپنے تخت پر بیٹھی بڑبڑا رہی تھیں۔

”اوہو بہت گھبراؤںم ہے یہ تو..... حد ہوگئی، اتنی کمزور بچی ہے اور اتنا خون نکل چکا ہے۔“ ڈاکٹر صاحب نے بہت فکر مندی سے اسے دیکھا تھا اس کی مرہم پٹی کرا کے اور دوئی لے کر ڈاکٹر کا..... ہدایت نامہ برائے خوراک بلکہ اچھی خوراک وہ واپس پٹی تو ماما اپنے تخت پر بیٹھی بڑبڑا رہی تھیں۔

”اوہو بہت گھبراؤںم ہے یہ تو..... حد ہوگئی، اتنی کمزور بچی ہے اور اتنا خون نکل چکا ہے۔“ ڈاکٹر صاحب نے بہت فکر مندی سے اسے دیکھا تھا اس کی مرہم پٹی کرا کے اور دوئی لے کر ڈاکٹر کا..... ہدایت نامہ برائے خوراک بلکہ اچھی خوراک وہ واپس پٹی تو ماما اپنے تخت پر بیٹھی بڑبڑا رہی تھیں۔



”میرے گھر میں رہتے ہیں اور مجھ پر ہی آنکھیں نکالتے ہیں یہ احسان فراموش۔ ذرا سی چوٹ کیا لگی، سارا خاندان تڑپ اٹھا، مرنے نہیں جائے گی یہ..... میرے کیچے پر بھاری پتھر پڑے ہیں کوئی نہیں اٹھے گا، چارون ہوتے ہیں اس دیدہ ہوائی کو باہر جاتے ہوئے اور حوصلہ دیکھو..... گھر سے باہر نکلنے والی لڑکیوں کی شرم و حیا ختم ہو جاتی ہے۔ بڑا حوصلہ ہوتا ہے ان میں باہر نکلنے کا۔“ ماما کی اس بات پر اس کے تن بدن میں آگ سی بجڑ کی تھی جی چاہا پلٹ کر کہے..... ”واقعی بہت حوصلہ ہے تمہاری بیٹیوں کا جو باہر نکل کر سارے کام شرم و حیا سے کر کے آتی ہیں۔“ بہت سی باتیں، ڈھیروں سوال اور پھر ان کے جواب جو اس کے اندر طوفان کی طرح چکراتے پھر رہے تھے گھر مند سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا۔ اسی نے خاموشی سے ٹانہ کو تکیے پر ٹاندا کیا۔ کزرو تو وہ پہلے ہی تھی۔ اب تو بالکل زرد ہو گئی تھی۔ نیند کے نشے کے زیر اثر سو رہی تھی۔ اس نے دوائیوں والی شیشیاں طاق میں دھریں اور پھر دوبارہ اس کے قریب آ گئی۔ امی نہ جانے کس کام میں مصروف تھیں وہ تو اپنی بیٹی کو دیکھنے بھی نہیں آئی تھیں۔ جرأت ہی نہیں تھی اتنی کس کام چھوڑ کر اسے تڑپے کر لاتے بے چین دل کی تسلی کے لیے پیچی کو دیکھ لیتیں۔

”میں جاؤں گی..... میں ضرور جاؤں گی، خواہ کچھ بھی ہو جائے۔“ ٹانہ کے چہرے پر نظرس جمائے اس نے ایک بار پھر اپنے عزم کو دہرایا تھا یہ ظلم وہ کب تک برداشت کر سکیں گے پاؤں کے نیچے جیوٹی آجائے تو وہ بھی کاٹتی ہے اور ماما کے روز بروز بڑھتے ہوئے ظلموں پر وہ کب تک خاموش رہیں گے۔ ”میری معصوم بہن.....“ اس نے ٹانہ کے زرد چہرے کو چھوا، اس کی آنکھ میں آنسو آ گئے۔

”وہ دیکھ رہا ہے نا..... وہ اوپر بیٹھا دیکھ رہا ہے، ہمیں بھی اور ماما کو بھی۔ تمہارا خون ضرور رنگ لائے گا۔ اس ظلم کا حساب ہو گا۔ ضرور ہو گا تمہارے ساتھ انصاف نہیں ہوا تو خدا کی پر سے میرا یقین اٹھ جائے گا۔“ وہ روتے ہوئے بے ربط جملے بول رہی تھی اس ظلم

نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ بہت دکھ ہوا تھا اسے ماما کے اس طرز عمل سے، ذرا سی پیچی کو بے رحمی سے مار کر بھی وہ شرمندہ نہیں تھیں۔ انا سینہ زوری دکھاتے ہوئے انہیں شرمندہ کرنے کی کوشش میں تھیں۔

\*\*\*

اس واقعے نے جہاں نجر کو بے انتہا تڑپا تھا وہیں ان کے خوف میں اضافہ ہو گیا تھا۔ شاید اس کے بچوں کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ بے ڈر انہیں راتوں کو ہڑبڑا کر اٹھنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ وہ کئی بار چاروں بچوں کو نٹول نٹول کر دیکھتی تھیں اندر سے میں اپنی تسلی کرتی تھیں پھر ان چاروں کو اپنے قریب لگائے لیٹ جاتی تھیں۔ ٹھیک ماما کی اس کیفیت سے بہت پریشان تھی۔ شاید وہ فیصلہ کیس بنی جارہی تھیں۔ تمام دن تو وہ بچوں کی پروا نہیں کرتی تھیں انہیں دیکھتی یا بلاتی تک نہیں تھیں اور رات کو تنہائی میں وہ انہیں بہت زیادہ پیار کرتی تھیں۔ انہیں اپنے ساتھ لگاتیں، اپنے قریب رکھنے کی کوشش کرتی تھیں۔ وہ ماما کی اس کیفیت سے پریشان تھی۔ اپنی اس پریشانی کا ذکر مسز رحمان سے بھی کیا تھا وہ غلوں اور محبت کا پیکر کتنے غور، عمل اور توجہ سے اس کی بات سنتی تھیں۔

”تمہاری ماما خوف کا شکار ہے۔ اعتماد کی کمی خوف کا جنم دیتی ہے۔ اپنے بچوں سے بے تحاشا پیار کے باوجود دن بھر شخص تمہاری ماما کے خوف سے وہ ہمیں نظر انداز کر دیتی ہیں اور رات میں جب تنہا ہوتی ہیں تو ان کی خود اعتمادی سامنے آتی ہے تب وہ ڈرے بغیر لوگوں کو پیار کرتی ہیں اور تمام رات ہمیں ہاتھ لگا کر لوگوں کے وجود کا یقین چاہتی ہیں۔ اپنی ماما کو اپنی موجودگی کا احساس دلاؤ۔ انہیں حوصلہ دو، بہت بڑھاؤ..... وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔“ مسز رحمان نے بہت آرام سے اس کی بات سن کر اسے مشورے سے نوازا تھا اور ان کی بات نے اسے بہت حوصلہ دیا تھا۔

ماما کی عجیب و غریب اور بالکل انجان سی حرکات سے تو وہ بہت خوفزدہ ہو گئی تھی۔ ”خدا خواستہ ای سے دماغ پر تو ٹانہ کی چوٹ کا اثر تو نہیں ہو گیا۔“ وہ کمر سوچتی تھی مگر اب مسز رحمان کی بات پر اطمینان ہوا تھا۔

”میں نہیں آؤں گا اتنی دور نہیں لینے۔“ تن دن تو فریت سے گزر گئے تھے مگر چوتھے روز سلطان پارلر سے واپسی پر اکڑ گیا تھا۔ اس کا انداز لب و لہجہ ٹھیکہ کو بے حد حیران کر گئے۔ ایسا بے خوف انداز اور خود سر لہجہ۔

”میں ٹھیک جاتا ہوں..... اور میری پڑھائی کا بھی رن ہو۔ ہے۔“ فرخ بھائی مجھے ڈانٹ رہے تھے کہ اگر میں نے اب مزید کوئی پچھتی کی تو وہ مجھے ماریں گے۔ اس کی بات پردہ چوکی۔

”فرخ.....! تم اب بھی اس سے بڑھتے ہو۔“ اسے اپنی لاعلمی پر افسوس ہوا تھا اور حیرت بھی۔ وہ اپنی ہی پریشانیوں میں الجھی اس سے لائق ہو گئی تھی کچھ ماما نے کئی لمبی دی تھی ماما اب سلطان بہت سمجھدار، عقل مند ہو گیا ہے، دل لگا کر پڑھتا ہے اور روزانہ اسکول بھی شوق سے جاتا ہے، امی اس کی طرف سے بہت مطمئن تھیں۔ اس نے بھی زیادہ کریدنا مناسب نہیں جانا مگر اب اس کی بات پر اپنی بے پروائی بہت بری طرح محسوس ہوئی تھی۔

”میں کل سے نہیں آؤں گا۔“ اس نے دوبارہ دھمکی دی۔

”کجاس نہ کرو، نہیں آؤں گا کچھ، ایک نام تو تمہیں آنا ہوتا ہے صبح تو ماموں کے ساتھ ہی آتی ہوں پھر مجھے تمہیں تکلیف ہے۔ پڑھا کو نہیں کا، یہاں سے جانے کے بعد پڑھ لیا کرو۔“ اس نے فحقی اور غصے سے اسے ڈانٹا۔ ”احساس ہی نہیں ہے بہن کا۔ شکر ہے صبح کا مسئلہ حل ہو گیا۔“ نورین نے ماموں سے رات کے کھانے پر بات کی تھی جب ماما مع انہی صاحبزادیوں کے اسٹارکس پر اپنے پسینہ بھرے ڈرامے دیکھ رہی تھیں۔

”ماموں میری بات سن کر کچھ دیر تو خاموش رہے اور میرا دل..... تو بہ میرا دل تو جیسے بند ہونے والا تھا ماموں نہ جانے کیا سوچ رہے تھے میں تو بہت زیادہ ڈر رہی تھی کہ کہیں ماما ہاؤز شروع ہو جائے مگر ماموں بولے تو بہت ہی آہستگی سے صرف اتنا پوچھا کہ صبح کا وقت کیا ہے میں نے بتا دیا، کچھ دیر انہوں نے سوچا پھر بولے۔ ٹھیک ہے میں اسے لے جاؤں گا مگر یہاں سے نہیں۔ وہ

گھر سے تو رخسانہ کے اسکول ہی جایا کرے گی اسکول سے میں پک کر لوں گا اس طرح کسی کو چاہی نہیں چلے گا اور ہمارا کام بھی ہو جائے گا۔“ ماموں کی بات پردہ سو جان سے قربان ہوئی تھی جب نورین نے واپس آ کر اسے خوشخبری سنائی تھی۔

”ٹھیکہ آئی! ماموں بہت اچھے اور رحمدل انسان ہیں، انہیں ہماری حالت کا بخوبی احساس ہے مگر وہ صرف اور صرف ماما کی وجہ سے اور گھر کے سکون کی وجہ سے ہمیں ملنے سے کتراتے ہیں، ورنہ..... نورین نے ماموں کی طرف داری کی۔

”ہاں..... شاید ٹھیک ہی کہتی ہو.....“ ٹھیکہ پہلی بار اس سے متفق ہوئی تھی۔

”تم ماما کو جانتی ہو نا۔ وہ تو ماموں کا بھی لحاظ نہیں کرتیں، اسی لیے تو وہ بے جا رہے ڈرتے ہیں۔“ نورین کی بات پر اس نے چونک کر اسے بہت چھوٹی بہن کو دیکھا۔ اس عمر میں اس کی سوچ کس قدر پختہ تھی اس کا مشاہدہ کتنا متیق تھا تو وہ بہت زیادہ عقل مند تھی یا پھر اسے حالات نے گہرا شعور عطا کیا تھا۔ وہ ٹھیکہ کے مقابلے میں زیادہ باشعور، سمجھدار اور تیز تھی۔ اس میں قوت فیصلہ بھی بہت زبردست تھی۔ وہ اکثر نامکمل باتوں کو مکمل کر دکھاتی اور ٹھیکہ حیران رہ جاتی تھی۔ ماموں کو راضی کرنے والا کارنامہ تو واقعی باکمال تھا۔

”میں امی سے جا کر تمہاری شکایت کروں گی۔ تم بہت بدتمیز اور بد لحاظ ہو رہے ہو، اپنی آپا کا تو خیال نہیں ہے اور وہ فرخ بھائی بہت ٹھیک بن گئے ہیں تمہارے۔“ اس نے غصے اور طنز سے ڈانٹا۔

”ہاں، ہیں وہ میرے نگے۔ وہ بہت اچھے ہیں مجھے چیزیں بھی دیتے ہیں اور پیسے بھی۔“ سلطان کی بات پردہ ایک بار پھر بری طرح ٹھیکہ کی سر جھجک کر اس نے خود کو سنبھالا تھا۔

”فرخ اور اتنی ہمدردی، محبت! کیوں..... کیوں؟“ اس الجھن کا سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ فرخ کا سلوک اگر کبھی گھروالوں کے ساتھ اچھا ہوتا تو وہ مان بھی لیتی کہ اس کی محبت یا غیرت جاگ گئی ہوگی۔ ان







بیادہ کر اگلے گھر بھی جانا ہے مگر اس لڑکی کے تو چھن ہی درست نہیں ہیں، سرنی پاؤں کا کتنا شوق ہے اسے.....  
نجمہ اونچہ کان کھول کر تم دونوں سن لو..... صبح سے یہ اسکول نہیں جائے گی۔ یہ گھر سے باہر نکلے تو میں اس کی پانکھیں تڑوا دوں گی....." ماما نے چیتے ہوئے پن میں آنسو بہاتی نجمہ کو وارن کیا تھا جن کی ہانگوں کی جان تو فرخ کی دہاڑے سے ہی نکل گئی تھی اور اب ان کی کمرور شیم جان مردہ ٹانگیں اٹھنے سے بھی انکاری تھیں، وہ را کہ میں انگلیاں چلاتے ہوئے برقی آنکھوں سے نہ جانے کیا تلاش کر رہی تھیں، شاید کھوئی ہوئی خوشیاں یا بگڑی ہوئی تقدیر جس کے بہتر ہونے کا کوئی راستہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا بلکہ بہتری کی ہر کوشش ناکام اور ہر صورت نامراد ہو رہی تھی۔

"میں صرف کام سیکھنے جاتی ہوں ماما..... اور سیکھوں گی بھی کیونکہ مجھے بڑی مشکل سے اور سفارش کے بعد اس پار میں کام سیکھنے کا موقع ملا ہے۔" اس نے حد بہت سے ماما کو اپنا فیصلہ سنایا تھا۔ ویسے بھی فرخ کے جانے کے بعد اس کے خوف میں بتدریج کمی ہوئی تھی۔

"ہائے ہائے، ہمت دیکھو اس لڑکی کی، دیدہ دلیری دیکھو، سیکھوں گی..... سکھاؤں گی میں تمہیں..... ضرور سکھاؤں گی" کام، تم صبح نکل کے دیکھنا گھر سے، واپس نہیں میرے گھر کی دہلیز پار کر سکو گی۔" ماما کے تن بدن میں اس کی بات نے آگ لگا دی تھی، اس کی جرأت پر وہ ناگن کی طرح ہلکھا گئی تھیں، اتنے خوفناک انداز اور تیوروں سے دھمکی دی تھی کہ شمیمہ کا وجود ہل بھر میں پانی پنا تھا اور اندر را کہیں کوئی جتا کوئلہ نجمہ کی انگلیوں میں یکدم آ گیا تھا، وہ اپنے ہاتھ کو اپنے دوپٹے سے دبا تے ہوئے اپنی تکلیف برداشت کر رہی تھیں۔

"دفع ہو جاؤ اب یہاں سے، منحوس شکل گم کرو، بے حیا، بڑوں کو جواب دیتی ہے، بے غیرت ابھی سے یہ چھن ہیں تو آگے بیوی پار کا کام کیکھ کر تو نہ جانے کون سے چاند چڑھاے گی۔" ماما کی بات پر اس کا

دل تڑپ اٹھا تھا۔ سارے بدن میں لہو کی گردش بن گئی تھی۔

"کاش..... کاش میں جواب دے سکتی..... کاش میں اتنی ہمت رکھتی، کاش میں اس گھر میں ہوتی کہ آپ کو بتا سکتی، کون بے غیرت ہے اور غیرت مند، کس کے چھن اچھے ہیں کس کے برے۔" شمیمہ نے سوچا۔

"ماما میں نے کہا نا....." اس نے اسی وقت بات کا فیصلہ کر لیا تھا کہ آج کل کربا ت ہو جائے۔

"تم جاؤ اندر شمیمہ....." وہ ابھی غصیلے لکھے یہاں تک ہی کہ پانی پنا تھی کہ نجمہ کی آواز پر چونک کر وہ سرخ آنکھیں لیے اذیت سے بھریاؤ چہرے ساتھ چن کے دروازے سے باہر کھڑی تھیں۔ نجمہ کچھ کہنا چاہا مگر ماں کی آنکھوں میں بچی وارنگ اور انکار دیکھ کر خاموش سے اپنے کمرے میں آ گئی، حالانکہ آج اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ماما سے صاف صاف بات کرے گی۔ اس روز روز کی چوری سے اور کل کے سے تو جان چھوٹے گی جو بھی ہوتا ہے، ہو جائے گا سا گناہ کر رہی ہے، اپنی ہٹا کی جنگ لڑنے کے لیے وہ ہاتھ پاؤں تو مارے گی۔ خود کو ماما کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تو نہ صرف ضمیر مردہ ہو جائے گا بلکہ پوری شمیمہ بدل جائے گی، انا، خودداری اور عزت نفس سب ہموں گا۔ زکوٰۃ اور خیرات کے پیسوں سے پیٹ بھرنا ہوگا ذلت اور اذیت کے دن رات اور اس پر بھی ماما کا احسان۔ یہ زندگی گزارنے سے تو بہتر تھا کہ وہ مرنے جاتی، اسی لیے تو اس نے سوچا تھا کہ وہ ابھی ماما سے ساری بات صاف صاف کر لے گی مگر.....!

"ارے ہمارے خاندان میں سات پشتوں میں کسی نے یہ نیائیں والا کام نہیں کیا، تمہیں بھی بھائی عزت کا احساس نہیں ہے نجمہ۔ میرا بیٹا فرخ سخت غم میں تھا، بمشکل اسے سمجھا کر ٹھنڈا کیا ہے اگر اس دوبارہ شمیمہ کو گھر سے باہر دیکھا تو نہ جانے کیا کر دے گا اس لیے لی لی بی بی مجھے سمجھانے کے بجائے جا کر اپنی کھال جی کو قتل دو، کیوں اپنی جان کی دشمن بنی ہے

عزت والوں کے گھر عزت سے رہے، میں ایسی آوارہ گردیاں اور عیاشیاں قطعاً برداشت نہیں کروں گی۔" ماما کی زبان انکار سے اگل رہی تھی، نہ جانے نجمہ نے کیا کہا تھا کہ وہ مزید غصے میں آ گئی تھیں۔

"عزت والے....." شمیمہ کو یہ الفاظ کوڑے کی طرح اپنے بدن پر لگے تھے۔ "عیاشیاں" اس کا حلق تک کڑا ہو گیا تھا، اس لمحے اسے باہر بیٹھی جلا دھفت ائی ماما اور زہرا ملتی اس کی زبان دونوں اس قدر بری اور..... نفرتی بھری لگی تھیں کہ اس کا بس چلتا تو وہ دونوں کو ہی کاٹ ڈالتی۔

"اے اللہ تو نے ہمیں اتنا مجبور کیوں بنایا ہے، کیوں اس قدر بے بس کر دیا ہے، اس جیسی ظالم بے رحم عورت کے در پر لا چکا..... کیوں؟ کیا گناہ کیا تھا ہم نے! ہم بول بھی نہیں سکتے، ہم حق بات کہہ نہیں سکتے، کیوں، اتنا مظلوم کر دیا ہمیں اور اسے اتنا طاقتور، اور ظالم....." اس کی ماں کی ہارے جواری کی طرح گردن گرائے، مرے مرے قدموں سے کمرے میں داخل ہوئی تھی، بے اختیار دھڑل شکوے اس کے لبوں سے نکلے تھے۔ آج کل وہ ویسے بھی خدا سے شکوہ شکایات کچھ زیادہ کرنے لگی تھی، انسان جب بھرے پیٹ ہوتا ہے، دنیاوی غموں اور فکروں سے بے پروا، مالا مال ہوتا ہے تو اسے خدا کا شکر یاد کرنا اتنی جلدی نہیں آتا، جتنا کی پرگھ کرنا شکوہ کرنا.....

"امی..... آپ نے ماما کو صاف صاف صاف کہہ دینا تھا کہ میں کام پر جاؤں گی، ضرور جاؤں گی..... میں اس موقع کو ہاتھ سے نہیں گنوا سکتی ہوں، چاہے کچھ ہو جائے۔" اس نے ماں کو پاپس و نامراد، غم حال دیکھ کر کھانسی سے جتایا تو انہوں نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ کیا ممکن تھا اس ایک نظر میں، وہ کانپ اٹھی، بے بسی، مظلومیت، ہار، دکھ، اذیت اور غم۔

"امی....." اسے لگا اس کا دل پھٹ جائے گا، اس کے ماں کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ دے۔ "میں مجبور ہوں..... کچھ نہیں کر سکتی ہوں....." نجمہ کی آنکھوں میں آنسو تھے اور ہونٹوں پر سسکیاں

تھیں۔ "اگر ابھی ہم نے بار مان لی، مجھے ہٹ گئے تو..... تو شاید کبھی بھی اس جہنم سے نہیں نکل سکیں گے اور یہی یہ عورت چاہتی ہے، ہمیں تمام عمر اپنا تاج رکھنا چاہتی ہے، دبا کر تو کروں کی طرح ہم سے کام لیتا چاہتی ہے، زکوٰۃ اور صدقات کے جو پیسے اسے ہمارے نام پر ملتے ہیں، ان سے ہاتھ دھونا پڑے گا، مفت کا وظیفہ کسے ہر لگتا ہے امی، حلال و حرام تو بعد کی باتیں ہیں، یہ عیش یونی نہیں ہو جاتے اور آپ کہتی ہیں میں کچھ نہ کروں، اتنا اچھا موقع گنوا دوں، کھنڈ اس لیے کہ یہ عورت ہم سے لڑے گی، ہمیں تنگ کرے گی۔" وہ بہت غصے میں تھی اس وقت اسے ماں کی بزدلی بھی بری لگ رہی تھی۔

"وہ ہمیں گھر سے نکال دے گی۔" نجمہ بولیں۔ "نکال دے..... میں جانتی ہوں امی اس کی اس دھمکی میں کوئی دھم نہیں ہے، وہ صرف ڈرائی ہے ہمیں، گھر سے نکالنا ہوتا تو بہت پہلے نکال چکی ہوتی۔ ہر بار صرف دھمکیاں نہ دیتی۔" شمیمہ تیز تیز لہجے میں بولی۔

"تم بے وقوفوں والی بات کر رہی ہو شمیمہ..... اب کی دفعہ شاد بہت غصے میں ہے، اس کے تیور بتا رہے ہیں وہ جو کہہ رہی ہے کبھی لے گی اور اگر اس نے اپنی بات کچ کر دکھائی تو تب تم کیا کرو گی..... سوک پر بیٹھ کر یہ سب باتیں اور منسوے ایک پل میں ہوا ہو جاتے ہیں، صحت اور سر چھپانے کا سہارا بس یہ یاد رہتا ہے باقی سب کچھ حتی کہ کھانا پینا بھی بھول جاتا۔" نجمہ بہت مایوس تھیں، رنجیدگی سے کہتے ہوئے انہوں نے گہری سانس لی تھی، شمیمہ چند لمحے کو خاموش ہوئی۔

"امی..... آپ چاہتی ہیں کہ میں پارلر نہ جاؤں....." اس نے بہت شجیدگی سے پوچھا تھا۔ "اس کے سوا کوئی راستہ بھی تو نہیں۔"

"راستہ تو ہے اور میں وہ راستہ ضرور استعمال کروں گی، اس آخری حربے کو ضرور آزمائوں گی۔" اس نے بہم لہجے میں دعویٰ کیا تھا، نجمہ چونک گئیں۔ "کون سا راستہ..... کیا کیا کرو گی تم نجمہ نے



پوچھا۔

”ای..... ماما! ہمیں دھمکیاں دے سکتی ہیں تو ہم بھی انہیں دھماکا دے سکتے ہیں، میں یہ زکوۃ والی بات ماموں کو بتا دوں گی۔“ اپنی طرف سے اس نے بڑا دھماکا کیا تھا۔  
”اور تمہارا کیا خیال ہے، وہ مان لیں گے۔“ نجمہ  
بے اختیار ہنسی نکھیں، مگر اسے اسے گھورا۔  
”کیوں، کیوں نہیں مانیں گے۔“

”وہ میرا مان چاہا ہے تمہیں..... میں جانتی ہوں اس کی رگ رگ کو..... دو دن تم اس کے اسکوٹر پر بیٹھ کر نہ جانے کیا سمجھتی تھی ہو..... اسے مجھ سے ہمدردی ضرور ہے تم لوگوں پر ترس بھی آتا ہوگا اسے مگر ایسی بات نہ تو شادو مانے کی اور نہ ہی میرا بھائی، لانا بھی تمہارے دشمن ہو جائیں گے اور جو چاکر مٹری کا سکون یہاں مل جاتا ہے وہ بھی جائے گا۔ تم چینی ہو تمہیں..... تم بہت معصوم ہو، تم زمانے کی چالاکیوں کو کیا جانو.....“ نجمہ بہت مایوس اور افسردہ تھیں اور تمہیں ان کی بات سن کر یکدم ٹھنڈی پڑ گئی تھی، اپنے تئیں اس نے بڑا دھماکا کیا تھا۔

”نہ مانے، کوئی نہ مانے مگر امی آپ یہ جان لیں، میں اس موقع کو ضائع نہیں کروں گی، اگر آج یہ موقع میرے ہاتھ سے نکل گیا تو تمام عمر ہم سب اس جہنم میں جلتے، کڑھتے گزار دیں گے، تمام عمر..... آپ کو بھی معلوم ہے اچھی طرح معلوم ہے یہ بات.....“ تمہین نے حتیٰ لچھے میں کہا۔

”ہاں معلوم ہے مگر یہاں سے نکل کر تو جہنم میں بھی کوئی ٹھکانا نہیں ملے گا نا۔“ نجمہ بولیں۔

”مل جائے گا..... اللہ بہتر کرے گا، انشا اللہ سب بہتر ہو جائے گا۔ آپ دعا کریں میں بھی حاجت کے نفل پڑھ کر سورۃ یٰسین پڑھ کر دعا کرنی ہوں، آپ کو یاد ہے نانی کہا کرتی تھیں کہ جب بھی کوئی مشکل ہو، مسئلہ ہو اور کسی بندے سے کام لینا ہو تو حاجت کے دو نفل پڑھ کر سورۃ یٰسین کا وظیفہ کرو اور دعا مانگو..... اللہ تعالیٰ ضرور مدد کرتا ہے۔“ تمہین کے منہ سے مرحومہ ماں کا ذکر سن کر نجمہ کی آنکھیں جل جھل ہو گئی ہیں۔

”ہاں، اماں کہتی تھیں، اماں نے مجھے روزانہ سورۃ

یسین اور سورۃ مزمل پڑھنے کی تلقین بھی کی تھی مگر میں دنیا کے دھندوں میں الجھ کر بھول ہی گئی۔ نماز بھی کا وقت نہیں ملتا، اللہ مجھے معاف کرے، شاید اسے آزمائش ختم نہیں ہو رہی.....“ نجمہ کے اندر بے روشن ہوئی تھی، اپنی کوتاہی پر شدید ندامت محسوس تھی، اپنے دکھ، اپنا غم، اپنی تکلیف سب یاد دہرا رہا تھا بھولا ہوا تھا۔ گلے شکوے ہر دم زبانی کھائی جا رہے تھے مگر ایک سجدہ مشکل بلکہ مشکل ترین لگتا تھا۔

”آؤ تمہیں..... آؤ..... آج ہم دونوں مل کر نماز کے حضور جھک کر دعا مانگیں۔“ ماں کی بات سن کر نجمہ فوراً کھڑی ہوئی تھی۔ جب وہ وضو کر کے جامنا پڑھا، تھی تو ماما نے اسی کو پکارنا شروع کر دیا تھا، ہنسنے چونک کر شیعہ کو دیکھا۔

”ارے کہاں مری گئی ہے نجمہ، باہر نکل، کیا سوچ رہی ہے؟“

”آف خدا یا..... یہ عورت سانس بھی نہیں لیتا۔ نجمہ نے بے بسی سے مٹی کو دیکھا۔

”ارے ایک کپ چائے بنا دو مجھے کوئی..... سرد سے پھنسا جا رہا ہے اس مگر میں پورا انجنال پورہ بیباک ہے، حرام خور، مفت خورے کسی کا احساس نہیں اس کے میں رہنے والوں کو..... کہاں مر گئے سارے۔“ ماما کی دہاڑی آواز اور لہجہ میں بخوبی کمرے میں آ رہی تھی نجمہ کے چہرے کا رنگ خوف سے تبدیل ہو گیا تھا، نجمہ نے سوالیہ نظروں سے تمہین کو دیکھا۔

”امی آپ جامنا پڑھ کر شروع کریں۔ اس نے نیت باندھنے کی غرض سے اپنے کندھوں تک اٹھائے تو نجمہ نے ایک بل کو سوجھا کھڑی ہو گئیں۔

”نجمہ..... ایسی دہلا دینے والی دہاڑی کہ میں بے چاری یکدم خوف زدہ ہو کر باہر کی جانب تھیں۔ زمین کے اوپر رہنے والوں کا اتنا خوف زمین آسمان کے مالک سے بھی زیادہ..... ایک دم دم نہ لگائیں لرزے لگی تھیں اسے لگا اس کی جان نکل رہی ہے، وہ گھٹنوں کے بل جھکی اور پھر اوندھے منہ جھکے

میں جاگری۔

”مجھے معاف کرو، مجھے معاف کر دے.....“ دونوں ہاتھوں کی ٹھٹھیاں تھکی سے بندھیں اور جامنا پڑھ کر اتر آئے ہوئے وہ ایک ہی بات دہراتے ہوئے زار و تھار رو رہی تھی، اسے اس وقت بالکل معلوم نہیں تھا کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔

میں وہ روئے جاری تھی اس کا علم محدود تھا، اس کی عمر پانچ تھی، سوچ پانچ تھی۔ وہ اپنے اس فعل کو کوئی ہم نہیں دے سکتی تھی، نہ ہی اسے اپنے رونے سے معافی مل جانے کی توقع تھی۔ وہ تو بس رو رہی تھی کہ دل اس حرکت پر پریشانی طرح تھا تھا، بدن پر لرزہ طاری کر رہے تھے اسے اس الونگی کیفیت کو وہ کوئی نام نہیں دے سکتی تھی۔

”آئی..... آئی.....“ نورین کمرے میں آئی تو اسے یوں بلک بلک کر روتے دیکھ کر حیران رہ گئی پھر یکدم اسے سمجھوتے ہوئے اٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔

”کیا ہے نورین..... بس بھی کرو.....“ لگا تار جھگوں پر اس نے اپنا سر اٹھا کر اسے ڈانٹا۔

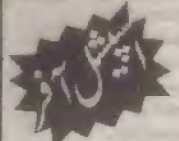
”تمہیں کیا ہوا ہے؟“ اس کی بے تحاشا روٹی آنکھیں، سرخ چہرہ اور سو بے ہوئے چہرے دیکھ کر وہ بے حد تشویش میں مبتلا ہوئی تھی۔

”کچھ نہیں..... مغرب کی اذان ہو گئی ہے؟“

اب کے وہ بولی تو لہجہ بے حد ہموار تھا۔

”ہاں.....“

”چلو پھر میں نماز پڑھ کر آتی ہوں۔“ اس کے انداز میں بلا کا ٹھہراؤ..... اور سکون تھا اس کی اتر حالت کے برعکس اس کی آواز اور انداز بہت ہی نارمل اور پُر سکون تھے، نورین نے اچھبے سے اسے گھورا تھا۔ وہ بہت سکون سے آنکھیں موندے نماز پڑھنے میں مصروف تھی، کچھ دیر اسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ باہر نکل گئی، تمہین نے مغرب کی نماز پڑھ لی، دو نفل صلوٰۃ الحاجت پڑھے، دعا مانگی اور باہر آ گئی۔ اس کی ماں بچن تھیں، وہ فرما دے کے لیے بیٹھا پڑھا پڑھا رہی تھیں جب کہ ماما پڑے کمرے میں خامی اونچی آواز میں ڈراما دیکھ رہی تھیں اور صاعہ، نرمابھی وہاں ہی تھیں کیونکہ ان



# گلکش

اپنی فائل مکمل کیجیے  
صرف 100 روپے میں

اپنی پسند اور ضرورت کے پچھلے 5 شمارے رجسٹرڈ ڈاک سے گھر بیٹھے حاصل کریں

## دکشا

کا اجراء اپریل 2006ء سے ہوا۔ اگر آپ پچھلے شمارے حاصل کرنا چاہیں تو اپنی پسند کے کوئی بھی 5 شمارے (دستیابی سے مشروط)

صرف 100 روپے کا ڈرافٹ یا منی آرڈر ادارے کے نام اور پتے پر بھیج کر رجسٹرڈ ڈاک سے اپنے دروازے پر وصول کریں۔

یہ رعایتی اسکیم محدود مدت کے لیے ہے۔ اس سے آج ہی فائدہ اٹھائیں۔

ڈرافٹ / منی آرڈر اس پتے پر بھیجیں

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز  
63 سی فیر 11 کینٹین، مین کوٹ روڈ، پٹنہ ہاؤس، اقتدار کی کراچی  
حریت طلبہ کیلئے۔ فون: 5802552





## جگنوؤں سی محبت

عالیہ حرا

میں کالاں ماری جا..... ساڈی فرمائش تے  
آج کالا جوڑا..... ساڈی فرمائش تے  
وہ اپنی دھن میں لمبے سے ڈنڈے پریش لگا کر  
پتوں کے چالے اتار رہا تھا اور ساتھ ساتھ ریاض بھی

کر رہا تھا۔ سر پر کپڑا بندھا تھا۔  
شمالہ نے اندر جھانکا، وہ اب کھڑا ہوا تنہی  
جائزہ لے رہا تھا کہیں کوئی جالا، کوئی گرد، دھول تو نہیں  
لگی چھت یا دیوار پر، ساتھ ہی ریکارڈ کی سائیڈ تبدیل

کے پسندیدہ ڈرامے میں کوئی مرتایا کسی کو گھر سے  
جاتا، کسی کی لڑائی ہوتی تو بے اختیار آنسو ان کی آنکھوں  
سے بہہ نکلتے تھے۔ اگلی قسط آنے تک آپس بھری  
تھیں، دشمنوں کو بددعا میں دی جاتی تھیں اور  
فیورٹ اداکاروں کے لیے دعائیں کی جاتی تھیں۔  
ان کی اس دوغلی شخصیت پر کسی بھی آئی ٹی اور انٹرنیٹ  
ہوتا تھا۔ انہوں پر اس قدر ظلم، غیر دل پر رحم..... یا شاہ  
ان کا ان کے ساتھ رشتہ ہی ایسا تھا، دنیا کا سب سے  
نازک اور خطرناک، زہریلا رشتہ نند بھادراج کا تھا۔  
”مائی کی پھولی..... وہ ساہیوال والی، جنہیں  
ہفتہ بھر پہلے فوج ہوا تھا، ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ اسی کی  
اطلاع آئی ہے۔“ نورین نے آکر اطلاع دی تو وہ چند  
لمحوں کو تو حیرت زدہ ہی رہ گئی تھیں۔

”ماموں ابھی آئے ہیں، مائی تو ابھی جانے کا  
کہہ رہی تھی مگر ماموں کہنے لگے کہ ابھی رات میں کوئی  
سواری نہیں ملے گی۔ رات بھر خوار ہونے سے بہتر ہے  
صبح صبح اذان کے ساتھ نکل پڑیں گے۔“  
”کتنے دن لگیں گے انہیں؟“ ثمنینہ پر سوچ انداز  
میں اسے دیکھ رہی تھی۔

”قل کے بعد ہی آئیں گے۔“ نورین نے بے  
پروائی سے جواب دے کر ثانیہ کی پچی ہوئی روٹی اٹھا کر  
کھانا شروع کر دیا تھی۔

”اوہ..... تو اس کا مطلب ہے، مجھے دو تین دن  
کی مزید مہلت مل گئی ہے۔ ہو سکتا ہے اس دوران کوئی  
بہتر حل نکل آئے۔“ یکدم اس کے ذہن پر چھائی آمد  
چھٹی تھی اور وہ بہت ہلکی جھلکی ہو گئی تھی۔ اسے مائی کی  
پھولی کا مرنا اور پھر مائی کا یہاں سے جانا ٹھنی امداد لگ  
رہی تھی۔ ”فی الحال اتنی مہلت ہی کافی ہے۔ یقیناً بعد  
میں کچھ نہ کچھ بہتر ہو جائے گا۔“ وہ یہ سب سوچتے ہوئے  
خاصی پرامید تھی مگر وہ جو کہتے ہیں کہ سب کچھ ہمارے  
مرضی اور ارادوں کے مطابق ہونے لگے تو پھر نقد پر ہمارے  
نقد پر بنانے والی ہستی پر کسی کا ایمان قائم نہ رہے۔

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں

کے رواں تہروں کی آواز بھی آ رہی تھی۔  
”باجی روئی.....“ ثانیہ اسے دیکھ کر اس کے پاس  
آگئی تھی۔ اس نے اسے گود میں اٹھایا اور بچن میں  
آگئی، تو بے پروئی ڈالنے ہوئے نجمہ نے یکدم اسے  
دیکھا تھا اور بے اختیار اس پر جھک لیا تھا۔  
”امی ثانیہ کے لیے روٹی دے دیں.....“ اس  
نے یوں کہا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، ماں کی مجبوری وہ جانتی  
تھی پھر انہیں کیا الزام دیتی، خدا تو قیامت کے دن ہی  
پکڑ کرے گا مگر بندہ لہو بھری تاخیر کیے بغیر پکڑ کرتا ہے،  
یہ بات اسے اچھی طرح سمجھ آگئی تھی۔

”یہ لو.....“ امی نے چنگیر سے سوکھی روٹی اٹھا کر  
اس پر آکر رکھا اور اسے پکڑا یا، ثمنینہ کی نظر بھی سے تر ہتر  
پراٹھے پر اٹھی تھی اور نامراد پلٹ آئی تھی ان کے لیے نہ تو  
یہ پراٹھا تھا اور نہ ہی اس قسم کی عیاشی کی اجازت تھی،  
ثانیہ بہت کمزور تھی، چوٹ کے بعد تو مزید کمزور ہو گئی  
تھی، اسے اچھی خوراک کی ضرورت تھی۔ دودھ، پھل،  
گوشت جب کہ یہاں دو وقت کی سوکھی روٹی بھی ملنا  
محال تھی۔ دودھ، پھل تو عرصہ ہوا انہوں نے چکھا نہ تھا،  
وہ چپ چاپ باہر نکل گئی اور نجمہ کے ہاتھ میں بھی جیسے  
سیال لاوا بن گیا تھا۔ اچھی اور بہتر چیزیں کھانے خود  
بنانے کے باوجود انہیں اپنے بچوں کو یہ سب دینے کی  
اجازت نہ تھی، وہ ماں نہیں تھی سے تر پراٹھے خود پکا کر  
اپنے بچوں کو سوکھی روٹی دیتے وقت دل کی کیا حالت  
ہوتی تھی، یہ وہی جانتی تھیں مگر وہ مجبور تھیں۔ وہ معصوم  
تھیں، بہت بھولی تھیں، چالاکی نہیں آتی تھی، چوری نہیں  
کر سکتی تھیں وہ..... ورنہ ہیرا پیمیری کے سوا طریقہ  
ہوتے ہیں مگر وہ ایسی چلتے ہوئیں تو شاید اب تک حالات  
کو بہتر بھی بنا چکی ہوتیں۔

وہ ثانیہ کو روٹی کھا رہی تھیں، جب یکدم شادو مائی  
کے زور زور سے رونے کی آواز آئی۔

”نورین جانا باہر ذرا دیکھنا، یہ بھابی کو کیا ہوا.....  
کوئی ڈراما میں ان کا پسندیدہ ہیرو تو نہیں مر گیا۔“  
نجمہ نے نورین سے کہا تو وہ ہنسی ہوئی اٹھ کر باہر نکل گئی۔  
شادو مائی بہت رحمیل تھیں، بہت چھوٹا دل تھا ان کا۔ ان



کی۔

اسلام آباد میں آیا ہی ٹیکس  
سوہنیاں دے آتے ہوں لگا کرے گا ٹیکس  
”لاحول ولا قوۃ.....“ ٹائلڈ سے سر جھکا۔ ”اسلام  
آباد والے اتنے فارغ بیٹھے ہیں نا انہیں ہی ٹیکس  
کریں۔“ قدرے طنز یہ نگاہوں سے سلمان کو دیکھا اور  
کھنکھار کر اندر جھانکا۔ وہ چونک کر مڑا۔  
”آہم.....“ بڑی شریر سی مسکراہٹ تھی۔ ”زہے  
نصیب!“

”سمانی کہاں ہیں؟“ نظریں ملائے بغیر کہا۔  
”ڈاکٹر رہائی کے کلینک گئی ہیں تمہارے  
ماموں کے ساتھ۔“ اسی کے انداز میں کہا۔  
”ٹھیک ہے انہیں بتا دیجیے گا کہ ٹائلڈ آئی تھی۔“  
قدم واپس پلٹے۔

”ٹھیک ہے تمہارے“ ٹائلڈ صدیقی آئی تھی شہر  
غیر سے۔ ”مڑ کر اسے دیکھا۔ برش کو کھڑکی سے باہر  
جھارتے ہوئے گنگنا رہا تھا۔  
نی پروین، اتوں تو نہیں اے  
تے دوچوں بڑی شوقین اے  
نی پروین اے

”اونہ۔“ وہ پلٹ کر پاؤں پختی باہر نکل گئی۔  
اس کے آنے اور پھر جانے کا اس نے کوئی نوٹس  
نہیں لیا تھا، بے حس بے مردت۔ تیز قدموں سے وہ  
پبلے لان میں اتری اور پھر روش سے گزرتی ہوئی سیاہ  
گیت کے داخلی دروازے سے باہر نکل گئی۔ اس نے  
در پیچے سے جھانک کر جاتی ہوئی ٹائلڈ کو دیکھا۔  
”کس بات کا زعم ہے محترمہ کو انک پر کبھی نہیں  
بیٹھے دیتیں۔“ شانے اچکا کر کوریڈور میں نکل آیا۔

اے رنگ کدی نہیں پائے..... یا  
ساڈی فرمائش تے  
اے رنگ تیرے تے نہیں سجدا  
اے رنگ کدی نہیں پائے..... یا  
ساڈی فرمائش تے  
اب وہ کوریڈور کے جالے اتار رہا تھا۔ سنڈے کا

دن تھا جو اس طرح کے کاموں میں گزارتا تھا۔ سچی  
خیال آیا چمت پر مشین میں کپڑے ڈال کر آیا تھا۔  
”اف!“..... ڈنڈا سائیڈ پر کھڑا کر کے کچھ  
جانب بھاگا۔ وہ اپنے کپڑے اتار کر خود ہی دھوئی تو  
مذرا بتول نے اپنے تینوں بیٹوں کو اپنی  
کے اصول کے تحت پروان چڑھایا تھا۔ اب انہیں  
ہونے کا دکھ نہیں ہوتا تھا۔ بیٹوں نے سکھ سے رکھا  
اور پچھلے دو ڈھائی سال سے سلمان نے جیسے گھر سنبھال  
ہوا تھا وہی کر سکتا تھا۔ دونوں ماسیوں کے سر پر کھڑے  
ہو کر کام کروا رہا تھا۔ سالن اکثر خود ہی بنالیتا تھا۔  
روٹیاں بنواتے وقت سر پر کھڑا ہوتا یا پھر عذرا بتول  
کھڑا ہوتا رہتا۔

”امی دھیان رکھا کریں ان کا، انہیں کہاں مغل  
ستھرائی کا پتا۔ جن ہاتھوں سے سر کھجائیں گی انہی ہاتھوں  
سے روٹی نکلیں گی اور دھیان رکھا کریں اپنے دوپٹے  
چادر سے یہ کوئی چیز صاف نہ کریں۔ انہی سے اپنے  
بچوں کی ناک کاں صاف کرتی ہوں گی۔“ زیتون اور  
زینب کا سلیکشن اس نے خود اپنی نگرانی میں کیا تھا۔ برا  
نقل قسم کا انٹرویو لیا تھا اور اکثر و بیشتر انہیں نکال دینے  
کی دھمکی بھی یہی دیتا تھا۔ اسے صاف ستھرا کام چاہیے  
تھا۔ سب سے بڑا ذیشان احمد تھا۔ اس کے بعد سلمان  
احمد اور آخر میں شیراز احمد۔

ذیشان احمد پرائیوٹ فرم میں منبج تھا۔ اس کی  
جواب بہت اچھی تھی وہ اسی میں مصروف رہتا تھا۔ شہر  
شہروں پوسٹنگ ہوتی رہتی تھی اس کی۔ سلمان احمد نے  
ایم کام کر لیا تھا۔ خوش قسمتی سے اسے گورنمنٹ جاب گھر  
بیٹھے ہی مل گئی تھی۔ سب سے چھوٹا شیراز احمد ابھی پڑھ  
رہا تھا۔ اس کا ارادہ سی ایس ایس کرنے کا تھا۔ احمد  
صاحب ریٹائرڈ آفیسر تھے۔ آج کل گھر میں ہوتے تھے  
تاہم انہوں نے ایک ادارہ جو ان کر لیا تھا اس کے علاوہ  
پرائیوٹ کالج میں چند کلاسز بھی لیتے تھے۔

عذرا بتول کو پچھلے دو سال سے گھٹیا کا مرض تھا  
جوڑوں کے درد میں مبتلا رہتی تھیں۔ پاؤں میں سوجن  
الگ رہتی، چلنے پھرنے یا کھڑے ہونے کے سارے



”تم مت سدھرتا“ اسے گلاس تھماتے ہوئے کہا۔

”اور کتنا سدھروں، سلیٹہ مند، نیک پر دین اید سکھ تو ہوں۔“ مند میں انگلی رکھ کر شرارتی ہوا۔

”بیگم اس کی شادی کر دیتے ہیں اب۔“ اندر آتے احمد صاحب یہ منظر دیکھ کر بنے۔ وہ جھپٹ گیا۔

”ای کیا بتایا ڈاکٹر نے؟“

”وہی جو ہمیشہ کہتا ہے۔ آرام، دھیان، پرہیز اور دوا۔“ انہوں نے اپنے پاؤں اٹھا کر صوفے پر رکھ لیے۔ سلمان دھیرے دھیرے انہیں دبانے لگا۔

”کہنا تیار ہے برخوردار.....“ احمد صاحب نے پانی پیچے ہوئے کہا۔

”جی ابو، گلو آؤں۔“

”بالکل، بالکل، تم نے کھالیا؟“

”نہیں.....!“

”اور شیراز.....؟“

”شیراز لائبریری گیا ہے اس نے ابھی ناشتا کیا تھا۔“ جاتے جاتے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

\*\*\*

”تم سے اپنے گھر میں نہیں بیٹھا جاتا۔ آجاتی ہو سن گئی۔“ شائلہ کو دیکھتے ہی سلمان کی زبان میں مٹھلی ہونے لگی۔ وہ وہیں کورڈیور میں رک کر اسے گھورنے لگی۔

”تم میرے راستے میں کیوں آجاتے ہو میرے ماموں کا گھر ہے۔“

”اچھا!“ وہ شرارت سے ہنسا۔ ”ان کے بیٹوں کا بھی گھر ہے سوہیوں..... کدی ساڑے نال بھی لمن آجایا کرو۔“ کالر جھاڑ کر ذمہ داری میں جھکا۔ وہ پاؤں فرش پر مار کر اندر بڑھ گئی۔

”میلے اپنے اندر صلاحیتیں تو پیدا کرو کہ کوئی لڑکی تمہیں دیکھ کر گرے۔“ وہ ہلکھلا کر ہنسا۔

”ہم مرد ہیں اور مرد کی مردانگی اور شرافت دیکھی جاتی ہے۔“

”ہاں! دروازے میں رکی اور مڑ کر اسے دیکھا۔

کام ان سے نہیں ہوتے تھے۔ اب وہ امور خانہ کی مگر ان ہو کر رہ گئی تھیں۔ ذیشان آفس میں مصروف رہتا، شیراز عدالت میں، لے دے کر سلمان کی ذات نیکی وہ اپنی تعلیم مکمل کر چکا تھا جاب اسے اچھی مل گئی تھی۔ آفس سے جلدی آ جاتا تھا۔ اکثر چھٹی کر لیتا تھا یا ہاف ڈے میں آ جاتا تھا۔ اس لیے ماں کی بیماری کی وجہ سے اکثر وہ پشتر اسے گھر دیکھنا پڑ جاتا تھا۔ کچھ گھر کے کاموں میں دلچسپی بھی لیتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس پر ڈتے داریاں پڑتی گئیں اور وہ گھریلو امور میں مشاق ہوتا چلا گیا۔ وہ بہتر بن کر لگ بن گیا تھا بوقت ضرورت اچھا مگر ان بھی بن جاتا تھا۔

بتول اور احمد رضا صاحب کی کوئی بیٹی نہیں تھی۔ وہ ایک وقت دو کردار نبھا رہا تھا۔ بیٹا بھی تھا اور بیٹی بھی۔ جالانکہ ان کے برابر کا گھر بھائی کا تھا اور ان کی دو بیٹیاں تھیں کافہ اور شائلہ۔ دائیں جانب ننکا گھر تھا۔ ان کی بھی تین بیٹیاں تھیں۔ نوشاہ، ریحانہ اور نعمانہ۔ دو بیٹے تھے حسام اور ابرار مگر عذرا بتول نے ان سے کام نہیں کروایا تھا۔

\*\*\*

”ای آپ کے بھائی کی بیٹی آئی تھی بڑوس سے۔“ کچن کا آخری چکر لگا کر بتول کی آواز پر کٹ کھولا تھا اور انہیں ساتھ لے کر اندر آیا۔ احمد صاحب گاڑی پارک کرنے لگے تھے۔

”کوئی بدتمیزی تو نہیں کی تھی اس کے ساتھ۔“ مرزا نش بھرے انداز میں دیکھا۔

”لا حول ولا قوۃ.....“ اس نے سر جھٹکا۔ ”اتنا گیا گزرا ہوں کہ کسی بدتمیزی کے ساتھ بدتمیزی کروں گا۔“ انہیں پانی کا گلاس دیا۔

”کیوں آئی تھی؟“

”میں نے پوچھا نہیں۔ بتایا کہ آپ گھر پر نہیں ہیں تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگی۔“

”تو تم بھی تو اس کے ساتھ بدتمیزی کرتے ہو۔“

”اپنی بھانجی کو بھی سمجھایا کریں کہ بدتمیزی مت کیا کرے۔“



”جن مردوں کے زمانہ اوصاف ہوں..... وہ..... انہیں کون دیکھتا ہے۔“ ظفر بھرے انداز میں دیکھا۔  
 ”ہوں!“ سر کھچا کر ہکا بھکا ہوا اندر قدم بڑھانے لگی۔ ”سنو! سنو!“ ادھر ادھر کھٹے کا تو وہ قائل ہی نہیں تھا۔ اس بے ساختگی پر گھوم کر اسے دیکھا۔  
 ”جن عورتوں کے مردانہ اوصاف ہوں انہیں کون دیکھتا ہے۔ مس شانہ صدیقی؟“ اس کے تاثرات دیکھنے کے لیے رکائیں اور پلٹ گیا۔ شانہ کا فشار خون بڑھ گیا۔  
 ”ایڈیٹ..... نان سنس! سمجھتا کیا ہے خود کو“ ایک تو عورت دوسرا مردانہ۔ ان دونوں لفظوں نے کھولا دیا۔

”کیا ہوا شانہ! سنے غصے میں کیوں ہو؟“  
 ”مائی.....“ اندر جا کر دم سے عذرا بتول کے سامنے گری۔ ”سنبھال کر رکھیں اس سلمان کو نہیں تو میں آنا چھوڑ دوں گی۔“ وہ جیسے سے انداز میں مسکرا دیں۔  
 ”ایسے ہی بولتا رہتا ہے۔ تم اس کی باتوں کو مانڈ مت کیا کرو اور سنو خبردار جو ادھر آنا چھوڑا..... تمہارا گھر ہے یہ۔“ اس کا ہاتھ تھام لیا اور ان کے لفظوں کو دل سے معنی پہناتی شانہ بٹس ہو گئی۔ عذرا بتول نے پیار سے اس کا رخسار چھو لیا۔ مزید خواب شانہ کی آنکھوں میں آن لے۔  
 ”ذیشان کے حوالے سے۔ خوبصورت، ویل ڈریس، مردانہ وجاہت کا شاہکار۔ ایک مکمل شخص! خوابوں میں جذبات کی پچھلی سی بج گئی۔

آج ویک اینڈ تھا، سب بڑی فرصت سے بیٹھے تھے، درمیان میں ڈرائی فروٹ کا تھال رکھا ہوا تھا۔ سلمان دو دفعہ چائے بنا کر لے آیا تھا۔ اب شیراز سے کہہ رہا تھا کالی لے آئے۔ ذیشان ٹیلی ویژن پر ڈاکو میٹری دیکھ رہا تھا۔ ناگوں پر گرم چادر ڈالے عذرا بتول توجہ سے بیٹوں کی باتیں سن رہی تھیں جب شیراز نے کہا۔

”ای..... میں اسلام آباد جا رہا ہوں۔ ایک سائنس سیمینار ہے اس میں شرکت کرنا ہے۔ سنڈے کو واپسی ہے۔“ چلغوزے منہ میں ڈالے۔

”ای میری ایک بیٹے کی ڈیوٹی اسلام آباد میں لگی ہے میں جا رہا ہوں برسوں“ ذیشان نے کہا۔  
 ای، ایو کو دیکھا۔ سلمان نے گھوم کر بھائیوں کو دیکھا۔  
 ”ای میں بھی غیر معینہ مدت کے لیے بیٹھے رہا ہوں۔“  
 ”کہاں؟“ بتول نے پوچھا۔  
 ”بھوٹان.....“ بے ساختہ کہا۔  
 ”کیوں.....؟“ سب نے بے ساختہ اسے دیکھا۔

”بھوٹیوں بجانے.....!“ منہ بسورا۔  
 سب مسکرا دیے۔  
 ”حد ہوتی ہے ہر بات کی، ہر کام میں کرنا اور چیز میں دیکھوں، ای انصاف ہونا چاہیے میرے ساتھ..... یہ آپ کے لاڈلے نہیں ہیں میں اکیلا ہر سنبھالوں اور یہ باہر گھومیں۔“ دل جلی بیٹوں کی طرف کہا اور ایک بار پھر سب مسکرا دیے۔  
 ”اس کا کوئی حل ہونا چاہیے۔“  
 ”اس کا کیا حل ہو سکتا ہے؟“

”یہ کہ ذیشان بھائی کی شادی کر دیں، گھر میں خاتون خاندان آئیں گی تو میری ڈنٹے داریوں میں کی گئی۔“  
 ”جی نہیں، میں فارغ نہیں ہوں دو سال تک اپنے پیروں پر تو کھڑا ہو جاؤں۔“ ذیشان ان کی طرف گھوما۔

”تو یہ آٹھ میٹر کے پاؤں آپ نے مستعار لیے ہوئے ہیں کسی سے؟“ سلمان نے طس کر کہا۔  
 ”شادی.....!“ شیراز نے ذوقی انداز میں کہا۔  
 ”اف.....!“  
 ”تم کر لو۔“ شیراز کی دلچسپی پر سلمان نے بے ساختہ کہا۔ شیراز مسکرا دیا۔ احمد صاحب نے اس کے کپڑے لیے۔  
 ”برخوردار پہلے مکمل پڑھائی، پھر نوکری پر شادی۔“

”اب میں تو امی کی سہولت کے خیال سے کہہ رہا تھا۔“ شرارت سے کان کھچایا۔  
 ”سہولت کے لیے گھر میں دو، دو نوکرانیاں ہیں پھر اسو جبراس سلمان احمد صاحب ہیں۔“  
 ”ہاں سارے بھگن میں ہی بھگتوں۔“  
 ”دیے سلمان ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ذیشان کی شادی کر دینا چاہیے۔“ بتول کے مطلب کی بات ہوئی تھی۔  
 ”نئی اگال تو امی آپ سوچیں بھی نہیں! ابھی تو میں فیصل آباد جا رہا ہوں، اس کے بعد ایک کورس کے لیے میں جڑی جانا ہے اور میرا دوسرا سالہ منصوبہ پکا ہے۔“  
 ذیشان نے صاف ہری جھنڈی دکھا دی۔  
 ”میرے خیال میں سلمان کی کر دیں، یہ فارغ بھی ہے آج کل۔“

”آ..... ہم..... آتھو.....“ سلمان کو پسند اگ گیا۔ شیراز اسے بے چارگی سے دیکھنے لگا۔  
 ”آ..... آپ..... آپ کو میں فارغ نظر آتا ہوں صبح آفس، دوپہر سے رات تک گھر کے کام اور میں فارغ ہوں۔ حد ہوتی ہے زیادتی کی۔“ سلمان جل بھین گیا۔  
 ”میں تو تمہارا ہاتھ بٹانے کے لیے کہہ رہا تھا۔“  
 ذیشان شرارت سے ہنسا۔  
 ”جی شکر یہ، نوازش کرم۔“

”دیے ای اس آئیڈے پر سوچا جاسکتا ہے، گھر کی ضرورت بھی ہے اور ہر مسئلے کا حل بھی۔“ شیراز اپنی رائے نکالنے لگا۔  
 ”تو قلم کرنے کے لیے اپنا سر پیش کر دو نا۔“  
 سلمان اٹھا اور باہر نکل گیا۔  
 ”مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔ میں سوئے جا رہا ہوں۔“ احمد صاحب نے بھی اس بات کو سرسری لیا۔  
 ”دیے ای.....!“ شیراز ماں کے قریب ٹھیک آیا۔ ذیشان اس کے سر پر اخبار کا رول مارتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔  
 ”دیے ای اس کی بات پر غور کرے گا۔“ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا کہ اس کی جان پچی۔ شرارت

سے شیراز ان کے اور قریب کھسک آیا۔  
 ”ای! اس آفر پر غور کرنا چاہیے۔ گھر میں کوئی بچل کوئی چہل چہل ہوتا چاہیے، کچھ چوڑیوں کی چھن چھن، پائل کی کھن کھن، کسی نئے فرد کا اضافہ ہو، کوئی ہلا گلا ہو۔“ ماں کے پاؤں دبانے لگا۔  
 ”تو پھر..... ذیشان کو منالو نا۔“ اس کے انداز نوٹ کر رہی تھیں آخر اس کی ماں تھیں۔  
 ”ای چھوڑیں نا ذیشان بھائی کو، ان کا تو شوق اور ولولہ ہی مر گیا نوکری کے پیچھے..... میں ہوں نا آپ کا خزانہ بردار اور نیک بچہ۔“ ایک ہاتھ سینے پر رکھ کر سر جھکایا۔

”تو پھر جائے فرمانبردار..... برخوردار.....“  
 ”کیون میں چائے کے برتن آپ کے منظر ہیں انہیں دھو کر رکھیں۔“ سلمان دروازے میں کھڑا تھا۔ ”ماں کے کاموں میں ہاتھ بٹائیے۔“  
 ”تم ضرور کباب میں ہڈی بننا۔“  
 ”نہیں..... ہڈا.....“ اندر آ گیا۔  
 ”ای! امی کی سن لیں اور کر دیں اور میرا نام نامکنتات..... میں شامل کر لیا جائے۔“  
 بتول کے پاس آیا، ان کے قریب سے جھک کر ٹاول اٹھایا اور پلٹ کر باہر نکل گیا۔  
 ”ای! یہ تو جھکی بڑھیا بن گیا ہے۔“ عذرا بتول دونوں کو دیکھ کر مسکراتی رہیں۔

\*\*\*  
 ”کہہ تو بیچے ٹھیک رہے ہیں ذیشان کی شادی کر دیتے ہیں۔ گھر میں رونق آئے گی اور گھر کی دیکھ بھال کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔“ صبح ناشتے کی ٹیبل پر عذرا، احمد صاحب سے کہنے لگیں۔  
 ”لگ گئی بیٹے کا سہرا سر پر بھانے کی۔“ مبہم سے انداز میں مسکرائے۔  
 ”کیسی لڑکی ٹھیک رہے گی۔“ ان کے اندر خواب جگمانے لگے۔  
 ”جو تم کو ہو پسند وہی بات کریں گے۔“ احمد صاحب گنگنائے۔



”میرے خیال میں بہو خاندان سے ہی لیتی چاہیے۔“  
 ”یا..... ہوا“ احمد صاحب گڑبڑائے۔ وہ ہنس ڈیں۔  
 ”اب بہولانے کے دن ہیں خواب دیکھنے کے نہیں۔“ جواب میں وہ مسکراتے ہوئے چائے بنانے لگے۔  
 ”تو ذیشان سے پوچھو۔“

”ہمارا مشورہ ہوگا تو ذیشان سے پوچھوں گی نا۔“  
 ”اس کی کوئی پسند بھی ہو سکتی ہے جوان اولاد ہے اور میرے خیال سے ان کی مرضی اور ان کی پسند سے ہی سب ہونا چاہیے۔ زندگی انہوں نے گزارنا ہے۔“  
 ”اور اگر اس نے آفس کی کسی لڑکی کو پسند کر رکھا ہو۔ یا کسی باہر کی لڑکی کا نام لے لے لے تو.....!“  
 ”تو کیا ہوا، زندگی آخر انہوں نے ہی گزارنا ہے، پسند ان کی ہی۔“

”جی نہیں.....!“ عذرا بتول نے سنجیدگی سے جھک سائیڈ پر کر دیا۔ زینون آکر ناشتے کے برتن اٹھا کر ٹیبل صاف کرنے لگی۔  
 ”میں کوئی ایسا رسک نہیں لیتا چاہتی، مجھے گھر کی دیکھ بھال کے لیے گھر داری کے لیے بہو چاہیے تاکہ نوکری کے لیے۔“

”تو اس لیے تو کہا ہے کہ ذیشان سے بات کرو۔“  
 ”کر لوں گی ذیشان سے بات، پہلے لڑکی دیکھ لوں پھر اسے بتاؤں گی کہ یہ میں نے تمہارے لیے پسند کی ہے..... مگر ابھی تو اس کی مرضی نہیں ہے شادی کی۔“  
 بولتے بولتے انہیں رات کی بات یاد آئی۔

”ہو جائے گی پسند تو کریں۔“ احمد صاحب نے حوصلہ دیا۔

”تو جس کی مرضی ہے ماما اس کی کر دیں۔“ ماں کا آخری جملہ سنا سلمان باہر آ گیا۔

”تمہاری ہے؟“  
 ”لا حول ولا قوۃ!“

”پھر شیراز تم سے چھوٹا ہے اس کی کیسے کر دیں۔“

”جس کا نمبر ہے اسی سے بات کریں۔“  
 زینون اس کے لیے جگہ میں چائے لے کر تھپی دروازہ کھول کر شاملہ اور ریحانہ بھی آگئیں۔  
 ”السلام علیکم ماموں!“  
 ”السلام علیکم چاچا.....!“  
 ”علیکم السلام، وعلیکم السلام..... کیسے ہو؟“  
 ”بالکل ٹھیک۔“

”پچھو ماما بازار جا رہی تھیں آج اگر آپ کو کوئی ملگوان ہو تو بتا دیں۔“  
 ”تم لوگوں کو سوائے بازاروں کے چکر لگانے کے کوئی اور کام نہیں۔“  
 ”سلمان بھائی آپ کی کوئی بہن ہوتی تو مسلم ہوتا۔“  
 ”اس سے کیا ہوتا؟“

”اس سے یہ ہوتا کہ جو کچھ آپ اپنی بیگمات کے لیے جوڑ توڑ کر رہے ہیں وہ لٹ چکا ہوتا۔“ ریحانہ ہنسی۔  
 ”میری بہن میری طرح کھڑے ہوتی۔“  
 ”مجھے تو یہ بھی ذیشان اور شیراز کی بہن لگتی ہے۔“ دونوں شرارت سے ہنسیں۔ احمد صاحب ان کے ساتھ ہنسے مگر عذرا بتول نے محبت سے اسے دیکھا۔

”اور کیا پوچھو..... جس گھر جائے گا راج کرے گا۔“  
 ”لوں رہ حکومت کرے گا۔ بڑی خوش قسمت ہوگی۔“  
 ”لڑکی۔“ شاملہ اسے چیخڑنے سے باز نہیں رہ سکتی تھی۔

”وہ گھر تمہارا نہیں ہوگا۔“  
 ”دیکھ رہی ہیں ممانی کتنا بدتمیز ہے یہ۔“  
 ”امی کیا بدتمیزی کی ہے میں نے آپ کی بھانجی صاحبہ سے۔“

”پھوپھو..... یہ دونوں لڑے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔“ انہوں نے ہنسنے ہوئے دونوں کو دیکھا۔

”جو لوگ لڑتے ہیں ان لوگوں میں محبت بھی بہت ہوتی ہے۔“ سلمان نے اک نگاہ تیز شاملہ پر ڈالی۔ اسی کے خواب اس کے خیالوں سے یکسر مختلف بلکہ الٹ۔

”اوندہ..... محبت!“  
 وہ اٹھا اور ڈانٹنگ ٹیبل سے کپ اٹھا کر ٹیبل

میں کے اور کچن کی جانب بڑھ گیا۔  
 ”امی! آلو گوشت کے ساتھ میرے لیے چاول ضرور پکوا دیجئے گا۔ میں شیراز کے لیے روٹیاں لیتا آؤں گا۔ اسے غور کی روٹی پسند ہے۔“ لیکن سے سلمان کی آواز آ رہی تھی۔ شاملہ اور ریحانہ ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس پڑیں۔  
 ”کھڑی بی.....“

”زینون میرے کمرے میں صرف پونچھا لگا دینا۔ اور سنو آج تیس اور سیرھیاں ضرور دھو دینا۔ پچھلے ہفتے بھی تم ڈیڑھ مار گئی تھیں۔ ذیشان بھائی کا ہاتھ روہن ضرور صاف کر لیتا۔“ وہ جاتے جاتے ہدایات بھی لٹک کر رہا تھا ماما کی لیے ”اور سنو پھر پلٹا.....“ ڈسٹنگ ڈرا ڈھنگ سے کیا کرو۔ مار دھاڑ کر کے جاتی ہو، چیزوں کو ان کی جگہ پر رکھا کرو۔“ اس کا لہجہ سخت تھا زینون باادب کھڑی تھی۔

”اور سنو جاتے جاتے پودوں کو پانی دے دینا۔ امی اسے کچھ پیسے دے دیجئے گا میں آفس کے کام سے جا رہا ہوں۔“ کہتے ہوئے وہ نکل گیا۔

”اللہ ممانی تو پورا لڑکی بن گیا ہے بلکہ.....“  
 ریحانہ بھی ہنسی۔ ”تو تے دارم کی آ پا جان.....“  
 بتول دھڑکے سے مسکرائیں۔ سلمان نے جاتے جاتے یہ طعناؤں سیرھیاں اتراتا چلا گیا۔

”پچھو آپ اتنی سخت قسم کی سراس ثابت نہیں ہوں گی جتنا یہ سخت قسم کی منداہت ہوگا۔“ شاملہ ہونٹ کیسے بغیر رہ ہی نہیں سکتی تھی۔

”سلمان بہت اچھا ہے، جس طرح میری ڈتے داری کو سنبھالا ہے، گھر، جاب، مہمان داری..... اس کا حوصلہ ہے یہ۔ ذیشان اور شیراز تو میں باہر کے کام کر سکتے ہیں۔“ جواب میں شاملہ نے منہ بنایا اور ریحانہ ڈھمکی انداز میں ہنسنے لگی۔

”پچھو اب آپ ذیشان بھائی کی شادی کر دیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”ہاں، آج کل ہم لوگ اسی موضوع پر بات کر رہے ہیں دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ تمہاری نظر میں کوئی لڑکی

ہو تو نہ تاتا۔“

”اوہو“ بڑے ذومعنی انداز میں شاملہ کو دیکھا اور اس کے گال دیکھنے لگے۔ اس گھر میں آنا اس کا خواب تھا۔ خوبصورت، وجہ ذیشان احمد اتنا پیارا سبز و شاداب گھر، گھر کا ماحول، بس اک ماموں اور ممانی کی ذات..... لڑکے تو ہوتے ہی من موعی اور اپنے آپ میں گن رہنے والے۔ شاملہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

”کیا خیال ہے پھوپھو تمہارا رشتہ مانگ سکتی ہیں۔“ باہر آ کر شاملہ کے گلاب ایسے چہرے کو دیکھتے ہوئے ریحانہ نے تبصرہ کیا۔  
 ”کیوں میرے اندر کس بات کی کمی ہے۔“ فخر سے گروں اٹھا کر فرضی کار بھاڑے۔

”خوبصورت، اساتذہ! میرے خیال میں بڑا لڑکا یہی دیکھتا ہے اور میرے خیال میں ذیشان بھی چاہتا ہے، اچھی طرح سے بولتے ہیں میرے ساتھ۔“  
 ”بھی اکتھار نہیں کیا۔“

”اس کی نوبت نہیں آئی۔ ان کا آفس، ان کی پوسٹنگ، ان کی مصروفیات۔“ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے باتیں بھی کر رہی تھیں۔

\*\*\*

”امی آپ سلمان کی کر دیں اس لحاظ سے وہ فارغ ہے۔“ عذرا بتول نے ذیشان سے شادی کی بات کی تو سننے ہی اس نے کہا۔

”یہ بات میں آپ کو پہلے ہی سمجھا چکا ہوں۔ دو سال تک میں شادی نہیں کر سکتا۔“

”اور یہی بات سلمان بھی کہہ دے تو۔“  
 ”تو پھر جیسے چل رہا ہے ویسے ہی چلے دیں۔“

”تم جانتے ہو اس گھر کو ایک عورت کی ضرورت ہے میرے علاوہ۔“

”امی!“ وہ مزج ہو کر انہیں دیکھنے لگا۔  
 ”یہ عمر تمہاری شادی کی ہے۔“

”ایک دو سال سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“  
 اطمینان دلایا۔



”اچھا لڑکی تو ڈھونڈ لوں تمہارے لیے؟“

”جب ارادہ ہو گا مل جائے گی۔“

”خاندان میں کرنا ہے یا باہر۔“ ذیشان ان کی شکل دیکھنے لگا۔ بھی سوپ کے پیالے لے کر سلمان اندر آ گیا۔

”آئیے گرم گرم سوپ پیئیں اور مزہ لیں۔“

”شما کلمہ کیسی ہے؟“

”سلمان کے لیے ٹھیک رہے گی۔“ برجستہ کہا اور شرارت سے سلمان کو دیکھنے لگا۔

”آہ..... ہم..... اسے سوپ کا پھندا لگتے گا۔“

”میں نے کون سا جرم کیا ہے جس کی اتنی بھیا تک سزا۔“

”ارے اتنی اچھی تو ہے سلم، اسارٹ پھر تمہاری گاڑھی بھی چھتی ہے یعنی ایک پتھہ دو کا۔“

”لا حول ولا قوۃ! آپ وہ آپ کے لیے..... بھرتی ہے۔ آتی جاتی آپ کے لیے تو میں کس کمیت کی مولی ہوں۔ ویسے سلسلہ آپ کے لیے چل رہا ہے پھر میں کیوں؟“

”میں فارغ نہیں ہوں۔“

”یعنی کہ میری کوئی اہمیت ہی نہیں ہے.....“

سجیدگی سے دونوں کو دیکھا۔ ”آپس میں چوبیس لڑانے لگے۔“

”تو یہ اپنی بلا میرے سر کیوں منڈھ رہے ہیں۔“

”اتنی اچھی گھر بیٹ لڑکی ہے۔ شما کلمہ، ریحانہ، گل، نعمانہ ان میں سے کوئی تم دونوں پسند کرلو۔ سلیقہ مند، خاندانی اور سلجھی ہوئی لڑکیاں ہیں۔“

ذیشان بوکھلا گیا۔ سلمان مسکرائے لگا۔

”ان میں سے کوئی بھی میرے لیے نہیں ہے کیوں کہ میں دین کو حدیث کی روشنی میں پڑھ رہا ہوں۔ مجھے خوبصورت نہیں بلکہ خوب سیرت، صوم صلوة کی پابند باحیا لڑکی چاہیے۔“

ذیشان، سلمان کو دیکھ کر ذمہ داری انداز میں مسکرایا۔

”جی جناب! باحیا، برقع پوش خواتین نے ہی

بہادری کے جھنڈے گاڑ رکھے ہیں آج کل۔“

”پھر..... پھر!“ انہوں نے سوپ ختم کر دیا۔

”میری سنسنا.....! باتیں تم لوگ کر رہے ہو تو اس لحاظ سے دیکھی بھائی خاندانی لڑکی ٹھیک نہیں..... اور چاب کرنے والی مجھے چاہیے۔“

”بہو چاہیے کماد پوت نہیں۔“

”مجھے تو اپنی اہمال اعتراض ہے۔“ ذیشان۔

ہری جھنڈی دکھادی۔

”اور اگر میری شادی کا خیال دل میں آیا ہے تو ان میں سے کوئی نہیں۔“ بول انہیں گھورنے لگیں۔

سلمان کے جواب نے سونے پر سہا گیا۔

”کیا خرابی ہے ان میں۔“ اسی وقت ذیشان کے فون کی بپ ہونے لگی وہ اس جانب متوجہ ہوا۔

سلمان ابھی آیا کہہ کر برتن اٹھا کر چلا گیا۔ وہ دونوں کا منہ دیکھتی رہ گئیں۔ دل میں خیال آ گیا تھا شادی کا۔

اب انہوں نے اس کام کو مکمل کرنا تھا مگر یہ لڑکے انہیں نئے سرے سے غصہ آئے لگا۔

سلمان شما کلمہ اور ریحانہ کو دیکھ کر ہنسا۔

آج ساڑھے نال کل کسی اورنی

سانوں پتا تیرے دل وچ چورنی

دونوں ہی چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔ واضح اشارہ ان کی طرف تھا۔ وہ اس وقت تایا کے لان میں بیٹھا واضح کو متوجہ سمجھا رہا تھا۔ وہ کسی کام سے اندر گیا تو ریحانہ اور شما کلمہ باتیں کرتی باہر سے اندر آئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر زبان پہ پھلجی ہونے لگی۔

”یہ لگک یہاں کون سی ترکیب پوچھنے آئے ہیں۔“ واضح چوٹ کی۔

”ہا..... ہا..... ہا..... بڑا لطیف ساطنر ہے۔“

”تم کچن کے علاوہ کہیں نظر آؤ تو بڑی جرات ہوتی ہے۔“

”اچھا.....! شریہ سے تھیر زدہ ہوا۔“

”تم ہانڈی میں چچہ چلاتے اور جالے اتارنے ہی بھلے لگتے ہو، جانے کیوں تم مرد بنتے ہو۔“

”اچھا تو لگتا ہوں نا.....“ سینے پر ہاتھ باندھے۔

”اور یہ تم مجھے دیکھ کر اسے سیدھے گانے کیوں گاتے ہو؟“ کمر پر ہاتھ رکھا۔

”اچھا تو گانا ہے یہ الٹا سیدھا کیا ہوتا ہے تم جانو۔“

”اس نے لب بھینچ کر اسے نور اور پاؤں پر کراندر چلی گئی۔“

سلمان کا دل جا ہانٹھے اور ایک منٹ میں اس کا

ظن طرہ اور کر وفر نکال دے۔ ساری لگی لپٹی نکل جائے گی۔ آج ہی ان دونوں کو اس نے ٹیبل پارک میں دیکھا تھا دونوں کے ساتھ مگرمروت، لحاظ، خیال، گھر کی بات، روز کا آنا جانا ملنا ملانا، کچھ عزت اور

شما کلمہ تو بھی بھی منہ پھٹتے اور بد لحاظ مکر جانی..... اپنی بلا تو لیے کے سر ڈال دیتی تو.....! اس سے امید بھی یہی تھی۔

”شما کلمہ تم باہر لان میں سلمان کے ساتھ بد تیزی کیوں کر رہی تھیں میں نے کچن کی کھڑکی سے دیکھا تھا۔“ اندر عابدہ خاتون نے اسے روک لیا۔

”ای!“ غصے سے انہیں دیکھا۔ ”وہ گھر بیٹو خاتون اس لائٹ ہے کہ اس کی عزت کی جائے۔“ اس کے لہجے میں طنز تھا۔

”شما کلمہ!“ انہیں غصہ آ گیا۔ ”میں تمہارا رشتہ یہاں کرنا چاہتی ہوں بھائی جان کے ہاں..... خاندان میں۔ کافہ کی شادی غیروں میں کی ہے اس کا انجام دیکھو ہی ہو تم، بالکل بھی خوش نہیں ہے وہ۔“

”تو!“ وہ گستاخی سے لپٹی۔ ”تو آپ چاہتی ہیں میں خاندان کے چکر میں سلمان سے شادی کروں۔“

”بے وقوف لڑکی سلمان نہیں تو ذیشان تو ہے تاکہ کیا کی ہے اس میں۔ برا سلمان بھی نہیں ہے مگر تیری عقل باجھر پڑ گئے ہیں۔“

”اور نہہ!“

”جہاں رشتہ کرنا ہوتا ہے وہاں ایک فرد سے نہیں بلکہ سب سے تعلق قائم کرنا پڑتا ہے اچھا تاثر دینا پڑتا ہے مگر تم.....! اک نگاہ ان پر ڈال کر خاموشی سے اندر کی جانب بڑھ گئی۔“

”جانے کب اس لڑکی کو عقل آئے گی.....“

یہ بڑواتے ہوئے باہر جانے لگیں..... اور شاید ان جیسی نا عاقبت اندیش لڑکیوں کو بھی عقل نہیں آتی جو ہمیشہ

خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتی ہیں۔ وہ ذیشان کی بھی منظر کشی اور خولہ کے بھائی سے بھی چکر چل رہا تھا جو

کر ڈاکٹر تھا گویا تو نہ کسی اور سی..... اور نہ کسی تو سی۔

\*\*\*

”میرے خیال میں احمد صاحب..... ذیشان کے لیے شما کلمہ ٹھیک رہے گی اور سلمان کے لیے نعمانہ.....“

”اپنے خیال کو عملی جامہ پہناتے ہوئے اظہار خیال کر دیا عزرا بولنے۔“

”ہوں..... دونوں ہی اچھی بچیاں ہیں۔“

”ہاں، نہ میرے بھائی کو اعتراض نہ آپ کے بھائی کو اعتراض..... پھر گھر کے رشتے ہیں، خاندانی..... خاندان کی لڑکیوں کا پہلا حق ہوتا ہے۔“

”ہوں.....! یعنی انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔“

”میرے خیال سے ان دونوں سے بھی پوچھ لو.....“ احمد صاحب نے اپنی رائے دی۔

”ان کی کیا مرضی.....! دونوں کا پوچھیں لڑانا یاد آ گیا۔“

”بڑے شریف ہیں میرے بچے، میری مرضی میں ہی خوش ہو جائیں گے۔“ انہوں نے اخبار کا کونا ہٹا کر انہیں دیکھا اور مسکرا دیے۔

”شریف ماں، باب کی اولاد شریف ہی ہوتی ہے۔“ وہ بس انہیں دیکھ کر رہ گئیں۔ ان کی شرافت پر کیا شک تھا۔

مگر..... سلمان اور ذیشان نے ان کی شرافت کے سارے فتوے باطل کر دیے۔

”ایم پاسیبل..... شامل تو بالکل نہیں، ہاں نعمانہ کے لیے سوچا جاسکتا ہے۔“

”کیوں، اس میں کیا اعتراض ہے؟“

”مجھے تو اعتراضات ہیں۔ ہاں..... بھائی کی مرضی معلوم کر لیں۔“ اچانک ہی بیٹیر ابدل۔

”میرا..... تو دو سالہ منصوبہ مضبوط ہے۔“



”امی! شیراز نے ہاتھ اٹھایا، ”اگر آپ کہیں تو میں سر قلم کر دوں آپ کے آگے۔ یہ نہ بھرا آپ کی بنا فرمان اولاد۔“ جواب میں بتول اسے گھور کر دیکھنے لگیں۔ وہ اپنی جگہ مسکین سے انداز میں بیٹھ گیا۔

”سارے بخو لیے یہاں جمع ہو گئے ہیں۔“

”امی سڈے ہے آج۔“ سلمان نے یاد دلایا۔

”تو تم لوگوں کو نامعلوم ہے۔“ انہوں نے حتی انداز میں دونوں کو دیکھا۔ مجبور یاں ان کے ساتھ بھی تھیں۔ بلند پریشہ وزن کی زیادتی، جھڑوں کا درد اور پوروں کی سوچن دن گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھ رہی تھی۔ سلمان مرد تھا کپ تک گھر دیکھ سکتا تھا۔ اس گھر کو ان کے علاوہ بھی ایک عورت کی ضرورت تھی اور یہ بچے اپنی من مانی کرنے پر تے ہوئے تھے۔

”جی!“ اچانک ہی دونوں نے باجماعت کہا۔

”تو میرے مرنے کے بعد کرو گے کیا؟“ جذباتی بلیک میلنگ کی۔

”خدا نہ کرے امی، کیسی باتیں کرتی ہیں۔“ دونوں نے گھبرا کر انہیں دیکھا۔

”ابھی مجھے ضرورت ہے اس گھر کو ضرورت ہے ایک ”ہاں“ کی، ایک گھر گزرتی دانی عورت کی اور تم لوگ نہ کہہ رہے ہو، جب تم لوگوں کو ضرورت ہوگی تو میں بیٹھوں گی بھی نہیں۔ مزید گویا ہوئیں۔“

”لا حول ولا قوۃ! امی یہی باتیں کرتی ہیں۔ کر لیں نا بھائی آپ۔۔۔۔۔ آپ کی عمر بھی ہے اس گھر کی ضرورت بھی۔“ امی کا ہاتھ تمام کرنا صحت انداز میں ذیشان کو دیکھا۔

”تو تم یہ سنی کمالو۔“

”بھائی!“ ٹھنڈی آہ بھری۔ ”میری تو ابھی عمر ہے نہ تجربہ۔“ بقول ٹھنڈے ابھی تو گھر داری سکھ رہا ہوں۔“

”پھر بکواس شروع کر دی۔“ عذرا بتول نے دونوں کو گھر کا۔

”بیگم۔۔۔۔۔ بیگم!“ احمد صاحب باہر کہیں کھڑے تھے۔

ان کی گفتگو سن رہے تھے۔ بڑی بے ساختگی آئے۔

”تمہارا مسئلہ میں حل کر دیتا ہوں۔“

پتھری رنگ بھی چھوٹا آئے گا۔ گھر کو جوڑنے کے لیے جانے گی۔ دھیان خیال دانی اور خواہش کی باتیں بے چاری۔ ”ذرا فاصلے پر بیٹھ کر کشن کو دیکھ رہا۔“

”کون ہے وہ؟“

”دوسری بیوی جو تمہاری مرضی اور پسند سے اس کی۔“

”لا حول ولا قوۃ!“

”استغفر اللہ!“

”دماغ خراب ہو گیا ہے آپ کا بچوں کے بارے میں۔“

”تمہارا مسئلہ میں نہیں حل کروں گا تو پھر کون کرے گا۔“ مسکین سی صورت بنائی۔

”کیوں بچو!“ جواب میں بچوں نے دلی دلی مسکراہٹ کے ساتھ منہ پھیر لیا۔

”ٹھیک ہے نہیں تو ناسی۔“ مجھے بھی سرد انہیں سے گھر ماسیوں پر چل رہا ہے چلتے دو۔ کوئی ڈانٹ کرے۔۔۔۔۔ سب مل کر گھر چلاؤ اور میری مجبوریاں۔ فائدہ اٹھاؤ۔“ ناراضی سے، کچھ ٹھکی سے کہتے ہوئے انہیں اور باہر نکلے لگیں۔

”بیگم!“ احمد صاحب نے پیچھے سے دھکی دی۔

”میں ہوں نا۔“

”امی میں بھی۔۔۔۔۔ ہوں نا۔“ شیراز کیوں بیٹھ رہتا۔

”آئیں امی میں کمرے میں چھوڑ دوں۔“ سلمان ہمدردی سے ان کی طرف بڑھا۔ ٹھکی سے ہاتھ جھٹکتی وہ اندر بڑھ گئیں۔ اور تینوں باپ بیٹا سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

”بیٹا ماں ہے تمہاری ماں لو اس کی بات نہ کرنا۔“

”ابھی بھی کرتا ہے اور کچھ عرصے بعد بھی تو پھر ابھی نہیں۔“ کچھ دیر بعد احمد صاحب بچوں کو سمجھا رہے تھے۔

”ابو۔۔۔۔۔!“ وہ دونوں سر کھانے لگے۔

”ابو میں تو راضی ہوں مگر آپ لوگ میرے لیے خبیثہ کیوں نہیں ہوتے۔“ شیراز نے پھر مسکین سی صورت بنائی۔ سلمان نے ابو کی نظر بچا کر زور سے کشن کو دیکھا۔ وہ اب کمرہ گیا۔

”کوئی پسند ہے تو بتا دو ورنہ ماں کی بات مان لو۔“ تینوں سر جھٹکا کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

”وہیے اصولاً آپ کو امی کی بات مان لینا چاہیے ان کی تمام تر توقعات آپ سے وابستہ ہیں۔“

سلمان، ذیشان کے کمرے میں بیٹھا در پردہ انہیں فورس کر رہا تھا کہ انہیں شادی کر لینی چاہیے۔

”یہ سارا کھڑاگ آپ کا ہی پھیلایا ہوا ہے۔“

بڑی عزت سے اسے دیکھا۔ ”نہ آپ کو گھر داری کا غم ہوتا نہ امی کے دل میں بات ڈالتے نہ وہ اتنا خنڈی ہوئیں۔“

”کرنا تو ہے نا۔“

”دو سال سے پہلے نہیں۔“ کمپیوٹر پر معروف سے انداز میں کہا۔

”کیوں، کیا موصوفہ گریجویشن کر رہی ہیں۔“ سامنے آ کر کھڑا ہوا۔

”ایسی کوئی بات نہیں بھائی۔ اسے تم لوگ ہی پسند کرنا۔“

”تو معنی تو کر دالیں ایکس والی ریڈ سے پھر دو سال تک قسطیں سمیٹے رہیے گا عید تہوار پر۔“

”تو یہ کام تم کر لو۔“ ہاتھ روک کر اسے دیکھا۔

”ہر کام میں ہی کیوں کروں۔“ وہ جھٹلا گیا۔

”قربانیاں چھوٹے ہی دیا کرتے ہیں۔“ ذیشان آرام سے مسکرایا۔

”بس تو پھر میں امی سے کہتا ہوں کہ کسی بھی امی کے لیے کواد کے کر لیتے ہیں مفتی کر دیتے ہیں۔“ فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”ارے۔۔۔۔۔ ارے۔۔۔۔۔“ سلمان کا فہم دیکھ کر جلدی سے اٹھا۔

”نہیں تو چھوٹو کی کر دیتے ہیں ویسے بھی اسے بڑا اشتیاق ہو رہا ہے شادی کا۔“ ٹھکی سے اسے دیکھا۔

”تو تم ہی کر لو نا۔“ پیار سے سلمان کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

”میں۔۔۔۔۔!“ جل کر اسے دیکھا۔ ”ہر کام میں ہی کروں پہلے گھر داری مجھے شادی کے بعد کرنا ہے بیوی بچوں کے آرام کے لیے مگر آپ لوگوں کا آرام دیکھ رہا ہوں۔ اب آپ اپنی ڈنٹے داری سنجالیں، میں۔۔۔۔۔“

بولتے بولتے ذیشان کو دیکھ کر شرارت سے ہنسا۔

”میں ٹھنڈا جا رہا ہوں دو سال کے دیرے پر۔“

”ہیں۔۔۔۔۔!“ حیر سے دیکھا اور اس کا شرارتی انداز دیکھ کر ہنس دیا۔

”پھر ادکے۔۔۔۔۔!“ باہر نکلے لگا۔

”ادکے“ خود ہی کہہ کر باہر نکل گیا۔ ذیشان دھم سے کمری پر گر گیا۔

”ویسے۔۔۔۔۔!“ اس نے پھر دروازے سے منہ نکالا۔ ”یہ دو اور چار سال کا منصوبہ تو شادی کے بعد ہوتا ہے۔ منصوبہ بندی کے لیے اور آپ ابھی سے۔“ نا بھی سے اسے دیکھا اور پھر سمجھ آئے پر سلمان کے پیچھے بھاگا۔ وہ ہنستا ہوا نو دو گیارہ ہو گیا۔

اگلے دن لاؤنج میں شام کی چائے پیتے ہوئے سلمان بتول کو مناتے ہوئے ذیشان کی ہاں کی خوشخبری سنا رہا تھا۔

”جج۔۔۔۔۔ ذیشان مان گیا۔“

”جی امی! بس جلدی سے ان کی مفتی کر دیں۔“

”بالکل، بالکل۔۔۔۔۔ لڑکیاں تو میں نے سوچ کر رکھی ہیں ذیشان کے لیے شالک اور تمہارے لیے نغمانہ۔“

”جی۔۔۔۔۔“ سلمان کے جوش کو بریک لگ گئے اور اپنے نام پر شالک کے قدم ٹھک گئے۔

”ہاں بس آج ہی تمہارے ابو سے بات کر کے کل چلیں گے بھائی صاحب کے گھر۔“ ان کا پُر جوش چہرہ دکھ رہا تھا۔ ”نئی پیاری ہے شالک۔“

”امی۔۔۔۔۔!“ سلمان سنجیدہ تھا۔



”شائلہ نہیں.....! شائلہ کے بجائے آپ نغمہانہ کو ذیشان کے لیے لے لیں اور میرے لیے چھوٹے ماموں کی مدد کر لیں۔“

”اب تمہیں شائلہ پر اعتراض ہے، کیا حرج ہے اس میں۔“

”امی!“ دھیرے سے اٹھ کر ماں کے پاس قدموں میں بیٹھ گیا، ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر سمجھانے والے انداز میں کہنا شروع کیا اور باہر کھڑی شائلہ کے قدموں سے زمین ہٹکنے لگی۔

”امی اس گھر کو، آپ کو ایک گھر ملو اور خوب سیرت لڑکی کی ضرورت ہے کسی ڈیکوریشن بیس کی نہیں۔ جو آپ کو دیکھے، ہم لوگوں کو دیکھے، اس گھر کی ضرورت کو محسوس کرے۔ کیا شائلہ ایسی ہے؟ کیا ہے صرف چہرہ خوبصورت ہے۔ ارے انسان کا دل خوبصورت ہونا چاہیے۔ ہاتھوں کو متحرک ہونا چاہیے۔ اسے صرف ذیشان سے غرض ہے، اسے لے کر فو پھر ہو جائے گی۔ وہ ہے بھی اسی بچہ کی۔“

”سلمان.....!“ بول اس کی شکل دیکھتی رہ گئیں۔

”بڑی بھائی کو ایسا ہونا چاہیے کہ اس کی عزت اس سے محبت کرنے کو دل چاہے۔ اس کے کردار میں جھول نہ ہو، وقت کی ضرورت کو سمجھے۔ ضدی، جھگڑالو اور خود پسند نہ ہو۔ دوسروں کی عزت کرنا جانتی ہو..... ذرا غورو غور کریں کیا ہے اس میں..... لہجہ تنک تو محبت آمیز نہیں۔“ شائلہ کھڑے قد سے پیچ کر گئی۔

”ہمیں خوبصورت نہیں، خوب سیرت بہو چاہیے۔“ شائلہ نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

”دوسری بہو آپ چھوٹے ماموں کی مدد کو منتخب کر لیں۔ ان کی غربت کی وجہ سے آپ نے انہیں چھوڑ دیا ہے۔ ماموں کے بعد وہ کیسے گھر چلا رہی ہے محنت اور جانفشانی سے۔ وہ حق ہے۔ ماموں کی چار بیٹیاں ہیں جنہر کے نام پریشمی رہ جائیں گی۔ خاندان کے لوگوں کے متعلق خاندان کے افراد ہی سوچتے ہیں امی۔“ دھیرے سے ان کے گھٹنوں کو دبایا۔

”یہ نیکی بھی ہے۔ زاد راہ بھی اور اس گھر ضرورت بھی۔“ نذر باتوں سے دیکھ گئیں۔ کتنا بکھر اور غمگین تھا ان کا بیٹا۔

”باقی آپ کو اختیار ہے۔“ ان کے گھٹنوں پر رکھا۔ حسد اور رقابت کی آگ نے اسے خاکستر کر دیا۔ بجائے پشیمان ہونے کے اس کے وجود میں ہی بے ہوشی آ گئی۔ دل چاہا کہ اندر جائے اور سلمان کا منہ نوچ لے۔ اگر یہ درمیان میں نہ ہوتا تو اسے دنیا کی کوئی چیز اس کی بہو بننے سے نہیں روک سکتی تھی۔ سر اٹھا کر اطراف میں نگاہ کی۔

یہ گھر، یہ پیارا گھر، ذیشان جیسا شخص۔ ڈاکٹر اختیار جیسے لوگ کھنڈ وقت گزاری کے لیے ہوتے تھے مگر..... اس وقت گزاری نے اس بھائی تسکین لے اسے کس قدر نقصان پہنچایا تھا۔ لائے قدموں بھاگی اور وہاں سے نکل آئی۔

فردا کسی سنیا سی باوا کا ذکر کر رہی تھی۔ ان کے ایک عمل سے محبوب قدموں میں، من چاہی مراد پوری ہو گئی۔ بور کے سہانے لٹو جھولی میں۔ سرعت سے سوچتی وہ فردا کے گھر کا نمبر ڈائل کر رہی تھی پھر اس کے ساتھ سنیا سی باوا کی درگاہ پر پہنچی۔ انہوں نے ایک خلیہ دکھانے لے کر سات تعویذ دیئے۔

”انشاء اللہ جو چاہو گی ملے گا۔“ اس نے ساتویں دن ساتواں تعویذ عقیدت کے گھر سے تاثر میں ڈوب کر جلایا تو امی اس کے کمرے میں آ گئیں۔ ان کا چہرہ اترا ہوا تھا اور انھیں غمناک۔

”امی.....!“

”شائلہ آج ذیشان کی مفتی ہے نغمہانہ کے ساتھ۔ تیار ہو جاؤ ابھی ابھی بھائی کا فون آیا ہے۔“ شائلہ بدحواس ہو گئی۔ ابھی تو اس نے امید کا آخری تعویذ جلا یا تو کہ امید برآئے گی۔ یہ امی کیا کہہ رہی تھیں۔

”اسی لیے..... اسی لیے میں تجھے سمجھاتی تھی کہ میں اعتدال اور روئے میں توازن پیدا کر بعد میں جو مرضی کر لیتی۔ سسرال تو اچھا ملتا..... مگر تو..... مگر تو..... انہوں نے شگشگیاں نگاہوں سے دم سادے بیٹھی شائلہ

دیکھا اور ہاڑ سے دروازہ بند کرتی باہر نکل گئیں۔ اس کے ہاتھ سنیا سی باوا کا نمبر ڈائل کرنے لگے۔ اس بار انہوں نے بڑا سخت تعویذ دیا تھا۔ اس پر چار بیٹیوں کا دروس اور تیسرے دن اسے زمین بوس یعنی مٹی میں دبا دیا۔ اس نے احمد والا کے گیٹ کے سامنے یہ کارنامہ انجام دے دیا۔

”میں خوش نہیں تو کوئی بھی خوش نہیں۔ سلمان میں تم سے تمہارا ہمین چھین لوں گی۔ تم نے..... تم نے.....“ حسد اور رقابت کی آگ میں جل رہی تھی۔ اس کا لمس نہیں چلی رہا تھا کہ اس دنیا کو کس گھر سے کر دے۔ آگ لگا دے مگر باگل لڑکی یہ نہیں جانتی تھی کہ کاغذ پر چند لکیروں والے رتے جلانے اور دبانے، دفنانے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک خدانہ چاہے۔

احمد والا کے لوگ چوتھے دن بڑی دھوم دھام سے ناظم آباد میں واقع ماموں کے گھر جا رہے تھے، کسی غریب، صابر، سختی اور حیا دار لڑکی کی قسمت جھگڑانے، مدد کو نہ ہونا۔ اسی زمین پر قدم رکھتے سب گزرے جہاں شائلہ نے من کی آشا پوری کرنے کے لیے تعویذ دفنا یا تھا۔ وہاں پھول ہی پھول بکھرے تھے۔ وہ پھول پھول کر رو دی۔ اس کی جلد بازی نے یہی ہاتھ کی بازی نکال دی تھی۔ بے وقوف کو خبر نہیں تھی کہ نیک نیتی ہو یا دلوں میں غور..... خدا بہتر قتل اعوذ برب الناس ہے۔ وہ نیک لوگوں کو بد فطرت لوگوں سے بچا لیتا ہے۔ دلوں میں چھپے شوروں کو پہچان لیتا ہے اور اپنے نیک بندوں کو شر سے محفوظ رکھنے کے گڑ جانتا ہے۔

\*\*\*

”سنو!“ بڑے شرارتی انداز میں سلمان اپنے ہاتھوں میں سکری کٹی بیٹھی مدد کو دیکھ کر ہنسا اور اس کی جانب جھکا۔

”میں آسمان سے تارے توڑنے کا وعدہ تو نہیں کرتا لیکن اگر تم اپنی محنت..... محبت، وفا اور حیا سے میرے گھر کو جنت سے جنت کدہ بنا دینے کا وعدہ کرو..... تو میں تمہیں دنیا کی خوش قسمت لڑکی بنانے کا وعدہ کرتا ہوں۔“ مدد نے ایک شرمیلی نگاہ اٹھائی۔

## غزل

خواب تم، خواب کی تعبیر ہو تم  
میری ہر پور پہ خرچ ہو تم  
کاش کہہ دے مرا راجھا اک دن  
کہ میں راجھا ہوں، مری ہیر ہو تم  
میں جسے توڑنا چاہوں نہ بھی  
ایسا اک حلقہ زنجیر ہو تم  
میں نہیں جانتی، یوں ہے کہ نہیں  
چاہتی ہوں، مری تقدیر ہو تم  
دیکھتی رہتی ہوں ہر دم جس کو  
دل کے اہم کی وہ تصویر ہو تم  
اور کیا تم سے کہوں، تم کیا ہوا  
دل کی تاریکی میں تنویر ہو تم!  
اس نے کچھ کہہ دیا تم سے لالی  
کیوں پریشاں ہو، دلگیر ہو تم؟  
شاعرہ: قدسیہ ندیم لالہ،  
سعودی عرب

”میں وعدہ نہیں کرتی وعدے کا کیا بھروسہ، وعدہ تو ٹوٹ جاتا ہے۔ عمل سے شکایت ہو تو بتائیے گا۔“ اس نقل فلسفے پر سلمان کان کھانے لگا۔

”اور مجھے ٹوٹے ہوئے تارے لینے کا کوئی شوق نہیں۔“ مزید کہا۔ سلمان نے حیرانی سے اپنی ہتھیلیوں سے حکایتی مدد کو دیکھا۔ جس کے ہاتھوں پر اس کے نام کی مہندی تھی اور بڑا جاندار قہقہہ لگایا۔

”واہ! خوب گزرے گی جوں بیٹھیں گے دیوانے۔“

جنگلؤں کی جیتوں نے کسی کی آنکھوں میں مریچیں سی بھر دیں اور کسی کی آنکھوں میں قوس قزح کے رنگوں کی آمیزش کر دی۔





# امریکل

شیریں حیدر

عورت بظاہر کمزور ہے اور ہمارے معاشرے میں اسے ترنوالہ سمجھا لیا جاتا ہے۔ ایک ایسی عورت کی داستان جس پر زندگی کی خوشیوں کا آغاز ہوتا ہے غم کا کوہ گراں آت گراٹھا مرے والوں کے ساتھ مرا تو نہیں جاتا مگر خود جیتا اور دوسروں کو بھی زندگی کی طرف لوٹانا بہت کٹھن کام ہے مگر یہ عورت ہی ہے جو سب کٹھنایاب خود پر جھیل کر بھی زندگی کا سفر جاری وساری رکھتی ہے۔ اس کی راہ کے کانٹے اور پتھر اور کوئی نہیں ہٹاتا، صرف قدرت ہی اس کی مدد کار ہوتی ہے۔ دشوار گزار راستوں میں آپ خود کو اس کا ہم سفر محسوس کریں گے۔

ایک نئی رواد حیات شیریں حیدر کے حاس قلم سے.....





”کیا کر رہی ہیں آپ امی جان؟“ میں نے یکدم درمیان میں آکر امی جان کا تیزی سے چلتا ہوا ہاتھ روک دیا۔ نادانستگی میں، میں منظر کے بالکل قریب کھڑی تھی۔

”جواب نہیں دیا آپ نے میری بات کا؟“ اس نے نظریں میرے چہرے پر گاڑتے ہوئے کہا۔  
”میں تمہارے کمرے میں بھلا کیوں جاتی؟ کس نے کہا تم سے کہ میں تمہارے کمرے میں گئی ہوں؟“ میں نے کبھی جواب جاؤں گی؟“ میں نے دل کڑا کر کے جھوٹ بولا۔

”میرے کمرے کے اندر آپ کی مخصوص خوشبو نے.....“ اس کی بات نے مجھے اس بات کا یقین دلایا کہ غیر معمولی طور پر ذہن ہے۔

”تمہارے کمرے کا دروازہ کھلتا تھا، صرف میں نے اسے بند کر دیا کہ میں ملازمہ میری لاعلمی میں اندر نہ جاے اور تمہاری کوئی شے غائب نہ ہو جائے، کوئی رقم یا کوئی اور قیمتی چیز۔“ میں نے صفائی دی۔

”سچ کہہ رہی ہیں؟“ اس کی آنکھوں میں بے یقینی کا مایوس تھا۔  
”میرے پاس جھوٹ بولنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔“ میں نے قدرے خشکی سے کہا۔

”آئی ایم سوری بھابی!“ اس نے دونوں ہاتھ میرے سامنے جوڑ دیے اور اس کی آنکھیں پانیوں میں ڈوب رہی تھیں۔ بچی کی دفعہ امی جان نے میرے سامنے اس پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ شاید کبھی بہت بچپن میں اسے مارا پیٹا ہو مگر جب سے میں آئی تھی میں نے اس کا بہت معصوم روپ دیکھا تھا۔ مجھے ابھی بھی اس پر بہت ترس آیا، میں نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

”مجھ سے نہیں امی جان سے معافی مانگو۔“ میری بات سن کر وہ امی جان کی طرف مڑا۔ انہوں نے ناراضی کے اظہار کے لیے رخ پھیر لیا۔

”مجھے معاف کر دیں امی! میری بچی بدتمیزی سمجھ کر مجھے معاف کر دیں۔ میری ماں، میری جنت! مجھ سے منہ پھیریں۔“ وہ بلب بلب کر بچوں کی طرح رورہا تھا۔ میرا دل بھی پھٹنے لگا کراہی جان کی ناراضی بدستور تھی۔ میں نے بھی ان سے سفارش کی کہ بچہ ہے اسے معاف کر دیں۔ اس پر انہوں نے اسے ساتھ لگایا اور رونے لگیں۔

”تمہارے باپ کے مرنے کے بعد غالب نے کبھی تمہیں باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی اور جب سے وہ ہمیں چھوڑ کر گیا ہے اس دن سے ماہانے نہ صرف حالات کا مقابلہ مردانہ دار کیا ہے بلکہ ایک باپ ہی کی طرح اپنی ذمے داریاں بھی سنبھالی ہیں۔ ارے کم بختو! تم تو اس کے احسانوں کا بدلہ بھی نہیں چکا سکتے.....“ وہ زار و قطار رو رہی تھیں۔ میں نے منظر کو ان سے علیحدہ کیا اور انہیں سنبھال دیا۔ منظر ان کے لیے ایک گلاس میں جوس ڈال کر لے آیا۔

”میں تو سوچتی تھی کہ میرے مرنے کے بعد بھی ماہا کا مرتبہ اس گھر میں سربراہ کا رہے گا مگر مجھے اپنی زندگی میں ہی یہ دن دیکھنا تھا کہ تم اتنی گستاخی کرو گے اس کے ساتھ۔“ امی جان نے روتے ہوئے کہا۔

”کہاناں معاف کر دیں، آئندہ ایسا نہیں ہوگا!“ اس نے ٹھٹھوں کے بل بیٹھ کراہی جان کے ہاتھ تھام لیے اور اپنا سر ان کی گود میں رکھ دیا۔

”چلو! منظر! منہ ہاتھ دھو لو، کھانا تیار ہو گیا ہوگا۔ اپنا کمرہ صاف کروانا ہے تو ملازمہ سے کہہ دو کرے گی۔“ میں نے بات بدلی تاکہ ماحول بدلے۔

”ٹھیک ہی ہے کمرہ بھابی! ضرورت نہیں ہے صفائی کی۔“ منظر نے مختصر کہا۔  
کھانا کھانے کے دوران بھی ماحول بوجھل سا ہی تھا۔ میں بھی اس میں کوئی خوشگوار تبدیلی نہ لاسکی۔ بظاہر تو میں نے منظر کا دفاع کر لیا تھا لیکن اندر سے میرا دل بہت خوفزدہ تھا۔

کھانا کھا کر منظر ٹی وی پر اسپورٹس کا کوئی چینل لگا کر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے لیے چائے بنائی اور اپنے کمرے میں لے آئی، چائے پی کر نماز پڑھی اور پھر صبح لے کر لیٹ گئی۔ صبح تو شیر کیا پڑھتی ذہن کی رو پھٹک کر اس طرف چلی گئی اس پر میں منظر سے کہہ دیتی کہ میں اس کے کمرے میں داخل ہوئی تھی تو وہ جانے سے میرے ساتھ کیا سلوک کرتا۔ غیبِ ثورات اور خوف سے مجھے پھریری آگئی۔ میں نے یہی سوچا کہ اب کے تیرے آئے گا تو میں اسے صورتِ حال سے آگاہ کر سکیں گی۔ رات نیند بھی ڈسٹرب رہی اور عجیب و غریب خوابوں نے رہی ابھی کسر بھی پوری کر دی۔

”تو جی میری وقت اور اوقات؟“ صبح اچھارہ دم میں آنے کے سامنے اپنی سوچی ہوئی آنکھیں اور ستا ہوا چہرہ دیکھ کر میں نے خود سے سوال کیا۔ میں جواب بھی پائیں برس کی بھی نہ ہوئی تھی، کیوں میں نے خود پر بھید کی کا یہ خول چڑھا لیا تھا اور کیوں میں نے زندگی کی سب خوشیاں خود پر حرام کر لی تھیں۔ اس لیے ناکہ غالب نے اتنے کم عرصے میں مجھے وہ مان اور پیار دیا تھا کہ میں اس گھر کے ساتھ ایک خوبصورت رشتے کی زنجیر میں بندھ گئی۔ ایک کے بعد ایک دستک ہوتی رہی اور میں نے ان دستکوں کے جواب میں دل کے دروازوں پر انکار کے نکل لگا رکھے تھے اور کیا یہ صلہ تھا کہ اب مجھے یہاں زندگی خوف کے سامنے میں گزارنا ہوگی۔

”لیکن میں یہاں رہنے کی پابند تو تھی۔“ ناشتا زہر مار کرتے ہوئے میں نے سوچا۔ ”کون سا مجھے کوئی مجبوری ہے کہ یہیں رہوں..... میں چاہوں تو والدہ کے گھر جا سکتی ہوں..... میرا خیال ہے کہ یہی بہتر ہوگا۔“ میں گویا دل ہی دل میں کسی فیصلے پر پہنچ گئی تھی۔

”کیا بات ہے ماہا! تم کچھ پریشان ہو؟“ امی جان ناشتے کی میز پر میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھیں اور ان کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”نہیں تو!“ میں یکدم بیٹھا گئی جیسے چوری پکڑی گئی ہو۔  
”مجھے معلوم ہے بیٹا! تم منظر کے روتے سے پریشان ہوگی۔ تم نے خود ہی اس کو سر چڑھا رکھا ہے۔ میں تو اس کے سر سے گستاخی کا بھوت اتار دیتی اگر تم درمیان میں نہ آ جاؤ تو۔“ انہوں نے شرمندگی سے کہا۔

”ارے نہیں امی جان! میں اس کے روتے سے پریشان تو نہیں لیکن اس کی بات سوتی ضرور رہی کیونکہ اس نے کبھی گستاخی کی نہیں پھر جو ان اولاد پر ہاتھ اٹھانا بھی تو مسئلہ کا حل نہیں..... آپ نے دیکھا نہیں کہ وہ بعد میں کیسے شرمندہ تھا اگر آپ اس کو مزید ماتیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ باغی ہو جاتا..... کہیں غصے میں آ کر گھر ہی چھوڑ جاتا تو۔“ میں نے مکمل صورت حال کا نقشہ امی جان کے سامنے پیش کیا۔

”اگر وہ گھر چھوڑ جاتا ہے اس بات پر تو مجھے دکھ نہیں ہوگا۔ ماں ہوں، کئی تو ہوگی لیکن اگر وہ تمہارے ساتھ گستاخی کرے اور تمہارے سارے احسانات بھول جائے تو مجھے بہت دکھ ہوگا۔“ امی جان نے کہا تو میری آنکھیں پھٹک آئیں۔

”اللہ نہ کرے امی جان کہ وہ کبھی بھی گھر چھوڑ کر جانے کے بارے میں سوچے۔“ میں نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔ ”اب ہم کسی کے جانے کا دکھ برداشت نہ کر پائیں گے۔“

”میں تو داد دیتی ہوں بیٹی تمہارے حوصلے کی اور آخر میں ہے تمہاری ماں کی تربیت پر کہ جس نے ایسی تربیت بیٹی کی، کی ہے۔ ایسا تدبیر بظہر آؤ، برداشت اور فہم تو بسا اوقات میری عمر کی عورتوں میں بھی نہیں ہوتا۔ تمہارے لیے دعا مانگتے وقت بھی میرے ذہن میں تمہارا تصور ہو کی حیثیت سے نہیں آتا۔“ امی جان نے کہا۔

”اس لیے امی جان کہ میں آپ کی بیٹی ہوں، بہو نہیں۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔  
”اللہ تمہاری آزمائشیں ختم کرے اور تمہارے لیے آسانیاں فرمائے، آمین!“ امی جان نے کہا۔



منظر کے کالج کی جفتے میں دو تعطیلات ہوتی تھیں۔ اتوار کو تو ہمارا دفتر بھی بند ہوتا تھا البتہ میں نے اسے کہا وہ جفتے کے روز میرے ساتھ دفتر جایا کرے اور پھر آہستہ آہستہ وہ جفتے کے روز آیا ہی دفتر جایا کرے گا۔ اس نے پیش کی کہ جفتے کے روز بڑھائی کی مصروفیات ہوتی ہیں، دوستوں کے ساتھ مل کر بڑھائی ہوتی ہے لیکن میں نے کیا تو وہ مان گیا۔ میں نوٹ کر رہی تھی کہ جفتے کے دن وہ ناشتا کر کے غائب ہوتا تھا اور رات دیر سے گھر آتا بسا اوقات تو ہمیں علم ہی نہ ہوا یا تھا کہ وہ رات کو لوٹا یا صبح کو۔ اسی جان بونیندی کے دوائے کر سوتی تھیں اس لیے اس نے بھی کبھی ایسی گہری نیند میں ہوتی تھی کہ اس کے آنے کا علم ہی نہ ہوا یا تھا۔ اس مسئلے سے منٹنے کے لیے یہاں ناچنے نے خود ہی سوچا اور خود ہی میں نے اسی جان کے سامنے بات چھیڑی۔ ان کا وہ بھی میرے حق میں تھا اس لیے اسے ہتھیار ڈالنے ہی بن پڑی۔

میرے ساتھ وہ پہلے دن جب دفتر گیا تو دو پہر کے بعد بوریت سے جمائیاں لینے لگا۔  
”آپ ویسے کیا چاہتے ہیں بھابی! آج آپ تو بور بھی نہیں ہوتیں۔ پتا نہیں کس مٹی سے بنی ہیں آپ؟“ منظر نے برملا اپنی بوریت کا اظہار کیا۔

”تم ڈھکے چھپے الفاظ میں یہ کہہ رہے ہو کہ میں ڈھپٹ مٹی کی بنی ہوئی ہوں۔“ میں نے مصنوعی غصے سے کہا۔  
”اللہ نہ کرے کہ میں آپ سے ایسی گستاخی کروں!“ وہ یکدم بولا۔  
”جیسے اس سے قبل تو تم نے کبھی مجھ سے گستاخی کی ہی نہ ہو۔“ میں نے نظریں پھیریں۔  
”اس کا مطلب ہے کہ آپ نے مجھے معاف نہیں کیا؟“ اس نے شکوہ کنٹاں نظروں سے دیکھا۔  
”نہیں، معاف تو کر دیا تھا، یونہی بات منہ سے پھسل گئی۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔  
”سچ کہہ رہی ہیں؟“ اس کے سوال میں بے یقینی تھی۔

بالکل سچ کہہ رہی ہوں“ میں نے کہا۔ ”بھی جھوٹ بولا ہے میں نے تم سے؟“  
”شاید!!“ اس نے شاید سادگی سے یہ لفظ کہا مگر میرے من کا چور تو گویا مجھ سے ہی کچھ پوچھنے لگا۔ میں نے بڑی ہمت کر کے ہنسنے کی کوشش کی اور وہ بھی ہنس پڑا۔ دروازے پر دستک ہوئی، میں نے اجازت دی تو نوید صاحب داخل ہوئے۔

”مخل ہونے کی معافی چاہتا ہوں۔“ انہوں نے کہا۔  
”ارے نہیں سراسر ایسی کوئی بات نہیں۔“ منظر نے کہا۔ ”بھابی کے لینے پر ہنس رہا تھا۔“  
”آپ پلیز مجھے سہرا نہیں، سہر تو مجھے آپ کو کہنا چاہیے۔“ نوید صاحب نے منظر سے کہا۔  
”ویسے تو میں آپ کو بھابی جان کا دوست ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ بھابی جان ہی کہتا رہا ہوں اور دفتر سے باہر اب بھی کہتا رہوں گا مگر دفتر کی آداب کے مطابق آپ سینئر ہیں اس لیے مجھے آپ کو سہرا کہنا ہو گا۔“ منظر نے ریکارڈ درست کیا۔

”آپ اس کاروبار کے مالک ہیں اور میں تنخواہ دار ملازم۔“ نوید صاحب نے کہا۔  
”کاروبار کی مالک بھابی ہیں، انہیں آپ میڈم کہتے ہیں، وہ ٹھیک ہے۔ البتہ مجھے آپ سر کہہ کر شرمندہ مت کریں۔“ منظر نے کہا۔

”میں کاروبار کی مالک نہیں ہوں منظر!“ میں نے مداخلت کی۔ ”اس کاروبار کے مالک تم اور تیور ہو، میں اس کا عارضی مگر اس ہوں اور میرے پاس یہ کاروبار ایک امانت ہے۔ نوید صاحب جانتے ہیں کہ کس طرح میں نے اس کتاب کو لپیٹھا اور شفاف رکھا ہے۔“ میں نے وضاحت کی۔

”پلیز جب آپ کہیں جائیں گی تو تب دیکھا جائے گا۔ جب تک آپ ہماری بھابی کی حیثیت سے کاروبار

سنبال رہی ہیں، آپ اس کی اسی طرح مالک ہیں جیسے میں اور تیور بھابی۔“ منظر نے زور دے کر کہا۔  
”میں چلتا ہوں!“ نوید صاحب نے اجازت چاہی۔

”تیوری، میں تو پوچھتا بھول گئی۔ آپ کیوں آئے تھے؟“ میں نے شرمندگی سے کہا۔

”آپ سے کچھ کام تھا بعد میں بات کر لوں گا۔“ نوید صاحب نے کہا۔

”ارے نہیں کل پھر اتوار ہے۔“ اور یوں بھی ابھی تیوری دیر میں، میں اٹھ کر گھر جانے ہی والی ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”آپ بات کریں۔“

”اصل میں مجھے آپ سے اکیلے میں بات کرنا تھی۔“ نوید صاحب نے جھجک کر کہا اور اس بات پر منظر نے چونک کر مجھے دیکھا، میں نے اسے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں یکدم مجھے غصے کا رنگ نظر آیا۔

”ایسی کون سی بات ہے جو منظر کے سامنے نہیں ہو سکتی ہے؟“ میں نے نوید صاحب سے پوچھا۔

”میرے کسی ذاتی معاملے پر بات ہے۔“ نوید صاحب نے مختصر کہا۔

”میں باہر چلا جاتا ہوں!“ منظر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ مجھے اس کے چہرے پر ہراتے ہوئے سائے کچھ خوش آمدند لگ رہے تھے۔ میں دل میں خوفزدہ ہو گئی کہ جانے اس بات کو کیا رنگ دے بیٹھے۔

”نوید صاحب آپ کے رشتے والے معاملے کی بات ہے تو میرا خیال ہے کہ منظر کے سامنے کرنے میں کوئی حرج نہیں!“ میں نے بات سمجھ کر کہا۔

”بات تو وہی ہے۔“ نوید صاحب نے کہا۔ ”میری بڑی بہن اما آپ سے اس سلسلے میں بات کرنا چاہ رہی تھیں اگر آپ اجازت دیں تو آپ کا نمبر دے دوں؟“

”ہاں ہاں! کیوں نہیں، لگتا ہے کہ وہ لڑکی دیکھ آئی ہیں جا کر؟“ میں نے جان بوجھ کر بات اس طرح کی کہ منظر کو کچھ آجائے۔

”جی ہاں! میری بہنیں گئی تھیں۔ وہ لوگ..... مجھے لگتا ہے کہ مطمئن نہیں ہوئیں۔“ نوید صاحب نے کہا۔  
”پلیز آپ انہیں بتا دیں کہ وہ مجھ سے بات کر لیں۔“ میں نے کہا تو نوید صاحب شکر یہ ادا کرتے ہوئے چلے گئے۔

”یہ آپ نے رشتے کروانے کا کام کب سے شروع کر دیا ہے بھابی؟“ منظر نے طعنے پر پوچھا۔  
”میں نے جواب میں خاموشی رکھی۔ واپسی پر گاڑی منظر چلا رہا تھا اور دیر سے خاموشی تھی۔

”کہاں کر داری ہیں آپ نوید صاحب کا رشتہ؟“ منظر نے پوچھا۔

”ہمارے ایک جاننے والے ہیں..... میں نے مختصر کہا۔“ بلکہ میری دوست ہی سمجھ لو۔“

”کون لوگ ہیں یہی تو پوچھ رہا ہوں؟“ اس نے پھر اصرار کیا۔

”تم تو یوں جرح کر رہے ہو جیسے تم میری سب دوستوں اور کلاس فیلوز کو جانتے ہو.....“ میں نے چڑ کر کہا۔  
”سوری! آپ کو برا لگا..... اصل میں مجھے آپ کی بات پر لگا کہ نوید بھابی کو آپ سے کچھ اور بات کرنا تھی لیکن میری موجودگی کی وجہ سے آپ بات بدل گئیں“ اس نے کہا تو مجھے بہت عجیب لگا۔

”منظر تمہیں مجھ پر کچھ زیادہ ہی شک نہیں ہو رہا؟ ہر بات کو تم جھوٹ سمجھتے ہو۔ جانے ایسا کیا کر دیا ہے میں نے کہ تم مجھ سے بدگمان سے رہتے ہو۔ لگتا ہے اب تم بہت بڑے اور بھدار ہو گئے ہو اور تمہیں اندازہ ہو گیا ہے کہ میں اب تک جو کرنی آتی ہوں اور کتنی رہی ہوں وہ سب غلط تھا۔“ میں نے جذباتی ہو کر کہا۔

”بخدا ایسی کوئی بات نہیں.....“ اس نے شرمندگی سے کہا۔ ”اصل میں یونیٹی مجھے لگا کہ نوید بھابی آپ سے اپنے اور آپ کے بارے میں کوئی بات کرنا چاہ رہے تھے، کیونکہ وہ بھی تو کوئی سلسلہ چل رہا تھا۔“ منظر نے جملہ مکمل کیا تو



میں اس کی معلومات پر حیران رہ گئی۔

”تمہیں غالباً اس سلسلے کا تو علم ہوا ہو گا مگر یہ علم نہیں ہوا ہو گا کہ وہ سلسلہ اپنے انجام تک پہنچ چکا ہے اور میں اس تجویز کو رد کر دیتا تھا۔“ میں نے غصے سے جواب دیا اور پھر سامنے دیکھتے ہوئے لب بھجھ لیا۔

”پھر ایسی کیا وجہ ہے کہ جو چیز یا شخص آپ کو اپنے لیے پسند نہیں آیا وہ اپنی دوست کے لیے تجویز کر دیا؟“ مظہر نے چبھتا ہوا سوال کیا۔

”حدیث شریف میں بھی ہے کہ دوسروں کے لیے وہی پسند کر دو جو تمہیں اپنے لیے پسند ہو۔“

”نوید صاحب میں ایسی کوئی خرابی نہیں جو کہ میرے انکار کا باعث بنی ہو۔ بس میرا دل ہی نہیں مانا ورنہ نہ صاحب بہت اچھے انسان ہیں اسی لیے میں نے اپنی دوست کے لیے ان کا سوچا۔“ میں نے کہا۔

”دیے آپ نے اچھا کیا جو آپ نے نوید صاحب سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو آپ کو گھر چھوڑ کر جا پڑتا۔“ مظہر نے کہا۔

”لیکن بہتر ہوتا اگر آپ تیور بھائی کے لیے ہاں کر دیتیں۔“

”تم خاموشی سے گاڑی چلاؤ مظہر۔“ میں نے بات ختم کی۔



شام کو نوید صاحب کی بہن بھائی کی کال آئی، میں ٹی وی روم میں ہی بیٹھی تھی، امی جان بھی پاس ہی تھیں۔ میں نے ہی فون اٹھایا تھا، سلام دعا کے تبادلے کے بعد انہوں نے پوچھا۔ ”آپ سے کچھ پوچھنا تھا اگر آپ گستاخی نہ سمجھیں تو پوچھوں؟“

”جی کیوں نہیں فرمائیے؟“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”اما! آپ جانتی ہیں ہمارے بھائی نے ساری زندگی مصائب کا سامنا کرتے اور اپنے فرائض سے عہدہ بردار ہونے میں گزار دی۔ اب ہمارے اصرار پر وہ بمشکل شادی کے لیے مانے اور آپ کے ساتھ کی خواہش کی۔“ وہ سانس لینے کو کھیں، میں ہمدن گوش تھی۔

”جب آپ کی شادی غالب سے ہوئی تھی تب سے آپ نوید بھائی کو پسند آئی تھیں اور انہوں نے ہم سے ہمیشہ آپ کی بہت تعریف کی۔“

”لیکن مجھے تو یاد بھی نہیں کہ میں بھی ان سے ملی بھی ہوں گی؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”غالب بھائی کی زبانی آپ کی تعریفیں سن سن کر ان کے ذہن میں ایک اچھی بیوی کا تصور بن گیا تھا اور پھر جس طریقے سے غالب بھائی کی وفات کے بعد آپ نے ان کے گھر کو سنبھالا دیا، جس ذمے داری سے کاروبار سنبھالا ہے وہ سب کے سامنے ہے اور نوید بھائی کو آپ کا یہی احساس ذمے داری اچھا لگتا ہے۔ اتنی کم عمری میں اتنی بالغ نظری آج کل ناپید ہے۔“ انہوں نے تفصیل بیان کی۔

”آپ نے مجھ سے زارا کے سلسلے میں بات کرنا تھی۔“ میں نے محتاط الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے بات کا رخ بدلا۔

”میں اسی بات کی طرف آ رہی ہوں، آپ بات کا رخ بدل رہی ہیں۔“ انہوں نے پھر بات شروع کی۔ ”آپ کے تجویز کردہ رشتے کو ہم دیکھنے گئے تھے اما! مجھے تو حیرت ہے کہ آپ نے ہمیں کیا سوچ کر وہاں بھیج دیا؟“ میں ان کی اس بات پر بہت حیران ہوئی مگر امی جان کی موجودگی کی وجہ سے کھل کر بات نہ کر سکتی تھی۔

”کیوں کیا ہوا؟“ میں نے صرف اتنا کہا۔

”اس غریب بستی میں دو کمروں کے اس مکان میں آپ نے ہمیں بھیج کر ہمیں کیا جتلیا ہے، کیا ہمارے بھائی کی یہی اوقات رہ گئی ہے۔ ہم کوئی اتنے گرے پڑے تو نہیں ہیں اما اور آپ چلی ہیں ٹاٹ کا پوند لگانے۔ ٹھیک ہے آپ کو ہمارا بھائی ناپسند سہی لیکن اس کو زارا سے شادی پر مجبور کر کے آپ کس چیز کا انتقام لینا چاہتی ہیں۔ آپ نے نوید



بھائی کو دکھا دیا ہے، کیا یہ کافی نہیں ہے.....؟“ وہ کافی چراغ پا لگ رہی تھیں میں کھل کر بات بھی نہیں کر سکتی تھی۔  
 ”دیکھیے ہاباجی! میں پھر کسی وقت آپ کو کال کر لوں گی، ایسی کوئی بات نہیں ہے، آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔  
 نے انہیں خدا کرنے کی کوشش کی۔

”ماہا! میں نے زندگی کو آپ سے زیادہ دیکھا اور برتا ہے اور جانتی ہوں کہ غریب گھرانوں کی لڑکیاں  
 خوشحال گھرانوں میں عیاشی جاتی ہیں تو ان کے اندر کی بھوک جاگ اٹھتی ہے۔ ان میں قناعت ختم ہو جاتی ہے۔  
 ماحول سے وہ آتی ہیں وہ ماحول نا دیدہ جمیز کی طرح ان کے ساتھ آتا ہے۔ وہ شاید ہمارے بھائی کو وہ دیکھ رہی  
 تھیں جو اس کا حق ہیں، انہوں نے خدا غلط کر لیا۔

”ایسی بات نہیں ہے۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔ امی جان غالباً سمجھ گئی تھیں کہ میں ان کی موجودگی کے بغیر  
 کھل کر بات نہیں کر پا رہی ہوں، اس لیے انہوں نے آرام کرنے کا بہانہ کیا اور اٹھ کھڑی ہو گئیں۔  
 ”ہاباجی! وہ بہت اچھی سمجھدار اور سچی ہوئی لڑکیاں ہیں۔“ میں نے رمان سے سمجھایا۔  
 ”لیکن زارا طلاق شدہ ہے.....“ انہوں نے ہچکچا کر کہا۔  
 ”پھر تو میں بھی بیوہ ہوں!“ یکدم میرے منہ سے پھسل گیا۔

”بیوہ ہونے میں عورت کا اپنا کوئی قصور نہیں ہوتا، جب کہ طلاق کی صورت میں یہ خیال تو بہر حال ذہن میں  
 رہتا ہے کہ اس میں عورت کا کوئی قصور ہوگا۔ اب بغیر نصیحتی کے طلاق کوئی بلا وجہ تو نہیں ہو جاتی ناں، کوئی تو وجہ رہی  
 ہوگی؟“ ہاباجی نے اپنے خدشے کو زبان دے دی۔

”درست کہہ رہی ہیں آپ، وجہ تو ہے اور میں وہ وجہ جانتی بھی ہوں۔“ میں نے کہا۔  
 ”اچھا کیا وجہ ہے؟“ انہوں نے تجسس سے پوچھا۔  
 ”سوئے اتفاق اس کی طلاق کی وجہ اور آپ کے اس رشتے کو ناپسندیدگی کی وجہ ایک ہی ہے یعنی غربت۔ میں  
 نے دکھ سے کہا۔ ”ہمارے ہاں المیہ تو یہ ہے کہ عورت ہی عورت کے لیے گڑھے کھودتی ہے، وہی اس کو قابل تو قرار  
 دیتی ہے اور وہی قابل تو قرار دیتی ہے۔“

”جذبانی باتیں کرنے کے بجائے آپ مجھے یہ بتائیں کہ کیا آپ اپنے بھائی کی برات اس گھر میں لے  
 جائیں گی، جہاں آپ ہمیں اپنے بھائی کی برات لے جانے کا کہہ رہی ہیں؟“ ہاباجی نے پوچھا۔  
 ”بے شک! کیوں نہیں، ہاباجی! آپ کو غالباً نوید صاحب نے پوری بات بتائی نہیں۔ میں نے اپنی والدہ سے کہا  
 ہے کہ وہ دوسرے نمبر والی ٹائی کے لیے علی بھائی کا رشتہ سمجھیں۔“ میں نے وضاحت کی۔  
 ”خود آپ نے زارا کا رشتہ کیوں نہیں مانگ لیا؟ کیونکہ آپ کی والدہ کو یا آپ کے بھائی کو وہ طلاق شدہ لڑکی  
 پسند نہیں آتی؟“ انہوں نے طنز سے مجھ سے پوچھا۔

”سیدھی سی بات ہے ہاباجی! نوید صاحب بڑے ہیں عمر میں علی بھائی سے، صرف یہ سوچ کر میں نے یہ بات  
 کہی تھی ورنہ جیسے آپ مناسب سمجھیں۔ میں سمجھ رہی تھی کہ آپ کو نہ نوید صاحب کو۔“ میں نے ان کو  
 وضاحت کی۔

”ہمارے بھائی کے لیے آپ کی بات کی کیا اہمیت ہے اس کا اندازہ آپ کو اس بات سے ہو جانا چاہیے کہ  
 انہوں نے خود ساتھ جانے کی ہاں بھری اور نہ ہی لڑکی کی تصویر دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ کہتے ہیں جو آپ ان کے لیے  
 مناسب سمجھ رہی ہیں، وہ ضرور مناسب ہوگا۔“ ہاباجی کے لہجے میں غالباً حد تھا۔

”یہ نوید صاحب کا بڑا پین ہے کہ انہوں نے مجھے اس قابل سمجھا۔ یقین کریں میں نے بھی خلوص نیت سے ان  
 کے لیے وہی بہتر سمجھا جو میں اپنے بھائی کے لیے سمجھ رہی ہوں اور اگر آپ زیادہ ملیں جلیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ زارا

بالکل ویسی ہی لڑکی ہے جیسی لڑکی کی نوید صاحب کو ضرورت ہے۔“ میں نے وضاحت کی۔  
 ”خدا کرے کہ آپ کا اندازہ صحیح ہو مگر میرا تجربہ بھی بالکل غلط نہیں ہو سکتا۔ ایسی لڑکیاں جب پر پڑے نکالتی  
 ہیں تو پھر ہم جیسے نادمہ مانگتے رہ جاتے ہیں۔ ویسے آپ کو ان لڑکیوں سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟“ ہاباجی نے پوچھا۔  
 ”مجھے اچھی لگیں وہ بچیاں، ان کا سلیقہ اور شرافت اور اس گھرانے کی مشکلات کی وجہ سے سوچا کہ شاید مجھے اللہ  
 نے ان کے لیے بہتری کا وسیلہ بنایا ہے۔“ میں نے وضاحت کی۔ ”کون کون کیا تھا؟“

”میں، فوزی، میری بہن اور ہماری بڑی چھوٹو۔“ انہوں نے بتایا۔  
 ”آپ نے زارا کی والدہ سے اس سلسلے میں کوئی بات کی؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”میں ہم اچانک ہی گئے تھے۔ انہیں غالباً ہمارے یوں جانے سے شک تو پڑا ہوگا مگر چھوٹو کا کہنا تھا کہ کوئی  
 بات نہ کی جائے۔ البتہ ہم جانے وغیرہ بلی کر تھوڑی دیر بیٹھ کر آ گئے۔“ انہوں نے بتایا۔

”تو اس کا مطلب ہے آپ کو زارا پسند نہیں آتی؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”بچیاں اچھی ہیں، والدہ بھی اچھی ہیں اور گھر بھی صاف ستھرا تھا، جس طرح ہم اچانک اٹھ کر چلے گئے تھے،  
 بغیر بتائے۔ زارا اخبار پڑھ رہی تھی، ٹائیٹل مشین پر کوئی کام کر رہی تھی، شام چھن چھو رہی تھی اور ان کی والدہ چائے بنا رہی  
 تھیں۔“ انہوں نے سب کی حالت کا بتایا تو میری آنکھوں کے سامنے گھر کا نقشہ سامنے آیا۔

”منظر علی سے ملاقات نہیں ہوئی آپ کی؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”وہ گھر پر نہیں تھا، البتہ ہماری جانے کے دوران وہ بھی آ گیا تھا۔“ انہوں نے بتایا۔ ”چھوٹو کو البتہ ایک بات  
 اچھی لگی کہ ہمیں جانے دی گئی تو ویسی ہی جانے باہر ڈرائیور کو بھی بھجوائی اور زارا کی والدہ نے یہ بھی معذرت کی کہ ان  
 کے گھر میں ڈرائیور کو بٹھانے کی جگہ نہیں تھی۔“

”پلیس آپ کی چھوٹو کو کچھ تو پسند آ یا ناں۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”آپ پلیز میری طرف سے خود کو مجبور نہ  
 سمجھیں اور نہ ہی نوید صاحب، خود ہی دیکھ بھال کر اور آپس میں مشورہ کر کے جو مناسب سمجھیں وہ فیصلہ کریں۔ ہو سکے  
 تو استعارہ کریں۔ میری والدہ صاحبہ تو ہمیشہ ایسے مواقع پر استعارہ کرتی ہیں۔“  
 ”بہت شکریہ ہم ایسا ہی کریں گے۔“ ہاباجی نے کہا۔ ”ویسے ماہا کوئی مچھائش نہیں آپ کے دل میں ہمارے  
 بھائی کے لیے؟ آپ ہماری عرضی پر غور تو کریں۔“

”پلیز ہاباجی! یہ باب بند ہو چکا ہے، اسے بند ہی رہنے دیں۔“ میں نے التجائیہ انداز میں کہا۔  
 ”فون کال ختم ہوئی تو میں امی جان کے کمرے میں گئی، وہ صوفے پر بیٹھی ہوئی تھیں پڑھ رہی تھیں۔ میرے ذہن  
 میں یہ خیال تھا کہ وہ اسی لیے اٹھ کر آئی تھیں کہ میں کھل کر فون پر بات کر لوں۔ جانے وہ کیا سوچیں یا کیا سمجھیں یہی  
 سوچ کر میں ان کے پاس آئی اور انہیں ساری بات کھل کر بتادی۔“ منظر علی سے لے کر جو میں نے نوید  
 صاحب کو رشتہ تجویز کیا تھا اور اپنی والدہ صاحبہ کو بھی۔ وہ خاموشی سے سنتی رہیں۔ میں نے زارا، ٹائی اور شا کے سلیپے کی  
 بجلی بہت تعریف کی۔ امی جان نے میری سوچ کو بہت سراہا اور دعا کی کہ اللہ ان بچیوں کے نصیب اچھے کرے۔  
 ”اور امی جان!“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”شا بھی بہت پیاری بچی ہے، اسے ہم اپنے چھوٹو کے لیے لے لیں  
 گے۔“ اور اس بات پر ہم دونوں خوب کھل کر ہنسے۔

☆☆☆

میں دفتر کے کام میں مصروف تھی کہ چیراجی نے صدف باجی کے آنے کی اطلاع دی۔ مجھے بہت حیرت ہوئی۔  
 کبھی اس سے قبل وہ اس طرح دفتر میں نہیں آئی تھیں۔ میں نے انہیں اندر بلوایا، ان کے ہمراہ کوئی اور آ دی بھی تھا۔  
 میں نے انہیں بیٹھنے کو کہا اور جوس منگوایا۔



”خیریت سے آئیں آپ صدف باجی؟“ میں نے ہالا خروبر سے دل میں مچلے سوال کو زبان دی۔

”خیریت ہی ہے..... ہمارے اسپتال میں نئے ڈاکٹر آئے ہیں ڈاکٹر معظم، یو کے میں ہوتے ہیں اور

سال تین ماہ کے لیے پاکستان آیا کریں گے..... دل کے ڈاکٹر ہیں۔“ صدف باجی نے تعارف کروایا۔ میری

نظریں ان کی طرف اٹھی رہیں۔ ڈاکٹر معظم سے تعارف میرے سوال کا جواب نہیں تھا۔

”اصل میں، میں سوچ رہی تھی کہ والدہ کو ڈاکٹر معظم سے چیک اپ کرواؤں اور اگر سرجری کی ضرورت

بھی انہی سے کروائی جائے، چاہے پاکستان میں کروائی پڑے یا باہر لے جا کر۔“ صدف باجی نے دساحہ

اس پر بھی میری نظر کا سوال برقرار تھا۔

”تو میرے دفتر آنے کی کیا وجہ ہے؟“ میری حیرت کو زبان مل گئی۔

”معظم میرا جو نذر بھی ہوتا تھا اور میرے ایک جھٹکا بیٹا بھی ہے..... اس کی بیوی کا شادی کے تین سال کے

انتقال ہو گیا تھا، ایک بیٹی ہے وہ بھی اپنی ایک بے اولاد خالہ کے زیر پرورش ہے..... خرم (صدف باجی کے شوہر کا)

خیال ہے کہ تمہارا اور معظم کا.....“ ہالا خروبر صدف باجی نے ہلی تھیلے سے نکال دی۔

میرا چہرہ بالکل بے اثر تھا اور ڈاکٹر معظم بڑے اشتیاق سے مجھے گھور رہا تھا۔ شاید وہ دیکھنا چاہ رہا ہوگا کہ اس

بات پر میرے کان شرم سے لال اور چہرہ گلابی ہو جائے گا یا غالباً میں دوپٹے کا کونا دانتوں میں دباکر شرمناک حیرت

دوں کی گھبراہٹ کا کچھ نہ ہوا۔

زندگی! اے زندگی..... تو نے مجھ کو کیوں انوکھے انداز دے دیے ہیں

یا اللہ!

مجھے مصائب دیے ہیں اور پھر ان کا سامنا کرنے کی ہمت بھی

مشکلات کا کوہِ گراں

اور مردانہ اور میری جدوجہد

اور اس لبادے کو اوڑھ کر میری تسوانیت

کہیں میرے وجود کی قبر میں سو گئی ہے

دل کچھ کہتا ہے، دماغ نفی کر دیتا ہے

دماغ سوچتا ہے تو دل نہیں کر دیتا ہے

اس کشمکشِ تن و من میں

میری روح کی حالت ایسی ہو گئی ہے

”بڑا بھونڈا سا طریقہ ہے ڈاکٹر معظم صاحب کا مجھے پروپوز کرنے کا اور بغیر دیکھے اتنے یقین سے یہ سوچ پینے

کہ غالباً میرے پاس انکار کوئی گنجائش نہیں ہے۔“ میرا لہجہ جانے کیوں تنگ ہو گیا اور ڈاکٹر معظم کے چہرے کا رنگ

یکدم تبدیل ہو گیا۔

”زبردست! صدف آپ نے بتایا تھا ہم نے ویسایا پایا، اور یہ انداز تو ہمیں اور بھی پسند آیا۔“ ڈاکٹر

معظم شکل سے جتنا خود پرست لگ رہا تھا، باتوں میں اس سے بڑھ کر لگا۔

”معظم نے تمہیں خاندان کی شادیوں وغیرہ کی فلموں میں بھی دیکھ رکھا ہے اور اس کی والدہ یعنی رانی باجی

بھی تمہیں اچھی طرح دیکھ رکھا ہے، تم جانتی نہیں ہو کیا انہیں؟“ صدف باجی نے معظم کی بات کی خفت مٹانے کے

صفائی پیش کی۔

”جی رانی باجی کو تو میں جانتی ہوں۔“ میں نے مختصر کہا۔ رانی باجی بھی معظم کی والدہ تھیں اور بیٹے سے چار

بھائی تھے۔

”یہ کیا تم نے عادتیں بگاڑ رکھی ہیں اس کی؟ میں تو کبھی اس وقت گائے والے کو ناشتا نہ دوں۔“ ماہ رخ نے انگلی

پر

بڑھ کر تجھیں۔ انہیں بھی ہر بات میں سے شروع کر کے میں پر ختم کرنے کا خیال ہوتا تھا۔ جو پہنا ہوتا تھا اس کی قیمت سب

کو جانا ضروری سمجھتی تھیں۔ مجھے تو حیرت تھی کہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس طرح کے ”اوجھی“ عادات والے رشتے

کو برے لیے لانے کی صدف باجی کی کیا تک تھی۔

”آپ چاہے کس کی صدف باجی؟“ میں نے ان سے پوچھا اور ڈاکٹر معظم کو نظر انداز کر دیا۔

”جی نہیں، چلتے ہیں.....“ وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔ ”اصل میں مجھے بھی یہ طریقہ زیادہ مناسب نہیں لگا تھا مگر رانی

باجی کا دھرم تھا اس لیے اتنے بھونڈے طریقے سے ملاقات کروانا پڑی۔ ظاہر ہے تمہاری سسرال میں تو ملاقات کے

لیے آئیں جا سکتا تھا۔ بات تو والدہ کے ذریعے سے ہی ہو گئی لیکن اس سے قبل مجھے تمہاری اور ڈاکٹر معظم کی ملاقات

کروانی تھی۔“ میں خاموش رہی۔

”اور اس پہلی ملاقات نے آئندہ ملاقات کی طلب میں اضافہ کر دیا ہے۔“ ڈاکٹر معظم یوں گفتگو کر رہا تھا جیسے

جنوں سے میرا ناشتی رہا ہو۔ میں نے بمشکل خود کو اسے ”شٹ اپ“ کہنے سے روکا۔ مجھے ایسے چپکوا پنا اور لچر ختم کے

مردوں سے سخت چڑھی۔ وہ لوگ اٹھ کر چلے بھی گئے لیکن میری کوفت میں کی نہیں ہو رہی تھی۔ جانے کیسے کیسے لوگ

میرے جی کو جلانے آ جاتے ہیں۔ بڑی شدت سے میں انتظار کر رہی تھی کہ کہیں صدف باجی اکیلے میں ملیں تو ان سے

بات کروں لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری تھا کہ والدہ صاحبہ سے بات کروں اور ان سے کہوں کہ مجھے ”ایسی چیزوں“

سے بچائیں۔

ماہ رخ لندن سے واپس آ گئی تھی اور خوب سرخ و سفید ہو کر آئی تھی۔ لگتا ہی نہ تھا کہ اس نے دو بچوں اور نگہت کو

سنبھالنے کی ڈیوٹی کی ہوگی۔ اپنی آمد کے تیسرے روز وہ اتوار کے دن ہمارے ہاں آ گئی، میں کسلندی سے دیر تک

بستر پر پڑی رہی تھی اور اس طرح تکیے اور صحن زدہ لباس میں بی بی وی لاؤنج میں آ بیٹھی جہاں امی جان سبزی پھیل

رہی تھیں۔ میں نے ان سے پوچھا اور بچن سے دو کپ چائے بنا لائی۔ ملازمہ کپڑوں کی دھلائی میں مصروف تھی۔ مظہر

ابھی تک کمر بند کیے سو رہا تھا۔

میں نے بی بی پر خبریں لگائیں اور صوفے پر ٹانگیں رکھ کر بیٹھ گئی، تبھی باہر کی کھنٹی بجی اور ملازمہ نے دروازہ

کھولا۔ ہم ملازمہ کے منتظر تھے کہ وہ آ کر بتائے کہ کھنٹی کس نے کی ہے، مگر اس کے بجائے ماہ رخ مسکراتی ہوئی داخل

ہوئی۔ ہمیں تپاک سے ملی اور خیریت وغیرہ بولی۔ اس کے مقابلے میں تو میں اپنے حلیے سے اس وقت کوئی ملازمہ ہی

لگ رہی تھی۔ چائے کا پوچھا تو اس نے انکار کر دیا کہ کھانا کھائے گی اور شام تک بیٹھیں رہے گی۔ میں نے اسے امی

جان کے پاس بائیں کرتا ہوا چھوڑا اور آ کر اپنا کمر اسنووار پھر ایک بیکلے سے رنگ کا سوٹ نکالا اور شانور لینے کے لیے

منزل خانے میں ٹھس گئی۔ بیس، پچیس منٹ میں، میں کمرے سے نکلی تو وہ اکیلی بیٹھی بی بی وی دیکھ رہی تھی۔ امی جان بچن

میں تھیں۔ میں نے امی جان کو بچن سے نکالا اور ماہ رخ کو اپنے پاس بی بلایا۔ تقریباً ڈیڑھ بجے تھے تب مظہر بچن میں

داخل ہوا اور ناشتی کی فرمائش کی۔ ماہ رخ کو سلام کیا۔

”اب تو دوپہر کا کھانا تیار ہے مظہر!“ ماہ رخ نے حیرت سے کہا۔

”مگر میں تو اچھی جاگاہوں اس لیے پہلے ناشتی کروں گا۔“ اس نے ضدی لہجے میں کہا۔

”اچھی دھونس ہے بھئی!“ ماہ رخ نے کندھے اچکائے۔ میں نے جلدی سے انڈا فراہم کیا، چار تو سینگے اور

کھنن جیم کے ساتھ چھریاں کاٹنے رکھ کر بڑے تیاری اور مظہر کو دی تو وہ بڑے لے کر بی بی وی روم میں امی جان کے پاس

جا بیٹھا۔

”یہ کیا تم نے عادتیں بگاڑ رکھی ہیں اس کی؟ میں تو کبھی اس وقت گائے والے کو ناشتا نہ دوں۔“ ماہ رخ نے انگلی

پر



سے کہا۔

”ایک ہی تو دن ہوتا ہے بنتے میں اس کی چھٹی کا۔ خبر ہے اگر دیر سے جاگتا ہے تو۔“ میں نے صفائی میزے لیے تو مظہر بچہ ہی تھا اور میری اس کے ساتھ دوستی بھی تھی اور یوں بھی یہ کوئی اتنی بڑی بات نہ تھی۔

”امید ہے کہ تم نے تیور کی عادتیں اس طرح بگاڑی ہوئی نہیں ہیں؟“ ماہ رخ نے مسکرا کر پوچھا۔

”اس کی عادتیں بگاڑنے اور سنوارنے کا تو مجھے موقع ہی نہیں ملا، میرے آنے کے بعد جلد ہی وہ اکثر بیٹھا تھا۔ اس کی عادتوں کے بگاڑ اور سنوار کے لیے تمہیں بھرپور موقع فراہم ہوں گے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”اس کی اچھی بری عادتیں تو اب تک پختہ ہو چکی ہوں گی!“ ماہ رخ نے بھی ہنس کر کہا۔

”خبردار جو تم نے میرے بھائی کی عادتوں کو برا کہا تو.....“ میں نے مصنوعی ناراضی سے کہا۔

کھانا بھی خوشگوار ماحول میں کھایا گیا پھر ماہ رخ نے ہم سب کو تحائف دیے۔ مظہر کے لیے وہ ایک خوبصورت جیکٹ لائی تھی، میرے لیے پنڈ بیک اور امی جان کے لیے پرفیوم۔ ہم سب نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

”تیور بھائی کے لیے کیا گفٹ لائی ہیں آپ؟“ مظہر نے مصیبت سے پوچھا تو وہ شرمائی۔

”تمہیں کیوں محسوس ہے تیور کے گفٹ کا؟“ وہ خود آئے گا تو اسے مل جائے گا۔“ میں نے مظہر سے کہا۔

”تم دونوں مت لڑو، میں کچھ بھی نہیں لائی۔“ ماہ رخ نے کہا۔

”کیوں بھائی! یقین آ گیا آپ کو کہ تیور بھائی کے لیے کوئی گفٹ نہیں آیا ہوگا؟“ مظہر نے سوال کیا۔

”نہیں چھوٹو مجھے یقین نہیں آیا!“ میں نے بھی ہنس کر جواب دیا۔

”بھابی آپ نے مجھے پھر چھوٹو کہا۔“ مظہر نے ناراضی کی ایکٹنگ کی۔

☆☆☆

پنج بیک میں، میں بیٹھی اپنا کوئی کام کر رہی تھی کہ نوید صاحب نے ملنے کی اجازت مانگی اور چلے آئے۔ میں نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”میڈم! میں نے ہمارا نوڈیہ کو سمجھایا ہے اور وہ لگتا ہے کہ کچھ قائل ہو گئی ہیں، صرف چند ایک اعتراضات تھے۔“ نوید صاحب نے کہا۔

”چند ایک اعتراضات؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”یقین کریں کہ ان میں سے کوئی بھی اعتراض میری طرف سے نہیں ہے، بس عورتوں کی باتیں ہوتی ہی کچھ ایسی ہیں۔“ وہ بات کرتے ہوئے ہنسیا رہا تھا۔

”آپ وضاحت کریں کہ کیا اعتراضات ہیں تو ہی میں سمجھ سکوں گی۔“ میں نے زور دے کر کہا۔

”اصل میں میری بہنوں کو اور اس سے زیادہ میری بڑی پھوپھی کو ان کے علاقے پر اعتراض ہے، اگر وہ کہیں اور گھر وغیرہ کرائے پر لے لیں یا خرید لیں تو.....“ وہ ادھوری بات کر کے خاموش ہو گئے۔

”میں سمجھتی تھی کہ آپ کی شادی کے معاملے میں زیادہ وقت آپ کی بات کی ہوگی مگر اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے گھر کے معاملات میں بڑی پھوپھی کے فیصلوں کی اہمیت سب سے زیادہ ہے اور جو بات وہ سوچتی ہیں اور جس طرح سے سوچتی ہیں، ظاہر ہے کہ اسے ہم تبدیل نہیں کر سکتے۔“ میں نے بے بسی سے کہا۔

”پھوپھی کی اہمیت ہمارے گھر میں واقعی زیادہ ہے کیونکہ والدین کے بعد انہوں نے ہمارے سر پر دست شفقت رکھا میری ایک بہن کو اپنی بہو بنوایا اور میری بہنوں کی شادیوں کے تمام معاملات انہوں نے ہی طے کیے.....“ نوید صاحب نے وضاحت کی۔

”سوری! آپ کو برا لگا، میرا یہ مطلب ہرگز نہ تھا۔ میرا مطلب تھا کہ پرانی اور نئی نسل کی سوچ میں فرق ہو۔“



چاہیے ناں۔" میں نے گڑبڑا کر کہا۔

"میں نے اسی نظریے کے تحت انہیں قاتل کیا ہے، لیکن ان کا یہ اعتراض بے جا نہیں کہ وہ لوگ اگر کوئی علاقے میں....." نوید صاحب کی بات میں نے کاٹ دی۔

"نوید صاحب آپ بھی جانتے ہیں کہ ان کے گھر میں ذریعہ آمدنی کیا ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا۔ پانچ دھان کے ہاں گئی ہوں مگر مجھے کبھی وہاں جا کر شرمندگی نہیں ہوئی۔" میں نے ذرا خشکی سے کہا۔

"دو تہائی اور دھن داری کے معاملات مختلف ہوتے ہیں، آپ دیکھ لیجئے گا کہ اگر آپ اپنی والدہ کو وہاں جا میں گی تو ممکن ہے کہ وہ بھی اسی بات پر اعتراض کریں۔" انہوں نے شرمندگی سے کہا۔

"میں اپنی والدہ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ تاہم آپ جیسے کہہ رہے ہیں میں ان سے موقع مناسب دیکھ کر بات کروں گی لیکن اس بات کا مجھے علم ہے کہ ان کے وسائل اس بات کے تحمل نہیں ہو سکیں گے۔" میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

اس سلسلے میں، میں ان کی مدد کر سکتا ہوں۔" انہوں نے جھپکتے ہوئے کہا۔

"میرا اندازہ ہے کہ وہ سفید پوش اور خوددار لوگ ہیں، کسی تیسرے شخص سے اس طرح امداد کبھی قبول نہیں کریں گے۔" میں نے دھوکے سے کہا۔

"اگر ہم مستقبل میں اس مضبوط حلق کی ڈور میں بندھنے والے ہیں تو میں ان کے لیے دوسرا تیسرا شخص نہیں رہوں گا۔" انہوں نے دلیل دی۔

"یہ بات آپ اپنے مستقبل کی حیثیت میں زیادہ بہتر طرح سے کر سکیں گے، ابھی اس وقت یہ بات نہ چھیڑیں۔" میں نے کہا۔

"مجھے نہ آج ان کی رہائش پر اعتراض ہے نہ بعد میں ہوگا۔ سارا مسئلہ یہی ہے ہمارے ہاں کی عورتوں کا کہ معنی یا شادی پر عریزہ دیا قارب باتیں کریں گے۔" نوید صاحب نے کہا۔

"کتنی یا شادی تو شادی ہال یا کسی ہوٹل وغیرہ میں بھی ہو سکتی ہے، تاہم میں پھر بھی دیکھتی ہوں کہ اس معاملے کو کس طرح ڈھلایا جاسکتا ہے۔" میں نے گویا بات ختم کی۔

"یقین کریں کہ مجھے آپ سے یہ بات کرتے ہوئے بہت شرمندگی ہو رہی ہے کہ جانے آپ میری بابت کیا رائے قائم کریں گی حالانکہ مجھے نہ شادی سے قبل لڑکی دیکھنے سے دلچسپی ہے نہ اس کا گھر۔" نوید صاحب نے کہا۔

"خود کو اس معاملے سے لافظ ثابت کر کے آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں اور میرے ضمیر پر بوجھ بڑھا رہے ہیں۔" میں واقعی شرمندہ ہو رہی تھی۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے، آپ عمر میں مجھ سے ممکن ہے کہ بہت چھوٹی ہوں لیکن میں نے ہمیشہ آپ کی عزت اور احترام کیا ہے اور آپ کا یہ خیال اور سوچ بھی میرے لیے محترم ہے۔ اسے آپ میری لافظی نہ سمجھیں بلکہ یہ آپ پر میرے اعتماد کا اظہار ہے۔" نوید صاحب یہ کہہ کر دفتر سے چلے گئے اور میں دیر تک جانے کس سکنے کی کیفیت میں رہی۔ ایسا نہ ہو کہ زارا کے بارے میں میرا اندازہ قاطع ثابت ہو اور نوید صاحب کی زندگی میرا کہنا مان کر اجڑن ہو جائے۔

☞☞☞

بہادر پور کچھ ایسا دور تھا کہ تیمور مینے میں ایک بار بھی نہ آ سکا مگر جب سے اس نے یونٹ میں رپورٹ کی تھی تب سے یونٹ آگے بارڈر پر متعین تھی۔ حالات کا یہ خراب تھا جسے اس لیے اسے چھٹی نہیں مل پاتی تھی۔ یہی وجہ اس فون آتا تو بھی اتنی ہلکی اور کمزور آواز ہوتی تھی کہ آدھے الفاظ کی سمجھ آتی تھی اور آدھے ہم اندازے سے ہی سمجھتے تھے

اور یہی کیفیت غالباً تیمور کی تھی۔ دو تین دفعہ ماہ رخ نے مجھے کال کر کے پوچھا تھا کہ کیا تیمور کو اس کے آنے کی خبر نہ ہوئی تھی۔ میں نے خود تیمور کو ماہ رخ کی آمد کا بتایا تھا مگر یہ سوچ کر کہ اس کے کال نہ کرنے کو یہ کیا سمجھے، میں نے خود ہی تیمور کا دفاع کیا۔

"اصل میں جب سے تم آئی ہو ہمیں بھی اس کی کوئی کال نہیں آئی..... اور یوں بھی جہاں پردہ ہے وہاں پر ہماری طرف سے بھی رابطہ بہت مشکل ہوتا ہے۔" میں نے وضاحت کر کے فون بند کیا ہی تھا کہ امی جان نے فوراً کہا۔

"مجھے اس لڑکی کی آزاد خیالی کوئی زیادہ پسند نہیں ہے اور ممکنہ کارشتہ کیا ہوتا ہے کہ یہ تیمور سے بات کرنے کو روک رہی ہے۔ ایسی کون سی باتیں ہیں جو اسے تیمور سے کرنا ہیں۔"

"کوئی بات نہیں امی جان! آج کل کے زمانے میں یہ کوئی ایسی انہونی بات نہیں ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"تمہاری بھی ممکنہ ہوئی تھی، میرا خیال ہے کہ شادی سے پہلے بھی باتیں نہیں ہوئی ہوگی۔" انہوں نے خشکی سے کہا۔

"وہ زمانہ اور تھا امی اور یہ زمانہ اور ہے۔"

"کوئی ایسی پرانی بات بھی نہیں ہے، نہ ہی تم لوگ ایسے بوڑھے تھے۔" وہ بدستور برہم تھیں۔

"امی جان ہمارے حالات اور تھے اور پھر آپ کو میں نے بتایا تھا کہ تیمور اور ماہ رخ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور ممکنہ سے پہلے بھی وہ ایک دوسرے سے رابطے میں تھے۔" میں نے انہیں رمان سے سمجھایا۔

"مجھے تو ایسی لڑکیاں بہت خلیہ ناگ تھیں جو گھر والوں سے بالا ہی بالالوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیتی ہیں اور یہ لڑکی تو مجھے ہمیشہ سے ہی پسند تھی۔ میں تو اس کے حق میں تھی۔ مناسب وقت پر لڑکیوں کی شادیاں ہو جائیں تو وہ مسرال کے ماحول میں رچ بس جاتی ہیں جب کہ ایسی لڑکیاں! امی جان نے ماہ رخ کی ٹیپ چڑھا رکھی تھی۔ میں انہیں غصہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ہفتے کا دن تھا، منظر دفتر گیا ہوا تھا، اب ایک ہفتے کے روز میں اس کے ساتھ جاتی تھی اور اس سے اگلے ہفتے کو میں اسے اکیلے دفتر بھیجتی تھی۔ اگرچہ وہ دن میں ہر بات کے لیے مجھے پچاسوں ہافون کرتا تھا۔ ہم دونوں باتوں میں مصروف تھے کہ منظر کی کال آگئی اور میں اس سے بات کرنے میں مصروف ہو گئی۔

اطلائی گھنٹی کی آواز آئی، ملازمہ چھٹی پر تھی اس لیے امی جان اٹھ کر دروازہ کھولنے چلی گئیں۔ میں فون پر بات کر رہی تھی کہ آنے والے تیمور کو دیکھ کر حیرت سے میری چیخ نکلی اور فون بند ہو گیا۔ جلی ہوئی رنگت، گالوں اور ٹھوڑی کی نمایاں ہڈیاں..... کتنا کمزور لگ رہا تھا وہ۔ امی جان بار بار اس کا منہ سرچوم رہی تھیں۔ اب کے تو وہ تقریباً ساڑھے تین ماہ کے بعد آیا تھا۔ میں نے اسے تازہ جوس بنا کر دیا۔ منظر کا دو پارہ فون آیا، میں نے ہی اٹینڈ کیا، وہ بہت پریشان تھا کہ مجھے کیا ہوا تھا۔ میں نے اسے تیمور کی آمد کا بتایا تو وہ بھی خوشی سے تقریباً چیخ اٹھا۔ فون بند ہوا تو مجھے اندازہ تھا کہ وہ انشا اللہ اگلے آدھے گھنٹے میں گھر ہوگا۔

"تم اٹھ کر فریش اپ ہو جاؤ، منظر بھی آنے والا ہوگا، میں کھانا بنالوں۔" میں نے ہدایات جاری کیں۔

"بھائی! میں گھر آیا ہوں، پلیز مجھے ایسے ہی رہنے دیں۔ فریش اپ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ منظر کون سا کوئی لڑکی ہے؟" اس نے سستی سے کہا۔

"اوہ ہاں یاد آیا تم نے ماہ رخ کو کال نہیں کی؟" میں نے سوال کیا۔ اچانک نظر اٹھی تو مجھے امی جان کے چہرے پر ہنس کے آثار نظر آئے۔

"اچھا! پس آگئی ہے وہ؟" تیمور نے لہجہ کو سرسری رکھنے کی ایک ٹیکنیک کی۔

"بیٹا تو تھا تمہیں میں نے فون پر....." میں نے حیرت سے پوچھا۔



”اس فون پر تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا، نہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ بول رہی ہیں نہ امی جان کی اور نہ آوازوں میں فرق لگتا ہے۔“  
 ”اب ایسی بھی نہیں ہونے کی۔“ اس کی بات پر میری ہنسی نکل گئی۔  
 ”کتنی چھٹی آئے ہو میرے بچے؟“ امی جان نے کہا۔  
 ”آئندہ اتوار کو دوبارہ آئے۔“ مختصر اس نے کہا۔  
 ”کیا حالت ہوگئی ہے تمہاری؟ کب تک یونٹ باہر رہے گا؟“ امی جان پریشان تھیں اور اس کے ہاتھ پھیر رہی تھیں۔

ماں بھی کیا رشتہ ہے  
 عمر بھر اس کی اولاد اس کے وجود کا  
 وہی ایک شہدہ بگڑا ہی رہتی ہے  
 اپنے وجود کو قسیم کر کے  
 جن اولادوں کو ختم دیتی ہے  
 وہ دنیا میں بکھر جاتی ہے، اپنے مقاصد کی تلاش میں  
 اور ماں بن جاتی ہے  
 ایک نامممل وجود

JIGSAW پزل کی طرح  
 جس کے کچھ ٹکڑے علیحدہ ہو گئے ہیں اس سے  
 انہی کی تلاش میں وہ عمر بھر  
 سرگرداں رہتی ہے  
 یہ ٹکڑے اسے مل کر بھی نہیں پاتے  
 کہ یہ ٹکڑے دوبارہ اس کے وجود سے  
 کبھی شملک نہیں ہو پاتے

ماں!

کہ لپٹا دو جاؤں کا دامن

اور آچل کی چھایا

اپنے وجود کے ٹکڑوں پر تان کر

زندگی بھر پاپہ سفر رہتی ہے

تیور کیا کھاؤ گے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”کر لے گوشت اگر یک سبکیں تو؟“ اس نے فرمائش کی۔

”ان کا تو موسم ہی ختم ہو گیا ہے۔“ امی جان نے کہا۔

”تو پھر کچھ بھی بنائیں، آپ جو بھی بنائیں گی اچھا ہی ہوگا۔“ تیور نے کہا۔

منظر آیا تو دونوں بھائی بڑے جوش و خروش سے ملے، کتے عرصے کے بعد دونوں ملے تھے۔ میں نے منظر کو دیکھا  
 میں بلایا اور اسے دوڑایا کہ کہیں سے بھی کر لے ڈھونڈ کر لائے۔ خود میں نے اتنی دیر میں فریزر سے شامی کباب نکال  
 دیے۔ مرغی بھی نکال دیکھ کر اگر کر لے نہ لے تو مرغی جلدی سے بن جائے گی۔ یعنی دیر میں، میں نے سلاوا بنایا اور

موندھا اور چینی تیار کی منظر کر لے لے کر آ گیا۔

”دو بی بھائی! مشکل اسنے ہی ملے ہیں، دس دکانوں کی خاک چھان کر۔“ اس کی شکل سے ہی اس کی کوشش کا  
 اندازہ ہو رہا تھا۔ کر لے تھے بھی اسنے خاص نہیں تاہم میں نے اس کا دل توڑنا مناسب نہ سمجھا۔

”بہت اچھے ہیں، اور مجھے پتا تھا کہ تم جہاں سے بھی ہو سکا ڈھونڈ کر لاؤ گے۔“ میں نے اسے تھکی دی۔ رات  
 کھانے کی مہم پر تیور کی خوشی کر لے گوشت دیکھ کر دیدنی تھی۔ اس نے تقریبنوں کے پل باندھ دیے۔

”آج کے کر لے گوشت کا سارا کر لے ٹو منظر کو جاتا ہے، کیونکہ اگر وہ کر لے نہ لاتا تو تمہاری فرمائش پوری  
 ہونا ممکن نہ ہوتا۔“ میں نے پھر منظر کی تعریف کی۔

”امی مجھے تھوڑی دیر تک علی بھائی لینے آ رہے ہیں۔“ میں نے میز پر بیٹھے ہی انکشاف کیا۔

”کیوں بیٹا، خیریت تو ہے؟“ امی جان تشویش سے بولیں۔

”بالکل خیریت ہے، اصل میں، میں آپ کو بتانے ہی والی تھی کہ تیور آ گیا اور بات ذہن سے نکل گئی۔ اصل  
 میں کل مجھے والدہ کے ساتھ علی بھائی کے لیے رشتہ دیکھنے جانا تھا جو آپ کو بتایا تھا۔“ میں نے وضاحت کی۔

”یاد ہے بیٹا، ٹھیک ہے چلی جانا پرکب واپسی ہوگی؟“ امی جان نے پوچھا۔

”پہلے تو رکنے کا ارادہ تھا مگر اب تیور آیا ہے تو کل شام کو ہی آ جاؤں گی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اور ہاں تیور  
 تم کل ماہ رخ کی طرف سے ہوا تا۔“

”تم واپس آؤ گی تو اسے ہی جا کر ہوا تا۔۔۔۔۔ ابھی تو بچہ تھکا ہوا آیا ہے، آرام کرے گا۔“ امی جان فوراً بولیں۔

”بی بھائی! آپ کل آئیں گی تو کل شام کو ہی چلے جائیں گے یا پرسوں۔“ تیور نے سرسری انداز میں کہا۔

اسے معلوم تھا کہ رشتہ طے بھی ہو گیا تھا مگر امی جان کو ماہ رخ کے انداز پسند نہ تھے۔ اسی لیے تیور بھی ان کے سامنے ماہ  
 رخ سے کیے دینے رہتا تھا۔

☆☆☆

جونی میں نے گاڑی نالے کے کنارے بنی ہوئی پلپٹا سے گزار کر گلی میں بائیں جانب نالے کے کنارے کھڑی  
 کی اور والدہ کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا تو وہ حیرت سے بولیں۔

”کیا ہوا؟ گاڑی خراب ہوگئی ہے کیا؟“

”والدہ باہر نکلیں، ہماری منزل مقصود آگئی ہے۔“ میں نے دروازہ کھولا۔

”دامغ ٹھیک ہے تمہارا؟ مجھے تو یہاں دور دور تک کوئی گھر نظر نہیں آ رہا ایسا جو ہماری منزل مقصود ہو۔“ انہوں  
 نے سر جھکا کر چاروں طرف دیکھا۔

”آپ سب طرف نہ دیکھیں، ادھر باہر نکلیں اور میرے ساتھ آئیں۔“ میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں گاڑی  
 سے باہر نکالا تاہم نکلتے ہی ان کا پاؤں نیچے پکڑ میں جا پڑا جو وہ اچانک دیکھ نہ سکیں اور ان کی سفید صاف ستھری شلوار

پنجر کے سیاہ دھبوں سے داغدار ہوگئی۔ والدہ کو تو کپڑوں اور جوتوں کی صفائی کا خطبہ تھا۔ شلوار پر پڑے ہوئے نشانات  
 ان کے لیے ناقابل برداشت تھے۔

”ماں! ایک منٹ، یہ سامنے والے کوارٹر سے ذرا تھوڑا مانی لے کر میں اپنے جوتے اور شلوار کو صاف نہ کر لوں،  
 اس طرح سے تو مجھے جانا ٹھیک نہیں لگ رہا۔“ انہوں نے اسی گھر کی طرف اشارہ کیا جس میں دراصل ہمیں جانا بھی  
 تھا۔

میں نے زار کو منظر علی کے ہاتھ لکھ کر پیغام بھجوایا تھا کہ میں اتوار کے روز اپنی والدہ کے ہمراہ ان کے گھر آؤں  
 گی۔ اس لیے انہیں ہمارے آنے کی خبر تھی۔ البتہ مجھے یہ صورت حال خاصی دلچسپ لگی کہ والدہ جس گھر میں یہ سمجھ کر جا



رہی تھیں کہ جو تے اور شلوار کے پانچ صاف کر لیں وہی دراصل منزل تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔  
 ”اسلام علیکم آتی!“ میں آگے بڑھ کر ان سے ملی اور گھر کے اندر داخل ہو گئی۔ میں تو اس گھر میں پہلے  
 دفعہ آ چکی تھی، البتہ والدہ کو میرے انداز سے علم ہو گیا تھا کہ میں ٹھیک اسی گھر میں آئی تھی جہاں میں نے اپنے  
 تھا، ان کے چہرے پر مجھے تعجب اور تھکاکارنگ نظر آیا تھا۔  
 زار نے آ کر سلام کیا اور ایک ہوائی چٹل لا کر والدہ کے سامنے رکھی کہ اسے پہن کر پاؤں اور ٹانگوں سے  
 دھو لیں۔ والدہ نے اس چٹل کو دیکھ کر انکار کر دیا۔ میں حیرت سے زیادہ شرمندگی سے سر جھکا کر رہ گئی۔  
 ”میں غسل خانے میں جا کر ہی پاؤں بھی دھو لیتی ہوں، چٹل بھی اور پانچے بھی۔“  
 ”میں یہیں پانی لا دیتی ہوں۔“ ہم برآمدے میں بیٹھتے تھے۔ زارا لوتے میں نیم گرم پانی لائی اور اس سے  
 کہ وہ والدہ کے پاؤں یا جو تے دھواتی میں نے اس سے لوتے لیا، حالانکہ وہ یہ سب کسی چالو سے نہیں کر رہی تھی  
 مگر مجھے اچھا نہیں لگا۔ میں نے والدہ کے پاؤں صحن کی طرف کر کے دھلائے، اپنے پرس سے نشو بچہ لے کر انہوں  
 نے پاؤں صاف کیے۔ میں نے اپنے جوتے انہیں پہننے کو دیے اور خود زارا کی لائی ہوئی چٹل پہن لی اور والدہ  
 جوتے اٹھا کر صحن میں لگنے پر جا کر ٹھوڑا پانی بہا کر دھوئے۔ اگرچہ جوتے ایسے نہ تھے کہ دھوئے جاتے مگر مجھے یہی  
 طرح جوتے خراب ہوئے تھے انہیں دھونا لازمی تھا۔  
 گھر میں منظر علی اور شامو جو نہیں تھے۔ زارا نے بتایا کہ کسی کام سے گئے ہیں۔ یقیناً ہماری تواضع کے لیے کہ  
 لینے گئے ہوں گے مجھے بہت شرمندگی ہوتی تھی۔ میں جب بھی اکیلی آئی تھی انہیں اس طرح کے تر دے منع کر دیتی تھی  
 اصل میں چپ سے مجھے ثانیہ کے سلائی کرنے کا علم ہوا تھا، میں اپنے اور امی جان کے کپڑے سلائی کے لیے آئے تھے  
 دے کر جاتی تھی۔ ہم دونوں ہی کو اس کے سلبے ہوئے کپڑے پہننا آ جاتے تھے۔ کیونکہ ہم سادہ سالہاس پہنتے تھے، یہ  
 اور بات ہے کہ ثانیہ کے ہاتھ میں اب صفائی آتی جا رہی تھی۔ منظر علی اور شامو بھی جلد ہی آ گئے۔ گھر کی بی بی بچی کے  
 چاٹ، بازار کا کبیر اور سادہ کیک..... لیکن والدہ نے کچھ نہیں کھایا۔ بلڈ پریشر کا بہانہ کر کے ٹھوڑی سے پنے کی چاٹ  
 ڈالی اور وہ بھی نہیں کھائی۔ مجھے تو ان کے رویے کی سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی۔ میں تو یہ سمجھتی تھی کہ میری والدہ سادہ  
 عورت ہیں اور ان کی نظر میں لڑکیوں کے سلیپتے اور شرافت کی بہت اہمیت ہے۔ ابھی ایسی بات انہوں نے نہیں کی کہ  
 انہیں علی بھائی کو کسی امیر گھرانے میں بیاہنا ہے لیکن اس وقت ان کا ناقابل فہم رویہ مجھ پر سوچوں کے بہت سے دروازے  
 کھلتا تھا۔  
 ہم سب ہمیشہ اچھے بڑے گھرانوں میں بیاہی گئی تھیں پھر بھلا وہ بنے کو کسی غریب گھرانے میں کیوں کر بیاہی گئی  
 تھیں جب کہ اس میں کوئی ذہنی وجہ تھی، قصہ تھا، نہ اس کے لیے رشتوں کی کمی۔ اور مجھے خود بھی علم تھا کہ بہت سے  
 گھرانوں سے لڑکیوں والوں کی طرف سے اس طرح پیش رفت ہوتی تھی۔ لوگ اپنی خوبصورت پڑھی لکھی بیٹیاں ان  
 سے بیاہنے کے خواہش مند تھے۔ ایسے میں بھلا اگر ایسی جگہ رشتہ کیا جاتا تو لوگ ہم سے پوچھتے کہ کیا یہ وہ گھرانہ تھا جس  
 کی خاطر آپ نے ہماری بیٹی کو بیاہا ہے گھرانے کو مسترد کیا تھا۔ مجھے وہاں بیٹھے بیٹھے اپنا وجود خالی لگنے لگا اور میں اس  
 یا حول سے کٹ کر قصا میں متعلق ہو گئی۔ کسی بے وقوفی کی محسوس میں نے۔ واقعی نوید صاحب کی پچو بھٹی ٹھیک سوچ رہی  
 تھیں اور والدہ بھی حق بجانب تھیں۔ نوید صاحب ٹھیک کہتے تھے کہ دوستی اور رشتے داری کے لیے معیار کے بتانے  
 مختلف ہوتے ہیں۔ میں نے جانے کب خود کو اتنا غلط سمجھنا شروع کر دیا تھا کہ خود کو ان لڑکیوں کا نجات دہندہ سمجھ کر  
 سے نوید صاحب اور علی بھائی کی قسمتوں کے فیصلے کرنا شروع کر دیے تھے۔ میں شرمندگی کی انتہا تک پہنچ گئی تھی کہ میں  
 نے آئی سے ایک دفعہ ڈھکے چھپے الفاظ میں اس خواہش کا اظہار بھی کیا تھا کہ مجھے ثانیہ اور زارا بہت اچھی لگی ہیں۔

بیٹیوں کی ماں تھیں ضرور والدہ کی آمد کا مقصد بھی سمجھ گئی ہوں گی۔  
 چلتی دیر میں چائے کی گئی والدہ مارے باندھے بیٹھی رہیں اور اٹھتے ہوئے پرس کھول کر اس میں سے پانچ سوکا  
 ٹوٹ کال کر میز پر رکھ دیا۔ میں ان کے اس طرز عمل پر بہت شرمندہ ہوئی اور نوٹ اٹھا کر شاکی طرف بڑھایا۔  
 شامہ اصل میں ہم خالی ہاتھ آئے ہیں، والدہ ہمیں دے رہی ہیں رکھ لو۔“ آئی نے شا کے ہاتھ میں سے نوٹ  
 ایک لیا۔ پہلے ہی اس نے ہنسل تھا ہاتھ اور نوٹ انہوں نے زبردستی میرے بیگ میں ٹھونس دیا۔ میں نے ناراضی کا  
 اظہار کیا مگر انہوں نے ایک نہ مانی۔ میں نے رخصت ہوتے ہوئے سب سے ملنا حسب عادت ضروری سمجھا جب کہ  
 والدہ خدا حافظ لہ کر گھر سے باہر نکل کر کھڑی تھیں۔  
 ”چلتی ہوں آئی پھر آؤں گی۔“ میں نے ان سے اجازت چاہی۔  
 ”جب تمہارا راجی چاہے بیٹا، تمہارا اٹنا کر ہے۔“ انہوں نے خلوص سے کہا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی میں نے منہ بھلا  
 لیا، والدہ نے میرے رویے کو محسوس کیا لیکن خاموش رہیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بات چیتیں تو میں ان سے ان  
 کے اس ناروا رویے کی وجہ تو پوچھوں لیکن وہ بھی میری والدہ تھیں اور اصرار کیا کہ باتیں کرنی رہیں۔ گھر پہنچ کر میں نے ان  
 سے واپسی کی اجازت چاہی۔  
 ”ارے! تم نے تو کہا تھا کہ چند دن روکو گی؟“ والدہ نے حیرت سے کہا۔  
 ”چلتی ہوں والدہ! تیمور بھی آیا ہوا ہے اور ملازمہ بھی چھٹی پر ہے اور کل مجھے دفتر بھی جانا ہے۔“ میں نے اپنی  
 مصروفیات کی وضاحت کی۔  
 ”تو تم اس گھر کی ملازمت تو نہیں ہو بیٹا۔“ والدہ غصے میں آ گئیں۔  
 ”والدہ ناراض کیوں ہوتی ہیں؟ میں پھر آ جاؤں گی۔“ میں نے انہیں کندھوں سے تھاما۔  
 ”مجھے تم سے چند ضروری باتیں کرنا سمجھیں۔“ انہوں نے تھکا ہوا لے۔  
 ”مجھے بھی آپ سے بہت ساری ضروری باتیں کرنا سمجھیں لیکن پھر آ جاؤں گی۔ تیمور آئندہ اتوار کو واپس چلا  
 جائے گا تو پھر ایک پورا ہفتہ آپ کے پاس رہنے کے لیے آؤں گی۔“ میں نے ان کے ہاتھ تھام کر وعدہ کیا۔  
 ”بس سب کے پاس کوئی نہ کوئی بہانہ ہوتا ہے۔“ ہمیں اندازہ نہیں کہ میں کتنے دنوں سے انتظار کر رہی تھی کہ تم  
 آؤ گی اور رہو گی۔“ والدہ ہلول ہو رہی تھیں۔  
 ”والدہ! حقیقت بتا رہی ہوں کہ تیمور اچانک آیا ہے، پہلے سے اطلاع ہوتی تو میں نوٹ کر کے آپ کو مطلع کر  
 دیتی۔ بس اب آپ بہو لے آئیں تاکہ آپ کی شہنائی بھی دور ہو۔“ میں نے لاڈ سے کہا۔  
 ”ماں جیسے ساری بہو ہیں ساسوں کی شہنائی دور کرنے کے لیے ہی تو آتی ہیں۔“ منظر سے انہوں نے کہا۔  
 ”گھر میں بہو آتی ہے تو رونق آ جاتی ہے، سب کی شہنائی اور اکیلا پن ختم ہو جاتا ہے۔ بہو اور بیٹے کے قہقہے،  
 ماس بہو کے جھگڑے، سر بہو کے لاڈ، بچوں کی چپکاریں..... کتنا کچھ ہو گا ناں“ میں نے ایسا خوبصورت نقشہ کھینچا کہ  
 اسے ساخنہ ہنس پڑیں۔  
 ”آپ کو ثانیہ پسند نہیں آئی ناں؟“ میں نے اچانک سوال کیا۔  
 ”میں نے کب کہا؟“ حیرت سے وہ بولیں۔  
 ”کچھ باتیں کہے بنا سمجھ لی جاتی ہیں والدہ!“ میں نے کہا۔  
 ”بڑی غلط فہمی ہو تم۔“ وہ مسکرائیں۔  
 ”آج آپ نے یقین دلادیا ہے کہ دنیا میں مجھ سے بڑھ کر بے وقوف کوئی نہیں ہے۔ میں تو آپ کو دنیا بھر کی  
 گورتوں سے مختلف سمجھتی تھی والدہ! لیکن آپ نے جو رویہ وہاں روا رکھا، اس نے مجھے میری نظر میں بہت گرا دیا۔ کسی



انسان کے پاس صرف عزت نفس کی دولت ہوتی ہے اور آپ نے ان کے اس مان کو بھی مٹی میں ملا دیا۔  
بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”کیا، کیا ہے میں نے جو تم اتنی جذباتی ہو رہی ہو؟“ وہ بولیں۔ ”میں تو اپنا پاؤں کچڑ میں جا پڑنے پر مجبور تھا۔“  
کا شکار ہو گئی تھی۔

”پاؤں تو آپ کا دھل بھی گیا تھا مگر آپ کے ماتھے کی تھوریاں پھر بھی قائم رہیں آپ نے انہیں مسہ کرنے کے بعد میں گھر آ کر پیغام بھیج دیتیں، کم از کم وہاں اس طرح۔“ جانے کیا ہوا کہ میں چنگوں پہنکوں رونے لگی۔  
”تم خود ہی اندازے لگا رہی ہو میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے ان کی تحقیر ہوئی ہو، میں تو تمام دست خاموش ہی بیٹھی رہی۔“ والدہ بولیں۔

”اس سے بڑھ کر ان کی اور تحقیر کیا ہوگی؟“ اور اس سے پہلے کہ ابو یا علی بھائی میں سے کوئی باہر آ کر جاری گفت و شنید سنتا میں انہیں خدا حافظ کہہ کر چلی آئی۔



گھر کی طرف واپسی کا سفر مانو کتنے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ واپسی پر سارا راستہ عجیب و غریب خیالات نے ذہن پر قبضہ جمائے رکھا تھا۔ پوری کوشش کر رہی تھی کہ کسی خیال کو ذہن پر حاوی نہ ہونے دوں۔ کیونکہ گاڑی چلاتے ہوئے خیالات کی رو بھٹک جانے کا نتیجہ میں ایک بار پہلے بہت اچھے طریقے سے بھٹک چکی تھی۔ ابھی تک میری ٹانگ سر جلتے ہوئے درد ہوتا تھا اور جڑوں پر ٹانگوں کے نشانات اگر کافی حد تک مندمل ہو چکے تھے مگر جلد پر ہلکا سا کھپاؤ مجھے اچھی تک محسوس ہوتا تھا۔ ابھی تک میں ان داغوں کو مندمل کرنے والی کریمیں اور لوشن استعمال کر رہی تھی۔

کبھی یہ خیال آ رہا تھا کہ مجھے والدہ سے اتنی گستاخی سے بات نہیں کرنی چاہیے لیکن یہ سب کچھ غیر ارادی طور پر ہوا تھا۔ مجھے بھلا اتنا جذباتی ہونے کی کیا ضرورت تھی یہ تو سب تقدیر کی باتیں ہیں اور بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ لڑکیاں بالیاں بیری کے درخت ہوتی ہیں۔ پیر کپنے پر پتھر آنا کوئی ایسا بعید از قیاس نہیں اور پھر ہمارے ہاں تو عام گھرانوں میں یہی سلسلہ ہوتا ہے، لڑکیوں کے رشتے دیکھنے کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک بڑھیا طریقہ رائج ہے، لڑکیوں کی شناختی پریڈ ہوتی ہے اور انہیں دیکھنے کے لیے آنے والی خواتین گھروں سے نکلتی تو اپنے بھائی یا بیٹے کے لیے شریک حیات کے انتخاب کے لیے ہیں لیکن ان کی نظریں بیک وقت جوہری اور قصاب کی نظریں ہوتی ہیں اور لڑکیوں کو یوں دیکھا جاتا ہے جیسے قربانی کے لیے بکرے کو۔ بڑی بہنوں کی نسبت کیسے طے ہوئیں مجھے ابتدائی مراحل کا علم نہیں تاہم مجھے ان مراحل سے بالکل بھی نہیں گزرنا پڑا کیونکہ بزرگوں ہی کے مابین بات طے پائی اور کسی تقریب میں غالب نے مجھے دیکھ بھی لیا جب کہ میں نے غالب کو کھٹکی کے وقت پہلی دفعہ دیکھا تھا، اس سے قبل صرف تصویر ہی دیکھی تھی۔

شاید معاشرے کے مختلف طبقوں میں لڑکیوں کے رشتوں کے مراحل مختلف طریقوں سے طے ہوتے ہیں۔ والدین کا صاحب حیثیت اور خوشحال ہونا شاید اسی لیے لڑکیوں کے حق میں بہتر ہوتا ہے کہ یہ خوبیاں بہت سی انکی خامیوں پر پردہ تان لیتی ہیں جو ایک غریب گھر کی بیٹی کے لیے جرم قرار پاتی ہیں۔ اللہ سب بچیوں کی قسمیں اچھی کرے۔ مجھے اپنی قسمت پر بھی حیرت ہو رہی تھی کہ بی اے کے امتحانات سے فارغ ہوتے ہی جٹ مظنی اور پٹ بھٹ والا معاملہ ہوا پھر غالب کا ساتھ چھوٹا تو ایک کے بعد دوسرا رشتہ کچھ عرصے کے بعد آ رہا تھا اور اگر میں کسی غریب گھر میں پیدا ہوئی ہوتی تو..... ثانیہ جو قدرتی میری ہم عمر تھی اور زارا مجھ سے بڑی..... کیا میں بھی ان کی طرح رشتوں کی آس میں بیٹھی ہوتی۔ مجھے اپنی قسمت پر رشک آیا۔ واقعی میرے رب نے مجھے کتنی نعمتیں عطا کر رکھی تھیں اور میں ان نعمتوں کو بھٹا رہی تھی؟



”کیا میں اپنے رب کی نعمتوں کو جھٹلا رہی ہوں؟“ خود سے میں نے سوال کیا۔ مجھے کوئی حق نہیں کفرانِ نعمت کا۔ جانے کہاں سے بھولا بھٹکا خیال میرے ذہن میں نوید صاحب کا آیا اور میں نے سوچا کہ اگر نوید صاحب کا راز کا رشتہ نہ ہو سکا تو دل مانے یا نہ مانے میں نوید صاحب کے لیے ہاں کر دوں گی۔ میں بھلا کیوں اتنی بے یقیناں کرتی رہی ہوں۔ نوید صاحب کو اس لیے مستر دکر دیا کہ لوگ کیا کہیں گے، تیمور کو اس لیے کہ وہ میرے بھائیوں کے لیے اور اب ایک نیا کردار ڈاکٹر معظم کا سامنے آ رہا تھا۔

مگر سچی تو سب لوگ میرا انتظار کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر گپ شپ ہوئی۔ تیمور نے بتایا کہ وہ دن بھر کابلی سے بس براور پھر لی وی روم میں صوفے پر پڑا رہا ہے۔ میری دن کی روداد پوچھی گئی تو میں نے مختصر ایتنا کیا کہ سب ٹھیک رہا۔ باقی فیصلہ بعد میں ہوگا۔ تیمور تفصیل جاننے کو لے چلن تھا اور میں نے نماز پڑھ کر سونے کا عذر پیش کر کے معذرت کر لی۔ کمرے میں آ کر نماز پڑھی اور سونے کے لیے لیٹی تو فینڈ آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ذہن کے پردوں پر ایک بیک کر کے ماضی کے منظر آنے لگے اور ان مناظر میں یادیں غالب کی۔

جو خود تو سکوں میں ہے مجھے بے سکوں کر کے

مجھے بساطِ زیست ہے

اک چٹا ہوا مہرہ بنا کے

جس کے دم سے قائم تھی بہارِ زندگی

وہ نہیں تو تھم گیا ہے

وجود ہے موسمِ خزاں

بہار آتی ہے اور دیتی ہے دستکیں

مگر میری جھین ہیں ویراں

اور منتقل ہیں دروازے شہرِ دل کے

منتظر ہے میرے بدن کی ریاست

کوئی تو دے دستکِ درِ دل پہ

یہ نہیں کہ اب غالب کی یادیں آتی تھیں مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ مجھے اپنے دل کے بند دروازے اب کسی دستک پر اکرنا ہی ہوں گے۔ زندگی یوں بھی پتانا مشکل ہو رہی ہے اور پھر گزرتا ہوا وقت آنے والے وقت کی تبدیلیوں کے آثار کو ظاہر کر رہا تھا۔ نیند کسی محبوب کی طرح روٹھی ہوئی تھی، اسے کافی دیر تک کروٹیں بدل بدل کر مٹانے کی کوشش کی۔ مجبوراً تھ کر نیند کی ایک گولی لی اور تھوڑی دیر میں ہی نیند کی مہربان آغوش میں جا گئی۔



جانے کیا وقت تھا اور کیا پہر تھا انتہائی گہری نیند سے اچانک بیدار ہوئی تو دل کی دھڑکنیں اچھل پھیل ہو رہی تھیں۔ اس کا مطلب ہے کہ میری نیند ڈسٹرب ہوئی تھی۔ مجھے یاد آ گیا کہ میں تو نیند کی گولی لے کر سوئی تھی پھر دستک ل آواز آئی، میں نے وہیں لیٹے لیٹے کان لگائے۔ دستک دروازے پر نہ تھی لیکن پھر بھی کافی واضح تھی۔ غور کیا تو سس کرے کی کھڑکی کے شیشے پر دستک ہو رہی تھی۔ کھڑکی میرے بیڈ کے بہت قریب تھی، پھر مجھے تیمور کی آواز بھی مل گئی۔ میں نے پردہ ہٹایا تو تیمور کھڑکی کے باہر کھڑا تھا۔ رات ان دنوں ملکی سی جنگی ہو جاتی تھی اور وہ عام سے کھڑکی میں باہر کھڑا ٹھہر رہا تھا۔ لیکن یہ اس وقت باہر کیوں کھڑا ہے؟ میں نے کھڑکی پر دقت دیکھا، رات کے دو بج رہے تھے۔



”کھڑکی کھولیں۔“ اس نے باہر سے آواز دی جو کہ بندیشوں کی وجہ سے مجھے بہت ہلکی آئی۔ میں نے اس کی کھڑکی کھولی اور اس سے کہا کہ وہ اندر آئے۔ مجھے مناسب نہ لگا کہ میں یہاں سے اس سے گفتگو کروں۔ اڑوس پڑوس والا دیکھے تو جانے کیا سمجھے، اوہ بار بار کھڑکی کھولنے پر اصرار کر رہا تھا میں نے اسے اشارہ کر دیا۔ سیدھے راستے سے اندر آ کر بات کرے۔ اپنا ہسٹراٹھ کر ٹھیک کیا اور بال سمیٹ کر دوپٹا اوڑھ کر میں نے دروازہ کھولا تو وہ باہر کھڑا تھا۔

”کیا ہو گیا ہے تیمور! اس وقت کیوں آدھی رات کو باہر کھڑے چیخ رہے تھے۔“ میں نے تھوڑے خفگی سے ”سوری بھابی! میں کافی دیر تک دروازہ کھٹکھٹاتا رہا مگر آپ دروازہ نہیں کھول رہی تھیں، مجبور اچھے کھولے راستے دستک دینا پڑی۔“ اس نے معذرتی انداز میں کہا۔

”ایسی کیا ایرجنسی پڑ گئی تھی؟“ میں نے اسی خفگی بھرے لہجے میں کہا۔ جواب میں وہ خاموش رہا، اس کی خاموشی سے مجھے وحشت ہونے لگی اور ساتھ ہی یکدم دل میں عجیب سا خیال یہ آیا کہ اگر امی جان یا مظہر میں سے کوئی جان جائے اور تیمور کو رات کے اس پہر میرے کمرے میں دیکھ لے تو..... اس خیال نے اتنی شدت سے میرے دل پر حملہ کیا کہ میں نے اٹھ کر فوراً دروازہ کھول دیا اور جانے میرے ذہن سے ٹپکی پیتی کی کیسی لہرس نکلیں کہ تیمور خاموشی سے باہر نکل گیا اور ٹی وی روم میں جا کھڑا ہوا۔ میں نے اس کی تقلید کی۔

”اب کھو گیا ہوا؟“ میں نے سوال کیا۔  
 ”بھابی! اعلیٰ بھائی کا فون آیا تھا..... اتنی کی طبیعت۔“ اس کا جملہ نامکمل ہی تھا کہ میں چیخ پڑی۔  
 ”کیا ہوا والدہ کو؟“

”بھابی! انہیں ہلکا سا ہارٹ ایک ہوا ہے، اسپتال لے گئے ہیں اور میں پچھلے ایک گھنٹے سے آپ کو جگانے کوشش کر رہا تھا۔ امی جان بھی ٹینڈی دوا لے کر سوئی ہوئی ہیں اور نہ آپ کے کمرے سے کوئی جواب آ رہا تھا، مظہر کے پھر مجبور اچھے آپ کی کھڑکی کی طرف سے کھٹکھٹانا پڑا۔“ وہ وضاحت کر رہا تھا اور میرا جسم لرز رہا تھا۔ میں صوفے کی بیک کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا لیکن مجھے لگ رہا تھا کہ میں ابھی گر پڑوں گی۔ تیمور نے مجھے سہارا دے صوفے پر بٹھایا، لیکن سے پانی لا کر دیا اور مجھے کپڑے تبدیل کرنے کو کہا اور خود بھی کپڑے تبدیل کرنے چلا گیا۔ میں نے کمرے میں آ کر جلدی سے کپڑے تبدیل کیے، بالوں میں برش پھیر کر بال سینے۔

امی جان کے کمرے پر دستک دے کر انہیں جگایا اور ساری صورت حال سمجھائی۔ تیمور گاڑی کی چابی لیے کھڑا تھا، میں نے مظہر کے کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑایا تا کہ وہ جاگ کر کم از کم گیٹ اور پیر ونی دروازہ بند کر لے مگر جواب نہ ارد۔ مجبور امی جان نے رات کے اس پہر آ کر گیٹ بند کیا۔ راستے میں تیمور نے مجھے بتایا کہ جب وہ باہر گیا تو کھڑکی کی طرف آ رہا تھا تو مظہر کے کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ میں نے استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں نے کھڑکی کھول کر جھانک کر اندر دیکھا تو وہ کمرے میں نہیں تھا..... کافی دیر میں اس انتظار میں رہا۔ شاید غسل خانے میں ہو مگر میرا خیال ہے کہ وہ گھر میں ہی نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ہم سب کے سو جانے کے بعد سے باہر گیا ہے کہیں؟“ تیمور کے لیے تو بلاشبہ یہ ایک انکشاف تھا۔ یہی ایک بات جو کافی عرصے سے میں اس ساتھ کرنا چاہ رہی تھی، اس کا انکشاف تیمور پر ہوا بھی تو ایسے وقت میں کہ میرے حواس والدہ کی خرابی صحت کا سن ہو رہے تھے۔

”وہ اکثر پہلے بھی گھر دیر سے آتا ہے اور بسا اوقات تو اتنا دیر سے کہ ہمیں علم ہی نہیں ہو پاتا کہ وہ رات صبح.....“ میں نے اس پر ایک اور انکشاف کیا۔



”خوفزدہ! وہ کس بات سے؟ چھوٹا ہے وہ آپ سے، اس سے کیوں خوفزدہ ہیں آپ؟“ اس نے تیز چلنے سے آگے آ کر سوال کر دیا۔

”جیوڑا اس کے پاس ریو الور ہے اصلی والا۔ میں نے وہ دیکھ لیا تھا۔“ لفٹ میں، میں نے اسے یہ بات بتاتے اڑتے ہوئے سنا۔ ”مگر ابھی تم اسے مت جتلاتا، میں بعد میں تمہیں ساری تفصیل بتاؤں گی پھر ہم دیکھیں گے کہ آگے کیا کرنا ہے۔“ میری اس بات نے اس پر یوں اثر کیا جیسے میں نے اس پر ریو الورتان لیا ہو۔ وہ ایک لفظ بھی نہ بولا۔ ایک لمحے کی حالت میں وہ مجھے دیکھ رہا تھا۔ ”جی! کہ ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے والدہ کے کمرے کے پاس پہنچ گئے۔ جہاں صدف باجی، خرم بھائی، علی بھائی، ابو کے علاوہ ڈاکٹر معظم بھی موجود تھے۔ یہ سب لوگ کمرے کے باہر کچے پتوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔“

”کیا ہوا والدہ کو؟“ میں نے ابو کے گلے لگتے ہوئے پوچھا۔ ”صبح تو بالکل ٹھیک تھیں بلکہ شام تک بالکل ٹھیک تھیں۔“ میں سسکتی گئی۔

”وصلہ کرو بیٹا! وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔ ان کی طبیعت کافی دنوں سے خراب تھی۔ معظم بیٹا تو کافی دفعہ کہہ چکا ہے کہ ان کو انجیو پلاسٹی کر دینی چاہیے۔“ ابو نے میری کمر سہلائی۔ میں باقی سب لوگوں سے باری باری ملی اور خواہش ظاہر کی کہ مجھے والدہ سے ملنا ہے، جب کہ صدف باجی کا کہنا تھا کہ وہ آرام کر رہی ہیں اس لیے انہیں دور سے ہی دیکھ لیا جائے مگر میں مصر رہی کہ مجھے ان کو چھو کر دیکھنا تھا۔

”جی! نہ بنو ماہا! والدہ کی حالت ایسی نہیں ہے کہ تم انہیں جا کر چھوؤ اور اگر وہ جاگ گئیں تو پھر ڈسٹرب ہو جائیں گی۔“ صدف باجی نے ڈانٹا۔

”پلیز میں انہیں چھوؤں گی نہیں، صرف دیکھوں گی۔“ پلیز باجی! میں نے التجا کی۔ میں والدہ کی اس حالت

## زندگی بدلنے والی ورزش کی مشینیں

**KOREA ELECTRIC TREADMILL**  
The King of All Exercise Machines

LCD-TV  
کے ساتھ بھی دستیاب

LG موٹر و انورٹری طاقت اور انتہائی مضبوط جاپانیز ٹیلٹ کے ساتھ

بعد از فروخت سروس اور پارٹس کی فراہمی کی ضمانت



**EXERCISE BIKE**

اسے کمرے میں ٹیلوں چلے اور سائیکلنگ کا لطف اٹھائیے۔ کسی بھی عمر میں اساتذہ اور توانائی سے بھرپور رہنے کے لئے صرف 5 منٹ روزانہ کی بھی وقت استعمال کیجئے۔ بے شمار مائلز آپ کے انتخاب کے لئے آپ کے بجٹ کے تین مطابق۔



یاد رکھیے! ادائیگی صحت برقرار رکھنے کے لئے چند منٹ کی مگر پوری ورزش کا کوئی نعم البدل نہیں، ورزش کے کوئی منفی اثرات نہیں

**BILAL BROTHERS**  
Mustafa Arcade, SMCHS, Karachi. Tel: 4531961-62

**LAHORE** NABI BUX & SONS Tel: 7354004  
**FAISALABAD** ELECTROLUXE Tel: 8541004-8543436  
**PESHAWAR** RASHID SONS Tel: 5272823-5274931  
**QUETTA** S. K. BUSINESS MART Tel: 2825564-2839082

BB-2007/13

جنوری 2008

167

ماہنامہ پاکیزہ

marksheet

”تو آپ نے یہ سب مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ کیوں چھپائے رکھا مجھ سے یہ سب؟ کیا آپ مجھے اس تمام صورت حال کو اکیلے ہینڈل کر لیں گی؟ مجھے تو اس کے اطوار پہلے ہی کچھ بدلے بدلے سے تھے۔“ تیور جذباتی ہو رہا تھا۔

”میں نے بار بار کوشش کی کہ تم سے اس سلسلے میں بات کروں، اگر تمہیں یاد ہو تو گزشتہ چار ماہ قبل تھے تو میں نے تم سے اس معاملے پر بات کرنے کے لیے تمہیں باہر چلنے کو کہا تھا، جب تم نے ماہِ ریح کی آمد میں نے اسے یاد دہانی کرائی۔“

”اس کے بعد بھی مجھے آپ اس بارے میں بتا سکتی تھیں۔“ تیور شکوہ کناس تھا۔

”کبھی موقع ہی نہیں ملا، میں تو خود اس معاملے میں بہت پریشان تھی، کچھ مجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ اس معاملہ کو کس طرح ہینڈل کیا جائے۔ اسی جان تو بات، بات پر اس کے ساتھ غصے میں آ جاتی ہیں۔“ میں نے سہانہ انداز میں کہا۔

”مجھے اسی جان نے بتایا تھا کہ کس طرح اس نے آپ کے ساتھ شدید بدتمیزی کی تھی اور آپ نے اس برداشت بھی کر لیا تھا۔ آخر کیا وجہ ہے، کیوں آپ اس کی اس طرح کی غلطیوں پر پردے ڈال دیتی ہیں؟“ ”کبھی کبھار لہجہ تھا تیور کا کہ میں دلی ہی دلی میں مل کھا کر رہی تھی۔“

”میں اس لیے برداشت کرتی ہوں کہ میں اس کی بڑی ہوں، مجھے اس کی غلطیوں پر اس کی اصلاح کرنا ہے اسے سمجھانا ہے، ہاتھ اس لیے نہیں اٹھا سکتی کہ میں اس کی ماں نہیں ہوں اور اسے برا بھلا اس لیے نہیں کہتی کہ خون ہے، کسی بات پر برا مان کر گھر سے ہی چلا جائے تو ہم کیا کریں گے۔“ میں بات کرتے کرتے سسکتی گئی۔ میں نے اپنی بے بسی کا اظہار کر ہی دیا تھا۔

”یقیناً آپ کیا سمجھتی ہیں کہ کیا وجہ ہوئی ہے؟ وہ ایسا کیوں ہو گیا ہے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔ ”کچھ سمجھ میں نہیں آتا سوائے اس کے کہ اس کا کوئی استاد یا کوئی دوست ایسا ہے جو خود کسی مذہبی وابستہ ہے اور اسی نے اس سے اثر لیا ہے۔“ میں نے مختصر آتیایا۔

”یہ اندازہ آپ نے کس وجہ سے لگایا ہے؟“ اس نے سوال کیا۔

”اس کے کمرے میں موجود مذہبی موضوعات پر بہت ساری کتابوں کی وجہ سے۔“

”لیکن اس کا کرا تو ای جان بتا رہی تھیں کہ بندر پتا ہے اور اس نے اسی بات پر آپ سے بدتمیزی کی تھی اسے شک ہوا کہ آپ اس کے کمرے میں گئی تھیں؟“ اس نے حیرت سے کہا۔

”ہاں اس نے مجھ سے اس بات پر بدتمیزی کی تھی، جس پر امی جان نے اس کی بہت پٹائی کی تھی۔“ میں بتایا۔

”لیکن جب آپ اس کے کمرے گئی ہی نہیں تو اس کو شک کیوں ہوا؟“ اس نے حیرت سے پھر سوال کیا۔

”اس لیے کہ میں اس کے کمرے میں گئی تھی۔“ میں نے انکشاف کیا۔ ”غلطی مجھ سے ہی ہوئی تھی ماں“

کمرے کا دروازہ کھلا دیکھ کر میں مارے جھنجھٹ کے اندر چلی گئی اور پھر لوٹ آئی۔ میں نے اعتراف کیا۔

”اور اگر آپ اس کے کمرے میں چلی ہی گئی تھیں تو اس کے سامنے یہ کہنے میں کیا حرج تھا۔“ ”جیوڑا“

گاڑی کو پارک کرتے ہوئے کہا۔ اسپتال آ گیا تھا، میں نے گاڑی رکتے ہی استقبالیہ کی طرف دوڑ لگا دی۔

میرے پیچھے لپک کر آیا۔

”آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔“ میرے ساتھ چلتے چلتے اس نے سوال کیا۔

”میں خوفزدہ ہو گئی تھی۔“ میں نے تجلّت میں جواب دیا۔

جنوری 2008

166

ماہنامہ پاکیزہ



”صفیہ! مجھ پر بھی ہے تم کو.....“ شمیمہ بیگم نے کی کمانی کی عادت پر گئی۔ ”شمیمہ بیگم نے حسب عادت تیرے لیے میں کہا۔  
”کیوں، کیا ہوا آپ؟“ صفیہ بیگم نے چونک کر پوچھا۔  
”توبہ، تو بد آہائیکسی باتیں کر رہی ہو؟“ صفیہ بیگم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

کاؤسے دار خود کو سمجھ رہی تھی، مجھے لگ رہا تھا کہ والدہ نے میری کی ہوئی کسی بات کی ٹینشن لی تھی، میں نے شاید زیادہ ہی گستاخی دکھائی تھی۔ میں دل سے شرمندہ تھی۔

”نہ ڈانٹیں صدف آپ، بچاری پریشان ہے۔ آنٹی کی چھوٹی اور لاڈلی بھی ہے..... آؤ ماہا میں خود چھوٹی چلوں آنٹی کے پاس،“ معظم نے آگے بڑھ کر یوں استحقاق سے میرا ہاتھ تھام لیا جیسے ارد گرد کوئی نہ ہو۔ میں اس وقت ذاتی طور پر اپنی منتشر تھی کہ اس بات کا احساس ہی نہ کر سکی اور اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے ایک معمول کی طرح اس کے ساتھ اندر کو چلی۔ خاموشی سے والدہ کے بیڈ کی پائنتی کھڑی انہیں دیکھتی رہی۔ وہ ہوش و حواس کی دنیا میں غائب ہے ہوش مجھ یا پھر گہری نیند میں۔

”ڈاکٹر معظم! والدہ نے کوئی ٹینشن لی ہے کیا؟“ میں نے پوچھا۔  
”نہیں، کوئی ایسی خاص ٹینشن کیا ہو سکتی ہے، ویسے ان کے دل کی حالت ایسی تھی کہ انہیں پلائی ہوئے کی ضرورت تھی۔ بونہی کوئی چھوٹی سی بات بہانہ بن جاتی ہے بسا اوقات۔ ہو سکتا ہے کہ دوا کے استعمال میں ہے تاہم دل ہو۔“ اس نے وضاحت کی۔

”دوا تو وہ ہمیشہ باقاعدگی سے اور بروقت کھاتی ہیں، ضرور کوئی ایسی بات ہی ہوگی۔“ میں نے خیال ظاہر کیا۔  
ڈاکٹر معظم مشین کے پاس کھڑا ان کا ریکارڈ چیک کر رہا تھا کہ میں نے دونوں ہاتھوں سے والدہ کے دونوں پاؤں چھوئے جو ہر طرف کی طرح سرد ہو رہے تھے۔ میری رگوں میں ایک خوف سا سرایت کر گیا۔ میں نے زیر لب بڑبڑا کر ان سے اپنی گستاخیوں کی معافی مانگی۔ کہیں والدہ..... یکدم مجھے خیال آیا اور میں نے سسکیاں لے کر رونا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر معظم نے مجھے کندھوں سے تھاما اور تقریباً دھکیلتے ہوئے باہر لے آیا، یہی نہیں بلکہ اپنی جیب سے لٹو ہے نکال کر دیا۔ میں نے باہر آ کر ابو کے گلے لگ کر رونا شروع کر دیا۔ دل میں یہی خدشہ تھا کہ والدہ کو کچھ ہونہ چاہے۔

کتنی نہیں کر رہی تھیں شام کو کدو رک جاؤ مگر میں اس وقت جانے کس موڑ میں تھی۔ غصے میں تھی شاید؟  
”یا اللہ والدہ کو صحت دے! میں ایک بار ان سے اپنی غلطی کی معافی مانگ لوں۔ مجھے تو ان سے بہت سی باتیں کرنا ہیں۔ میرے لیے تو وہ دنیا میں ایک مضبوط اخلاقی سہارا ہیں۔“ میں دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی۔

تب معظم نے اصرار کیا کہ سب لوگ گھر چلے جائیں اور دن کو دس بجے واپس آ جائیں جب تک ڈاکٹر وہی راولپنڈی کے چلے جائیں گے۔ میرا تو بالکل جی نہ چاہ رہا تھا کہ وہاں سے جاؤں مگر سب لوگوں نے یہی کہا کہ اسپتال کے بیچوں پر پیٹھے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں، سو بے دلی سے میں نے بھی سب کا ساتھ دیا۔

”پریشان نہ ہو لڈ گرل! اس وقت گھر جاؤ، صبح دس بجے آ جانا، پھر میں تمہیں آنٹی سے ملوادوں گا بلکہ ہو سکتا ہے کہ تم ان سے بات بھی کر سکو۔“ ڈاکٹر معظم نے مجھے بچوں کی طرح پکارتا۔

”یہ ڈاکٹر معظم کون ہے؟“ تیمور نے گاڑی اسپتال کے احاطے سے نکلنے ہی سوال کیا۔  
”صدف باجی کے جیٹھ کا بیٹا ہے اور کالج میں صدف باجی کا جو نیڑے بھی تھا۔“ میں نے سادگی سے کہا۔ ”اسی ہے انہیں چچی کے بجائے صدف آپ کہتا ہے۔“

”پہلے ہی نظر نہیں آیا؟“ تیمور کے لہجے میں کوئی عجیب سی چیز تھی۔  
”یہاں نہیں ہوتا، یو کے سے آیا ہے.....“ میں نے مختصر کہا۔

”آپ سے کچھ زیادہ فریک نہیں ہے؟“ تیمور کی بات پر میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

بقیہ اگلے صفحہ پر





”تینوں بیٹیوں کو بیاہ دیا۔۔۔۔۔ سب سے بڑی کو ابھی تک بٹھائے رکھا ہے۔ اٹھائیس سال کی ہو گئی ہے منعجا۔۔۔۔۔ اس کی عمر لڑکیاں تو اب دو، دو، تین، تین بچوں کی مائیں بن گئی ہیں۔“ شمیم بیگم نے گویا دل پر ہی ٹھونسا مار دیا۔

”بس کریں آیا۔۔۔۔۔ سب کچھ آپ ہی کے سامنے ہے۔ کتنی تک دو دو مل گئی ہوئی ہوں میں! اب خاندان میں تو منعجا کے جوڑ کا کوئی رشتہ ہے نہیں۔۔۔۔۔ تو بتائیں اس میں میرا کیا قصور ہے۔ اوپر سے اور بہنوں کے مقابلے میں منعجا کی شکل صورت بھی واقعی ہوئی ہے۔ کتنے ہی رشتوں میں ایسا ہوا کہ دیکھتے منعجا کو آئے اور پسند چھوٹی کر کر گئے۔۔۔۔۔ اب میں بڑھ چار بیٹیوں کی ماں، میرا تو بچل بھاری تھا میں نے اسی کو نصیحت جانا کہ ایک نہیں تو دوسری کا بوجھ ہی سر سے اتار دوں اور یوں تینوں کی ہو گئی۔۔۔۔۔ بے شک میری بچی شکل صورت میں کم ہے لیکن میری بچی میں وہ خوبیاں ہیں جو آج کل ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتیں۔“ ضعیف بیگم نے اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کیے۔

”وہیے میں نے رشتے والی خالہ سے کہا ہے۔۔۔۔۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ جیسے ہی کوئی اچھا رشتہ نظر آیا میں بات کروں گی۔“

منعجا دوسرے کمرے میں بیٹھی اپنی خالہ اور ماں کی تمام گفتگوں سن رہی تھی۔ آج پھر اسے احساس دلایا گیا کہ وہ واجبی شکل صورت کی لڑکی ہے۔ قدم قدم پر اسے یہی الفاظ سننے کو ملتے تھے۔

”بھئی اس کی کزن نانہ نے قہقہے میں اس کے سانولے رنگ کا مذاق اڑایا تو بھئی کسی کلاس فیلو نے اس کے ہلکے سے اٹھے ہوئے دہانے کو نشانہ بنایا اور تو اور رشتے داروں نے بھی یہ کہہ کر دل توڑا۔“ چھوٹی بھینس تو اتنی خوبصورت ہیں یہ کس پر چلی گئی۔ صرف نام خوبصورت ہے شکل تو۔۔۔۔۔

”یا اللہ کیا میری ساری زندگی ایسے ہی گزر جائے گی۔۔۔۔۔ میں کسی کا برا نہیں سوچتی لیکن لوگ۔۔۔۔۔ میں اپنی ماں کو اس طرح لٹکے لٹکے مارتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔ یا اللہ

اس دنیا میں میرا جوڑ ہے بھی یا نہیں۔“ منعجا نے اس میں لپٹی دیر تک آنسو بہاتی رہی جانے کب اس میں لگ گئی۔

\*\*\*

”امی میں نے ایک بڑا عجیب خواب دیکھا۔۔۔۔۔ منعجانے کھانا کھاتے وقت اپنی ماں کو مخاطب کیا۔“

”بیتا خواب کو کبھی عجیب نہیں کہتے۔“ منیر نے اسے ٹوکا۔

”اوہ، سوری۔۔۔۔۔ لیکن سنیں تو۔۔۔۔۔“ ایک ماں تھی جن کو منعجا تھوڑے بہت خمرے دکھا دیتی تھی۔

”اب سننا ہی دو۔“

”امی، پرسوں میں نے آپ کی اور خالہ کی باتیں سن لی تھیں۔۔۔۔۔ میں عجیب کشمکش میں تھی کہ میں آنکھ لگ گئی۔ میں نے دیکھا کہ میں کسی خوبصورت بھرے بھرے جنگل میں کھڑی ہوں اچانک ہی میری گردن پر پڑی۔“ منعجانے پانی کا گھونٹ سٹارے اتارا۔

”میں نے دیکھا تھا، ہتھنی کے ساتھ کھڑا، گھوڑا، گھوڑی کے ساتھ، شیر، شیرنی کے ساتھ، تاک کہ جیونے کو جیونے کے ساتھ دیکھا۔“ منعجانے

آیا۔۔۔۔۔ کہ اس خواب کا مطلب کیا ہے؟“ منعجا کی بات ادھوری رہ گئی۔ ضعیف بیگم نے مسکرا کر اطمینان کا سانس لیا۔

”اس کا مطلب ہے کہ اس دنیا میں اللہ کے لئے شے بے جوڑ نہیں بنائی۔۔۔۔۔ کہیں نہ کہیں تمہارا جوڑی موجود ہے بس اللہ کی طرف سے دیر ہے۔“

”یعنی اللہ نے مجھے میرے سوال کا جواب دے دیا۔“ منعجانے دل میں سوچا۔

\*\*\*

”منعجا بیٹا مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔“ ضعیف بیگم نے چائے کا کپ اُسے پکڑا دیا۔

”ماں بولیں۔۔۔۔۔“ منعجانے اپنے بال سینے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”بیٹا تم جاب چھوڑ دو۔۔۔۔۔“ ضعیف بیگم نے

آج اظہار کر دی دیا۔“ مجھے لگتا ہے کہ تمہاری جاب ہی تمہاری شادی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔“

”اوہ جی جی، کم سے کم آپ تو ایسی باتیں نہ کیا کریں۔۔۔۔۔ آپ نے اور پاپا نے ہمیں ہمیشہ یہی سبق دیا ہے کہ سب کے آگے کوئی نہیں جیت سکتا اور کوئی بھی

جیتنے کی کام میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ بشرطیکہ آپ کی نیت صاف ہو اور میری پیاری امی جب سب کی شادیاں ہو

جس تو میری بھی ہو ہی جائے گی اور اگر نہیں بھی ہوگی تو مجھے کوئی غلش نہیں ہوگی۔ کیونکہ جس کے پاس اتنی

پیاری ماں ہو اسے شادی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“ منعجانے اپنی ماں کی گردن میں انہیں ڈال کر کہا۔

”لیکن بیٹا میں کوئی ہمیشہ زندہ۔۔۔۔۔“ منعجانے ان کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”امی جی سب باتیں چھوڑیں۔۔۔۔۔ ابھی ربیعہ اور سعد آنے والے ہیں ان کے لیے کچھ پکانا بھی ہے یا نہیں۔“ منعجانے اپنی بہن اور بہنوں کی آمد کی یاد دہانی کر لی۔

”لاحول ولا قوۃ۔۔۔۔۔ میں تو بھول ہی گئی تھی۔“ ضعیف بیگم نے مسکرا کر اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

\*\*\*

”آئیے، آئیے۔۔۔۔۔ اتنی دیر میں آئے ہو، ذرا جلدی ہی آ جاتے۔“ منعجانے ربیعہ اور سعد کے گھر میں داخل ہوتے ہی کہا۔

”آئی میں آپ سے سخت ناراض ہوں۔ آپ تو کہیں ہو جاتے ہیں ہمارے گھر نہیں آتیں۔“ ربیعہ نے بھی نہیں چھوڑا۔

”نانی ذبیحہ! تم کو تو پتا ہے میری جاب کا۔۔۔۔۔ وہ ایک فارماسیوٹیکل کمپنی ہے۔۔۔۔۔ چھٹی کا تو سوال ہی نہیں ہوتا پھر گھر آ کر بہت تھکن ہو جاتی ہے۔“ منعجانے

تفصیل بیان کی۔

”ارے بھئی، امی نظر نہیں آرہی ہیں۔“ سعد نے دونوں کو چپ کرایا۔

”میں آگئی بچوں۔۔۔۔۔“ ضعیف بیگم فارغ ہو کر کمرے میں داخل ہوئیں۔ دونوں نے سلام کیا اور ادھر

کمرے میں داخل ہوئیں۔

ماہنامہ پاکیزہ

کودھری باتیں ہونے لگیں۔ نام کافی ہو گیا تھا منعجانے جلدی جلدی ڈانٹنگ ٹیبل لگا لی سب نے کھانا کھایا۔

”امی مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی تھی۔“ سعد نے آرام سے کرسی پر براجمان ہوتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ ربیعہ بھی وہیں بیٹھ گئی۔

”وہ دراصل میری چھوٹی زبیدہ کو تو آپ جانتی ہیں نا۔۔۔۔۔“ سعد نے سوائے انداز میں انہیں دیکھا۔

”ہاں، ہاں وہ تو بہت اچھی خاتون ہیں انہیں کیسے بھول سکتی ہوں! خیر تو ہے بیٹا۔“ وہ اس طرح اچانک سوال پر چونک گئیں۔

”دراصل ان کے چار بیٹے ہیں اور ماشا اللہ سبھی شادی شدہ ہیں اور ان کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ البتہ ان کے بڑے بیٹے شاہ عالم بھائی امریکا میں رہتے

ہیں۔ وہ وہاں میکینیکل انجینئر ہیں۔ بہت ہی ٹاکس آڈی ہیں نمازی اور پرہیزگار۔ دراصل ان کی پہلی بیوی کو انہوں نے طلاق دے دی تھی تقریباً دس سال پہلے۔

چھوٹی جان تو کب سے ان کے پیچھے بڑی ہیں کہ وہ شادی کر لیں لیکن وہ مانتے ہی نہیں تھے لیکن اب چھوٹی بہت بیمار ہیں ان کے بہت اصرار پر اب کہیں جا کر وہ

مانے ہیں۔ انہوں نے کسی قریب میں منعجا کو دیکھا تھا تو اسی سلسلے میں انہوں نے مجھے آپ سے بات کرنے کو کہا ہے۔“ گویا سعد نے تمام تفصیل ان کے گوش گزار کر دی۔

”امی جی، رشتہ بہت اچھا ہے۔ چھوٹی جان بہت اچھی عورت ہیں اور شاہ عالم بھائی کو بھی میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔“ ربیعہ نے بھی سلی دی۔

”بیٹا میں نے تو اس لڑکے کو نہیں دیکھا ویسے پھر بھی کیا عمر ہوگی؟“ ضعیف بیگم نے اپنے جتنے کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

”یہی کوئی پچاس یا باون“ سعد نے گویا ان پر بم گرا دیا۔

”پچاس یا باون۔“ ضعیف بیگم نے بہت مشکل سے اپنے غصے پر کنٹرول کیا۔ ”ربیعہ آخر میری بچی کی کون سی ایسی عمر ہو گئی ہے کہ میں بڑی عمر کے شخص۔۔۔۔۔ کو اپنی بیٹی

کے ساتھ رہنے دوں۔“

”ماں بولیں۔۔۔۔۔“ منعجانے اپنے بال سینے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”بیٹا تم جاب چھوڑ دو۔۔۔۔۔“ ضعیف بیگم نے

ماہنامہ پاکیزہ



وان کردوں۔“ صنفیہ بیگم نے ربیعہ پر افسوس کیا۔

”دیکھیں امی، اب اگر آپ یہ سوچتی ہیں کہ منجھا آئی کے لیے کوئی راجکار آئے گا تو یہ تو ہو نہیں سکتا۔ شاہ عالم بھائی سے شادی کے بعد عیش کریں گی آپ!۔ شکر کریں کہ انہوں نے آپ کو تو تکلیف نہیں کیا۔ وہ بڑے لکھے آدمی ہیں انہیں لڑکی بھی لگتی ہوئی اور پڑوسی کبھی چاہیے۔“ ربیعہ نے مزاج تلک کر کہا۔

”نیکر میں ایسا نہیں کر سکتی میری بچی لاکھوں میں ایک ہے؟“ صنفیہ بیگم نے تقریباً انکار کر دیا۔

”آپ اچھی طرح سوچ لیں امی۔“ سعد نے پھر زور دیا۔ منجھا چائے لے آئی تھی۔۔۔۔۔ وہ سب کچھ سن چکی تھی پھر بھی کمرے میں اسے دیکھ کر خاموشی چھا گئی۔

\*\*\*

صنفیہ بیگم اپنے کمرے میں سوچتی تھیں۔۔۔۔۔ لیکن منجھا کی نیند جیسے اس سے روٹھ گئی تھی۔۔۔۔۔ رات کی اس گہری سیاہی میں وہ شاید اپنی قسمت کو ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ چھت کی بنڈریوں پر بیٹھ گئی اور آسمان پر دور تک پھیلے تاروں کو دیکھتی رہی اور کچھ سوچتی رہی۔۔۔۔۔ اب وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔ وقت کی گزرتی ہوئی تیزی اسے کسی طوفان کا سندیسہ دے رہی تھی۔۔۔۔۔ اس نے اب فیصلہ کر لیا تھا کہ شاہ عالم والے رشتے کو انکار نہیں کرے گی۔۔۔۔۔ اپنی ماں کی خاطر یہ قربانی دے دے گی۔۔۔۔۔ کر لے گی اپنی زندگی سے بھجوتا۔۔۔۔۔

”لیکن دیکھ تو اس بات کا ہے کہ لوگ مجھ پر نہیں گے کہ معمولی شکل صورت ہونے کی وجہ سے ایک ایچڈ آدمی سے شادی ہو گئی لیکن میں صبر کروں گی کسی سے شکایت نہیں کروں گی۔“

\*\*\*

”شاہ عالم بھائی آج امریکا سے آرہے ہیں۔“ ربیعہ نے فون پر صنفیہ بیگم کو اطلاع دی۔

”ٹھیک ہے، میں کل ہی بھائی ایاز کو بلاتی ہوں ان کے گھر والوں سے بات کرنے کے لیے۔“ صنفیہ بیگم اپنے تمام مشورے اپنے بڑے بھائی ایاز الدین سے ہی کرتی تھیں۔۔۔۔۔ باپ کے نہ ہوتے انہوں نے تینوں

بیٹیوں کی شادی میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

\*\*\*

آج گھر میں بہت گہما گہما تھی۔ ربیعہ فاترہ کبھی گھر میں موجود تھے لیکن منجھا کا دل سنا اور اس تھا۔ چہرے پر مسکراہٹ سجائے وہ کسی پریشانی نہیں ہونے دے رہی تھی کہ وہ اندر سے ناخوش تھا۔ صرف اور صرف اپنی ماں کی خاطر اپنے آپ کو قربان رہی ہے۔

آج اس کی سسرال والوں نے آتا تھا ساتھ میں عالم بھی آئے تھے۔۔۔۔۔ لیکن فی الحال منجھا ان کے سامنے نہیں آئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اس کے دل کے حال کو سمجھ سکے لہذا شاہ عالم کے چاہنے کے باوجود بھی وہ ان سے نہیں ملی البتہ گھر کی عورتوں نے انہیں دیکھا۔ بڑے پیار سے شادی کی تاریخ رکھ دی۔

وہ دن بھی آ گیا جب منجھا، شاہ عالم کی دلہن بن گئی۔ یاد دہانی کے نکاح ہوا اور ہر کام انتہائی خوشی اور خیر و خوبی ہو گیا۔۔۔۔۔ لیکن منجھا کے دل کی چین تبدیل نہ کی۔ ”میری بیٹی بہت اچھی ہے اس کا خیال رکھا بیٹا۔۔۔۔۔ سات سمندر پار میں اللہ کے سپرد کر رہی ہوں اسے۔“ صنفیہ بیگم نے رخصتی کے وقت شاہ عالم سے منجھا کو خوش رکھنے کی گزارش کی۔

”آپ بے فکر رہیں، میں ہر طرح ان کو خوش رکھوں گا۔“ شاہ عالم نے مختصر جواب دیا۔ رخصتی کے بعد منجھا، شاہ عالم کی وسیع و عریض کوشی میں آ گئی۔۔۔۔۔ کمرے میں ہر طرف پھول ہی پھول بکھرے تھے۔

”انتی حسین بیج تو میں نے خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی۔“ منجھا نے ایک نظر ہال نما کمرے پر ڈالی تو کسی افسانوی ماحول کی عکاسی کر رہا تھا۔ اچانک ہی دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔۔۔۔۔ منجھا سمٹ کر بیٹھ گئی۔ شاہ عالم نے داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اپنا کوٹ اتار دیا۔ اس دوران منجھا کا دل زور زور سے دھڑک اٹھا تھا شاہ عالم ریلیکس ہو کر اس کے قریب آ گئے۔ ”کیا آپ سر نہیں اٹھائیں گی؟“ شاہ عالم نے



اس کے انتہائی جھکے ہوئے سر کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔  
 ”جی!؟“ متنبہ نے چونک کر دیکھا۔ دروازہ  
 بڑی بڑی آنکھیں جس کے گرد جھریاں صاف نظر آ رہی  
 تھیں۔ چوڑا ماتھا، سر پر کہیں کہیں سفید بال لیکن کپٹیاں  
 مکمل سفید تھیں۔ بھاری آواز لیکن پرسنائی بہت گریں  
 فل البتہ صراف بھلک رہی تھی۔ اس کے دل پر ایک  
 دم گھونسا پڑ گیا۔

”کیا ہوا؟ آپ چونک کیوں گئیں.....؟ شاہ عالم  
 نے اسے کھوئے ہوئے انداز میں دیکھ کر پوچھا۔  
 ”جی..... جی کچھ نہیں۔“ متنبہ کے ہونٹ سل گئے  
 تھے۔

”ہوں..... میں چاہتا تھا کہ آپ مجھ سے پہلے  
 لیں، مجھے دیکھ لیں تب شادی کے لیے ہاں کریں.....  
 لیکن آپ نے انکار کر دیا..... ورنہ میں شاید آپ کو پہلے  
 ہی اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیتا۔“ شاہ عالم نے  
 اپنے ہاتھ کی گھڑی اتار کر سائیز ٹیبل پر رکھی۔

”اچھا، میں چاہتا ہوں کہ آپ کو اپنے بارے  
 میں بتاؤں۔“ متنبہ اس بات پر آگ بھوکہ ہو گئی..... کی  
 نہ بڑی عمر کے لوگوں والی بات..... اس نے دل میں  
 سوچا۔

”میں شادی کے حق میں نہیں تھا لیکن ماں اور  
 بہنوں کے اصرار نے مجھے مجبور کر دیا..... ان کی خوشی کا  
 اندازہ آپ اس کمرے کی بناوٹ اور سجاوٹ سے لگا  
 سکتے ہیں..... میرا اس کمرے کو سجانے میں کوئی دل نہیں  
 تھا، یہ ان کی ہی ضد تھی۔“ متنبہ ایک بار پھر کھول گئی.....  
 ”یعنی میرے جذبات اور اور مان کچھ نہیں ہیں؟“ متنبہ نے  
 اپنی مٹھیاں بچھ لیں۔

”میری تو اپنی چھوٹی سی زندگی ہے۔“ شاہ عالم  
 بدستور بول رہے تھے۔ ”میں صبح تہجد کے لیے اٹھتا  
 ہوں۔ قرآن پاک کی فجر تک تلاوت کرتا ہوں پھر نو  
 بجے آفس چلا جاتا ہوں پھر وہاں سے چار بجے آنا.....  
 کھانا کھا کر آرام کرنا پھر اپنے ضروری کام نمٹانا اور عشا  
 کی نماز پڑھ کر سو جانا..... یہی میری لائف ہے۔ لیکن  
 اب آپ میری زندگی کا حصہ بن چکی ہیں۔ میں چاہتا

ہوں آپ میرا ساتھ دیں۔“ شاہ عالم بولنے لگے  
 رہے تھے اور متنبہ کرب کے عالم میں ان کی ہنسی  
 رہی تھی۔

☆☆☆

”آؤ بیٹی آؤ.....“ شاہ عالم کی ماں نے  
 خوشدلی سے صبح اس کا استقبال کیا.....  
 کے تو بھاگ کھل گئے نہیں پا کر۔“ انہوں نے  
 کہا۔

”امی ویسے بھاگ تو متنبہ کے بھی کھل گئے۔“  
 جی کی بہن فریخ نے ہنستے ہوئے اسے چھیڑا۔  
 مصنوعی مسکراہٹ بچاے بت بنی بیٹی تھی۔

”بیٹی تم خوش تو ہونہ.....؟ متنبہ کوان کے سوال  
 نے چونکا دیا۔

”خوش؟“ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا  
 ”میری تو ساری خوشیاں ہی ختم ہو گئیں۔“  
 ”کیا بات ہے بیٹا.....“ ماں جی نے اس کی  
 خاموشی کو توڑا۔

”جی کچھ نہیں..... میں خوش ہوں۔ آپ کو کیا  
 لا دوں۔“ متنبہ نے وہاں سے جانے کی کوشش کی۔  
 ”اللہ تمہیں خوش رکھے..... ابھی تو آئی ہو

سے کاموں میں لگا دوں..... تم تو مہمان ہو کچھ نہ  
 امریکا چلی جاؤ گی پھر کب آنا ہو؟ بیٹا..... میرا  
 بہت نیک ہے لیکن اس کی قسمت خراب تھی کہ اس کا

نہیں بسا..... وہ اس نے پسند کی شادی کی تھی  
 لیکن اس نے گھر بسانے کی کوشش نہیں کی تم شاہ عالم کو  
 بر تو کی اتنا اچھا پاؤ گی..... میرے شاہ عالم کو گھر کا

ضرور دینا.....“ ماں جی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔  
 ”میں پوری کوشش کروں گی.....“ متنبہ نے

کہا۔  
 کچھ دنوں بعد وہ تھوڑی سیٹ ہوئی۔

بھابھیاں، بہندیں اور ماں جی تو بہت ہی شوق عورت تھیں۔  
 پہلی بار کسی جگہ اسے یہ احساس نہیں ہوا کہ وہ معمولی  
 اہم ہے۔ بس ابھی تک وہ شاہ عالم کے قریب  
 ہو پائی تھی۔ شاید وہ ابھی تک اپنے خوابوں کے

میں بندھی۔

\*\*\*

”تم بہت چپ چپ رہتی ہو؟“ شاہ عالم نے  
 اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”نہیں امریکا آئے دو  
 بیٹے ہو گئے ہیں تم۔“

”نیا آ..... کو مجھ سے کوئی شکایت ہے؟“ متنبہ  
 نے ہیرا کر پوچھا۔

”ارے نہیں..... نہیں..... تم تو کسی ردیوٹ سے  
 زیادہ تیز ہو۔ ہر کام اس طرح وقت پر کر دیتی ہو  
 جیسے خیر میں تو حیران ہوں کہ میری ہر بات پر ہاں  
 دے دیتی ہو۔“ شاہ عالم نے اس کی بات ہی نہیں کر تیں..... سوہا  
 نے متنبہ نے آج پہلی بار ان کے منہ سے سوہا کا نام  
 سن کر انہیں چونک کر دیکھا۔

”خیر چھوڑو..... ادھر آؤ۔“ شاہ عالم نے اس کا  
 ہاتھ پکڑ کر اسے صوفے پر اپنے قریب بٹھالیا۔

”دیکھو، میں جانتا ہوں کہ تم ایک نیک لڑکی ہو  
 تمہارے بہت سے ارمان ہیں لیکن میں اس دور سے  
 بہت آگے آچکا ہوں..... میں عمر کے اس حصے میں تم کو  
 ”جان من“ کہہ کر نہیں بلا سکتا۔ آئی لو، مس یو جیسے  
 الفاظ اب مجھے اور لگتے ہیں..... بسب میں سوہا کے  
 ساتھ کر چکا ہوں.....“ اس نے ایک تکیہ سانس لی۔

”لیکن اس نے مجھے صرف دکھ ہی دکھ دیے ہیں  
 نے تم سے شادی کی رات ہی کہا تھا کہ تم کو میرا ساتھ دینا  
 ہو گا میں نہیں چاہتا کہ میں تمہیں چھوٹی سی بھی تکلیف

دوں۔“ شاہ عالم نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔  
 ”تم خوش رہا کرو تم کو تو میں تمہارا یہاں کسی

بندہ رشتی میں داخلہ کروا دوں تم نے ماسٹر کر لیا ہوا ہے  
 کیوں نہ تم آگے بڑھو۔“ شاہ عالم نے اسے ایک نئی

راہ دکھائی۔  
 ”میں سوچوں گی۔“ متنبہ نے مختصر جواب دیا۔

\*\*\*

”السلام علیکم.....“ اس مغربی ملک میں اپنی  
 زبان سن کر اس نے پلٹ کر دیکھا۔

”پاکستانی ہو؟“ ایک بوڑھی عورت مسکراتی ہوئی

اس کی بیٹی پر بیٹھ گئیں۔

”جی آپ.....؟“ متنبہ نے غور سے انہیں دیکھ  
 رہی تھی آج یہاں پہلی بار کسی نے اپنی زبان میں بات  
 کی تو اس کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔

”میں نہیں رہتی ہوں، میں تمہیں روز اپنے  
 اپارٹمنٹ کی گیلری سے دیکھتی ہوں۔ کیا روز اسی ٹائم  
 اس پارک میں آتی ہو؟“ اس عورت نے شفیق لہجے میں  
 اس سے سوال کیا۔

”جی ہاں، دراصل؟“ ابھی اس کی بات ادھوری  
 ہی تھی۔

”اچھا، اچھا تو اپنے سر کے ساتھ آتی ہو.....“  
 اس عورت نے قریب آتے شاہ عالم کو دیکھا..... متنبہ پر  
 جیسے کئی بجلیاں ایک ساتھ گر گئیں۔

”تم سوچو کہ مجھے کیسے پتا چلا کہ یہ تمہارے سر  
 ہیں۔“ متنبہ ابھی تک شاکدھی..... ”کیونکہ تم نے ناک  
 میں لونگ ڈالی ہوئی ہے۔ یہ تو ہے ہماری شہرٹی لڑکیوں  
 کی شادی کی نشانی..... سو میں سمجھ گئی تم شادی شدہ  
 ہو..... اور انہیں دیکھ کر.....“ شاہ عالم بالکل قریب  
 آچکے تھے..... اس سے پہلے کہ شاہ عالم تین وہ جلدی  
 سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آئی یہ میرے شوہر ہیں؟ میں ان کے ساتھ روز  
 واک کرنے آئی ہوں۔“ متنبہ نے جلدی سے انہیں اپنی  
 اصل بات کہہ ڈالی۔

”شوہر.....؟“ وہ شرمندہ ہو گئیں۔  
 ”اچھا آئی، میں اب چلتی ہوں۔“ انشا اللہ پھر

ملاقات ہوئی۔ ”وہ تیز قدم اٹھاتی شاہ عالم کے ساتھ  
 آ گئی۔

یہ باتیں تو اب روز کا معمول بن گئی تھیں لیکن شاہ  
 عالم بالکل بے خبر اور اپنی زندگی میں خوش تھے..... جب  
 کہ متنبہ اندر ہی اندر کڑھتی رہتی تھی کہ شاہ عالم اپنے سفید  
 ہوتے بالوں کو کالا کیوں نہیں کر لیتے تاکہ کچھ تو عمر سے کم  
 لگیں..... لیکن شاید شاہ عالم ان باتوں سے انجان تھے یا

بن رہے تھے۔

\*\*\*



”منہاجا.....“ شاہ عالم نے مزید ارکافی کا ایک گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے اسے پکارا۔  
 ”جی آئی.....“ اس نے جگن سے ہی آواز لگائی۔  
 ”اوہو بھئی..... جی، ہاں، اچھا، ارے بابا اس کے علاوہ بھی اس دنیا میں الفاظ ہیں۔“ شاہ عالم نے زوردار قہقہہ لگایا۔

”چلو آج میں تم کو ایک ایسی جگہ لے کر چلتا ہوں جہاں تم بہت خوش ہو گی..... یہاں لاس ویگاس میں ہمارے گھر سے تقریباً دس میل کے فاصلے پر اسلامک سینٹر ہے۔ وہاں تمام پاکستانی اور مسلمان لوگ آتے ہیں۔ رمضان المبارک میں افطار پارٹیز ہوتی ہیں، عید پر سب وہیں نماز پڑھتے ہیں..... دراصل آج میرے دوست احسان اللہ کے بچے کی آئین ہے۔ اس نے مجھے اور تمہیں انوائس کیا ہے۔ آئی ہو پ کے تم وہاں جا کر خوش ہو گی۔ میرے کئی دوست اپنی بیویوں کے ساتھ آئیں گے تم ان سے ملنا۔“ شاہ عالم اخباردار کو کافی کا حوضہ لیتے ہوئے بول رہے تھے۔

”لیکن آپ نے مجھے پہلے تو نہیں بتایا، منہاجا کو حیدر شاہ عالم ایڈوکیٹ پر جانے کا کہتے تھے۔“  
 ”ارے بابا..... پہلے سے انہیں بتایا جاتا ہے جن لوگوں میں کچھ کی ہو..... تم تو اتنی خوبصورت ہو کہ انہی کپڑوں میں چلی چلو گی تو تم جیسا کوئی نہیں ہوگا۔“ شاہ عالم نے مسکرا کر جواب دیا۔

”خوبصورت اور میں..... آج تک تو کسی نے کہا نہیں۔“ اس نے دل میں سوچا۔  
 منہجا آج واقعی بہت اچھی لگ رہی تھی لائٹ پیرٹ گرین کلر پر بلیو کمر سے انیمبر انڈری والی شرٹ اور کنٹراس بلیو کمر کی شلوار اور دو پٹا اس پر کافی مکمل رہا تھا۔

”منہجان سے ملو.....“ شاہ عالم نے ایک کپل کی طرف متوجہ کیا۔  
 ”یہ ہیں فراز اور یہ ان کی وائف ندا۔“ ان دونوں نے بڑے تپاک سے منہجا سے ہاتھ ملایا۔  
 ”شاہ عالم بھائی آپ کی وائف تو بہت بیماری

ہیں.....“ ندانے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ اسے تعریف پر بہت حیرت ہوئی..... وہ جب سے یہاں آیا تھی اسے کسی نے کم صورت نہیں کہا تھا حتیٰ کہ شہ نے بھی کبھی نہیں کہا..... ”کیا یہ لوگ میرا مذاق اڑاتے ہیں یا واقعی یہ سب بہت اچھے ہیں۔“  
 ”آپ آج کل کیا کر رہی ہیں.....؟“ ندا نے اسے خیالوں کی دنیا سے گھسیٹا۔

”جی، میں..... ابھی تو گھر پر ہی مصروف ہوں لیکن اب آگے بڑھنے کا سوچ رہی ہوں۔“  
 ”اوہ..... گریٹ“ فراز نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔  
 ”کتنا خوبصورت کپل ہے ان کا۔“ اسے اپنے دل میں جھین پی محسوس ہوئی۔

”وہاں بھی ایک دوسرے کے ساتھ کتنے اچھے لگ رہے تھے۔“ ندا اور عادل، شہناز اور صبا کی تو بہت ہی خوبصورت جوڑی تھی..... ایک، ہم ہی ب جوڑ..... وہ نہ جانے کیوں سب کی نظروں میں عجیب م نظر محسوس کر رہی تھی..... جب کہ وہاں سب اس بہت تپاک سے ملے تھے۔

”شاہ عالم بھائی اب تو ہمارے گھر آنے میں آپ کو کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہیے۔ اب تو آپ بھی گھر والے ہو گئے ہیں۔“ صبا ہمیشہ ہی بڑے پرمخ انداز میں بات کرتی تھی۔ ”بس مجھے نہیں پتا، اب آپ بھائی کو لے کر ہمارے گھر آ رہے ہیں۔ ورنہ اب بھائی کو ڈرائیونگ سکھا دیں تاکہ وہ آپ کی محتاج نہ رہیں..... ورنہ آپ کے سو فائدہ ماحول میں رہ کر تو آپ کی پاگل ہو جائیں گی۔“ گویا صبا نے ہتھ پتے اس پر ہم را دیا۔ شاہ عالم نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

”ہاں بھئی، اب تو میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ ان کو ڈرائیونگ سکھا دوں تاکہ آدھے کام تو یہ خود ہی کریں۔“ منہجانے صرف مسکراہٹ سے ہی کام لیا۔  
 وہ اس رات سو ہی نہیں سکی۔ آج اس کا روزہ جی چاہ رہا تھا ہر چیز بے رنگ لگ رہی تھی۔ ”شاہ عالم میری کوئی فکر نہیں ہے۔ وہ سارا دن مصروف رہے ہیں زندگی بچھے ہیں۔ شاید میں انہیں پسند نہیں ہوں۔“

رات بھر یہی باتیں سوچتی رہی اور آنسو بہاتی رہی..... جب کہ شاہ عالم کھری فینڈ سو رہے تھے۔

”سوبا.....“ شاہ عالم کے منہ سے آج اچانک اس کا نام نکل گیا۔

”آئی میں منہجا آج کھانے میں کیا بنایا ہے۔“ شاہ عالم نے سوبا کے نام کو بے پروائی سے جھٹکا لیکن آج منہجا واقعی بکلی گری۔

”سوبا.....؟ آخر تک یہ نام میری زندگی سے چڑا رہے گا۔“ منہجا آج پہلی بار ان کے زوردار کھڑی تھی۔

”کہا..... نہ س..... سوری۔“ شاہ عالم نے بات ختم کی۔

”میں نے آپ سے جواب مانگا ہے۔“ وہ جذباتی ہونے لگی۔ ”آخر تک تک میرے ارمان، میرے جذبات، میرے احساسات کو آپ روندتے رہیں گے..... میں تھک گئی ہوں ان باتوں سے، لوگوں کی نظروں سے..... اپنے آپ سے..... آخر میرا تصور کیا ہے کہ سوبا کو سب کچھ ملا اور مجھے کچھ بھی نہیں۔ آپ نے اسے ہر طرح کا عیش دیا، سکون دیا، محبت دی یہاں تک کہ اسے ورلڈ ٹور پر بھی لے کر گئے۔“

”یہ بات تم سے کس نے کہی؟“ شاہ عالم نے چونک کر پوچھا۔

”ندانے بتایا ہے مجھے کہ آپ اس کے ساتھ ہی مون منانے ورلڈ ٹور پر گئے تھے..... آپ بے حس ہو چکے ہیں اور مجھے بھی کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے آپ میں من رہتے ہیں میرا کوئی احساس نہیں ہے آپ کو۔“ شاہ عالم اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ کر رونے لگی۔ اس کا پورا جسم بلی طرح کا پ رہا تھا..... آج گویا وہ پھٹ پڑی تھی..... شاہ عالم اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے لیکن وہ اب خاموش نہیں رہنا چاہتے تھے۔

”ہاں، میں جانتا ہوں اسے سب کچھ ملا..... کیونکہ وہ میری زندگی کا پہلا ماہ تھا..... لیکن تم یہ تو جان

گئیں کہ میں نے اسے پوری دنیا کھائی لیکن تم نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ میری زندگی اس کے ساتھ کیسی گزری ہے۔ ہم بیٹیوں ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے تھے۔ ہفتوں ایک دوسرے کی شکل نہیں دیکھتے تھے۔ الگ الگ کمروں میں سوتے تھے جو سونک مجھے ان چار بیٹیوں میں تم نے دیا ہے وہ چار سالوں میں نہیں دے سکی تھی۔“ شاہ عالم نے ایک گہری سانس لی۔

”اس نے ہمیشہ اپنی انا کی دیوار کھڑی رکھی..... اسے صرف دنیا اور دنیا داری سے محبت تھی۔ میں ایک بے قیمت چیز تھا اس کے لیے.....“ شاہ عالم پھر کچھ دیر کے لیے رکے۔ ”اور ہاں! ایک اور بات..... تم کہتی ہو اسے سب کچھ ملا..... ہاں اسے واقعی سب کچھ ملا لیکن تمہیں..... تمہیں میں ملا ہوں منہجا میں ”شاہ عالم“ سوبا میرے دل میں بھی گھر نہیں کر سکی اور تم نے مجھے دونوں ہاتھوں سے جیت لیا ہے۔“ وہ وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے اور منہجا پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہ گئی۔

”میں آج صبا کے گھر جاؤں گی۔“ وہ سر جھکائے ناشتے کی ٹیبل لگاتے ہوئے بولی۔ مکمل رات کی بات سے وہ شرمندہ تھی لیکن شاہ عالم کا سلوک پہلے جیسے ہی تھا۔

”اوہ گڈ..... چلو ڈرائیونگ سیکھنے کا فائدہ تو ہوا اب تم خود جا سکتی ہو.....“ وہ اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے لیکن اس نے سر جھکا لیا۔

”ارے آج صبا کے فلیٹ کا دروازہ کھلا ہے۔“ وہ حیرت سے دل میں سوچنے لگی۔ پہلے وہ شاہ عالم کے ساتھ بھی آچکی تھی لیکن کبھی..... وہ انہی سوچوں میں اندر داخل ہو گئی۔

”کیا بکواس کر رہی ہے تو..... میں نے تجھ سے کہا تھا نہ کہ اس بار بھی ساری خواہ مجھے دینا۔“ شہناز کی زوردار آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو وہ وہیں رک گئی۔



”کیوں، آخر کیوں؟ جب سے میں یہاں آئی ہوں تم نے مجھے غلام بنادیا ہے..... اور رعب بھی جاتے ہو مجھے نہ ہونے کی دوائیاں کھلا کھلا کرتے مجھے سریش بنادیا اور اب چاہتے ہو کہ میں ہی سب کچھ کروں۔ آخر تم کب تک پیسہ جوئے میں ہارے رہو گے۔“ صبا زور زور سے رونے لگی.....

”کم ظرف، زبان چلاتی ہے طلاق دے دوں گا تجھے.....“ شاہنواز نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر رسید کیا۔

”آف میرے خدا.....“ منہا گرتے گرتے پئی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی باہر نکل گئی۔ گاڑی میں بیٹھی تو اسے سمجھ نہ آیا کیا کرے۔ وہ خوبصورت کپل جس کو کدھ کر اسے شاہ عالم برے لگ رہے تھے وہ اندر سے ایسے انکے..... سوچ سوچ کر اس کا دماغ پھٹنے لگا۔ اسی سوچ میں اس نے گاڑی نہ اڑے گھر کی طرف دوڑادی۔ ڈور تیل دی تو ندانے ہی دروازہ کھولا۔

”ارے منہا بھابی.....!“ کہنے کو منہا ان ہی لوگوں کی عمر کی تھی لیکن شاہ عالم کی پوزیشن کے رعب میں سب ہی اسے بھابی کہتے تھے۔ ”کیا بات ہے؟ کچھ پریشان ہو؟“ ندانے اس کی اڑی رنگت دیکھ کر تشویش ظاہر کی۔ منہا صوفے پر دراز ہو گئی۔

”ندانم سے ایک بات پوچھوں.....؟“ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

”ہاں پوچھو.....“ ندانے پیار سے بچہ کو جو چار سال کا ہوتے ہوئے ڈھائی سال کا لگتا ہے دوا پلاتے ہوئے بولی۔

”کیا صبا اور شاہنواز ایک دوسرے کے ساتھ خوش نہیں؟“ بس وہ اتنا ہی کہہ گئی۔

”یہاں کون، کس کے ساتھ خوش ہے.....؟“ ندانے ایک سرد آہ بھری۔

”یہ پردیس امریکا، لاس ویگاس جہاں کے لوگ خواب دیکھتے ہیں کہ ان کی بیٹیاں یہاں بیایا جائیں وہ شاید یہ نہیں جانتے کہ یہ پردیس ان کی بیٹیوں کے لیے کتنا بڑا ناگ ہے جو انہیں پل پل ڈس رہا ہے۔ اپنا وطن

اپنا ہی ہوتا ہے۔ کدھ دکھ میں کم سے کم ہم اپنا قریب تو ہوتے ہیں۔ کسی سے کدھ کہہ تو سکتے ہیں یہاں.....!“ اس نے توقف کیا۔ ”یہاں ہم پاکستان کے ہاں لکھن اکیلے۔“ پاکستان جا کر لڑکیاں اترا اترا کر ہیں۔ ”آف یہاں ڈسٹ بہت ہے،“ منہا بہت پریشان ہے۔ ”وہ یہاں پھر اداؤں سے بدتر حالت میں رہ رہی ہیں۔ آگ میں جل رہی ہیں..... مجھے یہ دیکھو دنوں پہلے اپنے پیارے بچے کی تیار داری کرتی ہوں کیونکہ جب یہ بچہ ہونے والا تھا تو میں ایک چھوٹا بنانے کے کارخانے میں کام کرتی تھی دن بھر وہاں کی خوشبو نے میرے بچے کی پیدائش بجا کر دیا۔ اسے ارنی ہے کہ شہید سردی میں بھی اسے گرمی لگتی ہے۔“ ندانے اپنے آنسو پونچھے۔

”اور فرناز..... وہ ایک ظالم شخص ہے..... بلکہ یہاں ہر مرد اور عورت ایک کمفٹ والی زندگی گزار رہے ہیں۔ آدھا خرچہ شوہر اٹھاتا ہے اور آدھا بیوی بکری پونگی گاڑی چلتی ہے۔“

”اور تمہارے ماں باپ.....“ منہا کی بات ادھوری رہ گئی۔

”ماں باپ مجبور تے ہوں تو ہمیں اتنی مصیبت نہ اٹھانی پڑے وہ تو یہی کہتے ہیں زندہ گئی ہوسر کے شہر کے گھر سے نکلتا۔“

”آف میرے خدا.....“ منہا کا ضمیر اسے ڈسنے لگا۔

”شنا کا تو ہم سے برا حال ہے۔“ ندانے اس کو مزید جھنجھوڑا۔ ”اس کا شوہر ایک نمبر کا قحط ہے۔ شہر خشک کرنا، لڑکیاں گھمانا اور ان کے ساتھ عایشیاں کرنا اس کا اولین شوق ہے۔ آہ..... ہم پردیسوں کی قسمت۔“ ندانے صوفے سے ٹپک لگائی۔

”منہا آپ سب سے زیادہ خوش نصیب ہو.....“ ندانے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ ”بلکہ دنیا میں سب سے زیادہ خوش قسمت ہو کہ آپ کو شاہ عالم بھابی بھائی شریک حیات ملا۔ ہم ان کو برسوں سے جانتے ہیں۔ انہوں نے ہر قدم پر ہماری مدد کی ہے۔ دس سال ہو گئے ان کا گھر خراب ہوئے..... بڑی سے بڑی زمین

وہاں ان کے پیچھے پڑیں لیکن انہوں نے آج تک کسی کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔“ ندانے رک کر سانس لیا۔ اور خیالوں میں کھوتے ہوئے بولی۔

”جس دن وہ حج پر جا رہے تھے ہم سب ان سے ملنے گئے تھے ان کو مبارکباد دے..... تب ہم سب نے ہی زور دیا تھا کہ اس بار پاکستان جائیں تو اپنی شریک حیات کو ساتھ لے کر آئیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے انہوں نے مسکرا کر کہا تھا کہ اس بار ضرور خانہ کعبہ کی چادر پکڑ کر اللہ سے گھر کا سکھ مانگوں گا اگر اللہ نے سن لی ضرور اپنی شریک حیات کو ساتھ لاؤں گا اور واقعی آپ ایسی ہی ہو کہ آپ کو خانہ خدا کی چادر پکڑ کر مانگا جائے۔“ ندانے بولتی جا رہی تھی اور منہا کی آنکھوں سے درد کا سیلاب بہتا جا رہا تھا۔

”بس، ندانیں کرو میں اس لائق نہیں ہوں.....“ میں نے تو قدم قدم پر خدا کی ناشکری کی ہے میں تو شاہ عالم جیسے فرشتہ صفت انسان کو بھی ہی نہیں۔ آج مجھے اپنی ماں کی ایک بات یاد آ رہی ہے۔ وہ اکثر کہتی تھیں۔ ”بیٹا خوش نصیب لڑکی تو وہ ہوتی ہے جس کا شوہر اس کا اپنا ہو بھر جائے وہ جہاں بھی ہو وہ سکون کی نیند سوتی ہے اور یہ نیند ہر لڑکی کو نہیں ملتی۔“ وہ راستے بھر روتی رہی۔

آج اسے ایک ایک پل صدیوں کے برابر لگ رہا تھا۔ مغرب کی اذان کا وقت ہو گیا تھا..... اس نے وضو کیا اور تجدد ریز ہو گئی۔

”اے اللہ تو مجھے معاف کر دے، میں نے اپنے فرشتہ صفت شوہر کو محض اس کی عمر کی وجہ سے دکھ دیے انہیں اپنے خاموش سلوک سے اذیت دی اور وہ پھر بھی میری قدر کرتے رہے۔ میں تو معافی کے بھی لائق نہیں ہوں۔“ وہ جھنجکیوں سے رو رہی تھی۔ اچانک ہی اسے اپنے کندھوں پر مضبوط ہاتھ کا وہاں محسوس ہوا اس نے بچے مڑ کر دیکھا تو شاہ عالم مسکرا رہے تھے۔ اس کی عمر ان زمین میں گڑ گئی، آسو تھے کہ رکنے کا نام نہیں سنا ہے تھے۔ شاہ عالم اس کے قریب بیٹھ گئے۔ اس کے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ لے لیا۔

”مجھے معاف.....“ منہا کی مات پوری ہوئے

## سالی نو مہینے

شاہد اب کے سال نو میں ہو پوری آرزو اداس دل کی رفاقتوں کا کوئی بھول بھل ہی جائے کا نیا بھر کا نکل ہی جائے نئے سال میں غم جدائی کا داغ خوشی کے اشکوں سے وصل ہی جائے ہاں شاہد اب کے سال نو میں کوئی معجزہ ہو ہی جائے پیچھا ہے جو وہل ہی جائے

مرسلہ: نصیر آصف خان، ملتان

”اپنے انہوں نے اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ کیا ہے..... تم کیوں پریشان رہتی ہو..... اس لیے میں نے تمہیں آزاد چھوڑ دیا تا کہ تم خود اپنی آنکھوں سے اس دنیا کو دیکھو اور سمجھو اس کے بعد میرے قریب آؤ..... جانتی ہو جب سے تم میری زندگی میں آئی ہو مجھے سوا سے شدید نفرت ہو چکی ہے۔ میں اسے بھول چکا ہوں، میں تو سوچتا ہوں کہ کاش دس سال پہلے تم مجھے مل جاتیں تو میری زندگی کتنی پرسکون گزرتی..... مجھے صرف تم سے محبت ہے۔“ منہا نے شاہ عالم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور شاہ عالم نے اس کے ماتھے پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔

✽



## گڑھا

عاليه بخاري

گارمنٹ فیکٹری کی ملازمت ان تینوں کے درمیان دوستی کی بنیاد بنی تھی۔ اچھے سیون کی بس میں، شہر کے تین مختلف حصوں سے چڑھنا پڑنا، ان تینوں ہی کا روز کا معمول تھا مگر "بغی روشنی" اسکول والے اسٹاپ پر وہ تینوں اکٹھی پہلی بار ہی اس روز اتری تھیں۔ سوئے اتفاق ان تینوں کے علاوہ اس اسٹاپ پر کوئی اور مسافر اس وقت نہیں تھا۔ ایک دوسرے پر چڑچڑائی نہ ڈال کر وہ تینوں آپس میں بنا سمجھ کے اپنی اپنی منزل کی

## ٹاؤنٹ





طرف روانہ ہو سکتی تھیں چند منٹ میں ہی اندازہ ہو گیا کہ منزل مقصود غالباً ایک ہی ہے۔

”ستار بھائی کی گارمنٹ فیکٹری میں چار ہی ہیں؟“ گلید کا اتنا پوچھ لینا ہی ابتدائی تعارف کا بہانہ بن گیا۔ ان دونوں کے ہاتھ میں تھامے ہوئے اپنے جیسے سستے پرس اور پلاسٹک کی ٹھکی میں رکھا بیج باکس دیکھ کر اس نے جو اندازہ لگا یا تھا وہ بالکل درست تھا۔

ستار بھائی کی فیکٹری میں یہ ان تینوں کا پہلا دن تھا۔ نیا اسکول، نیا محکمہ، نئی نوکری اور نئی رشتے داری کا آغاز کرتے ہوئے جو فطری سی گھبراہٹ دل پر طاری ہوتی ہے، وہی ان تینوں کو ایک دم قریب لانے میں مددگار ثابت ہوئی تھی۔

”سنا ہے ستار بھائی، کام کے معاملے میں بہت سخت ہیں۔ درکار کو سارا دن، ذرا سا بھی ریست نہیں لینے دیتے؟“ بھیلہ نے ستار بھائی سے جڑی سب سے معروف ”خوبی“ پریشان کن سے لہجے میں بیان کی۔

”ارے کچھ نہیں ہوتا، دو چار دن لگتے ہیں سیٹ ہونے میں، میں پہلے بھی کام کر چکی ہوں، ہر وقت مالک تھوڑی سر پریشیے رہتے ہیں، چار فیکٹریاں ہیں ان کی، میں پہلے دوسری فیکٹری میں کام کرتی تھی ان کی، سارا سسٹم اچھی طرح سمجھتی ہوں!“ اپنا تھک والا خوف خونی سے چھپا کر گلید نے اپنی دونوں ساتھیوں کی طرف ذرا خیر نہ لگا ہوں سے دیکھا۔ وہ دونوں پہلی بار بغرض ملازمت نکلی تھیں، گلید کی اس سیناریو سے بے حد متاثر ہوئیں۔

”پھر وہ نوکری تم نے کیوں چھوڑ دی؟“ شالی نے فوراً ہی پوچھا۔

”لو چھوڑ دی کہاں، وہ تو فیکٹری ہی دوسری جگہ شفٹ ہوگی۔ بہت دور پڑتی تھی ورنہ انچارج تو بہت خوشامد کر رہی تھی کہ میں ان کے ہاں کام نہ چھوڑوں، میرے جیسی ورکر.....!“

اسٹاپ سے فیکٹری تک کے فاصلے کو طے کرتے ہوئے وہ تینوں اپنا درمیانی فاصلہ ختم کرنے میں بڑی حد تک کامیاب رہی تھیں۔ فیکٹری میں ان کی شناخت کا

سبب یہی دوستی ٹھہری جو محض اتفاقاً ہی وجود میں آئی تھی۔ مزاجاً بے حد مختلف ہونے کے باوجود بھی ایک جڑ جوتیوں میں مشترک تھی، وہ تھیں ان کے حالات زندگی بد حالی اور ذلت داریوں کا بوجھ، ان تینوں کو بھی یکسانیت بہت تیزی سے قریب لائی تھی۔ یکساں امارت فاصلے پر بڑھائی ہے مگر ایک سی تنگ حالی۔ بڑی جلدی سارے تکلف اور فاصلے ختم کر دیتی ہے۔ نہ ہی گلید کو ان دونوں سے آئے دن بس کا کرایہ مانگنے میں جھجک رہی، نہ ہی بھیلہ کو کتنی کے چار جوڑوں کو بار بار پہن کر آنے میں کوئی شرمندگی ہوتی اور نہ ہی شالی کو اپنے بیج باکس میں پرانے کے ساتھ صرف اچار رکھ کر لانا ہی برا لگتا۔

سارا دن مشینوں کی گھر گھر، میں گھر سے رہ کر بھی وہ لوگ اپنی ڈھیر ساری باتیں کرنے کے لیے وقت نکالے ہی رکھتی تھیں۔ انچارج سیکرٹ آپا نے پہلے پہل تو ان تینوں کو بڑے سارے ہال کے تین مختلف کونوں میں بٹھایا، ان کی تجربہ کار آنکھوں نے پہلے ہی دن ان لوگوں کی آپس کی یکمشری کو بھانپ لیا تھا۔ اس طرح کی دوستیاں، کام میں رہنے کا سبب بنتی ہیں اور کسی پرائیویٹ سیکٹر میں یہی بات سب سے زیادہ ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ یہاں روزگار ٹارگٹ سامنے ہوتا جسے پورا کر کے مالکوں کو دینا ہی پڑتا، بعض اوقات تو اوور ٹائم بھی کرنا ضروری ہو جاتا تھا۔

”دیکھ لینا، ان سیکرٹ آپا کو تو میں کیسے جھٹے میں اتارتی ہوں، فکر ہی مت کرو!“ گلید نے اپنا دھڑکی کا کر دکھایا اور ہمینہ بھی نہیں گزرنے پایا تھا کہ وہ لوگ بالکل ہی قریب قریب کی سیٹوں پر بیٹھنے لگیں۔

”لوگ کیاں سختی ہیں اور خوش اخلاق بھی، ورکر کا کام لگن اور ایمانداری سے کرے تو ہمیں کیا پڑی ہے کہ ذرا ذرا سی باتوں پر اس کا چھپا پکڑے رہیں۔“ سیکرٹ آپا نے کام کرنے والی دوسری عورتوں کے سامنے ان تینوں کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ اب گلید اور بھیلہ بالکل آگے پیچھے بیٹھ گئی تھیں اور شالی ان کے دائیں ہاتھ پر۔ ”میں نے کیا کہا تھا، سیکرٹ آپا کو کتنی میں لہا ہوا

تم دونوں بے وقوف تو بے کار میں ہی گھبرا رہے۔“ گلید کی ”سیناریو“ واقعی بڑے کام آئی تھی۔ شالی اور بھیلہ نے اس کی بالادستی، دل و جان کے ساتھ ہی کی تھی۔ گلید بولتی بھی بہت تھی اور عاداتاً شوخ بھی تھی۔ بہت دیر تک ایک جگہ بیٹھے رہنا بھی اس کے مشکل کام تھا۔ اپنی پیاری دوستوں کو چھوڑ کر، موقع ملے ہی وہ دھڑا دھڑا چکر لگاتی اور چند منٹوں میں ہی ڈھیر ساری خبریں جمع کر لاتی۔



”باتیں ساتھ والی لائن کے بالکل آخر میں بیٹھنے والی تھی کہ میاں نے آج پھر اسے پیٹا ہے۔ آنکھ کے قریب نیل پڑا ہوا ہے۔ بہت رورہی ہے غریب!“ اس روز کی تازہ خبر تھی۔

”لوگ تو ٹھیک ہے اس کے میاں کا، بے چاری ان شریف اور سیدھی سادی ہے، سارا دن سر جھکائے کام میں لگی رہتی ہے!“ بھیلہ کو ن کر بڑی بات آئی۔

شالی واقعی بڑی شریف عورت تھی محض اپنے کام سے کام رکھنے والی مگر قسمت میں لکھا کچھ، محض خویوں کا ہر کام منہ کب ہوتا ہے؟ یہ تو کوئی اور ہی سلسلہ ہے۔ اس کا میاں کہتا ہے کہ تین سال میں ایک بچہ ہی پیدا نہیں کر سکی ایسی عورت کس کام کی، کسی وقت بھی لاپرواہ کر دیا گا!“ بے نیازی سے سر جھٹک کر گلید نے شالی سے سنا فقرہ من و عنان ڈھرایا۔

”کینہ کہیں کا!“ پاس بیٹھی شالی کے کان بھی ادھر ہی لگے ہوئے تھے۔ ”بے چاری سلی کا کیا تصور، یہ تو اس ٹکٹ، آوارہ آدمی کو کما کر رکھا رہی ہے پھر بھی نہ مانیں لینے دیتا۔ میں تو کہتی ہوں اس سے پہلے وہ کسے سلی کو خود دیکھ گی کا فیصلہ کر لینا چاہیے!“ شالی نے ان کے محض تین ماہ اور سترہ دن بعد شوہر نے نہ رہ کر گھر سے باہر کر دیا تھا۔ سواب وہ اپنی ذمہ انا مگر مٹی کے لیے زمانے بھر کی عورتوں کو ایسے ہی سنا سنا کر کرتی تھی۔ اپنی ستم نظریں کا قصہ مختصر الفاظ میں اس نے پہلے ہی دن، ان دونوں کو سنایا تھا مگر ان کی تقریباً روزانہ ہی ڈھیرالی جاتی تھیں۔

”مرد اگر فطرتاً گھٹیا ہے تو وہ ہمیشہ گھٹیا ہی رہے گا۔ یہ جو لوگ کہتے ہیں تاکہ ممبر کرو، وقت کے ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ محض طفل تلی والی بات ہے۔ میں نے ویسے کے اگلے دن ہی بڑی بہن سے کہہ دیا تھا کہ اشرف کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ اس کی مرضی کہیں اور تھی محض خالہ خالو نے زبردستی شادی کی ہے مجھ سے!“ گردن موڑ کر پیچھے بیٹھی، آنسو صاف کرنی سلی کو دیکھ کر، شالی کو پھر سے چھپتا دے گھیرنے لگے۔

”مگر میری آپا! کئی گنا تھ پادوں جوڑنے کے بس اب کسی اور کے سامنے کوئی لفظ منہ سے نہ نکالو، سب ٹھیک ہو جائے گا آہستہ آہستہ، مرے ہوئے باپ کی عزت کا واسطہ دینے لگی پھر جب تین ماہ بعد اس اشرف نے دھکا مار مار کر دروازے سے باہر کیا۔ اس وقت سر پر نہ برتن نہ چادر، کٹی میں جھڑا دو لگائی بختو نے اپنی چادر میرے سر پر ڈالی۔ اس وقت ابا کی عزت کو بہت چار چاند لگے!“ شالی کی آواز رندھنے لگی۔ اس کے ساتھ ہوا بھی بہت برا تھا۔

”دفع کرو اس قصے کو، کیوں بار بار یاد کر کے خود کو دکھی کرتی ہو۔ وہ تو آرام سے رہ رہا ہوگا۔ اپنے کیے پر ذرا بھی شرمندہ ہوئے بغیر تم یوں ہی آدھا وقت جل کر اور باقی آدھا وقت رو کر اپنی جان گھلائے دے رہی ہو!“ بھیلہ نے اس کے شانے کو زری سے چھتھایا۔

”سنا ہے، پھر سے اسی عورت کے ہاں آنا جانا بڑھ گیا ہے اس کا، گھر سے بھی بھاگ رہا ہے اور نوکری سے بھی، کیا خبر نکاح بھی پر چھوایا ہو!“ نظریں پچی کیے، وہ ہلکے سے بولی تو گلید ایک دم ہی فیس پڑی۔

”تم اس کے بارے میں خبریں ساری رکھتی ہو۔ آفر ضرورت کیا ہے؟“

”خبر کیا رکھتی ہے، خاندان ایک ہے۔ رشتے دار آتے ہیں تو خود ہی پتا جاتے ہیں!“ ایک ٹھنڈی سانس لے کر شالی سامنے رکھی مشین کی طرف پھر سے متوجہ ہو گئی۔

”اچھا اب سیشن ختم، ابھی تم لوگوں کو پچھن چھینر کھلائی ہوں نی بریک میں، سامنے والی بیکری میں



بڑے زبردست بنتے ہیں۔“ نگینہ نے کہا۔

”تم نے کب کھائے؟“ جبیلہ نے مشکوک سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”کھالیے ہیں، کسی کی مہربانی سے!“ وہ جواباً پھر سے ہنس پڑی اور پھر ”ابھی آئی“ کہہ کر باہر کی طرف چلی گئی۔

شالی اور جبیلہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر کچھ نہ سمجھتے ہوئے، دوبارہ اپنے اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ نگینہ، واقعی دومنٹ میں ہی واپس آ گئی تھی۔ سیکنڈ آپا، بی بریک سے ذرا پہلے راؤنڈ لیتی تھیں چند منٹ میں ہی ان کا راؤنڈ شروع ہو، وہ دہائیوں بڑے انتہا کے اپنے کام میں مصروف تھیں۔

”شباباش، اسی طرح محنت سے کام کرتی رہو، جلد ہی تمہارے پیسے بھی بڑھو اور ان کی چار ہوگی تو اور ٹائم بھی دلاؤ دوں گی۔“

”ہمارے لیے تو یہی انعام ہے کہ آپ ہم دہائیوں سے خوش ہیں ورنہ ادھر ستار بھائی کی دوسری فیکٹری کی انچارج صفراں آپا! آف تو یہ!“ چالیس سی مسکراہٹ کے ساتھ نگینہ نے ہلکے سے نفی میں سر ہلایا ”ایمان سے سیکنڈ آپا، اتنی بدتمیز عورت شاید آپ نے بھی دیکھی بھی نہ ہو۔“

”ارے دیکھ رکھی ہے میرے پاس ہی تو کام کر کے گئی ہے۔ معلوم نہیں کیسے انچارج بن گئی وہاں میں نے تو اسے بھی منہ نہیں لگایا تھا۔“ سیکنڈ آپا کی وہی روایتی سی ”پرفیشنل جلیسی“ تھی۔ جذباتی ہو کر، چند منٹ اسی میں الجھی رہیں۔ وقت کا یہ چھوٹا سا وقفہ، وہیں کھڑے کھڑے تمام ہو گیا۔ جہاں تک وہ نہیں جاپاکی تھیں وہاں بیسی ساری درکار نے بھی سکون کا سانس لیا۔

”نگینہ، بی بریک کے بعد تم سارے میں ایک چکر لگا کر مجھے رپورٹ دینا، آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے ذرا۔“ ہدایت دے کر، وہ واپس مڑ چکی تھیں۔ ایک طرف پارٹیشن کر کے ان کا چھوٹا سا آفس قائم تھا۔ چکن پیٹر واقعی چائے کے ساتھ موجود تھے اور دو نہ چار

پورے دو درجن بھر!

”اتنے سارے ہم کیسے کھائیں گے؟“ جبیلہ نے کچھ الجھ کر، ان مہک اڑاتے، گرما گرم پیٹری کی طرف دیکھا۔

”کچھ ہم کھائیں گے اور کچھ دوسروں کو کھلا دیں گے۔ سلی بے چاری آج بہت رو دھو کر بیٹھی ہوئی ہے اسے دے کر آئی ہوں اور دو پیٹری جا کر سیکنڈ آپا کو کھلا دیں ہوں۔ دیکھنا کیسی خوش ہوئی ہیں!“ وہ مزے سے مسکراتی ہوئی چل دی۔

معلوم نہیں اتنے سارے پیسے اس کے پاس آئے کہاں سے تھے۔ ورنہ آئے دن تو اس کا لبر کا کرایہ بھی ان ہی دونوں میں سے کوئی ایک بھر کرتا تھا۔ نگینہ واپس آئی، تو جبیلہ نے سب سے پہلے یہی سوال کیا۔

”میرے پاس کب تھے پیسے۔ کسی سے فرمائش کی تھی۔ بے چارہ سر کے بل دوڑا گیا پوری کرنے کے لیے!“ نگینہ کے چہرے پر بڑی خیر سی مسکراہٹ تھی۔ ”بہت بری بات ہے نگینہ!“ جبیلہ کے حلق میں وہ خوش ذائقہ پیٹری چھٹنے لگا۔ ”ایچ خراب ہوتا ہے ایسی باتوں سے۔ ہم یہاں کام کرنے آرہے ہیں۔ ایسی دہیسی باتیں نہیں بننی چاہئیں۔“

”ارے سب چلتا ہے۔“ نگینہ نے ہاتھ ہلار چیسے کھسی اڑائی۔ ”کام تو کر رہی رہے ہیں۔ ٹھوڑی سی دل کی بھی ساتھ چلے تو کیا حرج ہے!“ جبیلہ کو پتا تھا کہ کوئی ایسا ہی جواب سننے کو ملے گا۔

نگینہ اور مزاج کی لڑکی تھی۔ شوخ، زندہ دل اور انتہائی غیر محتاط۔ کبھی محلے کے کتے ہی چھوٹے موٹے عشق بھگت چکی تھی، اپنے دو انتہائی بد مزاج بھائیوں کی خاطر میں لائے بغیر۔ میٹرک میں تین سال مستقل دل ہونے کے بعد اس کا خالی گھر میں جیسا اور بھی خالی لگنے لگا تھا بھائیوں کو۔ سو وہ اس۔۔۔ تاکا بھاگی ہے بچانے کے لیے نوکری کی اجازت دینے پر مجبور ہو گئے تھے۔

”اچھا ہے صبح سے شام تک وہیں رہے گی پاشی

پھر عورتوں میں ہی سارا کام ہے!“ ایک بھائی نے ستار بھائی کی چاروں فیکٹریوں کا دورہ کر کے یہ بیان بخشنی رپورٹ مرتب کی تھی مگر نگینہ کے لیے ”رواں“ نہ گزر رہا تھا۔

”جی بات ہے زندگی میں کوئی چاہنے والا نہ ہو تو زندگی بالکل بے کار ہے۔ کوئی مٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے چھ پھرے تو دماغ خود بخود دساتویں آسمان پر پہنچتا ہے۔ مجھ سے تو ایسی روکی ہوئی جیسی زندگی نہیں گزارنی چاہی۔ معاف کرو!“ لڑکیوں کے اخلاق و کردار کی اہمیت پر ایک چھوٹی سی تقریر جو جبیلہ نے اس کے سدھارنے کی غرض سے کی تھی اس کے جواب میں نگینہ نے ہاتھ جوڑے۔

”تو پھر سیدھے سیدھے شادی کرلو، کرتی رہنا مارے ارمان پورے۔ مگر یہ سب تو ٹھیک نہیں ہے!“ جبیلہ کی چائے ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ ایک ہی سانس میں چٹ چٹ چٹ گئی۔

”شادی بھی ہو جائے گی۔ ابھی تو زندگی کو بھولنے کا زمانہ اور کوئی برائی بھی تو ہو۔ بس یوں ہی تھوڑا سا دل خوش کر لیتے ہیں اور کیا۔۔۔!“ نگینہ کو سمجھانا آسان نہیں تھا۔ جبیلہ کو اس کے مزاج پر حیرت ہوئی تھی اسے یہ دیکھ بھی نہیں لگتا تھا کہ کل کو اس کے شوہر کو ان باتوں کا ذرا سا سہیلم ہوا تو کتنا ریا ہوگا۔ خود اس کا تو دور دوری کوئی ایسا سلسلہ نہیں تھا۔ پھر بھی احمر کی جواب طلبی کا خوف ہر وقت ہی سر پر سوار رہتا تھا۔ اسے وہیں بیٹھے بیٹھے احمر یا تو دل بڑی زور سے دھڑک اٹھا۔

”معلوم نہیں، اس کے آج کے انڈر ویو کا کیا بنا گا!“ اس بار تو بات بن ہی جائے خدا کرے۔“ کتے کے بھارے نفل اس نے احمر کی کامیابی کے لیے مان گئے تھے۔ جانے کیا مسئلہ تھا جو صل ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ انتہائی طوالت جب اسے تھکانے لگی ہے تو اب چارے احمر کی ٹینشن کی وجہ تو سمجھ ہی آتی ہے۔ احمر کے ساتھ سوچ کا لانتنا ہی سلسلہ جڑا ہوا تھا، اس دن پھر کسی بات میں سارا دن لگ ہی نہیں سکا۔ شالی نے نگینہ کے ایک آدھ بارہ اس کی غائب دماغی کو نوٹ

کر کے پوچھا بھی مگر وہ نال گئی۔

چھٹی کے وقت وہ تینوں ایک ساتھ ہی بڑے ہال سے باہر آئیں۔ باہر کچھریل کے چھجے والا سہا سہا آواز تھا جس پر گہرے پیلے رنگ کے پھولوں والی نیکل بنا روک ٹوک کے پھیلتی ہی چلی جا رہی تھی۔ لڑکیاں اس برآمدے میں رک کر اپنی مٹھن کو دور کرنے کی کوشش کیا کرتی تھیں۔

چادریں، اسکارف سنبھالتے ہوئے، وہ باتیں بھی کرتی جاتی تھیں جو سارا دن میں نہیں ہو پاتی تھیں۔ جبیلہ، نگینہ اور شالی ایک ساتھ ہی فیکٹری سے نکلا کرتی تھیں۔ مگر اس وقت نگینہ نظر نہیں آ رہی تھی شالی، کپڑاؤں کے طے کر کے اس کے آگے گٹ تنک دیکھ کر بھی آئی مگر وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

”نگینہ۔۔۔۔۔!“ اسے تو میں نے اس طرف جاتے دیکھا تھا۔“ ایک ساتھی لڑکی نے جبیلہ کے استفسار پر برآمدے کے دوسرے سرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ اس طرف فیکٹری کا آفس تھا جہاں فیکٹری کے حسابات چیک کرنے کے لیے دو کلرک بیٹھا کرتے تھے۔ لڑکیاں عموماً اس طرف نہیں جایا کرتی تھیں۔ ان کا تمام تر ساتھ سیکنڈ آپا کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ نگینہ کو وہاں سے ایسا کون سا کام پڑ گیا تھا؟ شالی اور جبیلہ دونوں ہی کو سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ چند منٹ بعد نگینہ خود ہی آ گئی۔

”کچھ نہیں، بس معلوم کر رہی تھی کہ اگر مٹھے میں چادریں اور درٹاں کریں تو مٹھے میں کتنے پیسے بن جاتے ہیں!“ بے پروائی سے کہتے ہوئے وہ اپنی چیزیں اٹھانے لگی۔

”یہ بات تو تم سیکنڈ آپا سے بھی پوچھ سکتی تھیں۔“ شالی اعتراض کے بغیر نہیں رہ سکی۔

”وہ صحیح ٹھوڑی بتاتیں، بڑی صفائی سے یہ انچارج لوگ کوئی کر سکتی ہیں۔“ نگینہ نے کہا۔

”اچھا۔۔۔“ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی، وہ دونوں اس سے متفق ہو گئیں۔



جبیلہ گھر پہنچی تو حسب معمول سناٹا تھا۔ دروازہ



”پتا نہیں، میں نے تو پوچھا نہیں، شاید اماں کو معلوم ہو۔“ میں تو کھانا پکا رہی تھی۔ ”صدف نے سب پروائی سے جواب دیا۔

”کیا پکا یا تھا؟“ جیلہ نے پوچھا۔

”آلو پالک اور مونگ کی دال!“ صدف نے بتایا۔

”امی سے کہہ کر قید ہی منگوا لیتیں!“ جیلہ کو افسوس سا ہوا، آج احمر نے کتنے ہی دن بعد یہاں کھانا کھایا تھا۔

”مہینہ ختم ہو رہا ہے آپلی اور ابھی پہلی آنے میں تین دن باقی ہیں۔“ صدف کے جواب کے بعد بحث کی گنجائش نہیں تھی۔ اماں کی پشیمانی اور اپنے ایک کمرے، کچن، واش روم کا مختصر سا کرایہ، گھر کی گزر بسر کچھ تان کر ہی محدود رقم میں ہو رہی تھی۔ کئی سال سے اس نے گھر پر یوشن کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا مگر آس پاس بسنے والوں کے حالات بھی ان سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھے۔ کوئی بھی سودو سو سے زیادہ دینے کو تیار نہیں ہوتا تھا اور اس پر بھی ایک بڑے بچے کے ساتھ کسی چھوٹے کو غفلت کر دیا جاتا۔ ”اسے بھی بٹھاؤ، کچھ تھوڑا بہت بتا دیا کرو اسے بھی!“ وہ مارے مروت کے منے میاں کے ساتھ بھی دماغ سوڑی کیے جاتی۔

ظہر سے کھلا کتب، عشا تک چلتا ہی رہتا اور مہینے کے آخر میں ہاتھ آتے محض پانچ سو روپے تنگ آ کر اسے سوشل ورک کا یہ سلسلہ بند ہی کرنا پڑ گیا۔

اب یہاں ستار بھائی کی گارمنٹ فیکٹری میں اگر وقت کا دورانیہ لمبا تھا تو کم از کم پیسے بھی اتنے تو مل ہی رہے تھے کہ فراغت کا احساس ہونے لگا تھا۔ مہینے کے ابتدائی ہفتے میں ہی سہی۔ جھپٹلے مہینے اس نے اپنے اکی اور صدف کے لیے کاشن کے سوٹ خریدے، پانچ سو روپے احمر نے ادھا کر لیے۔ اس سے جھپٹلے مہینے میں احمر کی ساگرہ تھی۔ چھپو کی دن پہلے سے یاد دلانا شروع کر دیتی تھیں۔ انہیں بڑا ارمان ہوتا تھا کہ احمر کے لیے عیدی، بقر عید کے علاوہ ساگرہ اور نئے سال پر بھی ہونے والی سسرال سے ”گفت“ آئیں۔ جیلہ کو امی کی

صدف نے کھولا تھا۔ ”امی برابر والی خالہ کے گھر گئی ہیں ابھی تھوڑی دیر پہلے!“ اس نے جیلہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اطلاع دی۔

”اچھا!“ وہ کچھ چپ سی ہو گئی۔ کوئی نئی بات بھی نہیں تھی۔ امی کا یہ وقت اکثر ہی اس طرح کے خیر گالی دوروں میں گزرتا تھا اور اب عصر کی نماز کے لیے نکلنے تو عشا پڑھ کر ہی گھر آتے۔ پہلے تو بھی ایسا محسوس نہیں ہوا تھا مگر آج ایک دم ہی اس کو صدف کا اتنی دیر گھر پر اکیلے رہنا کھاتا تھا۔ وہ کم عمر تھی۔ انٹر کا پرائیویٹ امتحان دے رہی تھی۔ پڑھنے کی کوئی خاص شوقین بھی نہیں تھی۔ فرصت اور تنہائی دونوں ہی اس عمر میں غلطی کا کوئی امکان پیدا کرنے کا سبب بن جاتی ہیں۔

”کوئی آیا تو نہیں تھا؟“ اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے، جیلہ نے کچھ اندازہ لگانا چاہا۔

”احمر بھائی آئے تھے، کافی دیر بیٹھے رہے۔ تمہارا پوچھ رہے تھے!“ صدف نے کہا۔

”کب آئے تھے۔ کیا ابھی.....؟“ بہت مشکوک سا ہو کر اس نے پوچھا۔

”ابھی کہاں، وہ تو دوپہر کو آئے تھے۔ بہت دیر امی کے پاس بیٹھے رہے، دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا، میں تمہارے لیے چائے لاتی ہوں!“ وہ بے پروائی سے کہتی ہوئی کچن کی طرف مڑ گئی جیلہ کو اطمینان بھی ہوا اور شرمندگی بھی۔

”خدا نہ کرے، ہر ایک خراب ہی تھوڑی ہوتا ہے اور احمر تو بالکل بھی نہیں، بے حد محبت کرتا ہے مجھ سے بچپن کی محنتی ہے کوئی مذاق تھوڑی ہے۔“ خود کو باور کراتے ہوئے اسے سارا تصور رنگین کا نظر آنے لگا۔

”نگینہ کی دوستی، دماغ میں ایسے اٹلے سیدھے خیال بھر رہی ہے کہ ہر ایک بات پر شک سا ہونے لگا ہے۔ پھر بھی صدف کا اتنی دیر تک گھر پر تنہا رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ یہ بات امی کے ضروری گوش گزار کرنی ہے۔“

”احمر کا انٹرویو کیا ہوا.....؟“ صدف چائے لے کر آئی تو اس نے بڑی امید سے پوچھا۔



ٹینشن دور کرنے کے لیے کئی ماہ پہلے ہی سے بچت شروع کرتی پڑی تھی۔ اس بار ذرا آسانی رہی تھی۔

احمر کے لیے تحائف تو ایسے چلے گئے تھے پر باقی مینے ہاتھ ذرا کھینچ کر رکنا پڑا تھا۔ اب اس مینے کے لیے بھی اس کے ذہن میں کئی پروگرام تھے۔ ابا کے لیے دو نئے سوٹ، ذرا ایسے کپڑے کے، ان کے سارے ہی جوڑے دھل دھل کر اپنا رنگ کھو بیٹھے تھے۔ بجیلہ کو پتا تھا کہ وہ نہ تو بھی کسی کی کا اٹھار کریں گے اور نہ ہی خود سے اپنے لیے کچھ خرید کر لائیں گے یہ کام اسے ہی کرنا تھا۔

”اور کیا خبر، احمر بھی پانچ سو داپس کر دے تو پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہ رہے۔“ اس نے دل ہی دل میں کچھ اور صبح جوڑی۔

احمر اس بار اتوار کو آیا۔ بجیلہ گھر پر ہی تھی۔ صدف صفائی کر رہی تھی اور وہ خود جلدی جلدی کھانا پکانے میں مصروف تھی۔ کام سے فارغ ہو کر بازار جانے کا پروگرام تھا۔ احمر دروازے سے سدھا پکن میں چلا آیا۔ ”شکر ہے، تم گھر پر بیٹیں تو سبھی بہت دل لگتا ہے تمہارا اپنی فیکٹری میں!“ اس کا لہجہ جیتسا ہوا تھا مگر آج وہ اتنے دن بعد دکھائی دیا تھا کہ وہ اس خوشی میں بہ آسانی اس کے طنز کو نظر انداز کر گئی۔

”کیسے ہو، پچھو کو بھی لے کر آتا تھا، کتنے دن ہو گئے ان سے ملے ہوئے!“ گوان کے ہاں کوئی پابندی نہیں تھی اور بچپن کی اس مٹھنی کو بڑے سرسری سے انداز میں لیا جاتا تھا مگر وہ خود ہی شروع سے ان کے ہاں جانے میں بڑی محتاط رہا کرتی تھی۔ پچھو، ان کی بیٹیوں اور خود احمر کو اس بات کا گلار ہوتا تھا۔

”اگر وہ نہیں آئیں تو تم کون سا انہیں پوچھنے کے لیے چلی گئیں۔ انہیں تو ویسے بھی گھر سے نکلنے کی عادت نہیں ہے!“ بجیلہ مکرراتے ہوئے اس سے چائے کا پوچھنے لگی۔

”چائے تو بیوں کا مگر کھانا بھی کھاؤں گا، آج مجھے تم سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں!“ باہر برآمدے میں سے ای، احمر کو آواز دے رہی تھیں۔ ابا گھر پر ہی

تھے اور انہیں یہی خدشہ ہو رہا تھا کہ احمر کو ہاں بجیلہ کے سر پر کھڑا دیکھ کر وہ حسب عادت اعتراض کیے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔

احمر ان کے پاس چلا گیا تو بجیلہ نے آج کے ”مینو“ پر نظر پانی کی فقط آلو، پیٹن اور روٹی، کچھیل بار بھی جب وہ اس کی غیر موجودگی میں آیا تھا تب بھی، دال پاک کھا کر گیا تھا۔ آج تو کچھ عطا کرنا لازمی تھا۔ ”اب یہ آ کر بیٹھے ہیں گے، بازار جانا تو کیا ہمارا میں!“ صدف بے زاری ہوئی پکن میں آئی تو وہ پرں میں سے نکال کر لائے پیسے پکڑے کھڑی تھی۔

”برابر میں خالہ سے کہنا کہ کسی کو بھیج کر ایک کو چاول اور ایک ہی کلو پکن منگوا دو اور ساتھ میں.....!“ ایک چھوٹی موٹی سی لسٹ، اس ہنگامی دعوت کے سلسلے میں تیار ہو رہی تھی۔

”بہت پیسے خرچ ہو جائیں گے آبا، احمر بھائی کوئی مہمان تھوڑی ہیں اور ان کے اپنے گھر میں ایسا کیا پکا ہے۔ کچھیل بار جب میں اور ای گئے تھے تو پچھو نے بغیر گھما کر ہی ہوئی دال سامنے رکھ دی تھی، نہ چاول نہ کوئی سلا اور چینی، بس روٹی کے ساتھ دال کھا کر تم واپس اپنے گھر آ گئے تھے۔ پچھو کے ہاں کی مدارات صدف کے دل کو بڑی لگی تھیں۔ آئے وقت اسی کا قصہ پچھیلے رکتی چھوٹے سے گھر کے اس طرف برآمدہ تھا۔ یہاں سے وہاں آواز جائے میں کون سی دیر لگتی۔ بجیلہ کو اس کو خاموش رکھنے کے لیے ہاتھ تک جوڑنے پڑے۔

”بہت اچھی بہن ہے میری، شاباش خالہ کے ہاں چلی جا بھاگ کر!“ صدف منہ بٹائی ہوئی پانچ سوٹ لوٹ کو ہاتھ میں تھام کر گئی تو اسے تھوڑا اطمینان ہوا۔

صدف کو بازار نہ جانے کا بڑا ہی رنج تھا۔ اس غریب کے پاس آنے جانے کے چند گتے چنے، ”آپن“ ہوتے تھے دسب سے زیادہ جوش و خروش اسے بازار کے نام پر ہی محسوس ہوتا تھا۔ نت نئے سامان سے بھی دکانیں، آرٹیفیشل جیواری کے اسٹال، پھول چھوٹی چیزوں کے لیے بھاؤ ڈاڑ کرنے میں اسے براہ راست آتا اور اپنے لیے کی ہوئی شاپنگ، خواہ وہ کتنی ہی تھوڑی

کیوں نہ ہو اسے بہت ساری خوشی فراہم کرتی تھی۔ آج کا پروگرام بری طرح خراب ہوا تھا۔ ”کھانے کے بعد چلے چلیں گے۔ پوری شام وہی ہے ابھی تو!“ پکن بریانی پکاتے ہوئے، بجیلہ نے دلاسا دینے لگی۔ مگر اس کا موڈ ٹھیک ہونا تھا نہ ہوا۔ ”ابھی کھانا کھاتے کھاتے تین بج جائیں گے اور پھر احمر بھائی کا چائے کو دل چاہ جائے گا۔ دو تین بار برا کر بیٹیں گے۔ پھر کہیں عصر کے بعد وہ یہاں سے نہیں گئے، دیکھ لیتا۔“ سابقہ تجربات کی روشنی میں اس نے پوری قنیت کے ساتھ پیش گوئی کی۔ اس بار بجیلہ جو باخاموش رہی تھی۔

ابا کو کوئی بلانے آ گیا تھا۔ اب ان کی واپسی ظہر کی نماز پڑھ کر ہی ہوتی تھی۔ کھانا اس کے بعد ہی کھایا جاتا تھا۔ ابھی تھوڑا سا وقت باقی تھا۔ بجیلہ کام سے فارغ ہو کر خود بھی برآمدے میں آ بیٹھی سر دیوں کی نرم سوپ برآمدے کو گھیرے ہوئے تھی اور اندر کمرے میں صدف بڑے انتہاک سے ٹی وی کے آگے بیٹھی کوئی کھانا پکانے کی ترکیب نوٹ کر رہی تھی۔ بجیلہ تخت کے اگلے کونے پر ٹک گئی۔

”تمہارے انڈو یو کا کیا بنا احمر؟“ ای وضو کے لئے ابھی تو اس نے یوٹی ٹی وی سے ہی پوچھا تھا۔ مگر وہ ہر گز نہیں سمجھتا تھا۔

”کیا بنا تھا۔ سارے فیصلہ پہلے ہی کر لیے جاتے ہیں۔ بے کاری فارمیٹی ہوئی ہے۔ یہ اشتہار اور انڈو یو میں نے تو فیصلہ کر لیا ہے کہ آئندہ اس طرح کے اشتہارات دیکھ کر درخواست ہی نہیں دوں گا!“ بہت لمبے سے یہ موضوع اس کی دھکتی رنگ بن چکا تھا۔

”اس طرح مسئلہ تو حل نہیں ہوگا، تم اتنا مٹنی کیوں اپنے گتے ہو؟“ بجیلہ نے سمجھانا چاہا۔

”جب میں پیسے ہوں تو سب مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔“ وہ بڑی بے نیازی سے سر جھٹک کر بولا۔

”اور یہ پیسے کہاں سے آئیں گے، جب تک کوئی کام نہیں کرو گے؟“ بجیلہ نے بمشکل ہی خود کو یہ کہنے سے روک رکھا تھا۔ وہ تاؤ میں آ کر ابھی فوراً ہی اٹھ کر چلا جاتا

اور اتنے جتن کر کے پکا گئی بریانی یوں ہی جاتی۔ ”تمہارا کام کیسا چل رہا ہے۔ ماحول تو ٹھیک ہے نا وہاں کا؟“ بجیلہ کی خاموشی موضوع بدلنے کا سبب بن گئی۔

”ہاں، ٹھیک ہی ہے۔ وہاں تو ساری عورتیں ہی ہوتی ہیں اور پھر کام بھی اتنا ہوتا ہے کہ سر اٹھانے کی نوبت ہی نہیں آتی۔“

یوں ہی موبوم سی امیڈیٹی کی شاید وہ ہمدردی میں اتنا ہی کہہ دے کہ اتنا کام کرنے کی ضرورت نہیں، خود کو مت تھکایا کرو مگر اس نے ایک اور ہی نکتہ اعتراض ڈھونڈا۔

”عورتیں بھی ساری ٹھیک نہیں ہوتیں، زیادہ مراسم بڑھانے کی ضرورت نہیں ہے کسی سے بس اپنے کام سے کام رکھا کرو۔“ بجیلہ نے نا بعداری سے پہلے سے اثبات میں سر ہلادیا۔

”احمر، اب سنجیدگی سے کسی بھی کام کو سیٹ کرو۔ پلے بے شک تھوڑی تنخواہ ہو شروع میں، آہستہ آہستہ بڑھ ہی جاتی ہے!“ وہ پھر سے اصل بات پر آئی۔

”تم کیا سمجھتی ہو، میں جان بوجھ کر نوکری نہیں کرتا۔ ملے تو سبھی، جتنی ٹینشن خود مجھے ہے، اس کا تو کسی کو بھی اندازہ نہیں ہے۔“ تمام تر کوشش کے باوجود بھی، آخر کار اس کا موڈ خراب ہو ہی گیا۔

”ساری کوشش اکیلا خود ہی کر رہا ہوں ساتھ دینے والا کون ہے میرا، ہر ایک کو بس یہی فکر ہے کہ کسی نہ کسی طرح کمائی کر کے پیسے سب کے ہاتھ پر رکھے لگوں۔“ بجیلہ کے دل پر ٹھک سے کوئی چیز لگی۔ اتنے عرصے سے جو کچھ بھی وہ اس کے لیے کر رہی تھی خواہ وہ کتنا ہی کم تھا مگر اس کے دل میں ذرا بھی قدر نہیں تھی کسی بات کی بھی۔

”اور تمہیں جلدی کس بات کی ہے۔ آرام سے نوکری کر رہی ہو۔ تمہارے گھر میں تو کوئی مسئلہ بھی نہیں ہے ہمارے گھر کی طرح، ماموں کی پنشن، گھر کا کرایہ تمہاری تنخواہ، گھر میں ہر طرح کی خوشحالی ہے۔“

ابا کی معمولی سی پنشن، اوپر کے حصے کا فقط چند سو



ابا کو ان کا التفات، جھنجھلاہٹ میں جتا کر رہا تھا سو ایک دو بار انہوں نے ٹوک بھی دیا۔

جیلہ خاموشی سے پلیٹ میں تھوڑے سے چاول نکالے بھی رہی۔ چچی بات تو یہ کہ اتنا کچھ کر کے بھی اس کا دل بری طرح دکھا تھا۔ احمر کی حد سے بچی ہوئی سہا حسی، ابا کی بے اعتنائی.....! معلوم نہیں آگے قسمت کیا رنگ دکھانے والی ہے.....!

”ساڑھے تین بج رہے ہیں، دو بس بدل کر تم گھر پہنچو گے۔ اچھا خاصا وقت درکار ہے۔ اب نکلو گے تو پچھتے پچھتے مغرب ہو جائے گی۔“ جب وہ اور صدف برتن اٹھا رہی تھیں تو ابا کو اس نے کہتے ہوئے سنا۔

”ابا اپنے بھانجے کی عزت افزائی خوب ہی فرماتے ہیں۔“ صدف پن میں آکر غریب ہی بنی۔

جیلہ خاموشی سے چائے کا پانی رکھنے لگی اسے ابا کا اس طرح سے کہنا بھی اچھا نہیں لگا تھا کون سا وہ روز روز آیا کرتا تھا۔ پھر بھی وہ ایسا برتاؤ کرتے تھے مگر امی..... بہر حال تلافی کرتی تھیں۔ چائے کے بہانے بھی انہوں نے بڑے اصرار کے ساتھ احمر کو گھٹا بھر اور بٹھائے رکھا ابا مایوس ہو کر عصر کی نماز کو مسجد روانہ ہوئے، تب وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

”دو منٹ رک جاؤ، امی نماز پڑھ لیں!“ جیلہ نے کہا، تو وہ اودھر اودھر دیکھتا ہوا تھوڑا سا قریب آ گیا۔

”تھوڑے پیسے ہوں گے تمہارے پاس، بہت سخت ضرورت ہے۔ اسی لیے آیا بھی تھا۔ تمہارے علاوہ اور ہے بھی کون۔ جس سے میں مدد کے لیے کہوں!“ وہ اتنی بے چارگی سے کہہ رہا تھا کہ جیلہ کو اپنا دل چکھتا ہوا سانسوں ہونے لگا۔

”ٹھہرو، میں ابھی لاتی ہوں!“ وہ کہتی ہوئی حیزی سے کمرے میں چلی گئی۔ پرس میں چند دن پہلے ملی تھا ابھی باقی تھی۔

”میتے بھر آنے جانے کا کرایہ، ابا کے بچے خریدے جانے والے سوٹ اور ضرورت کی چند چیزیں مولیٰ چیزیں!“ اپنی ساری ہی ترچھات، اس کا ہاتھ روکنے کے لیے تیار تھیں۔ چند لمحوں کے لیے تو وہ مجھے

کرایہ اور اس کی یہ گارمنٹ فیکٹری کی نوکری.....! اگر احمر کو خوشحالی کی نوید سنا رہے تھے تو تردید کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ ایک ٹھنڈی سانس، اس نے اپنے اندر ہی اتار لی۔

”اصل میں خالہ، اب جلدی کر رہی ہیں صدف کی شادی کے لیے اگلے سال وہ اور خالو جج پر جانے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ ابا کی مرضی ہے کہ دونوں.....!“ وہ کچھ جھجک کر خاموش ہوئی۔

صدف کی چھوٹی خالہ کے ہاں بات طے تھی۔ امی ابا یہاں اپنے طور پر یہی فرض کیے بیٹھے تھے کہ دونوں کی شادیوں سے بیک وقت ہی منٹ لیا جائے گا۔

”تو کیا پر اہم ہے، صدف کی شادی اگر پہلے ہو جائے اور اماں تو ویسے بھی دو شادیوں کے بیک وقت ہونے کی مخالف ہیں۔ کہتی ہیں کہ ضرور ہی کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہو جاتی ہے۔“

بڑی بے پروائی سے کہتے ہوئے اس نے اعتراض کی وجہ تسمیہ بھی بتادی۔ اماں نماز ختم کر کے آچکی تھیں سو بات خود بخود ہی ختم ہو گئی۔ صدف اندر کمرے میں دسترخوان بچھا رہی تھی۔ ابا عمو تھوڑی دیر کر کے ہی گھر آتے تھے۔ محلہ میٹھی کے رکن تھے۔ اسی حساب سے ان کی اپنی مصروفیت ریتی تھی پر اس وقت وہ خارج ہوتے ہی فوراً گھر آ گئے۔

”میں نے سوچا احمر میاں کو گھر جانا ہوگا۔ جلدی سے کھانے سے فارغ ہو جائیں پہلے!“ وہ برآمدے میں کھڑے کہہ رہے تھے۔ گھر میں سب ہی کو اندازہ تھا کہ ابا کو احمر کا یہاں زیادہ آنا چاہنا پسند نہیں ہے۔ اور شاید احمر کو بھی ان کے لہجے کی رکھائی کو محسوس کر کے جیلہ کو ایسے ہی وہم ستاتے تھے۔

کھانا مزیدار تھا۔ خود احمر نے بھی بہت تعریف کی۔ امی اسے متوقع داماد کا پورا پروٹوکول دیا کرتی تھیں کتنی ہی بار انہوں نے اس کی پلیٹ میں چن چن کر اچھی بوٹیاں ڈالیں۔

”جتنی ضرورت ہوئی خود لے لے گا۔ تم کیوں زبردستی کر رہی ہو۔ بیمار ڈالنے کا ارادہ ہے کیا اس کو!“



میں ہی رہی۔

”معلوم نہیں اسے کتنے پیسوں کی ضرورت ہے، اگر سو دو سو میں ہی کام چلائے تو کتنا اچھا ہو پھر لینا چاہیے تھا کہ کتنے پیسے اسے چاہئیں!“ بھیلہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مگر اب کیا چاسکتا تھا۔

”کیا خبر سو دو سو دیکھ کر وہ ناراض ہی ہو جاتا اگر ذرا بھی اندازہ ہوتا کہ اسے پیسوں کی ضرورت ہے تو کھانے پر پیسے خرچ کرنے کے بجائے، یہی اسے دے دیتی!“ بے حد کلن کے ساتھ لپکا ہوئی بریانی اسے دوسری غلطی محسوس ہو رہی تھی۔ اچھے اچھے سے انداز میں پانچ سو کا ایک نوٹ لے کر وہ واپس برآمدے میں آگئی تو وہ وہیں کھڑا تھا۔

”بس اسنے ہی، میں تو سمجھا تھا کہ ابھی تمہیں تنخواہ ملی ہے تو شاید.....!“ احمر کے لہجے میں بڑی مایوسی تھی۔

”اصل میں ابھی سارے خرچے بھی باقی ہیں احمر!“ وہ شرمندہ ہو کر صفائی پیش کرنے لگی۔

”کچھ دن میں کسی دوست سے لے کر تمہیں واپس کر دوں گا!“ احمر کا اصرار بڑھنے لگا تو وہ انکار بھی نہ کر سکی۔

”بہت شکریہ بھیلہ، تم نے اس وقت میری بڑی پریشانی دور کی، خدا نہ کرے اگر میری زندگی میں تم نہ ہوئیں تو شاید میں بالکل ہی حوصلہ کھو بیٹھتا۔“ مزید پانچ سو لے کر اسے بڑی تسلی ہوئی، وہ محبت سے بھیلہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہی ایک نظر تھی جو ساری کوفت، ساری ٹینشن بھلا دیتی تھی۔ آج کی پریشانی کل کی خوشیوں کی نوید سنائی محسوس ہوتی تھی۔

ای نماز پڑھ کر فارغ ہوئیں تو احمر خدا حافظ کہہ کر چلا گیا صدف البتہ اتنی ناراض تھی کہ دی کے سامنے سے اٹھ کر اسے رخصت کرنے تک کے لیے نہیں آئی۔

”تم نے پرس سے نکال کر اسنے سارے پیسے احمر بھائی کو پکڑا دیے۔ آخر کس خوشی میں!“ وہ بھیلہ کو پرس میں سے پیسے نکالتے ہوئے دیکھ چکی تھی اور اب بذاتہ خود اس کے پرس کو چیک کر کے جواب طلبی پر اترتی ہوئی تھی۔

”احمر پریشان تھا کچھ دنوں میں واپس کر دے گا۔“ وہ بڑی نرمی سے اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ شکر تھا کہ صدف کو پچھلے ماہ کے پانچ سو کا علم نہیں ہو سکا تھا۔

”کبھی بھی نہیں دیں گے وہ، پہلے بھی جب ٹیوشن پڑھا یا کرتی تھیں جب بھی وہ سو پچاس لے ہی جاتا کرتے تھے۔ کبھی واپس کیے، ”وہ بدستور تھا“ اور پورے یقین کے ساتھ جو پیش گوئی وہ کر رہی تھی وہی حرف بہ حرف پوری ہوئی۔

احمر نے باقی پورے ماہ مشکل تک نہیں دکھائی۔ اوپر سے تم یہ ہوا کہ اوپر کے کمرے والے کرائے دار نے پچھلے مہینے کے آخری ہفتے میں محض دس دن کے لیے پنجاب گئے تھے انہوں نے اپنے قیام کی مدت بڑھا دی تھی۔ سو اس ماہ اوپر کا کرایہ بھی وصول نہ ہوا۔ اتھ ایک دم ہی تنگ ہو گیا۔ بہت سے ضروری اخراجات سما کٹوتی کرنی پڑی۔ ناشتے میں سے انڈا ایکسپریس ختم کر دیا گیا اور گوشت جو ہفتے میں ایک بار پاؤ، ڈیزہ باؤڈا کر پکالیا جاتا تھا۔ اس ماہ وہ سلسلہ بھی منقطع رہا۔ کوئی مل بھرا نہیں جاسکا اور کچھ نہیں مگر جس دن ابا اپنے ان ہی دھلے دھلائے اڑی ہوئی رنگت والے سوٹ میں اپنے دوست کی بیٹی کی تقریب نکاح میں شریک ہونے کے لیے گئے اس دن بھیلہ کے دل میں احمر کی طرف سے کو جڑ پکڑنے لگا۔

”کیا تھا اگر وہ سارے نہیں تو آدھے ہی بچے واپس کر جاتا۔ کسی سے لے کر ہی سہی۔“ آخر ان کے گھرانے کے باقی سارے خرچ بھی تو چل ہی رہے ہوں گے!“ وہ سوچ سوچ کر رنجیدہ ہوتی رہی۔



فیکٹری میں شالی اور گھنیز بھی اس کے چپ چپ رہنے کو نوٹ کر رہی تھیں۔ کئی بار اصرار کر کے پوچھا مگر اصل بات بتانے میں اسے خود اپنی توہین محسوس ہو رہی تھی۔

مہینہ ختم ہونے میں ابھی چھ دن باقی تھے اس دن وہ اور دنوں سے زیادہ خاموش تھی۔ ذہن بار بار

میں پڑے فقط چوبیس روپے کی طرف جا رہا تھا اللہ ہی جانے اب باقی دن کس طرح کتنے تھے۔

چائے کے وقفے میں وہ شالی کی باتوں کے جواب میں یوں ہی ہوں ہاں کیے جا رہی تھی۔ گھنیز حسب راسخاں ”ابھی آئی“ کہہ کر جو غائب ہوئی تو آدھا گھٹنا ڈال کر کھڑا ہوئی۔ اس کی ”پڑا اسرار“ نہیں رہی تھی۔ کچھ ریل کے برآمدے کے آخری سرے پر پہنچے چھوٹے سے آفس میں کام کرنے والے فخر سے اس کی بڑے غضب کی ”پڑا اسٹینڈنگ“ ہو چکی تھی۔

”ج کبھی ہوں، فخر ہی وہ انسان ہے جس کے بیٹے ساتھ کی میرے دل نے خواہش کی ہے۔“ گھنیز جیسی بیٹ کی ہلکی لڑکی، زیادہ دن یہ راز چھپا ہی نہیں سکی تھی۔ مگر اب جس تیزی سے وہ اس معاملے میں سنجیدہ ہوئی جا رہی تھی وہ شالی اور گھنیز دونوں کو حیران بھی کر رہا تھا وہ پریشان تھی۔ سو اس وقت بھی یہ طے شدہ بات تھی کہ وہ اپنا سیکینڈ کی آنکھوں میں دھول جھونک کر وہیں آفس میں گھسی پڑی تھی، فخر کے ساتھ گپ شپ میں مصروف ہو گئی۔

”کم از کم مجھے تو بتاؤ کیا پریشانی ہے۔ میں تو اپنا ملا دھو کر دوڑ رہی ہوں مگر تم شاید مجھے غیر ہی سمجھتی ہو۔“ شالی کے لہجے میں خلوص بھی تھا اور دردمندی بھی۔

گھنیز ساکت سی لگا ہوں سے اس کے چہرے کو تنگ کرتی۔ شالی کی گہری سانولی رنگت اور معمولی نقوش کے پیچھے یہ بڑی خوبصورت دل تھا۔ بھیلہ کو اسے بتانا ہی پڑا۔

”بس اتنی سی بات.....!“ اس نے مڑ کر اپنی آنکھوں کے ساتھ رکھے پرس کو اٹھایا۔

”یہ لو!“ اس نے سو پچاس کے طے طے سے چند نوٹوں کے ساتھ میں تھامے۔ ”تھوڑے اور بھی ہیں مگر مجھے بے گل میں اور بھی لے آؤں گی!“ بھیلہ نے وہ ساڑھے چار سو روپے تھے۔

”تمیں بس بہت ہیں۔“ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا ہارا

گئی تو وہ الٹا تھا ہو گئی۔

”پھر وہی غیریت والی باتیں، میں تو تمہیں اپنی بہنوں سے بھی بڑھ کر سمجھتی ہوں بھیلہ، تمہاری دوستی میں اپنا دکھ بھولے رہتی ہوں اور تم ہو کہ.....!“ بھیلہ کو باقاعدہ معافی مانگنی پڑ گئی۔

”یہ گھنیز کچھ زیادہ ہی دیر کے لیے غائب نہیں ہو جاتی ہے۔ کل سیکینڈ آ، اسے سیٹ پر نہ دیکھ کر ناراض ہونے لگیں تو مجھے یہاں گھرنا پڑا کہ دانش روم گئی ہے!“ شالی کو گھنیز کی فکر ہو رہی تھی ”اتنا سمجھاتی ہوں مگر کان ہی نہیں دھر رہی۔ اسے فخر کی محبت میں اسے کچھ بھائی نہیں دے رہا ہے!“ بھیلہ جواباً خاموش ہی رہی۔ محبت میں انسان یوں ہی، اندھا، بہرا اور گونگا ہو جاتا ہے۔ یہ بات وہ بھی جانتی تھی۔

”تمہیں پتا ہے!“ شالی اس کی طرف راز دارانہ انداز سے بھگی۔ ”اب تو یہ دونوں باہر بھی ملنے لگے ہیں۔ کبھی کسی بارک، کبھی ریسٹورنٹ، گھنیز کہہ رہی تھی کہ اب کسی دن فلم دیکھنے جائیں گے۔“

”یہ تو بہت ہی غلط بات ہے۔“ بھیلہ کو گھبراہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ ”تمہیں اسے سختی سے منع کرنا چاہیے تھا۔ ابھی کتنا جانتی ہے وہ اس لڑکے کو اگر وہ اتنا ہی غلط ہے تو اپنے گھر والوں کو بھیج کر رشتہ مانگ لے باقاعدہ!“

”لو وہ آ رہی ہے سامنے!“ شالی نے سامنے سے آتی گھنیز کو دیکھ کر کہا۔ چند لمحوں میں ہی وہ ان کے قریب آ کھڑی ہوئی تھی۔

”پتا ہے آج مجھے فخر نے کیا دیا.....؟“ اس کے لہجے میں دبا دبا سا جوش تھا اور چہرہ کسی اندرونی خوشی سے چمک رہا تھا۔ بھیلہ کو نور آ رہی اندازہ ہو گیا کہ گھنیز کو نصیحت کرنے کے لیے یہ بالکل بھی موزوں وقت نہیں ہے۔ آس پاس لاکیاں اپنا کام دوبارہ شروع کر چکی تھیں سو وہ بھی اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گئی۔ یہاں سیکینڈ آ پانے لگی جاسوس چھوڑ رکھی تھیں جو انہیں ساری خبریں دیتی تھیں گھنیز اگر ابھی تک بچی ہوئی تھی تو محض اپنی ہوشیاری اور چرب زبانی کی وجہ سے۔



”بجیلہ یہ دیکھو۔“ تھوڑا سا جھک کر اس نے چھوٹے سے شاپر سے کچھ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

”یہ ایک بریلیٹ تھا اور اس کے ساتھ ایئر رنگز، ویسے ہی جیسے عام طور پر مصنوعی زیورات کے جگہ جگہ لگے اسٹائر پلٹے ہیں۔“

”اچھا ہے نا، فخر نے دیا ہے۔ بالکل نیا ڈیزائن ہے!“ گنیز نے ذرا سی دیر میں ہی بہت ساری خوبیاں ڈھونڈ نکالی تھیں۔ بجیلہ نے یوں ہی مردانہ اثبات میں ہلادیا۔ اسے جیوری سے کوئی ایسی دیکھی نہیں تھی۔ یہ صدف کا ڈیپارٹمنٹ تھا۔ شالی نے بھی نگاہوں ہی نگاہوں میں سر ہلایا مگر گنیز کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔

”ابھی دو ہفتے پہلے فخر نے مجھے ایک پرنیوم بھی دیا تھا۔ جب میں اس سے ملنے، اتوار کے دن گئی تھی!“

”تمہیں ڈر نہیں لگتا گنیز اگر کوئی دیکھ لے، ویسے بھی تمہارے بھائی بہت سخت مزاج ہیں۔ اگر کوئی بات ان تک پہنچ گئی تو بڑا بجیلہ نے اس کے دل میں تھوڑا سا ڈر بھانا چاہا۔“

”اب مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے، بھائیوں کو کون سی میری پروا ہے۔ اپنے بیوی بچوں میں کم ہیں، اماں بھی ان ہی کی خوشنودی میں لگی رہتی ہیں۔ میری کس کو فکر ہے وہاں، اب جو میرا دل چاہے گا، میں بھی وہی کروں گی۔“ گنیز کے لہجے میں بڑی بے خوفی تھی اور چہرے پر کچھ کرگزر جانے کی سی کیفیت۔ بجیلہ کو بڑا ڈر سا لگنے لگا۔ سامنے سے سکیڑا پاراؤنڈر آرہی تھیں۔ انہیں باتیں کرنا دیکھ کر بھینا برامتا میں سو گنیز کا شاپر اسے پکڑا کر وہ خود سامنے رکھی مٹھین پر جھک گئیں مگر کسی وقت فرصت سے گنیز کو سمجھانے کا ارادہ ضرور دل میں پکا کر لیا تھا۔

مہینہ ختم ہونے پر تنخواہ ملتے ہی سب سے پہلے شالی کے پیسے واپس کیے، حالانکہ وہ منع بھی کرتی رہی، پھر بھی کسی نہ کسی طرح بجیلہ نے اسے وہ رقم واپس لینے پر مجبور کر ہی دیا۔

”مجھے کرنا کیا ہے پیسوں کا، نہ بچے نہ گھربار،

پیٹ تو بھر ہی جاتا ہے ماں باپ کے در پر، میں سنا تو نوکری صرف اپنی تنہائی بانٹنے کے لیے کی ہے۔ اگر میرے پیسے اپنے پاس رکھ لیتیں تو مجھے بہت خوشی حاصل ہوتی۔“

شالی پیسے ہاتھ میں لے کر آذرودہ سے لہجے میں کہنے لگی۔ اس کا ڈپریشن بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ وہ زور زور سے آہ آہ سے بے پروا ہو رہی تھی۔ کئی کئی دن ایک ہی سوٹ پہن کر فیکٹری آتی رہتی، بے تو جی اور مستقل مایوسی میں گھرے رہنے کی وجہ سے اس کی رنگت اور بھی زیادہ سیاہی مال ہو رہی تھی اور چہرے کی رونق بھی بالکل ختم ہو چکی تھی۔ بجیلہ اور گنیز دونوں ہی اسے جب موقع ملتا سمجھاتیں مگر وہ کچھ اثر نہ لیتی۔

”مجھے پتا ہے کہ اب کچھ اچھا نہیں ہوتا، اگر میری قسمت میں خوشی ہوتی تو اشرف سے ہی مل جاتی۔“ امر کی آخری کرن بھی وہ گنوا چکی تھی اور اب کسی خوش فہمی کے قریب پھٹکنے پر تیار نہیں تھی۔

”اس طرح خود کو مستقل اذیت میں رکھنے سے کیا حاصل ہے بھلا۔ اشرف نے جو کچھ کرنا تھا کر لیا۔ اب ساری عمر لکیر سیٹھے ہوئے تو نہیں گزارنی جاسکتی!“ بجیلہ غصے میں آنے لگی۔

شالی آج پورے تین دن کی چھٹی کے بعد آئی تھی۔ اس کی بیماری کی اطلاع تو فیکٹری تک آگئی تھی مگر اس بیماری کی اصل وجہ اس نے بذاتِ خود صوبے جب وہ تینوں بس میں اکٹھی ہوئیں تب شالی اشرف کی دوسری شادی ”کنفرم“ ہو چکی تھی اور اب وہ باقاعدہ اسی عورت کے ساتھ اس کے گھر میں رہنے لگا تھا۔

شالی آس پاس مسافروں کی پروا کیے بغیر، یہ خبر سناتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی گنیز اور بجیلہ کو اسے چپ کرانا مشکل ہو گیا تھا۔ فیکٹری میں ساتھ کام کرنے والی تقریباً سب ہی لڑکیوں کو شالی کا سارا قصہ معلوم تھا باری باری سب ہی نے آکر اظہارِ افسوس کیا شالی سر جھکائے بیٹھی رہی۔ بجیلہ کو اس کی حالت دیکھ دیکھ کر اب غصہ آ رہا تھا۔

”اور اگر اب یہی روتا ساری زندگی جاری رہے تو گزر گئی شالی بی بی۔ ارے، سیدھے طلاق لوائے



ہوئی جارہی تھیں۔ ایک دن ستار بھائی کا بڑا بیٹا بھی بطور خاص وزٹ پر آیا اور بڑی حد تک سب کو مطمئن کرنے کی کوشش کر کے گیا۔

شالی اور عینہ دونوں ہی اور ماتم لگا رہی تھیں۔

شالی کو تنہائی سے فرار کے لیے بہانہ درکار رہتا تھا۔ پھر یہ بھی تھا کہ بھابیوں کا موڈ بھی اچھا رہتا تھا کہ وہ سارا دن باہر رہے اور ان پر بوجھ بھی نہ ہے۔ مگر پر آج کل اپنا جینز جوڑنے کی ڈن سوار تھی۔ اپنے مستقبل کے گھر

کے لیے وہ چھوٹی چھوٹی چیزیں بڑے ارمان کے ساتھ اکٹھی کیے جارہی تھی۔ فخر سے اب اس نے جیلہ کے اصرار پر بہت زور دے کر کہا تھا کہ اس بار جب وہ حیدر آباد اپنے گھر جائے تو اپنی اماں کو ساتھ لے کر آئے تاکہ وہ ان دونوں کے رشتے کی بات چلا سکیں۔ آج کل ملنے والے ان اضافی پیسوں سے وہ بڑی لگن کے ساتھ اپنے مستقبل کے خاکے میں خوبصورت رنگ بھرنے میں مصروف تھی۔

آج کل جیلہ واپسی میں اکیلی ہی ہوتی تھی۔ اس کے ابا اور امی کی طرف سے اتنی دیر رکنے کے لیے اجازت نہیں مل سکی تھی حالانکہ اس نے بہت خوشامد کی تھی کہ زیادہ نہیں تو ہفتے میں تین دن ہی وہ بھی وہاں رک جایا کرے۔

”پیسوں کی ضرورت کسے نہیں ہوتی، یہ تو جتنے بھی ہوں کم ہی دکھائی دیتے ہیں اور اب تو تمہاری شادی بھی قریب ہے!“ رات کے کھانے کے بعد جب وہ دونوں بہنیں ذرا فرصت میں تھیں جیلہ، صدف کو ہموار کرنے کی کوشش کیے گئی وہ پہلے تو حجب چاپ سنتی رہی پھر جب جیلہ خاموش ہوئی تو بڑی سنجیدگی سے بولی۔

”ضرورتیں کم بھی تو کی جاسکتی ہیں آپنی، ضروری ہے کہ پیسہ کمانے کے لیے انسان اتنا بلکان کرے خود کو کہ پھر زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو انجوائے کوئے سے بھی محروم رہ جائے، پیسے سے آسانیاں میسر آ جاتی ہیں آپنی لیکن خوشی کا سلسلہ کہیں اور سے ہی جا کر بڑتا ہے اور میری شادی میں تو ویسے ہی ٹینشن لینے والی کوئی بات نہیں ہے۔ امی نے جو تیاری کر کے رکھی ہے وہی

”کون کرے گا مجھ سے شادی!“ شالی آنسو بہاتے ہوئے جیلہ سے بولی ”نہ رنگ روپ اور نہ ہی تعلیم، مفت کا بوجھ کون لا داتا ہے۔ شکل اچھی ہوتی تو حرف کا دل کسی اور پر آتا ہی کیوں.....؟“ اس کی سوئی دھنکی ہوئی تھی۔ جیلہ نے بے اختیار ہی انگلیوں سے نئے کوچھوڑا تو وہ کچھ جھپٹ گئی تھی۔

”اصل میں تم اور عینہ ماشاء اللہ اچھی صورت شکل کی ہو اس لیے تم نہیں سمجھ سکو گی۔ تمہیں ایسا کوئی احساس ہی نہیں ہے جیلہ!“ وہ اپنی بات کو واضح کرنا چاہ رہی تھی مگر جیلہ اور عینہ کے نزدیک اس کی بات میں ذرا کمی نہ تھیں تھیں۔

”انسان خوش رہے، اپنا خیال رکھے، مرد ہو یا عورت ہمیشہ اچھا لگتا ہے۔“ طبیعتوں میں ہزار اختلاف ہے باوجود دونوں میں کم از کم اس بات پر ضرور اتفاق ہے تھا۔ شالی پتا نہیں قائل ہوئی یا نہیں مگر ان دونوں کی محبت کے آگے خاموش ضرور ہو گئی۔



اگلے ہفتے سے فیکٹری میں کام ایک دم ہی بڑھ گیا ہے آرڈرز مالکان کو مل گئے تھے۔ اور ماتم بھی بڑھ گیا تھا اور نئی ورکرز بھی رکھی جارہی تھیں جو بہت طویل عرصے سے یہاں کام کر رہی تھیں، ان تعداد میں نئے کام والوں کی آمد یہاں پر کھل چکی۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ نئے آنے والوں کی آمد سے اور ماتم پانے میں پرانوں کی حق تلفی ہو رہی ہے دن کسی نہ کسی کی ٹھکار سنا دی دے جاتی تھی۔ سب سے زیادہ معاملات کو سلجھانے کی کوشش میں بلکان



بہت ہے! "بجیلہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

صدف ہمیشہ ہی بالکل بے وقوف اور نا سمجھ سی محسوس ہوتی تھی آج پہلی بار اسے لگا کہ وہ زندگی کے بارے میں نہ صرف بڑی واضح سوچ رکھتی ہے بلکہ یہ سوچ اس کے مقابلے میں بڑی سنجیدہ اور قابلِ تقلید ہے۔

"مجھے تو یہی سوچ کر افسوس ہو رہا ہے کہ اگر اس وقت احمر بھائی اور پچھو بھی تعاون کر لیتے تو امی اور ابا بڑی آسانی سے، ہم دونوں ہی سے فارغ ہو جاتے!" صدف کے لہجے میں بڑا رنج تھا۔ "بجیلہ حالانکہ قصور وار بھی نہیں تھی پھر بھی اس کی نگاہ جھکنے لگی احمر اور اس کے گھر والوں کے روتے کو چاہے کوئی بھی خوبصورت نام دے لیا جاتا مگر اس سے جھپکنے والی خود غرضی، صاف دکھائی دے رہی تھی۔ صدف کے لیے حالہ کے ہاں سے سختی سے جینے کے لیے منع کر دیا گیا تھا اور یہ فیصلہ خود فہد نے کیا تھا جو صدف کا منگیت تھا۔

"کاش ایسی ہی کوئی بات احمر بھی کہہ دیتا!" "بجیلہ کے دل میں کتنی ہی بار یہ بات پن کی طرح چمبی تھی۔ پچھو نے ابا کے لاکھ زور دینے پر بھی ایک ساتھ دونوں شادیوں کے ہونے پر رضامندی ظاہر نہیں کی تھی۔ سارا الزام احمر پر رکھتی تھیں کہ وہ ابھی راضی نہیں ہے اور احمر سے جب ملاقات ہوتی تو وہ پچھو بھی کی مجبوریاں گنوانے لگتا۔ کون سچا تھا؟ یا پھر وہ دونوں ہی سچ بولنے سے ڈرتے تھے۔ نیت کا کھوٹ، عمل کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ کھڑی کرتا ہے۔

"یہ تو ہم ہی بے وقوف ہیں جو ایک غیر ذمے دار اور جزوقتی کام کرنے والے لڑکے کو یہی سوچنے کے لیے بے قرار ہو رہے ہیں!" ابھی چند دن پہلے، ابا نے بہت جھنجھلا کر امی سے کہا تھا۔ یہ بھی پروا نہیں لی تھی کہ "بجیلہ بھی وہیں بیٹھی ہے۔ فہد کی اعلیٰ ظرفی کے بعد انہیں احمر اور بھی زیادہ کھلنے لگا تھا۔

"اور میری بات مانو تو اپنی شادی سے پہلے، یہ جاب چھوڑ دینا ورنہ احمر بھائی اور پچھو ساری زندگی نہیں پیستے ہی رہیں گے!" صدف نرمی سے جو کہہ رہی تھی

وہ سراسر ایک بہن کی محبت تھی مگر بجیلہ کے دل و دماغ چھائے غبار جو جسے نکاسی کا موقع ملا۔

"تم سب لوگ آج احمر کے پیچھے کیوں بڑھ گئے ہو؟" مانا فہد اس کے مقابلے میں ہر طرح سے بہتر ہے مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہر وقت اس کو ذلیل کیا جائے! اپنی بات کہتے کہتے اس کی آواز رندھنے لگی۔ "صدف جلدی ہے اپنی جگہ سے اٹھ کر بجیلہ کے پاس آ بیٹھی۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا آئی، اچھا پلیز معاف کر دو، میں تو صرف تمہارے خیال سے.....!" بات ادھوری چھوڑ کر، وہ خود رونے لگی تو بجیلہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ صدف بے چاری اب یہاں چند دن کی ہی مہمان تھی اور آج کل وہ خود جدائی کے جس احساس کے ساتھ گزر رہی ہوگی اس کا اندازہ کیا جاسکتا تھا۔ بجیلہ نے فوراً ہی آنسو صاف کر کے اسے گلے سے لگا لیا۔

مگر یہ قصہ یہیں ختم نہیں ہوا تھا۔ احمر کی بے پروائی اور بے حس کو اب باقاعدہ نوٹس کیا جانے لگا تھا۔ ابا کو اس سے خاص طور پر چڑھ چکی تھی، کسی کسی وقت تو بجیلہ کو لگتا کہ بس یہ رشتہ ٹوٹا ہی تو نا مگر امی بات کو کسی نہ کسی طرح سنجال بیٹھتیں۔

بجیلہ منتظر ہی رہی کہ وہ کب اس سے لیے گئے پیسے واپس کرے گا مگر احمر کا کھانا ٹیکسٹری ہی رہا۔ وقتاً فوقتاً اس سے پیسے لے لینا اب اس کی عادت بن چکی تھی۔ پچھو آتیں تو ان کا بھی یہی رویہ ہوتا کہ حالات سچ نہیں ہیں۔ بجیلہ کی مایوسی بڑھنے لگی مگر وہ خود کو بھرپور کسی طرح بھلا لیتی۔

\*\*\*

گھر میں صدف کی شادی کا ہنگامہ جاگ اٹھا تو بہت سارے دن اس کی نذر ہو گئے۔ گارمنٹ فیکٹری سے بھی اس نے پورے دس دن کی پھٹی لی تھی۔ صدف کی بار بار بھی مختصر سی امی تھی اور کھانے پر کھنکھوٹہ رکھی لی تھیں۔ بے جا اسراف سے بچتے ہوئے یہ شادی بڑے ہی ہلکے ہلکے انداز میں انجام پائی۔ دیسے گا کہ بھی ہوا، سب کچھ انجوائے بھی کیا مگر ٹینشن ابھی بجیلہ کی فیکٹری سے گھینے اور شادی کے علاوہ بھی

بہت سی دوسری لڑکیاں شادی میں شریک ہوئیں، خاص طور پر کینڈیا، جسن کی آمد غلطی غیر متوقع تھی۔ ان سب کا دلوس اور اپنائیت ہی قابلِ قدر تھی شادی اور گھینے نے احمر کو خاص طور پر دیکھا۔ صدف کی شادی والے دن، وہ ایک ہی بہت اسرارٹ رہا تھا۔ صورت شکل اچھی تھی ہی، ہاتھ کراچی کے کپڑوں نے پوری کر دی تھی۔ بجیلہ کو اسے ان لوگوں سے ملواتے ہوئے بڑے فخر کا احساس ہوا۔

شادی نے بہت کھل کر احمر کی تعریف کی تھی مگر گھینے نے کسی خاص اشتیاق کا اظہار نہیں کیا۔ باوجود تمام تر وسیع قلبی کے بجیلہ کے دل میں یہی گھٹایا خیال آیا کہ وہ اس سے جل گئی ہے۔ "فخر، احمر کے مقابلے میں بے چارہ بالکل ہی گیا گرا سا ہے اور اوپر سے پچھو اور کتنا! "بجیلہ کو گھینے سے کتنی اس کی باتیں یاد آئیں۔

صدف کی شادی کا ہنگامہ ششہا پڑا، تو زندگی پھر سے معمول پر آنے لگی۔ فیکٹری میں گزشتہ مہینوں والا کام لاوار، اب باقی نہیں رہا تھا۔ وہی روز کا کام چل رہا تھا۔ عارضی طور پر رکھے گئے ورکرز کی بھی بڑی تعداد گھٹ گئی اور جا چکی تھی اور اور ٹائم کا بھی اب وہ عالم نہیں رہا تھا۔ ہر وقت چلی مشینوں کے سچ پیٹھ کبھی بجیلہ کو بڑے سکون کا احساس ہو رہا تھا۔

گھینے کی کام کے سچ آنکھ بچوئی والا سلسلہ ابھی بھی جاری تھا۔ اس کے اور فخر کے سچ جو سلسلہ جاری تھا وہ اب راز نہیں رہا تھا۔ ساری لڑکیوں کو خبر ہو چکی تھی۔ شادی سے تیار کیا ایک روز، گھینے کی سب سے اہم اتحادی سینیٹہ اب اسے بھی بہت سختی سے خبر لی ہے اس کی۔

"بہت اچھا کیا، یہاں سب کام کے لیے آتے ہیں۔ اس طرح کی باتوں سے ماحول خراب ہوتا ہے اور لڑکیوں پر بھی اثر پڑتا ہے۔" "بجیلہ نے کہا۔ "تم تو یہ سوچ رہی ہوں کہ ہم دونوں کو بھی گھینے سے کچھ کم کر دینی چاہیے۔ یہاں پر ہمارا تاثر بھی ہے اور ہوا۔" "شادی کی بات اسے ٹھیک ہی لگی، چند دنوں کے سوچ لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ "خیر آئی، آج اس نے بہت خوبصورت کاشن کا

سوٹ پہن رکھا تھا جو دیکھنے میں خاصا مہنگا لگ رہا تھا۔ گھینے نے بھی شاید اس کی نگاہوں میں آنی پسندیدگی کو بھانپ لیا تھا۔ ایک فخریہ مسکراہٹ، اس کے چہرے پر چلی آئی۔

"بجیلے ماہ میری ساگرہ تھی۔ فخر نے گفت کیا تھا معلوم ہے تمہارے کتنے کا ہے؟" گھینے نے رعب بھانا چاہا۔

"تم اتنے مہنگے تحفے کیوں لے رہی ہو فخر سے، آخر کیوں وہ تم پر اتنے پیسے خرچ کر رہا ہے۔ کل کو تمہارے لیے کوئی پریشانی نہ کھڑی ہو جائے، اتنا تو سوچو۔" گھینے نے تمھوڑی سی غلطی کے باوجود بھی، بجیلہ نے دوستی کا حق بھانا چاہا مگر جواباً وہ بے پروائی سے ہنس پڑی۔

"وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ ایسی دلی نہیں، بچی محبت اور اسی لیے میرے لیے کچھ بھی لیتے ہوئے اسے پیسوں کی پروا نہیں ہوتی۔"

"پھر بھی، ابھی تو تم دونوں کے درمیان کوئی باقاعدہ رشتہ نہیں بنایا ہے۔ پھر بھی تم.....!" "بجیلہ نے کہا تو گھینے اس کی بات کاٹنے ہوئے ہوئی۔

"ظاہری رشتہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا بجیلہ، ہمیں ایک دوسرے پر پورا بھروسہ ہے اور اہمیت مٹانا، احمر تو تمہارا منگیت ہے۔ فخر بھی رشتہ دار بھی ہے مگر دل کا ٹھٹک ہے ورنہ بھی تو تم بھی اس کی لائی ہوئی کوئی چیز، ہمیں بہت شوق سے دکھائیں، لڑکیوں کو تو بڑا ارمان ہوتا ہے کہ ان کے منگیت.....!"

"ہمارے درمیان اس قسم کی باتوں کی اہمیت نہیں ہے۔ میں احمر کے لیے کتنی اہم ہوں اس بات کا اندازہ مجھے خود ہے۔" "بجیلہ کو اس کے سو فیصد درست تجربے سے انکار کرتے ہوئے خود اپنی آواز کھل گئی۔

"خوش فہمی ہے تمہاری، ان مردوں کے نزدیک خود ان کے اپنے علاوہ کوئی بھی اہم نہیں ہوتا۔ اپنی اہمیت عورت کو ثابت کرنی پڑتی ہے۔ جیسے میں کر رہی ہوں۔ ابھی سے میری فہمی میں ہے فخر بعد میں تو.....!" گھینے کے چہرے پر بڑی پراسرار سی مسکراہٹ ابھرنے لگی۔



جیلہ کو اس لمحے وہ کسی عام سی لڑکی کے بجائے، بڑی جہان پندہ سی عورت محسوس ہوئی جس کا فلسفہ زندگی اس کے ذاتی تجربات کا مرکب ہونا منت تھا۔ خوبصورت لباس کے ساتھ، میک اپ سے رنگے خوبصورت چہرے سے، نہیں معلوم کیوں اسے گھن سی آنے لگی۔

”اپنا مقابلہ ہم لوگوں سے مت کرو گھینے، یہ تو وقت بتائے گا کہ خوش فہمی میں، میں جیتا ہوں یا تم اور امر جیسا بھی ہے، کم از کم اس چھپورے آوارہ لڑکے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ جس پر تم بھروسہ کیے بیٹھی ہو!“ اس کے لہجے میں اتنی جھنجھکی اور تحقار تھی کہ کچھ میں بیٹھی مگر کروڑوں کا منہ دھستکتی شامی کمد اغلت کرتی ہی بڑی۔

”پاگل ہوگئی ہو تم دونوں، بات کو کہاں سے کہاں لے جا رہی ہو۔ چلو کھانا کھاؤ دونوں!“ اس نے تینوں کے چچ باکس آگے کمر کائے۔

”رہنے دو شامی، جب دلوں میں اتنی تلخی بھری ہو تو یہ دکھاوے کی دوستی بالکل ہی بے معنی ہے۔“ گھینے ایک جھٹکے سے اپنا لہجہ باکس اٹھا کر کھڑی ہوگئی۔ شامی نے اسے روکنا بھی چاہا مگر وہ تیز قدم اٹھاتی ہوئی دوسری طرف چلی گئی۔ کچھ میل والے برآمدے میں، اس دوستی کے تابوت میں آخری کیل ٹھک ہی گئی۔ ساتھ کام کرنے والی لڑکیوں نے شروع شروع میں تو ان کے مابین چھائی سردمہری کا بہت زیادہ نوٹس لیا۔ کرید کرید کر اصل وجہ جاننے کی کوشش کرتی جاتی مگر اس سابقہ دوستی کا اتنا لحاظ انہوں نے ضرور رکھا کہ کسی دوسرے کے سامنے ایک دوسرے کی برائی سے اجتناب ہی کرتی رہیں۔

رفتہ رفتہ سب ہی اس نئے معمول کے عادی ہو گئے۔ کچھ میل والے برآمدے میں اب لہجہ بریک میں شامی اور جیلہ ساتھ کھانا کھاتی دکھائی دیتی تھیں۔ گوشالی کی براہ راست گھینے سے کوئی ناراضگی نہیں ہوتی تھی مگر وہ خود بخود ہی جیلہ کے ساتھ گروپ بنا چکی تھی۔ اس کی زور زورچی اور پاپوسی، جیلہ کی حساس طبیعت کے ساتھ ہی میل کھاتی تھی۔ ویسے وہ رسماً گھینے سے بھی دعا سلام کرتی اور آتے جاتے بس میں اگر جگہ کا مسئلہ ہوتا تو گھینے کے ساتھ بیٹھ بھی جاتی۔

جیلہ نے اس دن کے بعد بالکل ہی پروا کرنی چھوڑ دی تھی کہ وہ کیا پہن رہی ہے اور کتنی بار اپنی سیٹ سے غائب ہوتی ہے۔ اس کا دل، گھینے کی طرف سے ہر اتنا خراب ہو گیا تھا کہ اگر شامی بھی گھینے کے متعلق کوئی بات چھیڑتی تو وہ بات کا موضوع بدل دیتی چند دن بعد گھینے نے جگہ بھی تبدیل کر لی تو یہ قصہ تقریباً ختم ہی ہو گیا۔

\*\*\*

جیلہ جتنی دیر فیکٹری میں رہتی۔ وقت گزرنے کا کچھ بھی نہیں چلتا مگر گھر میں اب صدف کی غیر موجودگی میں وقت کا نڈا دو بھر ہو رہا تھا۔ اب حسب معمول زیادہ سے زیادہ وقت باہر امی اب اس کے خیال سے شام کو اس کے آجانے کے بعد نہیں نہیں جانی تھیں مگر جو باشا وہ صدف سے بے ٹکان کر لیا کرتی تھی امی سے کہاں کرتی۔

البتہ کبھی کبھی جب صدف رہنے کے لیے آتی تو بس عید کا سامان ہو جاتا۔ وہ اب جیلہ کے لیے بریطان رہا کرتی تھی۔ اس کے سامنے تو نہیں مگر غیر موجودگی میں امی پر زور دیا کرتی کہ وہ جلد از جلد جیلہ کی شادی کرنے کی کوشش کریں۔

اس بار وہ نسبتاً جلدی آگئی، نہ کوئی فون، نہ اطلاع اور ابھی وہ لوگ حیرت بھری خوشی سے لکھے بھی نہیں تھے کہ اس نے وہ خبر بھی سنا دی، جسے سنانے کے لیے وہ دوڑی چلی آئی تھی۔

”احمر بھائی کو تو بڑی اچھی چاہل گئی ہے۔ ایک پرائیوٹ فرم میں، فہد کا اتفاقاً جانا ہوا تو وہاں ان سے ملاقات ہوئی۔“ اتوار کا دن تھا، گھر پر امی کے ساتھ جیلہ بھی تھا، وہ دونوں ہی اس کی شکل دیکھنے لگیں۔ ایسا کہے ممکن تھا۔ بے شک امر آج کل بہت کم آتا تھا مگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ سب سے پہلے بیٹیں سنانے آتا۔

”ہو سکتا ہے، وہ وہاں کوئی انٹرویو وغیرہ دینے گیا ہو، فہد کو فلفل نہیں ہوئی ہو۔“ جیلہ نے ایک بڑا سا جھوٹا تلاشا۔

”کیسی باتیں کرتی ہو آبی!“ صدف تیزی سے

”جی، شادی کے بعد اس کی بات میں خود بخود وزن پیدا ہو گیا۔“

”احمر بھائی وہاں آفس میں بیٹھے باقاعدہ فائلیں دیکھ رہے تھے، فہد کو بتایا کہ ابھی آئیں وہاں جو اس کے حیرت انگیز ہے۔“

”دیکھو تو بھلا، کسی نے تک فون کر کے نہیں بتایا، خوش خبری پر ہمارا حق نہیں تھا۔“ امی آزرہ ہونے لگی۔ خود جیلہ کے بھی دل کو دھکا سا لگا۔ کیسی خوش خبری کی جودل دکھانے کا سبب بنی تھی۔

”ابھی فون کریں پچھو کہ کھر، ویسے تو آئے دن جیلہ بیٹھے رہتے تھے احمر بھائی، اچھی چاہ کیا ملی، واماں اور انی ساتویں آسان پر جا پہنچا، امی مجھے تو ان لوگوں کی بات ٹھک نہیں لگ رہی ہے۔“ صدف شاید اور بھی کچھ کہتی مگر جیلہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر خاموش ہوگئی۔

”ابھی سے اندازے قائم مت کرو، میں خود بات کرنا گی اور ابھی اپنے ابا سے کچھ ذکر مت کرنا۔“ امی نے کچھ سوچتے ہوئے صدف کو ہدایت کی۔ وہ صرف ہی اطلاع دینے کے لیے آئی تھی۔ تھوڑی دیر ہی بیٹھ کر اس بار ہی تھی۔ ابھی احمر کی آمد ہوئی۔

”دیکھا، آج فوراً آئے، پتا تھا کہ اب یہاں ملازمین میں دیر نہیں لگے گی!“ صدف نے دروازے سے نکلتے ہوئے سرگوشی کی تو جیلہ بس اسے دیکھ کر رہ گئی۔

صدف اور فہد چلے گئے تو امر نے وہ خوش خبری سنا لی، جواب تھوڑی سی پرانی ہو چکی تھی۔

”ہاں بتایا تھا صدف نے ابھی، مبارک ہوا!“

امی کے انداز میں بڑی واضح رکھائی تھی۔ احمر نے کسی طرف دیکھا تو وہ بھی بڑی سنجیدہ سی محسوس ہوئی۔

”اصل میں، ابھی تک کفر نہیں ہوں۔ اسی لیے گناہ چھائیں لگا۔ میں نے سوچا پہلے پورا اطمینان کر لیتا۔“

”جیلہ کو ایسا لگا جیسے وہ جھوٹا ہے۔“

”میں جائے بنا کر لاتی ہوں!“ وہ فضول بات کو تھک کر کھڑی ہوئی تو وہ بھی فوراً ہی اٹھ گیا۔

”نہیں، جائے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے چند ضروری کام ہیں، بس چلا ہوں۔“

امی اور جیلہ دونوں ہی حیرت سے اسے دیکھنے لگیں۔ عام طور پر جب وہ آتا تھا تو اٹھنے کا نام نہیں لیتا تھا اور دوپہر کا کھانا تو لازمی ہی تھا۔

”پھر آؤں گا فرصت سے!“ اس نے ان کی تسلی کی خاطر ہی کہا اور پھر فوراً ہی چلا گیا۔ جیلہ بہت دیر طول سی ہوئی بیٹھی رہی۔ اگلے دن فیکٹری بھی نہیں گئی، سر درد کا بھانہ کر کے سارا دن اپنے کمرے میں ہی گزار دیا۔ اس سے اگلے روز جب وہاں پہنچی تو ایک نئی خبر وہاں بھی منتظر تھی، گواس کے لیے اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی پھر بھی.....

”فخر کا ٹرانسفر کر دیا ہے یہاں سے ستار بھائی نے، اب وہ ان کی دوسری فیکٹری میں کام کرے گا۔ چلا گیا یہاں سے کل لہجہ بریک میں۔“

”اچھا!.....“ جیلہ کو سن کر اچھا ہی لگا، خواہواہ فیکٹری کا ماحول خراب ہو رہا تھا۔

”گھینے تو کل بہت روئی، کہہ رہی تھی کہ سکیٹہ آپا جان بوجھ کر فخر کو یہاں سے بھیجا ہے۔ لڑکیاں ان سے میری شکایتیں کرتی تھیں، کہیں اس کا اشارہ ہم دونوں کی طرف تو نہیں ہے۔“ شامی کے پاس خبر کے ساتھ خدشات بھی تھے۔

”ہمیں کیا پڑی ہے۔ گھینے کی حرکتیں چھپی ہوئی تھوڑی ہیں سب ہی کو پتا ہے کہ یہاں کیا چل رہا تھا۔“

جیلہ نے بے پروائی سے کہتے ہوئے اس طرف دیکھا، جس طرف اب گھینے بیٹھتی تھی۔ درمیان میں فاصلہ تو تھا، مگر اتنا بھی نہیں کہ وہ گھینے کے چہرے کی افسردگی کو نہ دیکھ پاتی۔ اب وہ سارا وقت اپنی جگہ پر ہی دکھائی دیتی۔

فخر کی جگہ بنا لڑکا آ گیا تھا ایک دو بار وہ آتا جاتا دکھائی بھی دیا تھا۔ فخر سے زیادہ خوش شکل تھا، شامی اور جیلہ دونوں ہی کو یقین تھا کہ گھینے کی شوخیاں پھر سے رفتار پکڑی شروع ہو جائیں گی مگر اب ایسا کچھ نہیں ہوا۔ گھینے سارا وقت اپنی جگہ پر بیٹھی کام کرتی رہی اور چھٹی ہوتے



اسے تلاش کر لیا مگر کچھ فائدہ نہیں، اب کل اس کے کسی دوست نے بتایا ہے کہ اس نے وہاں حیدر آباد میں ہی نوکری کر لی ہے اور پچھلے جمعہ کو اس کا نکاح بھی ہو گیا ہے وہیں.....

”کوئی نئی بات نہیں!“ بجیلہ کے انتہاک میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ”ایسی کہانیوں کا یہی انجام ہوتا ہے، تم کیا سمجھ رہی تھیں کہ فخر بہت عزت کے ساتھ نگینہ کا ہاتھ تھام لیتا، ظاہر ہے اسے یہی کرنا تھا جو اس نے کیا۔“ شالی خاموش سی ہو گئی۔ اسے امید تھی کہ پرانی دوستی کے صدمے ہی سہی بجیلہ، نگینہ کے لیے دلفظ تو ہمدردی کے کہہ ہی دے گی۔

”نگینہ کی حالت بہت رومی ہو رہی ہے کبھی ہے مجھے منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑا ہے اس فخر نے، آج یہاں سے اس کا حیدر آباد والا پتا پوچھنے آئی ہے مگر سیکرٹ آپا نے بھی صاف انکار کر دیا ہے۔“ شالی کی آنکھوں میں سہم سا طاری ہو رہا تھا۔

”معلوم نہیں ان دونوں کی دوستی کس حد

کھانے کا وقت اب فتم ہو رہا تھا، بجیلہ لٹچ باکس بند کر کے واپس اپنی جگہ پر آ بیٹھی، ساری لڑکیاں ایک، ایک کر کے اندر آ رہی تھیں مگر نگینہ ان میں نہیں تھیں اس کی جگہ بدستور خالی تھی۔ بھی اسے شالی اندر آتی دکھائی دلی۔

”بے چاری نگینہ کے ساتھ بہت برا ہوا!“ وہ روتی اب آگے پیچھے ہی بیٹھتی تھیں۔

”نگینہ بے چاری کب سے ہو گئی ہے؟“ بجیلہ نے اس کی ایکسٹنٹ کو ٹیکسٹ نظر انداز کیا۔

”سنو تو سہی، فخر نے بہت برا دھوکا دیا ہے اسے، بے چاری تو بہت غلطی ہی اس کے ساتھ!“

”وہی روایتی کہانی!“ بجیلہ تیزی سے بغیر کرنے لگی مگر شالی اس کی بے نیازی کو خاطر میں لائے بغیر وہ سارا قصہ سنانے کے لیے بے تاب تھی جو یہاں آدمی لڑکیوں کو تو معلوم ہو ہی چکا تھا۔

”بہت دن سے فخر غائب تھا جہاں کام کرتا ہے وہاں بھی نہیں آ رہا تھا، موبائل بھی بند تھا۔ نگینہ نے ہر جگہ

بڑی مشکل ہو جائے گی۔“ وہ گود میں رکھے ہاتھوں کو ہلکے ہلکے سے ملتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے وہاں جانے کی، یہاں کم از کم اپنے پیروں پر کھڑی ہو، ماں باپ کے سامنے میں رہ رہی ہو، وہاں جا کر ان لوگوں کی بے دام غلام بن کر رہ جاؤ گی اور بس.....“ بجیلہ کو یہ سوچ گریہ برا لگ رہا تھا کہ شالی جیسی ستم رسیدہ ایک بار پھر اسی آزمائش کی بجھنی میں جھوکی جائے۔ کچھریل والے برآمدے میں نرم سی دھوپ پھیل رہی تھی اور فرش پر ہوا کے سرد جھونکوں سے ٹوٹ کر گرنے والے تیز پیلے پھول اڑتے پھر رہے تھے۔

”اماں زور تو نہیں دیتیں مگر دے لفظوں میں کہیں ہیں کہ میں واپس چلی جاؤں، ان کا خیال ہے کہ اسی میں عزت ہے!“ شالی کی آواز اور بھی ہوئے گی۔

کس کی عزت، اسی کہنے اشرف کی جس نے ایک بار دھکا دے کر باہر نکالا..... واپس انہی کے دروازے پر جا کر پڑنا ضروری ہے کیا؟“ بجیلہ کو بہت زور کا غصہ آیا۔ شالی نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر بھی بجیلہ کے پیچھے کچھ دیکھ کر یکدم ہی چونک اٹھی۔

”ارے، اسے کیا ہوا؟“ بے ساختہ ہی اس کے منہ سے نکلا۔ بجیلہ نے پونہی بیٹھے بیٹھے مڑ کر دیکھا تو ہڈے فاصلے پر نگینہ کھڑی تھی۔ منگے سے کپڑوں میں میک اپ کے بغیر اس کا چہرہ بڑا بے رونق سا لگ رہا تھا۔ بجیلہ دو تین دن سے وہ یہاں نہیں آ رہی تھی اور اب آئی تھی تو اس وقت جب لڑکیاں کھانے کے وقتے میں باہر آئی بیٹھی تھیں۔

”کوئی بات ہے ضرور، ظہر میں پوچھ کر آتی ہوں!“ شالی کہتی ہوئی اٹھی اور بجیلہ کا جواب سنے بغیر آگے بڑھ گئی۔ لڑکیوں کا ایک گروپ پہلے ہی نگینہ کو گھیرے کھڑا تھا۔

”صرف توجہ حاصل کرنے کے ڈرامے!“ انہوں نے لہجہ میں گندھے سے لگ کر روئی تھی۔ بجیلہ نے منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے اس کی طرف سے رخ پھیرا۔

یہی خاموشی سے گھر کو روانہ ہو جاتی۔ ان کا روٹ ایک ہی تھا سوس میں وہ الگ ہو کر بھی ساتھ ہی تھیں، شالی کی زبانی پتا چلا کہ وہ اب بھی فخر سے ملتی ہے۔ بجیلہ اور اس کے درمیان چھائی سرد مہری برقرار تھی کسی کسی وقت بجیلہ کا بڑا دل چاہتا کہ وہ اس کو اشرف کی نئی نوکری کے بارے میں بتائے کہ اب وہ کتنی بہترین جگہ پر کام کر رہا ہے اور زمانے بھر کا چھپورا فخر اب بھی ستار بھائی کے کسی تنگ سے آفس میں بیٹھا گارنیشن کا حساب کتاب دیکھتا ہو گا۔ دل ہی دل میں اس گھٹیا سی مقابلے بازی سے اسے بڑی خوشی حاصل ہوتی تھی۔

اشرف کا آنا جانا اب کم ہو گیا تھا، نیا آفس نئی ڈسٹے داریاں۔ گھر میں امی اب بجیلہ کی شادی کی تیاریوں میں مصروف رہنے لگی تھیں۔ پچھونے کہا تھا کہ اب جلد ہی وہ باقاعدہ تاریخ لینے والی ہیں۔

اشرف کی بے اعتنائی کا سارا گلہ بجیلہ کے دل سے جاتا رہا تھا۔ اب تو اس نے دل میں یہ حساب جوڑنا بھی چھوڑ دیا تھا کہ اشرف اس کا کتنا قرض باقی ہے۔ اب یہ حساب کسی خوبصورت لمبے میں بے باق ہونا تھا۔ اس بار صدف والا سلسلہ نہیں تھا۔ پچھو اور ان کے گھرانے کو جہیز میں ہر شے کی توقع تھی اور یہ باتیں وہ یاد دہانی کے طور پر عرصے سے کر رہے تھے سو اس بار اچھی طرح تیاری و کار تھی۔ بجیلہ کی تنخواہ اب اسی دم میں خرچ ہو رہی تھی۔

شالی اسے خوش دیکھ کر خوش تو ہوتی مگر ساتھ میں تو ہڈی سی اداسی بھی گھیرتی۔ ”میں یہاں اکیلی ہو جاؤں گی، نگینہ کے ساتھ اب وہ پہلے والی بات ہی نہیں رہی، ویسے بھی اسے تو فخر کے علاوہ کچھ سوچتا ہی نہیں ہے اب۔“ شالی جب بھی زیادہ دل گھبراتا اسی طرح کی باتیں کرتی تھی، بجیلہ اسے مایوسی سے ٹکائے کے لیے کچھ بھی کہتی وہ بے اثر ہی جاتا۔

”خالہ خالو کہتے ہیں کہ میں آ کر ان کے ساتھ رہنے لگوں مگر میں سوچتی ہوں کیا فائدہ، یہاں ہوں تو آنکھ او جھل، پہاڑ او جھل والی بات ہے، وہاں رہوں گی تو اشرف اپنی بیوی کے ساتھ آتا جاتا دکھائی دے گا مجھ

## ایک ماہنامہ 2008ء

== لکھنے کے علاوہ صرف عشق کیا ہے۔

== مجبوری ہے اپنے مداح قارئین سے فاصلہ رکھنا پڑتا ہے۔

== ادب کے ٹھیکے دار ڈائجسٹوں میں لکھنے والوں کو بے ادب سمجھتے ہیں۔

== 77 سال کا بوڑھا نانڈ بے میں سفر کرنا چاہتا ہے۔

یہ اور بہت سارے عجیبے سوالات کے دلچسپ و ممتی خیز جوابات

لاکھوں دلوں کی دھڑکن اور دنیا کی طویل ترین کہانی وینونا کے تخلیق کار

محی الدین نواب کا دلکش نئے قلمی سبب میں خصوصی اظہار خیال

نواب صاحب کی باتیں سن کر ہر دل کے لیے 2008ء کا جشن بنی ہوئی ہے

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز فون: 5895313 فیکس: 5802551



تک.....؟" جیلہ نے پل بھر کے لیے کام پر سے ہاتھ روک کر اس کی آنکھوں میں جسے خوف کو دیکھا اور پھر واپس مٹھیں پر دباؤ بڑھانے لگی۔ آج اسے زیادہ سے زیادہ کام ختم کر لینا تھا کیونکہ کل کی چھٹی لینی تھی۔ پچھو نے گھر بدلتا تھا اپنا پڑا گھر کرانے پر دے کر وہ بیٹا بہتر علاقے میں آئی تھیں، یہ ان سے زیادہ احرار کی خواہش تھی، اب سے نہیں کتنے ہی عرصے سے اور اب جب اسے اچھی بھاری بھر کم تنخواہ مل رہی تھی تو اس نے اپنی خواہش کو پورا کرنے میں دیر نہیں لگائی۔



پچھو کے گھر محفل میلاد تھی، پچھو اصرار کے ساتھ بلا دادے گئی تھیں۔ جیلہ کو یہ محفل سعید، اپنی متعلق خوشیوں کا پیش لفظ ہی محسوس ہو رہی تھی اور وہ اس میں پوری تیاری کے ساتھ شرکت کرنا چاہ رہی تھی۔ اگلا سارا دن جیسے پر لگا کر اڑا، کلی میں ہی واقع بیوٹی پارلر سے آئی بروز بواؤں، بال بہت اچھی طرح شیمو کر کے پہلی بار ان میں کنڈیشنر بھی لگا دیا اور چہرے پر ماسک بھی، پنج ایک دن پہلے صدف آئی تھی تو کرنی تھی۔ سہ پہر کو جب وہ تیار ہو رہی تھی تو شخصیت میں ایک بڑا واضح نکھار محسوس ہو رہا تھا۔ ایک دم اسے نگینہ یاد آئی۔ یہی سب جو وہ آج بطور خاص کر رہی تھی، نگینہ کے معمول کا حصہ تھا۔ شاید چاہنے والی نظر کے آگے سراپے جانے کی خواہش بھی کی ایک جیسی ہوتی ہے۔

اسے اپنی اور نگینہ کی مماثلت عجیب سی لگی مگر آج کا دن فضول سوچوں کی نذر کرنے کے لیے نہیں تھا۔ صدف کو اپنے گھر سے ہی وہاں جانا تھا۔ یہاں سے بس وہ ادرا لیتے تھے، اسی کا خیال تھا کہ رکشا سے چلے جائیں گے مگر جیلہ نے نیکی پر اصرار کیا۔ "نیکی میں زیادہ اچھا لگے گا امی، اتنی مدت بعد تو جارہے ہیں۔" امی خاموش ہو رہی ہیں، وہ اپنا کنارہ ہی نہیں سوچ رہی تھیں کہ کوئی دل چاہتا تھا۔ "تین سو سے کم نہیں لے گا کسی والا اور پر سے کیک، مٹھائی پورے ہزار روپے کا نسخہ ہے۔" جب تک وہ لوگ گھر سے نکلیں، ابابڑاڑاتے ہی رہے۔

پچھو کا گھر کافی ٹھیک ٹھاک تھا۔ بتایا ہوا ہون پونٹ گھر زیادہ بڑا تو نہیں تھا مگر ان لوگوں نے اس سے پہلے اتنا فٹنگ والا گھر نہیں دیکھا تھا۔ "مجھے تو کوئی گڑ بولگ رہی ہے، بھلا کم سے کم کی کیا کرایہ ہوگا اس گھر کا.....؟" صدف نے سرگوشی کی میلاد شروع ہونے میں ابھی تھوڑا وقت باقی تھا اور پچھو انہیں خیر انداز میں اور پرچے گھر دکھاتی پھر رہی تھیں۔ "آفس کے لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے اب وہاں اس گھر میں تو کوئی بٹھانے لائق جگہ بھی نہیں تھی، احرار کے پاس نے خود اس گھر کا انتظام کر کے دیا ہے، کرایہ تنخواہ سے کم جایا کرے گا۔"

"بھلا سمجھ میں آنے والی بات ہے آئی!" صدف سے پچھو بڑبڑایا، جیلہ اسے مشتعل تعجبی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ صرف امی تھیں جو پرچہ کو دیکھ کر بہت خوشی سے ماشا اللہ کہے جا رہی تھیں۔ یقین بڑا اسٹاکس تھا اور حقیقتاً جگہ بڑا تھا۔ "اس گھر سے کم از کم میں بغیر بیکھاری ہوئی وال کھا کر تو واپس نہیں جانا پڑے گا!" کسی یاد نے چلتی سی لی تو صدف اپنی بات کہتے ہوئے قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ جیلہ نے شکر کیا کہ پچھو امی کو لے کر وہاں سے چاچی نہیں۔

پچھو کی بیٹیاں تیار ہو کر اب کمرے سے برآمد ہونا شروع ہو گئی تھیں، ان دونوں کو دیکھ کر رہی سی خوشی کا اظہار کیا اور پھر مہمانوں کو ریسیو کرنے میں لگ گئیں۔ گھر کے آگے والے لان میں تقریباً کا انعقاد تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ان لوگوں کو اندازہ ہو گیا کہ آنے والوں میں زیادہ تر نئے چہرے ہیں، خاندان میں سے صرف کتنی کی دو چار خواتین ہی آئی تھیں، وہ بھی وہ جو نظر انداز نہیں کی جاسکتی تھیں۔

"مجھے تو بڑا اطمینان ہوا یہاں آ کر، اللہ نے ہماری سن ہی لی۔" امی کے لہجے میں بڑی گہری طنز تھی۔ جیلہ نے کن آنکھوں سے پچھو کی طرف دیکھا کہ شاید وہ اس کے حوالے سے کوئی خوش امید بات کرے مگر آج وہ بہت مصروف تھیں۔ شاید ڈھنگ سے سامنے

تھیں۔ خاندان کی خواتین نے البتہ امی کو خصوصی طور پر مبارکبادی احرار کی جانب کی، سب کا خیال تھا کہ بس اب بیوی ہونے میں کچھ ہی دن اور لگیں گے۔ خود کو موضوع مسرت بناتے ہوئے جیلہ کی ہجرت کر رہی تھیں۔ سامنے گیٹ سے کچھ دھڑک کر احرار کچھ لڑکیوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کے قدم بڑے نوانستہ سے انداز میں اس کی طرف اٹھ گئے۔ وہ ماری شکلیں اس کے لیے انجان تھیں پھر بھی ان کا اندازہ تو وہی کیا کہ وہ لوگ احرار کی لوگ ہیں۔ "یہ میری نزن ہے جیلہ!" اسے قریب کھڑا دیکھ کر احرار کو مری سا تعارف کرانا پڑا۔

"اچھا!" ان سب نے بڑی دلچسپی سے اس کا جائزہ لیا۔ "کیا کر رہی ہیں ابھی، پڑھ رہی ہیں یا کہیں باب اسٹارٹ کر لی ہے؟" وہ جو ابھی صرف "نزن" نامی تھیں چھپی غیریت کے مطلب معنی سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی، سوالات کی اس بوچھاڑ سے بالکل گنبد ہونے لگی۔

"مگر رجیشن کر لیا ہے، اب فیشن ڈیزائننگ کر رہی ہے!" سامنے کھڑا احرار بڑے اعتماد سے ان لوگوں کو اس کے بارے میں بتا رہا تھا۔ گارمنٹ ڈیزائنر بن کر رہی تھیں، پر یہ عزت افزائی بھی اس کے اعتماد کو بحال کرنے میں ناکام ہو رہی تھی۔

"بہت دلچسپ سبجیکٹ ہے، مزہ تو بہت آتا ہو گا!" احرار کے بالکل ساتھ کھڑی وہ بے حد معمولی شکل کی لڑکی اس سے بڑے اشتیاق سے پوچھ رہی تھی۔ شیٹوں کی گھر گھر سے گونجا ہوا وہ بڑا سا ہال پل سے گزرتے ہیں اس کی نگاہوں میں گھوما۔ "جی بہت۔" وہ ہلکے سے کہہ کر واپس مڑ آئی، میلاد شروع ہو گیا تھا۔ وہ سیدھی صدف کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

"کہاں پھر رہی ہو تم، جب پچھو کی بیٹیاں ہمیں ملتی تھیں دے رہیں تو کیا ضروری ہے کہ ہم خواہنا بنج

## گھریلو ٹوٹکے

☆ کپڑے اور برتن دھوتے وقت دستانے ہنسنے کی عادت ڈالیں، یہ ہاتھوں کی حفاظت کے لیے بہت ضروری ہے۔ چھوٹی بچیوں کو شروع سے ہی دستانوں کی عادت ڈالیں۔

☆ آنکھوں کی صوبن دور کرنے کے لیے ان پر کئے ہوئے آلوریں۔

☆ کپڑے دھونے سے پہلے ہاتھوں پر کوئی بھی چکنی چیز مل لیا کریں تاکہ پاؤں میں پایا جانے والا کاسٹک سوڈا ہاتھوں کی ملامت پر اثر انداز نہ ہو سکے۔

☆ کام کرنے کے بعد اپنے ہاتھوں کو اچھی طرح خشک کر کے کوئی سی بھی کریم ضرور لگائیں۔

☆ بار بار پانی سے ہاتھ دھونا اچھا نہیں ہوتا، اس سے گریز کریں۔

☆ کھانے کے بعد کیوئیالیوں کے جھکے سے ہاتھوں کو صاف کیا جا سکتا ہے۔ اس سے ہاتھ نرم ہوتے ہیں۔

☆ بعض اوقات گوشت ایسا آجاتا ہے جو گلنے میں ہی نہیں آتا۔ اس کے لیے آزمودہ نسخہ یہ ہے کہ خرپوزے کے جھکے سکھا کر رکھ لیں اور جب کبھی ایسی صورت حال پیش آئے تو گوشت میں ڈال کر پکا لیں گوشت گل جائے گا۔

☆ عرق لیوں میں ہم وزن گھیر سن ملا کر اس میں ایک چھوٹا چھچھو بورک ایسڈ ڈال کر تینوں کو یکجا کر لیں اور تیشی میں بھر کر رکھ لیں، ہاتھ دھونے کے بعد دن میں دو تین بار استعمال کریں، یہ عمل ہاتھوں کو نرم اور چمکنا رکھتا ہے اور ہاتھوں کی رنگت نکھارنے کے لیے بہت مثال ہے۔

☆ ناخن اور آنکھوں کی پوروں پر کیوئیالیوں کے جھکے ملتی رہا کریں، اس سے ناخن اور پوروں میں چمک آ جاتی ہے۔

☆ شائستہ رمضان، کراچی



# دائے زندگی کے

تحسین اختر

”کیسے چپ کر جاؤں بڑا انہوں نے تو اپنی طرف سے بڑا چھانٹ کر لڑکا چنا تھا بڑا کبھی تھیں مجھے کہ عیش کرو گی عیش.....“ شافہ کی بات کا سنتے ہوئے ابا جان نے کہا۔

”لیکن بیٹا یہ تو بتاؤ کہ اصل بات کیا ہے۔ اس نے ایسا کیا کہہ دیا ہے کہ موصوف کی اتنی ساری خوبیاں بغیر سانس لیے ہی گنوائے جا رہی ہو۔“ ابا جی عصر کی نماز

”امی دیکھ لیا آپ نے اپنے اچھے اور بہت اچھے داماد کا حال جس کی تعریفیں کرتے ہوئے آپ ہلکی نہیں تھیں۔“ اس نے اپنے پلو سے غم آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے ماں سے شکوہ کیا تھا۔

”ارے آپ اب بس بھی کرو اب چپ ہو جاؤ امی کا پہلے ہی بلڈ پریشر بہت ہائی ہے۔“ مدحیہ نے شافہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کے آنسو پونچھے تھے۔



ایک نظر دیکھ لینے کے خیال سے ہی چند قدم آگے بڑھائے تھے جو قدموں تلے سے زمین سر کی تھی۔ بہت دہل کر وہ اٹھنے قدموں واپس چلی۔

”کوئی ہے احمر!“ ایک نسوانی آواز اسے سنائی دی۔

”ارے کوئی نہیں، تمہارا وہم ہے!“ احمر کی آواز میں بڑا خفا تھا۔

جیلہ کو پلٹ کر دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور نہ اس نے دیکھا۔ سبز جیوں کو کتنی تیزی سے وہ طے کر سکتی تھی اس نے کی پھر بھی آخری سے چند میٹر میز اس کا پاؤں بری طرح پھسلا۔ گلابوں سے بھری ٹوکری الٹ کر میز جیوں پر اور نیچے فرش پر پھیل گئی تو وہ بے بس ہو کر وہیں بیٹھ گئی۔ ٹھنڈوں میں منہ چھپا کر اس نے خود کو کمپوز کرنے کی پوری ہمت کے ساتھ کوشش کی مگر آنسو بڑی روانی کے ساتھ اس کے چہرے کو تر کرتے رہے۔

چند لمحے یونہی خاموشی کے ساتھ دل پر سے ہوتے گزرے بھی اسے لگا جیسے کوئی اس کے دامن بائیں آ کر بیٹھا ہے، جیلہ نے آہستہ سے سر اٹھایا۔ بالکل سامنے قد آدم آئینہ لگا ہوا تھا جس میں اس کا عکس دکھائی دے رہا تھا مگر یہاں وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ شالی اور نگینہ بھی تھیں۔ وہ چپ چاپ سامنے دکھائی دیتے اس عکس کو دیکھنے لگی جہاں وہ تینوں ایک ساتھ موجود تھیں۔ شلٹ کے تین زاویوں کی طرح الگ الگ بھی اور ایک دوسرے سے جڑی ہوئی بھی۔

”کیا ہے تقدیر کا مجید بھاء؟ اس نے ایک گہری سانس کھینچی اپنے اپنے اربانوں کی راہ پر پیچھی وہ تینوں تنی ایک ہی لگتی ہیں۔ جیلہ نے ایک اور حیرت بھری نگاہ سامنے والے شے پر ڈالی۔

کتنی مماثلت..... اور وہ خود تنی بڑی اہم تھی کہ مرد کی ذات کو پہچانے بغیر اپنے آپ کو دوسروں سے ”الگ“ سمجھنے کا ذمہ لے لیتی تھی۔ ایک دم ہی اس کا دل چاہنے لگا کہ وہ شالی اور نگینہ کو سامنے والے شے سے نکال کر گلے سے لپٹائے۔

میں تمہیں!“ صدف خفا ہونے لگی اور پھر میلا دی محفل کا خیال آیا تو فوراً ہی خاموش بھی ہو گئی۔ جیلہ اس با برکت محفل سے تقریباً گم ہی رہی، بار بار درود شریف پڑھتے ہوئے وہ اس درس کی طرف پورا دھیان دینے کی کوشش کرتی جو بڑے موثر انداز میں دیا جا رہا تھا مگر سارا دھیان اس لڑکی کی طرف جا رہا تھا جو احمر کے ساتھ بہت قریب ہو کر کھڑی تھی اور ایک بار بھی یہاں آ کر نہیں بیٹھی تھی جب کہ اس کے ساتھ آئی دوسری لڑکیوں کو وہ یہاں مستقل موجود دیکھ رہی تھی۔ پچھو، ان کی بیٹیاں بھی جب یہاں تھیں تو آخر وہ کہاں تھیں۔

”کیا بات ہے؟“ صدف نے اسے بے چینی سے پہلو دے لیتے دیکھ کر سرگوشی میں پوچھ ہی لیا۔

”کچھ نہیں، میں ذرا پانی پی کر آتی ہوں۔“ وہ اٹھ کر شامیانے سے باہر آئے لگی بھی پچھو تیزی سے اٹھ کر اس کے پاس آئیں۔

”جیلہ، اوپر میرے کمرے میں سے گلاب کے پھولوں والا تھا تو اٹھا لاؤ بانٹنے کے لیے، یہ لڑکیاں تو بس بیٹھ ہی گئیں تیار ہو کر بیٹھ کر!“

”جی اچھا! اس نے ایک خاموش سی نگاہ پچھو کی تینوں بیٹیوں پر ڈالی جو بطور خاص پڑھنے والیوں کے دائیں بائیں بیٹھ چکی تھیں۔

اس نئے گھر کے تینوں بیڈ رومز اوپر تھے، میز جیوں کے طے کر کے پچھو کے کمرے سے گلاب کے پھولوں سے بھری کین کی باسکٹ اٹھانے میں اسے چند منٹ ہی لگے، اوپر لی لاونج میں صرف سیٹ لائٹس ہی جل رہی تھیں۔ سوتا جاگتا یہ ماحول اتنا دلکش تو ضرور تھا کہ اسے چند لمحوں کے لیے رک کر سہا لیا جاتا۔ جیلہ کے بھی قدم میز جیوں کی طرف بڑھتے بڑھتے رکے تھے بھی اسے جیسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس نے ادھر ادھر دیکھا، لاونج حقیقتاً خالی ہی تھا پر دوسری طرف آخری دروازہ نیم وا تھا۔

”معلوم نہیں یہ کس کا کمرہ ہے۔ لڑکیوں کا یا احمر کا!“ اس نے یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے محض



پڑھ کر گھر آئے تو شافہ کے گلے شکوے سن کر اس کے قریب ہی بیٹھ گئے تھے۔

”کیا بتاؤں اباجی، عادل نے اس شرط پر مجھے گھر بھیجا ہے کہ جب تک میں آپ سے عیدی کے طور پر ایک ہٹا سکا ٹکڑا سا بکرا نہیں لاتی وہ مجھے لینے نہیں آئے گا۔ اب آپ بتائیں یہ کوئی تک ہے۔ آج کے اس مہنگائی کے دور میں بکرا خریدنا کوئی آسان تھوڑی ہے۔ دس ہزار تک کا تو مریل سا بکرا ملتا ہے پھر آپ کیسے اس کی نگلڑے سے بکرے کی فرمائش پوری کریں گے۔ لوگ ایسے موقع اور تہواروں پر روٹھے ہوؤں کو منا کر گھر واپس لاتے ہیں اور اس نئی القلب آدمی نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔“ وہ پھر رونے لگی تھی۔

”عادل ایسا تو نہیں ہے، بات واقعی پریشانی والی تھی۔ مرزا صاحب کے ماتھے پر بھی پریشانی اور فکرات کی لکیریں ابھرنے لگی تھیں۔ عذرا بیگم شوہر کی پریشان صورت اور بیٹی کے آنسوئیں دیکھ سکتی تھیں وہ سخت سے اتر کر چل گھٹینے ہوئے باورچی خانے میں چلی گئیں۔“

”میں اس سے بات کرتا ہوں۔ وہ میرے لیے غیر تھوڑی ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کا سر ایک ایماندار فیکٹری در کر رہے اور مینے بھر کی سرتوڑ محنت کے بعد جو چھ سات ہزار مجھے ملتے ہیں وہ چار بچوں کے بڑھنے اور گھر کے اخراجات پر اٹھ جاتے ہیں اگر میری اتنی استطاعت ہو تو کیا میں ہر سال قربانی سے محروم رہ جاؤں۔ میں خود قربانی نہ کروں۔“ وہ عادل سے بات کرنے کا ارادہ کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

”رہنے دیں اباجی، بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ سب باتیں میں نے اس سے کی تھیں اور پھر وہ خود بھی تو ہمارے حالات جانتا ہی ہے تا لیکن اس نے میری کوئی نہیں سنی اور مجھے یہاں بھیج دیا۔ اباجی وہ بکرا ہا تھا اس کے یار دوست اور ملنے ملائے والے کھاتے پیتے لوگ ہیں اور سب لوگ قربانی کریں گے۔ ایسے میں ہمارا بکرا نہ خریدنا بہت شرمندگی کا باعث ہے اور آپ کو تو پتا ہے کہ آپ کا داماد کتنا شاہ خرچ ہے۔ شک ہم دونوں عیاں بیوی آٹھ نو ہزار میں اچھی طرح گزارہ کر

سکتے ہیں بلکہ بچت بھی کر سکتے ہیں لیکن اسے کسی نے بچت کرنے کی عادت ڈالی ہو تب نا۔ جب وقت بے وقت ہوٹلوں میں کھانے کھائے جائیں گے۔ یار دوستوں کی ضیافتیں کی جائیں گی تو پھر آٹھ نو ہزار کی کیا اوقات پچاس ہزار بھی کم پڑ جاتے ہیں۔“ شافہ نے کہا۔

”لا حول ولا قوۃ کیا زمانہ آ گیا ہے، یار دوست رشوت کے مال سے پلے پلائے بکرے خرید رہے ہیں تو اسے بھی بکرا چاہیے، چاہے کسی بھی ذریعے سے۔ اس کا مطلب ہے قربانی خدا کی راہ میں دینے کی نیت سے نہیں کی جاتی بلکہ لوگوں کو دکھانے اور اپنا اسٹیٹس بڑھانے کے لیے کی جاتی ہے۔ تو یہ تو بہ خدا پاک ایسے خیال اور نیت سے دور ہی رکھے۔“ وہ اس مسئلے کا حل سوچتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چل پڑے تھے۔

”اباجی اب میں کیا کروں؟“ شافہ نے پیچھے سے انہیں پکارا تھا۔ اس کی شادی کو ابھی عرصہ ہی کتنا ہوا تھا دو سال۔ وہ عید کا خوبصورت اور مقدس دن اپنے گھر میں اپنے شوہر کے ساتھ منانا چاہتی تھی۔ بے شک شوہر کیسا ہی مطلبی و خود غرض اور سنگ دل کیوں نہ ہو۔ ”کچھ کرتا ہوں۔“

وہ جھکے جھکے سے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے تھے۔

\*\*\*

دسمبر کا دوسرا ہفتہ تھا، نرم نرم سی دھوپ درو یوار کو آسودہ حرارت سے نواز رہی تھی۔ شافہ چھت پر پڑی چار پائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ اسے اپنے گھر سے آئے ہوئے پانچ دن ہو گئے تھے۔ عادل نے ابھی تک اس سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا گویا وہ ابھی تک اپنی بات پر ڈٹا ہوا تھا۔ اسے شادی کے ابتدائی دن یاد آ رہے تھے۔ ان دنوں کی اپنی اہمیت اور حسن ہوا کرتا ہے۔ شاید اس وقت فریقین پر ایک دوسرے کی خوبیاں ہی خوبیاں آشکار ہوئی ہیں۔ خامیوں پر دبیز پردہ پڑا ہوتا ہے جو بعد میں آہستہ آہستہ اترتا ہے۔ عادل بھی اس کے ساتھ بہت اچھا رہا تھا۔ وہ محبتوں اور رفاقتوں کا ترسا ہوا شخص تھا۔ شافہ نے اس کو پور پور آسودہ کر کے مکان کو گھر بنا دیا تھا۔ وہ بھی بہت



موج میں ہوتا تو اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر احسان مندی کے طور پر اس کا بے حد شکر گزار ہوتا کہ جس نے اس جیسے سیلابی شخص کو اپنی محبت کی زنجیروں میں باندھ دیا تھا۔ وہ دن بے حد اچھے تھے لیکن آج کل کے دن بہت بے کیف اور اداس کر دینے والے تھے۔ وہ اس کے والدین کی مالی حالت سے بخوبی آگاہ تھا پھر اس نے ایسا کیوں کیا۔ تیز دھوپ شافعی آنکھوں میں چھینے لگی تھی لیکن اسے اس سوال کا کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ اس نے اندازہ دینا منہ پر ڈال لیا اور آنے والی عید کے متعلق سوچنے لگی۔ جب تک عادل اس کی زندگی میں نہیں تھا تب اور بات تھی لیکن دو تین عیدیں اس کے سنگ منا لینے سے اسے لگنے لگا تھا کہ ان عیدوں کے تمام رنگ عادل کے ساتھ موجود ہیں۔

”آپا سوگئی ہو کیا؟“ مدیحہ اس سے دو سال چھوٹی تھی اور تھرڈ ایئر میں پڑھ رہی تھی۔ وہ دھلے کپڑوں کی بالٹی اٹھائے اوپر آئی تو اسے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”نہیں، اس وقت نیند کہاں آئے گی۔ بس دھوپ میں لینے سے سستی سی چھا گئی ہے۔ تم نے کپڑے دھو لیے، مجھے ملایا ہوتا۔“ مدیحہ کی آواز پر اس نے دو پٹا منہ سے اتار لیا تھا۔

”تم تو مہمان ہو آپا پھر میں تم سے کام کرواتی اچھی لگوں گی۔“ وہ ہنس کر کپڑے تار پر پھیلانے لگی تھی۔

”مہمان..... کیا خبر یہیں رہنا پڑ جائے۔“ وہ طنز بے انداز میں مسکرائی تھی۔

”کیوں، اللہ نہ کرے ورنہ لینا تم عید سے پہلے اپنے گھر چلی جاؤ گی۔ مایوس کیوں ہوئی ہو۔“ مدیحہ نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”لیکن کیسے، کیا ساتھ والے وحید صاحب کے گھر کے باہر بندھا ہوا موٹا سا کالا بکرا کھول کر لے جاؤں۔“ شافعی نے طنز کیا۔

”آپا بابت گئے تو ہیں پیسوں کا انتظام کرنے۔“ وہ کپڑے پھیلا کر اس کے پاس آ بیٹھی تھی۔

”پیسوں کا انتظام کرنے لیکن کہاں سے.....؟“

وہ چیخے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ ”ابھی تو ان کا بچھلا قرض نہیں اتر۔“ وحید صاحب کے دس ہزار جو پچھلے مہینے قرض لیے تھے وہ تو ابھی تک نہیں لوٹا سکے ہیں۔“ شافعی نے فکر مندی سے کہا۔

”وہ ان کا مسئلہ ہے، قرض آہستہ آہستہ اتر جائے گا اب تمہیں تو کسی نہ کسی طرح گھر بھیجنا ہی ہے۔“ ورنہ عادل بھائی کے ساتھ ساتھ لوگ بھی باتیں بنائے لگیں گے۔“ مدیحہ نے کہا۔

”مدیحہ کیا تمہیں نہیں لگتا کہ زندگی کس قدر مشکل ہے۔“ شافعی نے کہا۔

”آپا زندگی مشکل نہیں ہے بس اسے ہم لوگوں نے اپنے لیے مشکل بنا لیا ہے۔“ وہ ایک گہری بات کہہ کر سیڑھیاں اتر گئی تھی۔ باپ کی بے بسی پر شافعی کی آنکھوں میں نمی سی جھلکنا لگی تھی۔ وہ بیچ جانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے ایک بار پھر وہیں لیٹ گئی تھی اور خیالوں میں کھو گئی۔

\*\*\*

”آپا، یہ دیکھو میں نے تمہارا دو پٹا رنگا ہے کتنا اچھا لگ رہا ہے۔“ یہ سوکھ جانے کا تو اپنے ہاتھ سے اس پر گونا گونا رنگ لگا رہا ہے۔“ مدیحہ سرخ دو پٹا اس کے سامنے پھیلا کر اسے دکھانے لگی تھی۔

”ہاں، اچھا ہے۔“ وہ بے دلی سے بولی تھی۔ کئی عید تھی اور عید کی تیاریاں زور شور سے ہو رہی تھیں۔ ابا پیسوں کا انتظام نہیں کر سکے تھے جس کی وجہ سے وہ اب تک یہیں تھی۔ امی جان اور ابا بھی اس سے یوں آنکھیں چرائے پھر رہے تھے کہ جیسے اس کا گھر میں موجود ہونا ان کی وجہ سے ہو۔

”آپا شام کو چوڑیاں بننے چلیں گے۔“ مدیحہ دروازے تک جاتے جاتے پلٹی تھی۔ شاید اس کی عمر کا تقاضا تھا کہ وہ اتنی فکروں میں نہ پڑے۔ شافعی نے اس کا دل توڑنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

جوں جوں شام ہوتی جا رہی تھی باہر سے آتی پٹاخوں قہقہوں کی آوازیں اور روڑیوں میں آواز ہوتا جا رہا تھا لیکن شافعی عادل کے دل میں تاریکی بڑھتی جا

رہی تھی۔ خدا جی کو مجبور اور غریب بھی پیدا نہ کرے۔ کئی برس کے دل سے بے شکوہ ابھرا تا اور اس نے کئی بار خود ہی منہ سے معافی مانگی تھی۔

”آپا، آپا جلدی سے باہر آؤ۔ جلدی آؤ نا۔“ اس سال گڑیا اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولی تھی۔ اس سے پوچھا جا رہا تھا۔

”کیا ہے مدیحہ.....؟“ وہ دوپٹا درست کرتے کرتے ان کے ساتھ باہر آ گئی تھی۔

”عادل..... دل!“ اس نے آنکھیں مل کر اسے بار بار دیکھا تھا کہ کہیں وہ کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی ہے۔

”ہاں..... میں!“ وہ بکرے کی رسی مدیحہ کے ہاتھ میں تھا کہ اس کے قریب چلا آتا تھا۔

”لیکن..... یہ..... بکرا۔“ وہ الٹ الٹ کر بولی تھی۔

”یہ بھی میں لایا ہوں۔ ہم اس بار عید یہیں منائیں گے اور دل کر قربانی کریں گے۔“ عادل نے کہا۔

”دل..... لیکن.....“ وہ ابھی تک کچھ نہیں بھیجی تھی۔

”لیکن..... لیکن کچھ نہیں۔“ ادھر آؤ تمہیں بتاتا ہوں۔“ عادل بولا۔

”یہاں نہیں بیٹا، اندر جا کر آرام سے بیٹھو میں جانے لے کر آتی ہوں۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر صحن میں جی چار پانی پر بیٹھنے لگا تو امی جان نے اپنے اکلوتے داماد سے بڑے پیار سے کہا تھا۔

”تم جی جاؤ شافعی۔“ وہ اندر چلا گیا تھا جب کہ وہ ابھی تک کتے کی سی کیفیت میں وہیں کھڑی تھی۔ شافعی نے کن آنکھوں سے ابا جی کی طرف دیکھا جو مدیحہ کے ہاتھ سے بکرے کی رسی تھامے اسے ایک طرف لے کر چارے جارہے تھے۔ امی بھی کچن میں جا چکی تھیں۔

”ابھی لوگوں کے سامنے عادل کے پاس جاتے شرم نہ آئے گی۔“ میدان صاف دیکھ کر وہ عادل کے پاس چلی گئی تھی۔ اسے ابھی اصل معاملہ معلوم نہ تھا۔

”یہ کیوں لائے ہو، ہماری غریبی اور بے بسی کا مذاق اڑانے کے لیے.....؟“ وہ روٹھے ہوئے انداز میں اندر جا کر بولی تھی۔

”شافعی بلیر، مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہارا اور تمہارے گھر والوں کا دل دکھایا ہے۔ جب بڑی آپا کے سسرال سے بھی یہی تقاضا آیا کہ سسرال والے بکرا بھیجیں تو میری آنکھیں کھلیں کہ بری بات تو بری ہی ہوتی ہے۔“ عادل دھیسے لہجے میں بولا۔

”اگر چوت لگ کر تمہیں عقل آگئی تھی تو مجھے بلوا لیا ہوتا۔ یہاں کیوں آگئے ہو۔“ شافعی نے منہ پھلاتے ہوئے کہا۔

”کیا یہ میرا گھر نہیں ہے۔ ماموں بھی تو باپ کے برابر ہوتے ہیں۔“ عادل نے بھی ہلکا سا کھوکھو کیا تھا۔

”وہ تو ہیں۔“ وہ گڑ بڑا گئی تھی۔

”تو پھر ایسے کیوں کہہ رہی ہو۔ امی اور ابو بکرا لے کر تایا کے گھر گئے ہیں تاکہ بڑی آپا خوش ہو جائیں اور میں یہاں آ گیا۔“

”عادل تم نے مجھے بہت ستایا ہے۔“ دل پر تحریر کچھ گلے کھٹوے مٹے تو اپنا خیال آیا تھا۔

”مجھے پتا ہے اسی لیے تو اب تمہیں منانے آیا ہوں بمعہ بکرا۔“ وہ شوخ ہوا تھا اور اپنی پُرشوق نظریں شافعی کے بیچ چرے پر نکال دی تھیں۔

”اب بھی نہ آتے۔“ وہ اس کی نظروں سے بچتے ہوئے منہ موڑ کر بولی تھی۔

”کیسے نہ آتا۔ لوگوں کو عید کا چاند آسمان پر دیکھنا تھا مجھے زمین پر..... وہی تو دیکھنے آیا ہوں۔“ اس نے اس کے کندھے پکڑ کر اپنی طرف گھما ڈالا تھا۔

”واہ جناب، بڑے عاشق بنے پھرتے ہیں۔ یہ نہیں پتا کہ اس عید کا چاند تو دس دن پہلے ہی نکل آیا ہے پھر آپ کو سنا چاند تلاش کرنے آئے ہیں۔“ اس کی نفرتی ہنسی نے عادل کی ساعتوں میں رس گھولا تھا۔

”مجھے تو بس ایک ہی چاند کی تلاش ہے۔“ اس نے ایک شوخ جسارت کی تھی۔

”میں اپنا بکرا دیکھنے جا رہی ہوں۔“ شافعی گھبرا کر باہر دوڑ گئی تھی۔ عادل نے صحت چھاؤ قہقہہ لگایا تھا

عید ایک روز پہلے ہی اس گھر کے درودیوار کو اپنی خوشبو سے مست کرنے لگی تھی۔

\*\*\*



# جب خوشبو نے تھا ماہاتھ

نورین ظفر خان



”آسمان جیسی گہری براؤن گول گول آنکھیں.....“ شاہ میر نے آنکھیں بند کر کے ایک جذب کے عالم میں کہا۔  
 ”تیرا دماغ تو ٹھیک ہے شاہ میر۔ یہ آسمان کا رنگ براؤن کب سے ہو گیا؟“ شاہ میر کے پہلے براؤن کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ شاہ میر سے استفسار کے ساتھ ساتھ اس نے آسمان کی طرف ایک نگاہ ڈال کر اطمینان کرتا چاہا اور اسے تسلی ہوئی کہ آسمان



ہمیشہ کی طرح صاف شفاف نیلے رنگ کا تھا۔  
 ”اس کے سفید بال اتنے نرم و ملائم ہیں جیسے کوئی  
 مٹلی کیل۔“ شاہ میر، آذری حیرتوں سے بے خبر کھڑی کا  
 پٹ تھا سے بدستور خوبانہ لہجے میں بولا تھا۔  
 ”سفید بال.....؟“ آذری نے ڈر لیا..... حیرت کا  
 شدید جھٹکا۔ ”کیا وہ کوئی ساٹھ سالہ لڑکی ہے؟“ اسے  
 شاہ میر کی بات ہنسنے لگی تھی۔ اب اتنا بڑا وقت بھی  
 نہیں آیا تھا کہ شاہ میر جیسا نوجوان پڑھا لکھا خوبصورت  
 بندہ ساٹھ سالہ بڑھیا سے محبت کرنے لگا ہے۔ اس نے  
 ایک ٹھنڈی آہ بھری واقعی محبت اندھی ہوئی ہے مگر اتنی  
 اندھی.....

”کل جب وہ سڑک کراس کر رہی تھی تو اچانک  
 ایک کار سامنے آگئی۔“ اس نے لہجے میں سنسن بھرا اور  
 یوں گویا ہوا جیسے وہ منظر سامنے ہو۔

”میں گیٹ پہ کھڑا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے پاؤں دوڑ  
 پڑا اور بھاگ کر اس کے نرم دنا زک و جود کو اپنی بانہوں  
 میں اٹھالیا۔“ شاہ میر بتا رہا تھا۔

”شاہ میر چپ کر جاؤ، اب میں ایک لفظ بھی  
 برداشت نہیں کروں گا تم تو بالکل ہی پاگل ہو گئے ہو یعنی  
 ایک لڑکی کو تم نے بانہوں میں اٹھالیا، آسان جیسی براڈن  
 آنٹھیں، سفید بال..... یہ سب کیا بکواس کیے جا رہے  
 ہو۔ اس کو تو چھوڑ دو تمہارے خوابوں کی شہزادی نہیں ہے  
 جسے تم تھامے کھڑے ہو۔“ آذری نے کھڑی کے پٹ  
 سے چپکے شاہ میر کو کھینچ کر سامنے کیا۔

”کیا مصیبت ہے؟“ شاہ میر اس طرح کھینچنے پر  
 چلا یا جیسے واقعی اسے خوابوں کی شہزادی سے الگ  
 کر دیا گیا ہو۔

”رہتی کہاں ہے وہ؟“ آذری کڑے تیور لے  
 ہوئے تھا۔

”آئی وہیہہ کے گھر۔“ وہ جھجکا کر صوفے پر  
 آ بیٹھا۔

”جہاں تک میری معلومات ہیں ان کے گھر میں  
 کوئی لڑکی نہیں ہے۔ اٹکل احمد اور آئی وہیہہ اکیلے ہی  
 رہتے ہیں۔“ آذری کا جیس کے مارے برا حال تھا۔

”لڑکی.....؟“ شاہ میر نے آذری کی ساری گفتگو  
 میں لفظ لڑکی پر حیرت سے آنکھیں پھیلایں۔ ”لڑکی کا  
 ذکر کس نے کیا؟“

”دیکھو شاہ میر مجھے غصہ آرہا ہے۔ تمہارے حق  
 میں یہی بہتر ہے کہ مجھے صاف صاف سیدھے الفاظ میں  
 بتا دو۔ ورنہ.....“ کہنے کے ساتھ اس نے ادھر  
 اُدھر نظر دوڑائی کس مناسب چیز کی تلاش میں جسے اختیار  
 کے طور پر استعمال کر کے مناسب کارروائی کر سکے۔ آخر  
 اس نے ٹیبل پر پڑا کرشل کا گلدان اٹھالیا، انداز بڑے  
 جارحانہ تھے۔ شاہ میر کو اس کے نشانے پر تو کچا بھروسہ تھا  
 کہ آج تک نشانے پر نہیں لگا تھا مگر اپنی قسمت کی طرف  
 سے پراسید نہیں تھا کیا بتا ہی جاتا لہذا فوراً صلیج جو  
 انداز اپنایا۔

”آذری میرے بھائی بقول تمہارے جس لڑکی کا  
 میں ذکر کر رہا ہوں وہ اصل میں لڑکی نہیں بلکہ آئی وہیہہ کی  
 خوبصورت سفید بلی ہے۔“ ٹھہر ٹھہر کر اصل قصہ بیان کیا  
 گیا۔ آذری کے تو پاؤں سے لگی سر پہ بھی والا کام ہوا مکمل  
 اس کے کے گلدان اسے دے مارتا شاہ میر ادھی آواز  
 میں چیخا۔

”دیکھو اگر یہ ٹوٹ گیا تو ماما مجھے اور جنہیں اس کی  
 گرجیوں سمیت باہر پھینک دیں گی۔“ آذری سے غصہ  
 ضبط کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ آئی کے ڈر سے اس نے  
 گلدان نہایت شرافت سے میز پر رکھ دیا تھا مگر صوفے  
 سے سارے کٹن سمیٹ لیے تھے۔ ”حق، مالائق،  
 گدھے جیسے القابات سے نوازنے کے ساتھ ساتھ وہ  
 کٹن شاہ میر کو مار رہا تھا جنہیں شاہ میر نہایت آرام سے  
 کچھ کر رہا تھا کیونکہ اس کی فیلڈنگ بہر حال آذری کی  
 باؤنٹنگ سے کہیں بہتر تھی۔

☆☆☆

”خاموش ہو جاؤ، اب ایک لفظ بھی نہ سے نکالنا تو  
 گلا دوں گا۔“ آذری کی کھیر کی دھاڑ دہاتی زور سے  
 بولا تھا نی ٹولی لیکن سہم کر رہ گئی۔ اس نے بھی تصویر کی  
 نہیں کیا تھا کہ اس کا دولہا اس روپ میں سامنے آئے  
 گا۔

”لیکن آپ بھی تو.....“ اس نے کزور لہجے میں  
 کہہ کر کہا چاہتا تھا کہ اس کے الفاظ ادھر سے ہی رہ گئے۔  
 ”خاموش ہو جاؤ کسی نے تمہیں شوہر کی عزت  
 کرنی نہیں سکھائی۔ آگے سے زبان چلائے جا رہی ہو۔

آرام سے جا کر بیٹھ کر بیٹھ جاؤ۔“ وہی غصیلہ لہجہ تھا۔  
 ٹیبل کی تیز آواز پر وہ چونکی۔۔۔۔۔ پھر ٹیبل ٹیبل پر  
 آواز فوراً گیٹ کی طرف پھیل گئی۔ دیکھنے میں اس قدر  
 شگفتہ تھی کہ دروازہ بچنے کی خبر ہی نہیں ہوئی تھی اور اب  
 مسلسل بچتی ٹیبل نے اسے ہوش دلایا تھا۔

”آج تو شامت آئی۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے  
 بیٹ کھولا اور سامنے ٹھیکہ آئی کے چھوٹے بیٹے کاشی کو  
 دیکھ کر غصے سے کھول اٹھی۔

”کیا ہے؟“ اس نے کڑک کر پوچھا۔ کاشی نے  
 غصے سے لال ہوئی نہ یا کو دیکھا ضرور مگر ڈرا بالکل نہیں تھا  
 کیونکہ اب تو وہ اس کے مزاج کا عادی ہو چکا تھا۔ بھی  
 اتنی نرم خود ہو جاتی کہ اس کے لیے غایاں نکلاتی۔ اس  
 کے ساتھ کرکٹ بھی کھیل لیتی مگر کبھی بکھار تو اسے  
 پھانسنے سے بھی انکار کر دیتی اور ایسا تب ہوتا تھا جب  
 دادو جان سے عزت افزائی ہوتی تھی۔

”آئی، دادو جان نہیں آئیں ابھی۔“ اس کے  
 غصے سے بے پروا کاشی نے کٹے گیٹ سے اندر جھانکا۔  
 کاشی نے دادو جان کو لٹولانے کے لیے پیسے دے  
 رکھے تھے اس لیے لٹو کے حصول کے لیے وہ تیسری  
 رتبہ پر کرنے آیا تھا۔

”نہیں آئیں ابھی، جب آئیں گی تو دوبارے  
 بازار سے لوں گی۔“ خبردار جواب دروازہ بجایا۔ ”کہنے  
 کے ساتھ اس نے دھڑ سے دروازہ بند کیا اور پھر لاؤنج  
 آگئی۔ ناول لکھنے کے دوران کاشی نے اسے تین  
 بار ضرب کیا تھا اس لیے اس کا غصہ عروج پر پہنچ چکا  
 تھا۔ دادو اماں اور آئی صبح سے بازار گئی ہوئی تھیں اور  
 دادو جان کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر اس نے کاغذ  
 کو مسجیا تھا۔ اب ناول کا اختتام لکھ رہی تھی کہ کاشی  
 نے پھر دھڑبڑ کر دیا، لکھنے کا موڈ بالکل ختم ہو گیا تھا۔  
 اس نے سارے کاغذ سینے اور درواز میں ڈال

دیے۔ گھڑی پر نگاہ ڈالی ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔  
 ”دادو جان اور آئی اب آنے والی ہی ہوں گی۔“  
 اس نے خود گلائی کی مگر دادو جان کے ذکر پر دل ایک دم  
 سے دھڑکا تھا۔ دادو جان شاید کچھ کرنے کو کہہ کر گئی تھیں  
 مگر وہ ”کچھ“ کیا تھا اسے سرے سے یاد ہی نہیں تھا۔  
 ذہن پر بہت زور دینے کے باوجود ناکامی ہوئی۔ اس  
 نے فوراً لیجن کی راہ لی کہ شاید وہاں یاد آجائے۔

”کیا کروں؟“ بے بسی سے خود سے سوال کیا۔  
 ”دادو جان نے کیا کرنے کو کہا تھا۔“ ڈائمنڈنگ  
 ٹیبل کی کرسی پر بیٹھ کر سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس  
 نے پھر سے یاد کرنے کی کوشش کی۔ اصل میں جب دادو  
 جان نے کام بتائے تھے وہ اس وقت ذہن میں ناول کا  
 پلاٹ ترتیب دے رہی تھی اس لیے سن کر سمجھ ہی نہیں پائی  
 تھی۔

”آٹا گوندھ لیتی ہوں۔“ چٹکی بجاتے ہوئے اٹھ  
 کھڑی ہوئی۔ آٹا گوندھ کر فریج میں رکھنے کے لیے فریج  
 کھولا تو وہاں سفید پیلا پہلے سے موجود تھا۔ پلیٹ ہٹا کر  
 اس نے دیکھا تو اپنا سر پیٹ لینے کو بجی چاہا۔ صبح کا بیجا ہوا  
 آٹا بھی کافی سارا پڑا تھا اور اس نے بھی اب بڑے کھلے  
 دل سے گوندھ لیا تھا۔ ٹیبل کی تیز آواز پر وہ چونکی پیالے کو  
 فریج میں چٹا اور دروازے کی طرف چل دی۔ اب کی  
 بار دادو جان اور آئی تھیں۔ متوقع بے عزتی کا خیال اسے  
 ڈرا رہا تھا۔

”اُف خدا یا بہت گرمی ہے۔“ دادو جان اندر کی  
 طرف جاتے ہوئے پولیس گیٹ بند کر کے وہ ڈھیلے  
 قدموں سے اندر آئی تھی۔ آئی چادر اتار کر دو پٹالے چکی  
 تھیں گرمی سے ان کا چہرہ دھک رہا تھا۔

”نندیا بیٹا، ذرا پانی تو پلانا۔“ دادو جان نے کہا۔  
 ”آئی کیا، کیا لائیں ہیں؟“ دادو جان کو گلاس  
 تھماتے ہوئے وہ آئی کے پاس آ بیٹھی جو شاہ پر زین  
 چیزیں چیک کر رہی تھیں۔

”یہ دیکھ لو، میں ذرا لیجن میں چیزیں سیٹ  
 کر لوں۔“ انہوں نے تین شاہ پر اس کے آگے کیے اور  
 باقی دو ہاتھ میں لے کر لیجن کی طرف چل پڑیں جن



میں جھٹے بھر کا سودا تھا۔ دالیں، گوشت، بیسن اور اٹلے وغیرہ۔

”نڈیا اپنے اباں ویسے ہیں؟“ پکن کے دروازے پہ رک کر آئی ہے پوچھا۔

”اوہ! خدایا تو اپنے اباں لے تھے، پیاز کاٹنی تھی“

لبسن نہیں کر رکھا تھا اور کاشی سے وہی منگوانا تھی۔“

چنوں کے ساتھ ہی ساری لسٹ یاد آگئی۔ آئی کے ساتھ ساتھ دادو جان کی سوالیہ نگاہیں بھی اس پر آئیں۔

”جی آئی، میں نے دو لفظ بڑی مشکل سے ادا کیے اور آئی کے پیچھے ہی پکن میں آگئی۔ وہ شاپرٹیل پر رکھ کر چنوں کی تلاش میں نگاہ دوڑا رہی تھیں۔

”آئی۔ وہ اصل میں، میں ناول لکھ رہی تھی ناں تو مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ آج چاول پکانے ہیں۔“ نڈیا

روانی سے مگر بہت آہستہ آواز میں بولی مبادادادو جان نہ سن لیں۔

”تو..... اس کی خاموشی پر اٹلے فرخج میں رکھتے ہوئے آئی نے مڑ کر پوچھا۔

”تو یہ کہ میں نے چنے نہیں ابا لے۔“ نڈیا نے انگلیاں چٹائی آواز آہستہ تھی۔ اور ”پیاز بھی نہیں

کاٹی۔“ ایک توقف کے بعد پھر بولی۔ ”اور وہی بھی نہیں منگوا“ آخر بات پوری ہو گئی تھی۔ اس کے انداز پر آئی

بشکل اپنی ہنسی روک پائی تھیں۔

”نڈیا، بہت بری بات ہے اگر دادو جان کو معلوم ہو جائے تو خوب ڈانٹ پڑے۔ پھر تم فٹ سے رونے

لگ جاتی ہو۔ اب تم بچی نہیں رہی ہو۔“ انہوں نے سنجیدہ لہجہ اپنایا۔

”سودی آئی، مجھے بالکل یاد نہیں رہا۔ آپ دادو جان کو نہیں بتائیں گی نا.....!“ اس نے لاڈ سے ان کے

گلے میں ہاتھیں ڈال دیں۔

”اچھا، اچھا اب چلو۔ پیاز کاٹو بہت دیر ہو گئی ہے۔“ آئی بولیں۔

☆☆☆

”کہاں تک سونگے کہاں تک سناؤں“

”ہزاروں ہی بے عزتیاں ہوئیں کیا کیا بتاؤں“

وہ بڑے سر میں تان سین بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک مصرعہ ہی گایا تھا کہ آڈرنے دوسرا مصرعہ بڑی روانی سے کہہ ڈالا۔ شاہ میر نے تان ٹوٹنے پر آڈر کو کھڑک کر دیکھا یہ اور بات ہے کہ ہمیشہ کی طرح اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

”کیا آواز میں درد پایا ہے میر درد صاحب۔“

آڈرنے اس کے نام کے لاشعے سے فائدہ اٹھایا اور اس کی سر میں درد کرنے والی آواز کی تعریف کی۔

”داستانِ حیات جب غموں سے بھری بڑی ہو تو درد آ ہی جاتا ہے۔“ وہ یوں بولا جیسے دنیا کا دھڑی ترین شخص وہی ہو۔

”بہتر ہو گا کہ آپ اپنے درد کو اپنے تنک

محدور کھیں برائے مہربانی اسے دوسری کی ساتوں میں مت اٹھ لیں۔“ اب اس نے واضح تعریف کی تو شاہ

میر تپ کر پلٹا۔

”ابھائی بد ذوق آدمی ہو تم۔“ اسے اپنی مدد

سراپی پسند نہیں آئی تھی۔

”یقیناً جس کا دوست تم جیسا ہو وہ آدمی بد ذوق ہی ہو سکتا ہے۔“ اس کا جواب شاہ میر..... کے لیے

نازیانہ ثابت ہوا۔

”کہاں ہو تم چلے آؤ محبت کا تقاضا ہے“ شاہ میر

گنگٹایا۔

”بے عزت ہو گئے تم۔ ہمارا اندازہ ہے“

اس نے ایک بار پھر اپنی آواز کا جادو سمجھنا چاہا

مگر اب کی بار بھی آڈرنے اس کی خواہش کا گلا گھونٹ دیا تھا۔

”یار تجھے تکلیف کیا ہے آخر یہ شاہ میر بھلا لے ہوئے بولا۔

”جس کا دوست تم جیسا ہوا۔“ تکلیف ہو گئی ہے۔“ آڈرنے ایک بار پھر غصہ کیا۔

”نہیک ہے تو پھر میں چارہ ہوں خبردار جو مجھے روکا۔“ وہ فوراً کھڑا ہوا تھا انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہا ہو

روکنا ہے تو روک لو۔

”اللہ حافظ۔“ آڈر بھی کہاں کہ تھا۔ رخصتی کے

الفاظ آہ ڈالنے میں دیر نہ کی۔

”یار شرم آئی چاہیے تجھے کتاب لکھا، بد عقل واقع

ہو ہے تو.....“ شاہ میر پھر سے پلٹا تھا۔

”تشریف رکھیے جناب ذی وقار، عقل ناپائیدار

صاحب میں آپ کے لیے چائے بناتا ہوں۔“ اس نے

شاہ میر کا بازو پکڑ کر صوفے پر بیٹھایا اور خود پکن کی راہ لی۔

اب چائے ہی شاہ میر کے موزوں بہتر کر سکتی تھی۔

”وہ خوش جو ہم سے روٹھ گیا اب اس کا حال سنا لیا“

آڈر چائے لے کر لاؤنج میں آیا تو اس کا ریکارڈ

پھر سے بج رہا تھا۔ فریدہ خاتون کی آواز کو پہچان کر تا وہ

مخش کے دکھ سے گارہا تھا۔ اس بار آڈرنے اس کو

چھیننے کی غلطی نہیں کی تھی ورنہ نتیجے کے طور پر ایک

پانی چائے اور بنانی پڑتی۔ راگ کا اختتام ایک آہ پر

کر کے اس نے چائے کا گھونٹ لیا۔

”یار، یہ آج اتنی عجب اور ٹھنڈی آہیں کیوں

تمہارے دل ناداں سے نکل رہی ہیں؟“ آڈرنے اس

کی حالت زار کو دیکھتے ہوئے بڑے سنجیدہ لہجے میں سوال

کیا۔ جس کا جواب بڑا مہنگا پڑا تھا۔ شاہ میر تو تھا ہی اس

بات کا منتظر کہ اسے اپنی داستانِ حیات سنائے کاموں

میں جائے، کان تو وہ ہمیشہ ہی کھاتا تھا آج تو اس نے حد

ی کر دی۔

”دوست کیا بتاؤں۔ وہی پرانا مسئلہ ہے محبت

کا۔“ کہنے کے ساتھ ایک ٹھنڈی آہ پھر سے بھری۔

”غم کتنے خوش قسمت ہو آڈر! ایک دم ہیں۔

رمانے بھر کے طریقے آزما لیے مگر کوئی نصرتِ شہینہ، کوئی

س دلہہ، کوئی حسینہ شاد کٹ زلفوں والی یا ناگن

جیسے سیاہ من مل کھاتے بالوں والی ہم یہ مہربان نہیں ہوتی

اور یہ میر ا دل کم بخت بھی تو کسی شیار کے پراندے میں

بس اٹھا۔“ آڈر جو کہ صوفے پر بیٹھا تھا، نیم دراز

پر گیا۔ شاہ میر کی داستانِ غم شروع ہو چکی تھی اور

آر جاتا تھا کہ اس کا دورانیہ پندرہ میں منٹ سے کسی

بھر کم نہ ہو گا اور اتنی دیر بیٹھ کر جمائیاں لینے سے لینا

مکمل بہتر تھا۔

”میں تمہیں پوری نہیں سنائے لگا ہوں۔“ اسے

لینے دیکھ کر شاہ میر چڑ گیا۔

”دوست تم کسی رکھو صرف لینا ہوں، سوڈن گا

تھیں۔ تم اپنی بات جاری رکھو میں نہایت غور سے سن

رہا ہوں۔“ آڈرنے اسے تسلی دی۔

”ہاں، تو میں کہہ رہا تھا کہ محبت کرنے کا ہر فلی،

ڈرامائی کہانی کی طریقہ آزمایا مگر محبت نے تو گویا نہ ہونے

کی قسم کھائی ہے مگر میں نے بھی بہت نہیں ہاری۔ پہلے

دن کی طرح آج بھی اپنے قول پر قائم و دائم ہوں۔

ایک طریقہ اور ہے میرے ذہن میں۔“ شاہ میر بڑا

پر جوش تھا۔ آڈر جتنے آرام سے لینا ہوا تھا اس سے زیادہ

جلدی اٹھ بیٹھا۔

”اور ایک اور طریقہ کیا ہے؟“ آڈر نے جلدی

سے پوچھا کیوں کہ پرانے سارے طریقہ اسے ابھی

طرح یاد تھے جو شاہ میر نے آزمائے تھے۔ شروع میں تو

اس نے اخلاق کا یہ معیار اپنایا تھا کہ ہر کسی کے سامنے

مسکرائیے کا اشتہار بن جاتا۔

”کوئی کام ہو تو ضرور بتائیے گا۔“ وہ مسکرا کر

بڑے خوبصورت انداز میں لڑکیوں سے کہتا..... ساتھ

میں ان کی والدہ محترمہ کو بھی اپنی خدمات پیش کرتا نتیجہ یہ

نکلا کہ ہر طرف شاہ میر کی پکار پڑنے لگی تھی۔ کسی لڑکی کو

رسالہ منگوانا ہوتا تو شاہ میر حاضر، کسی آئی کو کبزی منگوانی

ہوتی تو شاہ میر حاضر۔ صبح شام کے چکروں میں وہ محض

چکر میں کردہ گیا بھر سے ڈانٹ الگ اور جب لڑکیوں

نے اس کی آرزوؤں کے خلاف شاہ میر بھائی پکارنا

شروع کیا تو اس نے لالچ و لاکھ کر مسکراتے دانتوں پر

تختی سے خول چڑھا لیا اور لوگوں میں کسی حد تک مغرور

مشہور ہو گیا۔ اس کا نتیجہ بھی کچھ اچھا نہیں نکلا لڑکیاں اس

سے کئی کڑا کر نکل جاتیں۔

آخر اس نے محبت کی تلاش کا ایک اور طریقہ

آزمایا۔ اس کے خیال میں آدھی محبتیں شادیوں میں قائم

ہوتی ہیں لہذا اس نے شادیوں میں جانا شروع کر دیا

مگر وہاں بھی کچھ خاص بات نہیں بنی۔ مہندی، ہارات پر

لڑکیاں اس جج دج سے تیار ہوتیں کہ اسے ہلڑکی اپنی

محبوبہ نظر آنے لگی مگر چہرہ وحل جانے کے بعد وہ پہچان



ہی نہیں پلا کہ کون ہے۔ دوسرا نقصان یہ بھی ہوا کہ شادی کے گھر میں گھسے ہی اس کی والدہ محترمہ کو اپنے بیٹے کے سر پر سہرا باندھنے کا شوق ابا ل کی طرح اٹھتا اور پھر کئی روز تک وہ یہی موضوع لیے رہتیں۔

”طریقہ یہ ہے کہ اس بار میں کسی جبر کا رآدی سے مشورہ لوں گا۔“ شاہ میر بولا۔

”تم نے محبت کرنی ہے کہ مٹھائی کی دکان کھولنی ہے۔“ آذر اس کی بے تکلیف بات پر مسکرایا۔

”وہیے یار آج تو تم مجھے بتا دو، ترس کھا لو مجھ پر اور اپنی محبت کی پر سوز داستان سنا دو شاید اس میں ہی مجھے بھی کوئی کلیو مل جائے۔“ آذر کی بات نظر انداز کر کے وہ اس کے سر ہو گیا۔

”چھوڑو یار.....“ آذر کا لہجہ آذر وہ سا ہو گیا۔

”چھوڑنا تو میں ہوں اور اتنی لمبی کہ سینیٹی مشکل ہو جاتی ہے مگر آج تمہیں نہیں چھوڑ سکتا کیونکہ اگر تمہیں چھوڑ دیا جائے تو میں بے محبت رہ جاؤں گا اور کبھی بڑا نہیں ہو سکتا گا۔“ شاہ میر بولا۔

”یار بھی تو ٹھیک اردو بول لیا کرو۔“ آذر نے اس کے لفظ بے محبت پر ٹوکا۔

”اور ویسے میری محبت میں تمہارت بڑے ہونے کا کون سا پہلو لگتا ہے؟“ آذر نے حیرت سے پوچھا۔

”پہلو تو کیا پورا وجود لگتا ہے۔ تم مجھ سے آٹھ سال بڑے ہو، محبت کیے ہوئے تمہیں زیادہ نہیں تو چھ سال تو ہو گئے ہوں گے۔ تم صبح فجر پر رکھتے ہو، ذرا اپنے دوست کو بھی مستفید ہونے کا موقع دو۔ پلیز یار بس تم مجھے وہ جگہ بتا دو جہاں تمہیں کسی خوبصورت لڑکی سے محبت ہوئی تھی۔“ شاہ میر منت پر اتر آیا تھا اور باقاعدہ آذر کے گھنٹہ دبانے لگا۔

”بہتر مرشد مجھے اپنا مرید بنالیں ورنہ میں بے فیض و بے شری ہوں اس دایر فانی سے کوچ کر پاؤں گا۔“ میر مرشد میرے والد بزرگوار کی نسل پر رحم نہ کریں۔ میری آنے والی نسل پر ترس کھائیں اور اپنے اس حقیر پر نصیحت مرید کو اس عظیم شرمندگی سے بچالیں جو اسے اپنی اولاد کے سامنے اٹھانی پڑے گی۔“ آذر کے گھنٹوں پر سر

رکھے وہ ایسے بول رہا تھا جیسے کوئی مرید اپنے جبر سے دعا کروا رہا ہے۔

”شاہ میر تم تو بالکل پاگل ہو گئے ہو۔“ آذر اس کے انداز پر بولکھٹا گیا۔

”پاگل نہ کہو مجھے دیوانہ نہ کہو۔“ وہ لہک کر کہا شروع ہوا ہی تھا کہ فون کی تیز بیل نے اسے خاموش ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ وہ کینڈہ تو نظروں سے ٹپکی فون کو گھورنے لگا جب کہ آذر فون سننے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”ہیلو، السلام علیکم آئی۔“ وہ آواز پہچان کر بولا۔

”جی میں بالکل خیریت سے ہوں۔ شاہ میر میرے پاس ہی ہے، جی اچھا میں اسے بھیجتا ہوں۔ جی بالکل۔ اللہ حافظ۔“

”بچہ کیا شادی پیغام۔“ آذر فون رکھ کر پلٹا ہی تھا کہ شاہ میر تنک کر بولا۔ ”شہزادہ عالم کی ڈھنڈا بچ گئی ہوگی۔ ملکہ صاحبہ کو اپنے اکھوتے سب جیسے لعل کی یاد ستانے لگی ہوگی۔ خدام کو شہزادہ عالم کی بازیافت کے لیے دوڑا دیا گیا ہوگا۔“ وہ تن فون کرتا بول رہا تھا کہ آذر کی ہنسی چھوٹ گئی۔

”ہنس لے بیٹا ہنس لے۔“ شاہ میر، آذر کی ہنسی پر مزید چڑ گیا۔ آذر کے ہال آئے ہوئے ابھی اسے آدھا کھٹکھٹا ہی ہوا تھا اتنی جلدی واپس بلائے جانے پر وہ تپ گیا تھا اصل غصہ تو اسے اپنی اتنی ضروری بات کے ادھورے رہ جانے پر تھا۔

”اچھا اب زیادہ گرم مت ہو اور گھر کی راہ لو۔“ آذر نے تنک آنکھوں پر جمایا۔

”ایسے تو میں نہیں جاؤں گا۔“ شاہ میر جو کھڑا تھا آذر کی بات سن کر دھم سے صوفے پر گر گیا۔

”ایسے تو تم واقعی نہیں جاؤ گے جب تک میں خود تمہیں باہر کی راہ نہ دکھا دوں۔“ آذر کہتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔

”خبردار جو مجھے ہاتھ لگایا۔“ شاہ میر کے ایک دم چپخٹے پر وہ ٹھٹک کر رک گیا۔

”کیوں تم نے چلا کاٹ لیا ہے اپنے گرد کہ تمہیں

آخہ لگانے سے میں پتھر کا ہو جاؤں گا۔“ آذر اسے چبھتے ہوئے بولا۔

”چلے تو اب شروع ہوگا۔ جب تک مجھے یہ نہیں جاؤ گے کہ سینی سے کہاں ملے تھے میں نہیں جاؤں گا۔“ وہ مزید صوفے پر پھیل گیا تھا۔

”ارے یار میں کوئی بھاگا جا رہا ہوں پھر کبھی آرام سے بات کر لیں گے۔“ آذر نے ٹاننا چاہا۔

”تم تو بھاگے نہیں جا رہے مگر میری عمر بھاگی جا رہی ہے بقول والدہ محترمہ میری عمر کے لڑکے دو، دو بچوں کے والد محترم بن چکے ہیں۔ ویسے آذر تمہارے گھنٹے بچے ہیں؟ تم تو مجھ سے آٹھ سال بڑے ہو۔ کم از کم آٹھ بچے تو ضرور ہونے چاہئیں اور خدا زیادہ مہربان ہوا ہو یعنی ایک سال میں ڈیڑھ لکھ ملا ہو تو دس بھی ہو سکتے ہیں، ہیں ناں؟“ وہ شرارت سے بولا۔

”شاہ میر تم بہت بدتمیز ہو گئے ہو ٹھیک کہتی ہیں آئی تمہاری شادی کر دینی چاہیے۔“ آذر اس کی بات پر جھنجھکیا تھا سو اپنی جھنجھکی کو مٹانے کے لیے بولا۔

”یہ کیا بات ہوئی۔ جب تک بدتمیز نہ ہوں جب تک شادی نہیں ہو سکتی۔“ شاہ میر بڑی حیرت سے بولا تھا۔

”ویسے میں آج ڈیڑی سے پوچھوں گا کہ وہ کس عمر میں بدتمیز ہوئے تھے کہ دادا جان کو ان کی شادی کا خیال آ گیا لیکن آذر اگر بندہ شادی کے بعد اور بدتمیز ہو جائے تو کیا اسے شادی کرتے رہنا چاہیے؟“

شاہ میر کی زبان فینچی کی طرح چل پڑی تھی وہ بڑی راز داری سے آذر سے پوچھ رہا تھا۔

”اوہ میرے خدا۔“ آذر نے سر ہاتھوں میں تھام لیا۔ ”تم اپنی ان فضول شخص ہو۔“

”دیکھو منتر تم مجھے اصل مقصد سے ہٹا رہے ہو۔“

”سے سیدی طرح بتا دو..... ورنہ..... ورنہ۔“ اس نے پھر سے کے تاثرات کو خوف ناک بنانے کی ناکام کوشش کی۔

”ورنہ کیا.....؟“ آذر نے ڈرنے کے بجائے ٹھٹک کر پوچھا۔

”ورنہ یہ کہ میں پھر سے بیٹھ جاؤں گا۔“ دھمکی

کو بے اثر ہوتا دیکھ کر وہ نہایت معصومیت سے کہتا ہوا پھر سے بیٹھ گیا تھا۔

”نہ جاؤ تمہاری مرضی ویسے آئی بتا رہی تھیں کہ انکل بھی آپٹے ہیں۔“ اس نے بطور خاص انکل کا ذکر کیا۔

”تو پھر.....؟“ شاہ میر بھی آج ہر ذرے سے آزاد تھا۔

”بہت ڈھیٹ ہو تم.....“ آذر غصے سے بولا۔

”ڈھیٹ نہیں ابن ڈھیٹ ہوں۔“ خیال آنے پر اس نے زبان دانتوں تلے دبا لی۔ ”میرا مطلب تھا ابی ڈھیٹ۔ دیکھو آذر کھانے کا ٹائم ہو رہا ہے اگر تم خرچ سے بچنا چاہتے ہو تو منہ کھولو ورنہ تنہا کے ڈٹے دار تم خود ہو گے۔“ شاہ میر نے کہا۔

”یہ لو.....“ آذر بھی کہاں کہ تھا کہنے کے ساتھ ہی اس نے منہ کھول کر اس کے سامنے کر دیا۔

”اب تم پٹو گے مجھ سے؟“ آذر کے انداز پر اس نے غصے سے کش اٹھا لیا اس سے پہلے کہ وہ حملہ کرنا فون بچا اٹھا آذر نے منہ خیر مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائی۔

”دیکھو اگر عزت پیاری ہے تو فوراً انکو یہاں سے ورنہ انکل خود آ رہے ہیں۔“ فون سن کر وہ اس کی طرف پلٹا۔

”میری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تم اگر مجھے بتا دو تو میں ابھی چلا جاتا ہوں۔“ وہ بھی اپنے نام کا ایک ہی تھا۔

”یونیورسٹی میں.....“ آذر نے یوں کہا تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ نہ لیا اب جاؤ دفع ہو جاؤ۔

”یونیورسٹی.....“ شاہ میر نے جوش سے ڈہرایا۔

”باقی کل سہی“ کہتا ہوا وہ دروازے کی طرف بڑھا اور آذر نے سکون کا سانس لیا تھا۔

☆☆☆

”ندیا سو جی اچھی طرح بھونٹا۔“ کچی ہوئی تو حلوا صحیح نہیں بنے گا۔“ دادو جان نے ندیا کو ہدایت کی جو کڑا ہی میں سو جی ڈال رہی تھی۔ چہرے پر جھنجھلاہٹ اور نیزاری صاف رقم تھی۔

”کشمکش میں نے صاف کر دی ہے۔ تم کھوپرا،



بادام پارک کاٹ لیتا، دادو جان نے پیٹ اس کے پاس رکھی۔

بنائے کچن کے دروازے میں آکھڑا ہوا۔  
”سلام دادو۔“ اس نے مزید رونی صورت بنائی تھی۔

”کیا ہوا کاشی؟“ دادو کے جواب کے بعد ندیا نے کاشی سے پوچھا تھا۔ ”کیا آج پھر سے تم سے عزت کروائی ہے؟“ اس کی رونی شکل دیکھ کر اس نے شرارت سے چڑا یا اور جواب میں کاشی بچارہ کھائی سی ہنسی کر رہ گیا۔

”کیا ہوا ہے کاشی، ادھر آؤ“ اسے بدستور دروازے میں استادہ دیکھ کر دادو نے پیار سے بلایا۔  
”دادو کل میرا ٹیسٹ ہے میں نے ماما سے کہا تھا کہ مجھے تیاری کر ادس کر ملے بہت پیڑھے ہے۔“ وہ اندر آکر ان کے ساتھ ڈانگ ٹیبل کی کرسی بٹھ کر بیٹھ گیا۔

”ارے علی نے کیا بدبیزی کر دی؟“ دادو نے حیرت سے پوچھا بھلا چہ ماہ کا بچہ کیا بدبیزی کر سکتا تھا۔ ندیا بھی جواب سننے کے لیے ادھر متوجہ ہوئی۔

”مما جب بھی میرا کوئی کام کرنے لگتی ہیں یا مجھے پڑھانے لگتی ہیں علی صاحب فٹ سے شور مچا کر اپنی طرف بلا لیتے ہیں۔ عمر نے تو بھی ایسا نہیں کیا۔“ کاشی کا بوجھ شکایت سے بھرا ہوا تھا۔ حالاں کہ وہ اپنے جڑواں بھائیوں سے بہت محبت کرتا تھا۔

”ندیا آئی مجھے تیاری کر ادس گی ناں؟“  
اب کے اس نے ندیا کو مخاطب کیا۔ ندیا جو سوچی بھوننے کے بعد پانی اور چینی اس میں ڈال کر چھج ہلا رہی تھی نہایت بے دلی سے۔ کاشی کی آمد اسے بڑی خوشگوار لگی تھی۔ اسے گھٹ سے داخل ہوتا دیکھ کر ہی اسے ملوے سے جان چھوٹی نظر آتی تھی اور اب جو کاشی نے اس کے مطلب کی بات کی تو وہ جھٹ سے بولی۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔“  
”لیکن آپ تو کام کر رہی ہیں۔“ کاشی صوفیت سے بولا۔

”یہ۔ یہ تو دادو کر لیں گی۔ کیوں دادو؟“ کہنے کے ساتھ ہی اس نے دادو سے بھی پوچھا اور غلاب تو قی دادو فوراً مان بھی گئیں۔

”ہاں ٹھیک ہے، تم کاشی کو پڑھا دو میں دیکھ لیتی ہوں۔“ کہنے کے ساتھ وہ چوٹھے کے پاس آکھڑی ہوئی۔

”شکر۔ دادو۔“ چھج نہیں تھا کر خوشی سے بولی مسلسل وہ کاشی کو پڑھانے کی اجازت ملنا نہیں بلکہ اپنی ہنسی بوجھتا رہی۔  
”آؤ کاشی۔“ دادو کے گال پر چٹ سے پیار کر کے کاشی کو بلانے کے ساتھ ہی وہ محبت سے کچن سے برسی ماما دادو کا ارادہ بدل ہی نہ جانے۔

کاشی سرور سائیک اور بیٹ سیٹھالٹ اس کے پیچھے ہولیا۔ دونوں گھر کے پچھلے کچن میں آگئے جو کچن کم اور چھوٹا سا باغچہ زیادہ لگتا تھا۔ بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ بڑی کھار یوں میں جامن، آم، امرود، مالٹے کے درخت تھے۔ اس کے علاوہ لیموں کے پودے بھی تھے۔ اس کے علاوہ آبی کے پینڈہ پھولوں چٹیلی، گلاب کے پھول پودے کیاری میں ترتیب سے لگے تھے جو ہر موسم میں اپنی بہار دکھاتے تھے اور شام کے وقت ان کی خوشبو سے سارا گھر مہک اٹھتا تھا۔ سامنے کی دیوار کے پاس جامن کے بڑے سے درختوں کے درمیان ہارنگھار کی ٹیبل تھی جو اتنی جمیل چٹیلی کہ ایک بڑی سی چھتری کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ اس کی کچھ شاخیں جامن کی شاخوں سے جھمی لپٹی ہوئی تھیں اور جامن کا دامن بھی اس کے خوب صورت پھولوں سے بھرا رہتا تھا۔ یہ ٹیبل اور اس کے پیچھے کی جگہ ندیا کی پسندیدہ جگہ تھی وہ اکثر بیٹھ بیٹھ پانی پانی نہیں ملتین کی طویل نظمیں یاد کرتی ہوئی۔ کاشی غالب اور انش کی غزلوں میں گم اور کبھی اپنے کسی خوب صورت ناول کا اختتام لکھتی ہوئی۔

”آبی السلام علیکم“ کاشی بستہ وغیرہ میز پر رکھتا ہوا صوفیہ کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ اپنے دھیان میں تھیں ماریوں کی صفائی کرنے کے بعد اب گوڈی کر رہی تھیں اور ندیا اور کاشی کی آمد سے بے خبر تھیں۔ کاشی کی آواز پر انکدم چوک اٹھیں۔

”وعلیک السلام کاشی صاحب، کب آئے آپ؟“  
”میں نے خوشدلی سے پوچھا۔“

”بس ابھی آیا ہوں۔ ندیا آتی ہے کام تھا۔“ اس نے بڑے مصروف بندے کی طرح جواب دیا۔

”اچھا کیا کام تھا۔ ذرا ہمیں بھی تو پتا چلے ناں؟“ سعید نے اس سے تفصیل پوچھی۔

”میتھ کے ٹیسٹ کی تیاری کرنی ہے۔“ ٹیسٹ کے نام پر اس نے پھر منہ بنایا۔

”اچھا تو پھر وقت کیوں ضائع کر رہے ہو چلو پڑھو۔“ وہ اس کے انا از پر مسکرائیں۔  
”چلو کاشی ادھر آؤ۔“ ندیا نے اس کی کتاب نکال کر آواز دی تو وہ ادھر چل دیا پھر وہ دونوں پڑھنے لگے۔ سعید نے گوڈی کرنے کے بعد کھار یوں کو پانی لگایا اور ہاتھ منہ دھونے کے بعد اندر چلی گئی تھیں۔ جہاں دادو حلوے کو دم پر رکھنے کے بعد عصری نماز کے لیے وضو کر رہی تھیں۔ سعید نے بھی وضو کیا اور نماز کے لیے کھڑی ہو گئیں۔

”کاشی تم آؤٹ ہو چکے ہو۔“  
”نہیں ندیا آبی آپ چٹنگ کر رہی ہیں۔“

”سعدیہ اور دادو نماز پڑھ کر فارغ ہوئی ہی تھیں کہ کاشی اور ندیا کی تیز آواز ان کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

”ارے اتنی جلدی تیاری ہو گئی ٹیسٹ کی؟“ دادو نے حیرت سے سعید کی طرف دیکھا۔

”دادو یہ پڑھانے کے دوران ٹھیک کا وقت ہے۔“ سعید نے مسکرا کر کہا تو دادو بھی اس کی بات پر مسکرا دیں۔

☆☆☆

”جی اتو فرمائیے شاہ میر صاحب آپ نے اس غریب کو اتوار کے دن صبح سویرے کیوں یاد فرمایا ہے؟“

آڈر نے پوچھا۔

اتوار کا دن تھا اور آڈر پر تک سونے کا عادی تھا مگر شاہ میر کی ایمر جیسی کال نے اس کی نیند کا بیڑا غرق کر دیا تھا۔ وہ ڈھیٹ بن کر پڑا سوتا رہتا لیکن وہ جانتا تھا کہ اگر چندہ منٹ میں نہیں گیا تو شاہ میر خود حاضر ہو جائے گا اور کسی طرح شام سے پہلے نہیں ملے گا اور اتنے وقت میں اس کا سارا دماغ ختم ہو جائے گا۔ شاہ

میں نے خوشدلی سے پوچھا۔

”یہ۔ یہ تو دادو کر لیں گی۔ کیوں دادو؟“ کہنے کے ساتھ ہی اس نے دادو سے بھی پوچھا اور غلاب تو قی دادو فوراً مان بھی گئیں۔

”یہ۔ یہ تو دادو کر لیں گی۔ کیوں دادو؟“ کہنے کے ساتھ ہی اس نے دادو سے بھی پوچھا اور غلاب تو قی دادو فوراً مان بھی گئیں۔

برآمدے سے ہوتا ہوا لاؤنج سے گزر کر وہ منہ



میرا اپنے گھر شاید آگئی اکل کے سامنے اپنی زبان کو کم استعمال میں لائے یہی سوچ کر وہ چلا آیا تھا۔ مگر دماغ ابھی تک سویا ہوا تھا۔

”آذر صاحب مسئلہ اہم نوعیت کا ہے جس کے لیے پرمغز ہونے کے ساتھ ساتھ پُر پیٹ ہونا نہایت ضروری ہے اس لیے آپ کے خالی پیٹ کو بھرنے کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔“ شاہ میر نے کہنے کے ساتھ چکن کی طرف اشارہ کیا جہاں ردا اپنا تمام تر سکھڑا آتما کر بہترین ناشتا تیار کرنے میں مصروف تھی۔ شاہ میر کی بات وہ بھی نہیں مانتی اگر اسے شاہ میر سے کام نہ ہوتا۔ اسے شام کو اپنی دوست کی سالگرہ پر جانا تھا اس لیے اگر وہ شاہ میر کی بات نہیں مانتی تو وہ بھی اسے دوست کے گھر نہیں لے کر جاتا اور امی اسے اکیلا تو بھی بھی جانے نہیں دیتیں۔ اس لحاظ سے ردا کافی مطلب پرست واقع ہوئی تھی۔

”چلو کچھ تو آپ کو اپنے خادم کی غربت کا خیال آیا۔“ ناشتے کی تیاری کا من کر آذر کے پیٹ میں دوڑتے چوہوں نے کچھ دم لیا تھا۔ وہ یہ کہتے ہوئے صوفے پر دراز ہو گیا۔

”وہی تم نے میرے پیٹ کے متعلق تو سوچ لیا ہے مگر اپنے خالی دماغ کے لیے بھی کوئی تدبیر کی کہ نہیں ہے؟“ آذر نے نہایت فکر مندی سے پوچھا۔

”جی ہاں، بہت سوچا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ کی طرح جس بھراؤں۔“ شاہ میر اس کی بات پر مل ہی تو گیا لہذا جواب بھی جملے کئے انداز میں دیا۔

”اچھا، میرے سر میں بھس بھرا ہے تبھی تو مجھے اپنے سامنے گدھے نظر آتے ہیں۔“ آذر نے شاہ میر پر نظریں گاڑیں۔

”بالکل بجا فرمایا آپ نے۔ یقیناً آپ کو گدھا اس وقت نظر آتا ہوگا جب آپ آئینہ دیکھتے ہوں گے۔“ شاہ میر نے بڑی سہولت سے اس کی بات اس کو لوٹائی۔ ”معتز زین محفل ناشتا تیار ہے۔“ اس سے پہلے کہ آذر کوئی جواب دیتا ردا ٹرائی ٹھیکٹی داخل ہوئی۔ شاہ

میر اور آذر دونوں سیدھے ہو بیٹھے۔

”شکر ہے خدا کا، آج محسوس ہوا کہ ہم ملتان میں رہتے ہیں۔“ پہلا نوالہ منہ میں رکھتے ہی شاہ میر بولا۔ ”کیوں بھی؟“ آذر حیران ہوا۔

”اس لیے میرے بھائی کہ ہماری ردا صاحبہ کھانے میں نمک ہی فراخ دلی سے استعمال کرتی ہیں کہ کلتا ہے کہ ہم کھڑے کی کان میں رہتے ہوں۔“ اس نے وضاحت کی تو آذر فیس پڑا۔ اور ردا جو کہ تقریباً لفظ سننے کی منتظر تھی پچھلے کھانوں کا حوالہ سن کر ہیر چٹکی ہوئی چلی گئی۔

ارادہ تو تھا کہ ایسا جواب دے کہ شاہ میر کو مزہ آجائے مگر دل کی خواہش کو دبا گئی کیوں کہ جانتی تھی کہ اس کا جواب اس کے ہی خلاف جائے گا۔ شاہ میر کو لڑائی کرنے کا موع مل جاتا اور نتیجتاً وہ اس سے ناراض ہو جاتا اور وہ اپنی دوست کی سالگرہ میں جانے سے محروم ہو جاتی۔

”اول درجے کے ناشکرے ہو تم۔“ آذر نے ردا کے ناراض ہو جانے پر شاہ میر کو ڈانٹا۔ ”ہاں، میں بہت ذہین ہوں ہمیشہ اول آتا تھا۔“ اس نے فخر پر کہا۔

ناشتے کے بعد شاہ میر کو برتن خود ہی سنبھلنے پڑے کیوں کہ ردا سے تو اب شام کو ہی ملاقات ہوتی تھی۔ ”جی! تو جناب اب وہ اہم نوعیت کا مسئلہ پیش کیا جائے۔“ تو لیے سے ہاتھ پوچھ کر آذر صوفے پر بیٹھا۔

”بزرگوار مسئلہ یہ ہے کہ مجھے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا ہے۔“ شاہ میر اس کے قریب بیٹھے ہوئے اطمینان سے بولا۔

”کیا.....؟“ آذر واقعی حیران ہوا تھا۔ ”یونیورسٹی میں ایڈمیشن وہ کیوں بھی..... جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تم پچھلے سال ایم ایس کی فزکس فیصلہ خدا کی عزت کر چکے ہو۔“ آذر کے لہجے میں حیرت ہی حیرت تھی۔

”لیکن اب میں ایم اے اردو لٹرچر میں کرنا چاہتا

ہوں۔“ شاہ میر اطمینان سے بولا۔

”اچھا تو اب تم مودب ہونا چاہتے ہو۔“ آذر نے مذاق کیا۔ ”یاد رکھیں نہیں ہو سکتے؟“ شاہ میر برا مانتے ہوئے بولا۔

”قسم لے لو شاہ میر میں تو بہت سیریس تھا مگر نصرت نے ہی ساتھ نہیں دیا۔“ آذر نے معصومیت سے خالی پیش کی۔

”آذر.....“ شاہ میر نے اسے تنبیہی انداز میں حورا۔ سو آذر نے سنجیدہ ہو جانے میں عافیت جانی۔ ”ذیفر فریڈم کیم میں ہمہ ترکوش ہوں۔“ آذر نے کہا۔

”اصل مسئلہ یہ ہے کہ صورت حال سنگین ہوتی جا رہی ہے۔ اور محبت ہے کہ ہونے کا نام نہیں لے رہی۔ مگر کو میری شادی کے علاوہ کچھ سوچتا نہیں مگر میں نے بھی شان لی ہے کہ میں ہرگز دادا ابا اور بابا کے نقش قدم نہیں چلوں گا۔“ شاہ میر نے کہا۔

”تو کیا تم شادی نہیں کرو گے؟“ آذر پھر شرارت سے گویا ہوا تھا۔ حالاں کہ اصل بات جانتا تھا۔ ”نہیں یار، دراصل میں چاہتا ہوں کہ محبت کی شادی کروں۔“ شاہ میر نے جواب دیا۔

”دوسرے الفاظ میں مجنوں کی طرح خوار ہونا چاہتا ہوں۔“ آذر کی زبان میں پھر مچھلی ہوئی۔ ”لیکن یہ تو بتاؤ محبت کی شادی کا یونیورسٹی سے کیا تعلق؟“ شاہ میر کے جارحانہ تیور دیکھ کر آذر اصل موضوع کی طرف آگیا۔

”یونیورسٹی ہی وہ جگہ ہے جہاں نوے فی صد سے زائد بھیتیں جنم لیتی ہیں۔“ شاہ میر نے جھجکی سے کہا۔ ”واہ کیا مشاہدہ ہے۔ کیا گہری نظر ہے۔“ آذر نے اسے داد دی۔

”کلتا ہے یہ مشاہدہ اب ہی زیر غور آیا ہے۔ دوسرے خیال میں تم نے یونیورسٹی میں چار سال گزارے ہیں اس بات کا پتا اگر تمہیں تب ہوتا تو تم اب شادی کی بجائیں اور کئی شادیاں کر چکے ہوتے۔“ آذر نے لاپرواہی سے کہا۔

”نہیں یار، جب تو اس طرف خیال ہی نہیں کیا اور ویسے بھی بابا جان نے یونیورسٹی کے پہلے روز ہی فرمان جاری کر دیا تھا کہ ہر خوار یونیورسٹی میں پڑھائی کرنے جا رہے ہو تو پڑھائی ہی کرنا ہی ایس اور ایم ایس کی چار سال میں ہی کر لو تو بہتر ہے کہیں یونیورسٹی کی مستقل آمدنی کا ذریعہ نہ بن جانا اور جیسے ہو ویسے ہی رہنا مجنوں، رانجھائی کے کوشش نہ کرنا۔“ شاہ میر نے بابا کی نقل کر کے بتایا تھا۔

”تو ذیفر کیا اب تمہیں یقین ہے کہ اس بار تمہارے والد محترم اس قسم کی کوئی نصیحت تمہارے پلو سے نہیں باندھیں گے۔“ آذر نے پوچھا۔ ”اب تو وہ خود کسی۔۔۔ پلو والی حسد کی تلاش میں ہیں۔“ نہایت حسرت سے کہا گیا۔

”کیا.....! اکل کسی حسد کی تلاش میں ہیں؟“ آذر کو حیرت کا شدید جھکا گدوہ پہنچ گیا۔ ”لاحول ولا.....“ شاہ میر اس کے فقرے پر تلملایا۔ ”میں اپنی بات کر رہا ہوں۔“

”اس کو اس کے بعد مجھے یہ بتاؤ کچھ کیا کرنا ہے؟“ آذر نے پوچھا۔ ”تم میرے اکلوتے دوست ہو اس لیے تمہیں میری ہر طرح سے مدد کرنی ہے۔“ شاہ میر نے اطمینان سے پوچھا۔

”مثلاً.....“ آذر نے تفصیل جانتا چاہی۔ ”مثلاً اخلاقی، اور مالی، شاہ میر نے جواب دیا۔ اخلاقی مدد تو میں کر سکتا ہوں مگر مالی مدد سے قاصر ہوں کیوں کہ میرا اپنانا مالی نہ ہونے کی وجہ سے ابتری کا شکار ہو گیا ہے۔“ آذر بڑی ادا سے بولا۔ آذر کے جواب پر شاہ میر کا خون کھول اٹھا۔ اس نے سارے کشن اسے دے مارے۔

”جس کا دوست تم جیسا ہو اس شخص کو تو شرم سے مرجانا چاہیے۔“ شاہ میر غصے سے بولا۔ ”اچھا تو پھر کب اپنے قول پر عمل کرنے والے ہو۔“ آذر جی کم ڈھیت نہ تھا۔ ”خدا کے واسطے میرے مسئلے کا حل سوچو۔“ آخر



شاہ میر نے تھپار ڈالے اور ہاتھ جوڑ کر عاجزانہ انداز اپنایا۔

”اچھا، اچھا بتاؤ کیا کروں؟“ آذر نے پوچھا  
”تمہیں ماما اور بابا کو ممانا ہے۔“ شاہ میر نے کہا۔

”ان میں لڑائی ہوگئی ہے؟ سوئی میرا مطلب تھا کہ مالی مدد سے تمہاری کیا مراد ہے۔“ آذر نے پوچھا  
”مالی مدد سے مراد یہ ہے کہ اگر بابا راضی نہیں ہوئے تو تم مجھے ایڈمیشن فیس دو گے۔“ شاہ میر نے اپنا غصہ ظاہر کیا۔

”کیوں جناب، کیا آپ میری لے پالک اولاد ہیں؟“ آذر نے طنز یہ لہجے میں پوچھا۔  
”یونہی سمجھ لو۔“ شاہ میر اطمینان سے بولا۔  
”اچھا، جو خدا کو منظور۔“ آذر نے غصہ کی سانس بھری اور نہایت صبر و شکر کا مظاہرہ کیا۔

☆☆☆

ڈارک میرن اور کیمیل کنٹراسٹ سوٹ میں روا بہت پیاری لگ رہی تھی، تھیں کے گلے اور آستینوں پر ننھے ننھے شیشے جگہ گارہے تھے اور ان کی چمک سے اس کی گلابی رنگت اور بھی گھری گھری لگ رہی تھی۔ کلائیوں میں چوڑیاں اور گجر اپنے وہ کب سے تیار ہو کر لاؤنچ میں کھڑی تھی اور شاہ میر کو آواز دے جا رہی تھی۔ شاہ میر کو ایک گھٹنا ہو گیا تھا، دروازہ بند کیے تیار ہوتے۔ روانے ٹائم دیکھا ساڑھے سات بج چکے تھے جب کہ سالگرہ کا ٹائم سات بجے کا تھا۔  
”امی بلا میں ناں بھائی کو.....“ اس نے تھک ہار کر ماما سے شکایت کی۔

”شاہ میر کیا کر رہے ہو اب ابھی جاؤ، بہن کو دیر ہو رہی ہے۔“ انہوں نے روا کی جھنجھلاہٹ پر مسکراتے ہوئے شاہ میر کو تختی سے پکارا اور وہ آیا ماما جان کہتا ہوا یوتھ کے جن کی طرح حاضر ہو گیا تھا۔ ماما اور روا اس کی تیاری دیکھ کر چونک اٹھیں۔

”پرنس صاحب، خیریت تو ہے ناں.....!“ دل ہی دل میں اس کی نظر اتارتے ہوئے انہوں نے اس

کے دلچسپ سر ایا پر نظر ڈالی۔ ڈارک بولکر کے کان کے کلف لگے کرتے شکار میں وہ واقعی بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔

”بھائی صاحب کیا دولہا کے سلیکشن کے لیے جا رہے ہیں؟“ روانے اسے سر سے تھک دیکھا۔  
”بالکل نہیں، مابودولت دہن کی تلاش میں جا رہے ہیں۔“ شاہ میر نے جواب دیا۔  
”اچھا تو ایک گھنٹا اس لیے تیاری میں لگا ہے۔“ روانے اس کے قریب بھیلی Havoc کی خوشبو سونھیں۔

”پرنس کو تیار ہونے میں کچھ تو وقت لگتا ہے ناں کنیز۔“ شاہ میر نے شاہانہ انداز میں کہا۔  
”ویسے ایک بات بتاؤ پرنس صاحب پرنس تو پرنس ہوتا ہے اسے تیاری کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی البتہ.....“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑا اور معنی خیز انداز میں ماما کی طرف دیکھا۔

”خبردار جو ہماری شان میں گستاخی کی۔“ شاہ میر اس کی شرارت سمجھ گیا تھا۔

”ردا دیر ہو رہی ہے اب بس کرو جاؤ.....“ واپس بھی آتا ہے۔“ ممانے ٹائم کی طرف توجہ دلائی جو کہ دونوں ایک دوسرے سے لوک جھوک میں بھول چکے تھے۔

”ایک منٹ میں ابھی آیا۔“ اس نے جانے کیا یاد آگیا اور واپس پلٹنے لگا مگر روانے اس کا بازو پکڑ لیا۔  
”نہیں، بس بہت ہو گیا مجھے دیر ہوگئی ہے۔“ شاہ میر ایک کاٹ لے گی۔“ روانے سچپتی ہوئی پوریج تک لے آئی۔

”بے فکر رہو۔ کوئی بھی خیرجی کارروائی تمہارے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔“ اس نے گاڑی کا لاک کھولا۔  
”ڈیزر برادر سالگرہ تو میری دوست کی ہے، تمہاری اتنی تیاری کی وجہ سمجھ نہیں آئی۔“ راستے میں روا نے اس سے پوچھا۔

”ہو سکتا ہے تمہاری دوست تمہاری بھابی بن جائے۔“ وہ بڑی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”کیا کہا..... خبردار جو میری دوستوں پر نظر رکھی۔“ وہ مجھے بہت عزیز ہیں۔“ روا، شاہ میر کو آنکھیں دکھاتی ہوئی بولی اور اسی پر اکتفا نہ کیا۔ اترتے ہوئے اس کے خوبصورت سلیقے سے بنے سنورے بالوں کو ہاتھ سے فراب کر کے فوراً ترنگی اور پلٹ کر دیکھا بھی نہیں۔ شاہ میر نے آئینے میں اپنے کھمبے بالوں کو دیکھا جنہیں جتنی محنت سے اس نے سیٹ کیا تھا اور دل میں سچ و تاب کھاکر رہ گیا۔ ایک میدان میں ناکام ہونے کے بعد اس نے دوسرے کو فتح کرنے کا سوچا اور گاڑی گھر کی طرف موڑ لی تاکہ ماما سے ایڈمیشن کی بات کر سکے۔

”السلام علیکم ماما جانی۔“ سیٹی پر انگلیش گانے کی دھن بجاتا ہوا بڑے خوشگوار موڈ میں اندر داخل ہوا۔ ماما اسے لاؤنچ میں بیٹھی مل گئیں۔ لیکن سے فارغ ہو کر اب وہ لاؤنچ میں آئیٹمی ٹیبل اور سینٹرل ٹیبل کا ٹیبل سا کرشل کا گلدان صاف کر کے بھول لگا رہی تھیں۔

”علیکم السلام، بیٹا اتنی جلدی واپس آ گئے میرا خیال تھا کہ تم آذر کی طرف جاؤ گے۔“ گلدان کو ہاتھ میں کھرا کر انہوں نے بھولوں کی سیٹک چمک کی۔  
”ماما آپ کتنا کام کرتی ہیں تھک گئی ہوں گی،“ وہاں میں وہاں۔“ ان کے ہاتھ سے گلدان لے کر میز پر رکھ کر ان کے ہاتھ تھامتے ہوئے بڑی فکر اور محبت سے بولا۔

”خیریت تو ہے بیٹا جی۔“ ماما اس کے انداز پر مسکرائیں۔ ضرور کوئی کام ہوگا۔ انہوں نے شاہ کو دیکھا جو ان کے شانے پر سر ٹکائے ان کے ہاتھ ہاتھوں میں لیے بیٹھا تھا۔

”ارے ماما آپ کو کیسے پتا چلا کہ مجھے آپ سے کوئی کام ہے۔ کتنی ذہین ہیں آپ۔“ وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

”اچھا اب اس خدمت کو چھوڑیں اور فرمائیں کہ کیا کام ہے؟“ انہوں نے ہاتھوں سے اس کے بال ہٹا دیے۔

”ماما ذرا پابنت کا اور ثبوت دیں اور بتائیں کہ بھلا کیا کام ہو سکتا ہے؟“ وہ بڑے لاڈ سے بولا۔

”اچھا.....!“ انہوں نے کہا اور سوچنے لگیں۔  
”ایک خوبصورت، نوجوان اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکے کو کیا کام ہو سکتا ہے کہ وہاں سے لاڈ سے کہیں۔“ انہوں نے سوچا اور سمجھ گئی اور بڑے اعتدال سے بولیں۔ ”صاف صاف بتاؤ کہ سلیکٹ کیا ہے؟“ وہ حیران ہو کر ان کے شانے سے ہٹا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ماما اتنی جلدی ہی اس کی بات سمجھ لیں گی۔

”ماما تو کیا آپ مجھے دلوادیں گی۔“ اس نے بے یقینی سے پوچھا جس کام کو بہت مشکل سمجھ رہا تھا ماما اتنی آسانی سے مان جائیں گی اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔  
”دلوادوں گی سے تمہاری کیا مراد ہے۔ میں اسے گھر کی رانی بنا کر لاؤں گی۔“ ان کے لہجے میں پیار ہی پیار تھا۔

”کیا.....! آپ یونیورسٹی کو گھر کی رانی بنا لیں گی۔“ حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔  
”یونیورسٹی.....؟“ اب حیران ہونے کی باری ان کی تھی پھر انہوں نے سوچا کہ شاید یونیورسٹی میں پڑھتی ہوگی اس لیے پھر فوراً بولیں۔

”کیا نام ہے اس کا.....؟“ انہوں نے پوچھا۔  
”آرڈو لٹریچر۔“ وہ فوراً بولا تھا۔ اس نے سمجھا کہ ماضیوں کا نام پوچھ رہی ہیں۔  
”دماغ تو تھمکے تھے تمہارا لڑکی کا نام آرڈو لٹریچر ہے کیا؟“ انہیں شاہ میر کی دماغی حالت پر شبہ ہوا۔  
”کیسی نیکی باتیں کر رہے ہو؟“

”لڑکی.....“ حیرت سے شاہ میر کا منہ کھلا کھلا رہ گیا۔ وہ اب سمجھا تھا کہ ممی کی ذہانت کا ثبوت ایک لڑکی تھی۔

”ماما آپ غلط سمجھ رہی ہیں، میں تو اصل میں یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے کی بات کر رہا تھا۔“ اس نے انک اٹک کر وضاحت کی۔

”کیا.....! یونیورسٹی میں ایڈمیشن.....؟“ وہ حیرانی سے بولیں۔

”جی ماما، میں آرڈو لٹریچر میں ماسٹر کرنا چاہتا ہوں۔“ شاہ میر نے کہا۔



”پاگل ہو گئے ہو کیا؟ میں شادی کی تیاری کر رہی ہوں تمہارے لیے لڑکی دیکھ رہی ہوں اور تم پھر سے یونیورسٹی کی زیارت کرنے چلے ہو۔“ انہیں سچ بچ غصہ آ گیا۔

”مما شادی کے لیے تو عمر پڑی ہے۔“ اس نے انہیں سمجھانا چاہا۔

”شادی کے لیے عمر پڑی ہے اور تم لکھ لوداب تو تمہیں ماسٹرز کر کے بھی نہیں آئے گا۔“ غصے سے برا حال تھا ان کا۔

”یعنی آپ کی طرف سے اجازت ہے ایڈمیشن لے لو۔“ وہ خوشی سے چلا یا۔

”خبردار جو تم نے ایڈمیشن لیا۔۔۔ آنے دو اپنے باپ کو سیدھا کر دانی ہوں تمہیں۔“ وہ غصے میں بولیں۔  
”قسم لے لیں مما جو میں ذرا سا بھی میڑھا ہوں بانس کی طرح سیدھا ہوں۔“ شاہ میر نے ان کا مزاج خوشگوار کرنا چاہا۔

”بس زیادہ بکواس مت کرو۔ ایم ایس سی کر کے کیا تیر مار لیا ہے جو ڈبل ایم اے کی خواہش جاگ اٹھی ہے۔ باپ روز کہتا ہے کہ ساتھ آفس چلو مگر نواب صاحب کو فرصت ہی نہیں۔“ وہ کہتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ شاہ میر بھی ان کے پیچھے تھا۔  
”ای آپ نے پڑھا نہیں کہ ماں کی گود سے قبر تک علم حاصل کرو۔“ قائل کرنے کے لیے اس نے احادیث کا سہارا لینا چاہا۔

”اور ماں، باپ کی اطاعت کی احادیث نہیں پڑھیں تم نے۔“ انہوں نے اسے گھورا۔

پھر شاہ میر نے علم..... ڈبل ایم اے کی اہمیت، افادیت، چیدہ چیدہ لوگوں کی مثالیں تک پیش کیں مگر ممّا کی ناں ہاں میں نہیں بدلی۔ احتجاجاً شاہ میر ناراض ہو کر کمرے میں بند ہو گیا، ردا کو لینے بھی نہیں گیا۔ اس کی دوست خود چھوڑنے آئی تھی۔ رات کے کھانے پر بھی باہر نہیں نکلا۔ اس کے متعلق وہ پریشان تو بہت ہوئیں مگر جانتی تھیں کہ اب ڈھیل دی تو وہ مزید چوڑا ہو جائے گا لیکن انہیں پتہ ہی نہیں چلا کہ رات کو اس نے فریج کی

بھر پور تلاش لے لی تھی۔ ناشتے پر بھی جڑتال جاری تھی۔ ماما اور ردا نے لاکھ دروازہ بجایا مگر اس نے جواب تک نہیں دیا تھا۔ آخر ممّا نے آذر کو بلایا۔ اس کے آنے پر شاہ میر نے جھٹ سے دروازہ کھولا تھا مگر آذر کو اندر کھینچنے کے بعد فوراً بند کر لیا۔ نہ جانے ان میں کیا گفتگو ہوئی۔ آذر کچھ دیر بعد باہر آیا اور آگنی سے طویل مذاکرات کا سلسلہ چلا۔ آخر آذر ان کو منانے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ ورنہ دوسری صورت میں اسے شاہ میر کی مالی مدد کرنی پڑتی۔

☆☆☆

پچھلے ایک ہفتے سے ندیا کی نمازیں اور دعائیں معمول سے کچھ زیادہ طویل ہوئی تھیں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ آج شام کو اس کا رزلٹ آؤٹ ہوتا تھا۔ اب بھی ظہر کی نماز کے ساتھ نوافل پڑھنے اور دعا مانگنے کے بعد فارغ ہوئی تھی۔

”دادو جان آپ نے میرے لیے دعا نہیں کی؟“ وہ نماز پڑھ کر لاؤنج میں آئی تو دادو کو اخبار پڑھتے دیکھ کر بولی۔

”ارے بیٹا مانگی کیوں نہیں، میری ساری دعائیں تم دونوں کے لیے ہی تو ہیں۔“ انہوں نے کتاب میں لال ڈوری مطلوبہ صفحے پر نکال کر کتاب بند کی اور نہایت شفقت سے اپنی پوتی کو دیکھا۔ جس کے چہرے پر بلا کی مصحوبت تھی۔ سفید دوپٹے میں اس کا روپ چاندنی کی طرح نکھر رہا تھا۔

”دادو جان! آپ کو پتا ہے کہ ہم تینوں دوستوں نے جرنلزم میں ماسٹرز کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ کتنا مزہ آئے گا ناں جب ہم یونیورسٹی جایں گے۔ یونیورسٹی لائف کا تو اپنا ہی ایک مزہ ہوتا ہے، ہے ناں آپ۔“ پُرجوش لہجے میں بولتے ہوئے اس نے سلیو سے بھی تائید چاہی۔

”ہاں واقعی۔“ کچن میں کام کرتی سلیو نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور دل ہی دل میں ندیا کی کامیابی کے لیے ڈھیروں دعائیں کی۔ دادو، ندیا سے کچھ کہنے والی تھیں مگر پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گئیں وہ

اس وقت ندیا کو اداس اور ناراض نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ شام کو تو ندیا خوشی سے دیوانی ہو رہی تھی۔ سب کی دعائیں اور اس کی اپنی محنت رنگ لائی تھی وہ نہ صرف بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوئی تھی بلکہ اس نے اپنے کالج میں ناپ کیا تھا۔ اس کی دوستوں کے ساتھ ساتھ بچرز کے بھی مبارکباد کے نون اور میج موصول ہو رہے تھے۔ دادو نے تو فوراً شکرانے کے نفل پڑھے تھے۔  
”دادو اب تو میں ناول لکھ سکتی ہوں ناں۔ پڑو سکتے چہرے کے ساتھ ان کے گلے میں بانہیں ڈالے وہ لاڈ سے پوچھ رہی تھی۔

”پاگل، اب تم تو ہر کام کر سکتی ہو کیونکہ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میری ندیا بہت ذہین ہے۔ بیک وقت کئی کام کر سکتی ہے اور اب تو تم مجھ سے اور سلیو سے کھانا پکانا بھی سیکھ گئی، ہے ناں؟“ انہوں نے شرارتی لہجے میں اجازت دینے کے ساتھ استفسار بھی کیا۔

”دادو..... یہ کچن درمیان میں کہاں سے آ گیا۔“ مصنوعی ناراضی سے کہتی ہوئی وہ ان کے پاس سے اٹھ کر کچن میں آگئی اور پانی پینے لگی۔

”بیٹا، کچن درمیان میں نہیں ساکنڈ پر آ گیا ہے تمہارا بابا سے کہا بھی تھا کہ کچن لاؤنج اور کمرے کے درمیان میں بیٹانا مگر انہوں نے سائنڈ پر بنوایا ہے۔ جرات ہے تمہیں اب بھی یہ درمیان میں لگ رہا ہے۔“ دادو کا لہجہ پھر شرارت لیے ہوئے تھا۔

”دادو.....“ ندیا کا لہجہ احتجاجی تھا۔  
”جی جی میں چاہتی ہوں کہ تم اپنے ناول کی ہیروئن کی طرح سکھو جو آؤٹ کر کے تمہاری شادی بھی کر دے۔“ دادو نے کہا۔

”دادو میں آپ سے نہیں بولتی۔“ وہ ناراضی سے بچے ہوئے کمرے میں جا گئی۔

☆☆☆

”صاحبزادے کیا ارادے ہیں آپ کے؟“ اس وقت سب ناشتے کی ٹیبل پر موجود تھے۔ رضا صاحب نے اخبار پڑھنے کے دوران ذرا سا اخبار ہٹا کر کھ بھر شاہ کو دیکھتے ہوئے سوال کیا اور اخبار پھر سے نظروں کے

سامنے پھیلایا لیکن وہ شاہ میر کے جواب کے منتظر تھے۔  
”وہ بابا اصل میں.....“ رضا صاحب کو اسلام آباد سے واپس آئے چار روز ہو گئے تھے اور ان چار دنوں میں انہوں نے شاہ میر سے یونیورسٹی میں ایڈمیشن پر نہ تو کوئی استفسار کیا تھا اور نہ ہی ڈانٹا تھا۔ اس لیے شاہ میر جو شروع میں ڈرا ہوا تھا اب بے فکر ہو چکا تھا اس کے خیال میں امی نے بابا کو راضی کر لیا ہو گا اس لیے بابا نے کوئی سوال نہیں کیا مگر آج اچانک اس حملے پر وہ گڑبڑا گیا اور کوئی مناسب جواب نہیں بن پڑا تھا۔

”بابا میں بتاتی ہوں۔ اصل میں بھیا کا موقف ہے محبت.....“ ردا بڑی روانی میں شروع ہوئی مگر نظر جو بھی شاہ میر پر پڑی اس کی آنکھوں میں ”سوچ لو“ کا مفہوم واضح دیکھ کر یکدم خاموش ہو گئی۔ شاہ میر اس کے ہزاروں کام بغیر کسی رشوت کے کر دیا کرتا تھا۔ لائبریری سے کتابیں لانا۔ ٹیکہ کو کپڑے دے کر آنا۔ دوستوں کے گھر لے جانا اور دوستوں کی آمد پر بازار سے چیزیں لا کر دینا وغیرہ وغیرہ۔ ردا نے پل میں سوچا کہ اگر آج اس نے ڈیڑی کے سامنے شاہ میر کے موقف کا اظہار کر دیا تو پھر آئندہ ہمیشہ کے لیے اپنے ہزاروں کاموں کے لیے شاہ میر کی خدمات حاصل کرنے سے محروم ہو جائے گی جو سراسر کھانے کا سودا تھا۔ لہذا اس نے سفید دوپٹا لہر کر اس کا اعلان کیا اور ساتھ ہی شاہ میر کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا۔ اگلے ہی لمحے وہ دونوں اپنا چائے کالگ سنبھالے وہاں سے کھسک گئے۔

”یولو ردا آخر کیا موقف ہے ہمارے پروردار کا.....؟ پُردا کے آدھے چمکے کے بعد خاموشی کے وقفے پر انہوں نے اخبار سے نگاہ اٹھائی مگر ردا ہوتی تو جواب دیتی ناں۔ ساتھ ہی شاہ میر بھی غائب تھا۔ انہوں نے بیگم کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا جو مسکرا رہی تھیں پھر وہ بھی ان کی مسکراہٹ میں شامل ہو گئے۔

☆☆☆

یونیورسٹی کا احوال بھی نہایت دلچسپ تھا۔ ہر لڑکی کو دیکھ کر شاہ میر کو لگتا کہ یہی ہے خوابوں کی شہزادی.....  
وہ خوابوں کی شہزادی صرف یونیورسٹی تک رہتی گھر آ کر



”اڑا لو مذاق..... لیکن میں جانتا ہوں جس دن میں نے اپنی محبت پالی اس دن سب سے زیادہ خوش تم ہی ہو گئے۔“ شاہ میر یقین سے بھرپور لہجے میں بولا۔

”اسے یونیورسٹی جاتے ایک ماہ ہو چلا تھا۔ روز صبح تک سک سے تیار ہو کر جاتا مگر مقصد ابھی تک نہیں آیا تھا۔ ایک سے ایک حسین لڑکی تھی۔ مصیبت اور سادگی کی بھی کئی نہیں تھی مگر محبت تھی کہ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ پری ریخ محبوبا میں میر اور غالب کی غزلوں کی طرح محدود ہو گئی تھیں اور وہ غزلیں اشعار باد کر کر... کے تنگ آ گیا تھا۔ غالب کے حالات زندگی سے زیادہ اسے اپنی زندگی قابلِ رحم لگتی تھی۔“ اگر اگلے ایک ہفتے میں محبت نہ ہوئی تو میں یونیورسٹی چھوڑ دوں گا۔“ اس نے گویا دل کو اٹنی مٹم دے دیا۔

☆☆☆

محبت کرنے کا یہ طریقہ بھی کارگر ثابت نہ ہوا۔ شاہ میر نے نہایت دلبرداشتہ ہو کر یونیورسٹی کو خیر باد کہہ دیا۔ تقریباً ایک ہفتہ ہو چلا تھا اسے یونیورسٹی چھوڑے۔

”پرنس صاحب کیا حال ہے آپ کے لڑ بچہ کا؟“ اتوار کی ایک خوشگوار طبع تھی۔ رضا صاحب گھر پر تھے۔ ردا اور امی یکن میں ناشتا بنا رہی تھیں۔ وہ ابھی جاگا تھا۔ لاؤنج میں داخل ہوا تھا کہ بابا نے اس سے سوال کیا۔

”بابا میں نے یونیورسٹی چھوڑ دی ہے۔“ انداز ایسا تھا جیسے مجھوں نے سلی کی طلب چھوڑ دی ہو۔

”چھوڑ دی.....؟“ انہوں نے اچھبے سے دیکھا۔ ابھی کل تک تو خوب تیار ہو کر جاتا تھا اور اب چھوڑ بھی دی ہے۔

”جی بابا.....“ جواب نہایت سعادت مندی سے دیا گیا تھا۔

”میں آپ کو بتا رہی ہوں کچھ کرنا ہے تو کر لیں یہ لڑکا نکل جائے گا ہمارے ہاتھ سے۔“ ماما بھی لاؤنج میں آ گئی تھیں۔ سز ہدانی کے بیٹے کی شادی کا کارڈ آیا ہوا تھا۔ ان کی بھی بیٹے کے سہرے کے پھولوں کی خواہش جاگ اٹھی تھی۔

”کیوں جناب، کیا کہہ رہی ہیں آپ کی

اسے اس کی شکل تک یاد نہیں آتی اگلے دن پھر کسی چہرے کو اپنی محبوبہ کے تصور سے دیکھتا مگر اب تک اس میں کسی لڑکی سے دوستی کرنے میں پہل کرنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی ہمت شاید ہو بھی جاتی اگر دل کسی لڑکی کو پسند کر لیتا مگر دل تو نہ جانے کس ڈھٹ مٹی کا بنا تھا کہ محبت کرنے کو تیار ہی نہ تھا۔ کسی کی بھی تصویر دل کے خانے میں نہ نہیں ہوتی تھی ہر شام وہ آذر کے گھر پایا جاتا اور اسے یونیورسٹی میں گزرے وقت کے ایک ایک منٹ کا احوال سناتا۔ کون سی لڑکی کس سوٹ میں اچھی لگ رہی تھی آج کتنی لڑکیوں سے گفتگو ہوئی اور کیا کیا ہوئی۔ کتنی لڑکیاں اسے دیکھ کر مسکرائیں۔ اتنی باتیں کہ آذر کا دماغ گھومنے لگتا۔ محبت کے متعلق ایسے ایسے سوال پوچھتا کہ آذر زچ ہو جاتا۔

”اچھا مجھے یہ بتاؤ کہ محبت کی علامات کیا ہیں؟“ شاہ میر نے آذر سے کہا۔

”محبت کا پوچھ رہے ہو یا کسی بیماری کا؟“ آذر ان اوٹ پٹانگ سوالوں سے تنگ آیا ہوا تھا بھی چلا کر بولا۔ جب سے شاہ میر کو پتا چلا تھا کہ آذر کسی لڑکی کو پسند کرتا ہے جب سے وہ آذر کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ اس سے محبت کرنے کے گرو پچھتا رہا تھا۔

”یار بیماری ہی سمجھو۔“ شاہ میر نے نہایت بیمار لہجہ اپنایا۔

”تیری بیماری کا ایک ہی علاج ہے۔ انکل آئی کی پسند سے شادی کر لے۔“ آذر جلا بھنا بیٹھا تھا۔

”یہ نہیں ہو سکتا، میں نے اس رسم کے خلاف علم بغاوت بلند کیا ہے۔ پہلے میرے والد محترم پھر دادا محترم پھر والد محترم کے دادا محترم سب نے یونہی شادی کر لی مگر میں شادی کروں گا تو محبت کی۔“ بڑے جوش میں جواب دیا گیا۔

”واہ، کیا عزائم ہیں۔ کتنا جوش و جذبہ ہے ہمارے جوانوں میں۔ تمہیں تو وزیر اعظم کا عہدہ بطور تحفہ پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔ تمہیں تو مجنوں کے گھر پیدا ہونا چاہیے تھا وہ یقیناً ایسے ہونہار سپوت پر فخر سے اکڑ کر چلتا۔“ آذر نے کہا۔



”کن چکروں میں پڑے ہوئے ہو۔“ انہوں نے آج دو دو ہاتھ کرنے کی ٹھانی۔  
”چکر کیسے بابا بس یونہی۔“ شاہ میر نے آہستہ سے جواب دیا۔

”یہ بس یونہی کیا ہوتا ہے۔ صاف صاف بات۔“ رضا صاحب نے سختی سے کہا۔  
”آج خیر نہیں۔“ شاہ میر نے دل میں کہا اور پھر ہنستا ہنستا بولا۔ ”اصل میں بابا میں نے سوچا تھا کہ وہ کوئی خدمت کر لوں۔“  
”تو پھر.....؟“ رضا صاحب کی نظریں شاہ میر کے چہرے پر گڑی تھیں۔

”بابا پھر یہ کہ ادب تو بڑی مشکل چیز ہے اتنی لمبی نہیں، تشریح، مصنفوں، شاعروں کے حالات زندگی۔“  
”مجھ سے نہیں ہوتا یہ سب کچھ۔“ شاہ میر نے بڑے جھجھکائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”واقعی ادب بہت مشکل چیز ہے صرف تم جیسوں کے لیے۔“ رضا صاحب کا طنز سے بھرپور لہجہ سمجھ تو وہ گیا۔  
”مگر ادب کا تقاضا تھا کہ خاموش رہا جائے۔“  
”آپ نے جواب نہیں دیا صاحبزادے۔“ وہ

کہاں بیچھا چھوڑنے والے تھے۔  
”کس بات کا بابا.....؟“ اسے واقعی یاد نہیں رہا۔  
پرائمری اسکول کے بچے کی طرح وہ بھی بڑا مظلوم نظر آ رہا تھا جس کا استاد دو کا پہاڑ آباد نہ ہونے پر سزا دینے والا ہو۔ ردا اور ماما اس کی مظلومیت پر مسکرا رہی تھیں۔

”یادداشت بھی خوب پائی ہے۔ میں نے پوچھا کہ یونیورسٹی کیوں چھوڑ دی ہے۔“ انہوں نے سختی سے اس کا استفسار کیا۔

”بابا میں نے بتایا ناں کہ مشکل ہے۔“ شاہ میر نے انسانی پردہ دینے کو تھا۔

”اچھا.....!“ انہوں نے معنی خیز انداز میں اچھا لہجہ لیا۔ ”کل تک تو علم کی احادیث پر بڑا عمل کرتا تھا۔“

”لیکن بابا!..“ اس نے کچھ کہنا چاہا۔

”بس بہت ہو گیا مذاق اگر تم نے یونیورسٹی چھوڑی تو پھر دیکھنا۔ مفت کا مال نہیں ہے کہ تم ایڈمیشن لو اور چھوڑ دو۔ اتنا فالتو پیسہ نہیں ہے میرے پاس۔ داخلہ لیا ہے تو پورا کرو۔ تمام لوگوں کو پتا ہے کہ ہمارا ہونہار سبوت ڈبل ایم اے کر رہا ہے۔“

”لیکن بابا۔“ اس نے پھر احتجاج کرنا چاہا۔  
”لیکن کیا..... سنا نہیں تم نے کیا کہہ رہا ہوں میں۔ جب میں نے کہہ دیا تو اس کا مطلب ہے کہ تم ایم اے پورا کرو گے۔“ انہوں نے غصے میں خشن انداز میں کہا اور اب کسی نہ کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ شدید رد عمل کے طور پر اس نے گود میں رکھا شش دور پھینکا اور میز کو ٹھوکر مارتا یا ہر نکل گیا جب کہ ردا اور ماما ”ارے ارے“ کرتی رہ گئیں۔

☆☆☆

”بیٹا ندیا کو بھی بلا لاؤ۔“ سعید نے کھانا ٹیبل پر رکھا تو دادو جان نے اس سے کہا۔

”اے بھوک نہیں ہے دادو آپ شروع کریں۔“  
سعید نے پلیٹ اور چادلوں کی ڈش ان کی طرف بڑھائی جسے انہوں نے خاموشی سے تھام تو لیا مگر پھر ٹیبل پر ہی رکھ دیا۔ سعید نے اچھٹے سے انہیں دیکھا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ کئی دنوں سے ندیا کی بے رخی برداشت کر رہی تھیں مگر آج ان کا صبر ٹوٹ گیا تھا۔

”دادو جان یہ کیا؟“ سعید بے چینی سے ان کی طرف بڑھی۔  
”اپنے ہاتھوں سے ان کے آنسو صاف کیے۔“  
”دادو جان آپ کیوں فکر مند ہو رہی ہیں کچھ دنوں میں خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔“ اس نے انہیں تسلی دی۔  
اسے ندیا پر بھی سخت غصہ آ رہا تھا جو اس طرح ری ایکٹ کر رہی تھی۔

”دادو جان میں ندیا کو بلا کر لاتی ہوں۔“ سعید نے آج ندیا سے سے کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے کمرے کی طرف چل دی۔  
”اٹھو ندیا، کھانا کھاؤ۔“ سعید نے کہا۔

”مجھے بھوک نہیں ہے؟“ ندیا الماری میں نہ جانے کیا تلاش کر رہی تھی اس نے سڑے بغیر جواب دیا۔ سعید



ایک نے چند لمحے انتظار کیا مگر ندیا بدستور الماری میں چیزیں ادھر ادھر کر رہی تھی۔  
”ندیا میں نے تم سے کچھ کہا ہے۔“ سعید کے لہجے میں غصے کی آمیزش تھی۔

”اور میں جواب دے چکی ہوں۔“ ندیا نے کھٹ سے الماری بند کی اور زور سے بولی۔ سعید اس حرکت پر بھونچ کر رہ گیا۔

”ندیا! سعید کے لہجے میں تاسف تھا۔“ تم اتنی خود غرض ہو۔ تمہیں اپنے آگے کوئی نظر ہی نہیں آتا۔ شرم آتی چاہیے تمہیں۔ تمہاری وجہ سے دادو جان کتنی پریشان ہیں اگر تمہیں پوچھو تو میں ایڈمیشن لینے کی اجازت نہیں دی تو اس کی کوئی وجہ ہے۔“ سعید نے اسے سمجھانا چاہا۔

”کیا وجہ ہے؟ کیا انہیں مجھ پر اعتبار نہیں؟“ ندیا نے سعید کی بات کا غلط مطلب لیا۔

”تم پر اعتبار ہے مجھے۔“ سعید کے جواب دینے سے پہلے ہی دادو جان کی آواز آئی۔ ان دونوں نے مڑ کر دیکھا۔ دادو جان غم آٹکھوں سے ندیا کو دیکھ رہی تھیں ندیا نے نگاہیں ملنے پر نظریں جھکا لیں۔

”لیکن ندیا بیٹے مجھے زمانے پر اعتبار نہیں۔“ وہ چلتے ہوئے بیٹھ بیٹھ گئیں۔ عمر کی طویل مسافت نے انہیں تھکا دیا تھا۔

”اس زمانے نے مجھ سے میری زندگی کا سہارا چھین لیا۔“ وہ بولیں تو دنیا بھر کا کرب ان کے لہجے میں آسا۔ ”تم سے تمہاری ماں، تمہارا باپ چھین لیا۔ رب کے نیکے کو کوئی نہیں مٹا سکتا مگر تم آٹکھوں کے سامنے رہو تو دل سکون میں رہتا ہے۔ دل کو تسلی رہتی ہے۔ ذرا نظروں سے اوجھل ہو تو دل کتنی مرتبہ جیتا مرنے سے تم نہیں جانتیں۔ بیٹا اگر تمہارا باپ زندہ ہوتا تو میں تمہیں بھی مت نہ کرنی اور اگر تمہارا بھائی ہوتا تو بھی تمہیں نہیں روکتی۔ بھائی تو تمہیں رب نے دیا نہیں اور باپ اس نے واپس لے لیا تو بتاؤ میں کس کے آسمان پر تمہیں اتنی دور جانے کی اجازت دوں؟“

ندیا جواتے دنوں سے کیا کیا الٹی باتیں سوچ رہی تھی۔ دادو جان کی بات سن کر بری طرح شرمندہ ہو گئی۔

اس نے تو اس طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ نہ کبھی یہ بات سوچی تھی اور حقیقت دادو جان سے جان کر اسے اپنے آپ پر بے تحاشا غصہ آ رہا تھا۔ اس نے دادو جان کو اتنے دن نظر انداز کیا تھا۔ ان کے دل پر کیا گزری ہوگی اس نے یہ بھی نہیں سوچا تھا اور اپنی جو اس سے اشتہار کرائی تھی ان سے بھی بدتمیزی کی تھی۔

”دادو جان، مجھے معاف کر دیں۔“ دل غم اور شرمندگی سے بھر گیا وہ دوڑ کر دادو جان سے لپٹ گئی۔ ”میں بہت بری ہوں۔ پلیز مجھے معاف کر دیں۔“ شدت سے روتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی۔

”دیکھا سعید میں نے کہا تھا ناں کہ میری ندیا میری بات مان لے گی۔“ دادو جان نے ندیا کے چہرے سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا سعید مگر ادا۔

”میں کھانا گرم کرتی ہوں۔“ سعید نے کہا اور اگلے پندرہ منٹ میں کھانے کی ٹیبل جگ چکی تھی۔

”آئی آپ بھی مجھے معاف کر دیں، میں نے آپ سے بہت بدتمیزی کی ہے۔“ سعید نے چاول ڈال کر پلیٹ اس کے سامنے رکھی تو ندیا کی آنکھیں پھر سے چمک پڑیں۔ اس نے سعید کا ہاتھ تھام لیا۔

”ندیا اب بس بھی کرو۔ سارے آنسو آج ہی بہا دیے تو اپنی شادی والے دن کیا گلہ سرین استعمال کر دیگی۔“

سعید نے اس کے گال تھپتھپائے۔

”جی نہیں، میں اپنا میک اپ بالکل خراب نہیں کروں گی۔“ ندیا نے اپنی جون میں آکر جواب دیا۔ اپنی سمیت دادو جان بھی اس کی بات سن کر کھل کر مسکرائیں۔

☆☆☆

دو دن پہلے اس کا آخری پیپر ہوا تھا۔ اگلا دن اس نے سو کر گزارا تھا۔ اپنا آپ یوں ہکا بھکا لگ رہا تھا کہ منوں بوجھ سے آزاد ہو گیا ہو۔ اس فراغت میں اس کا دماغ نئے نئے طریقے سوچنے میں مصروف تھا۔ ہر طرح کی پوری ہی پوری تھی۔ آؤر کی ممالک طبعیت اس کا خراب ہو گئی تھی اور وہ ایک ہفتے سے انگینڈا گیا ہوا تھا سو وہ

میر تھا اور اس کی بے پناہ پوری ت۔

”اپنا مقصد کسی طرح پورا ہوتا نظر نہیں آ رہا۔ کیوں

میں نادرن ایریاز سے ہو آؤں۔“ اس نے خود کو سٹول مشورہ دیا۔ ”آٹکھوں میں دیکھا ہے کہ کسی فوری صورت سی وادی میں کسی چشمے کے قریب ہیروئن لافانات ہوتی ہے اور پھر محبت ہو جاتی ہے۔ کسی پھیل کے قریب خوب صورت حسینہ کا پاؤں پھسلتا ہے تو ہیروئن آن

موجود ہوتا ہے اور پھر محبت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے یا پھر کسی کو خونا کا موڑ پر کسی نازنین کی گاڑی خراب ہو جاتی ہے اور پھر وہ ملکینک بن کر پہنچ جاتا ہے۔ بعد کا قصہ ہی محبت یا پھر کسی کھار کوئی دلربا سی پری حالات سے تنگ آکر خود کشی کرنے کے لیے پہاڑ کی چوٹی پر کھڑی ہوتی ہے تو ہیروئن زندگی کی خوشیاں لے کر پہنچ جاتا ہے۔ قصہ مختصر بیت اور پھر شادی۔“

”شاہ میر بیٹا.....“ خود کو مشورہ دینے کے ساتھ ساتھ وہ ہر کردار میں خود کو ایک خوب صورت لڑکی کے ہمراہ دیکھ رہا تھا۔ اپنے خیالوں میں غلطیاں دہیچاں تھا کہ بابا کی

”جی بابا.....“ ان کو دیکھ کر سیدھا ہو بیٹھا۔

”کیا حال ہے بیٹا جی؟“ وہ اس کے برابر صوفے پر بیٹھنے۔

”ٹھیک ہوں بابا۔“

”بچہ کیسے ہوئے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”اچھے ہوئے ہیں۔“ اس نے مردہ دلی سے جواب دیا۔

”جبر کے حالات زندگی میں غالب کے حالات زندگی

”جی انشاء اللہ لیکن شاید قتل ہونے والوں میں۔“

”وہ دل میں خود سے کہا۔“

”آج کل کیا پروگرام ہے؟“ رضا صاحب نے

”کچھ خاص نہیں۔“ شاہ میر کہہ کر ہچکچاتا تھا۔

”تو پھر ٹھیک ہے۔ تمہیں گاؤں جانا ہے۔ اس سال

آفس میں کام ہے فارغ ہونے میں کئی دن لگ جائیں گے۔“ وہ تو پہلے ہی طے کیے بیٹھے تھے۔ شاید اس کے فارغ ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔

”لیکن بابا.....“ اس کا احتجاج دو لفظوں پر ہی مشتمل ہوتا تھا۔

”بیٹا جی! اگر آپ اپنی پوری زندگی سے یہ بچا رگی بھرے دو لفظ نکال دیں تو بہت اچھی گزرے گی۔“ رضا صاحب نے کہا۔

”لیکن بابا.....“ اعتراض آپ ہی کو ہوگا۔“ اس نے

بابا پر زور دیا۔

”اچھا بس باتیں مت بناؤ۔ دو دن آرام کر لو اور سو مار کو روانہ ہو جاؤ۔“ انہوں نے حکم صادر کیا اور اٹھ کھڑے ہوئے، وہ بیٹھا رہ گیا۔ محبت کے حسین سفر کے شروع ہونے سے پہلے ہی بابا راہ میں آ کھڑے ہوئے تھے۔ No way کے بوڑھے کے مانند۔ اس کا جی چاہا کہ اپنی قسمت پر آٹھ آٹھ آنسو بہائے عمل ہی کرنے والا تھا کہ ردا آ بیٹھی۔

”شاہ بھائی کیا کر رہے ہیں؟“

”جی فرما میں، آپ کبھی کوئی حکم دیجیے غلام حاضر ہے۔“ احتجاج غصے کی صورت میں نکلا تھا۔

”بھیا! آج کیم ہے ناں تو آپ مجھے ڈائجسٹ لا دیں۔“ ردا اس کے غصے کی کم ہی پروا کرتی تھی اب بھی اس پر شاہ میر کے غصے بھرے انداز کا خاص اثر نہیں ہوا تھا۔

”مجھے نہیں جانا۔“ روٹھے بچے کے مانند اس نے

مند و سری طرف پھیر لیا۔

”بھائی پلیز! آپ کتنے اچھے ہیں۔“ ردا نے بکھن لگایا۔

”نہیں ہوں میں اچھا، بس مجھے نہیں جانا۔ تم اپنے بابا جان سے منگوالو۔“ شاہ میر نے کہا۔

”اوہ، تو آپ گاؤں جانے کی وجہ سے پریشان ہیں۔ شاہ میر بھائی میرے پاس ایک ایسی خبر ہے کہ آپ سو مار چھوڑ آجی گاؤں جانے کے لیے بھاگ آئیں گے۔“ ردا نے تجسس پیدا کیا۔



”جی..... ایسی کون سی خاص بات ہے گاؤں میں۔“ وہ فوراً سیدھا ہو بیٹھا۔

”اے نہیں پہلے ڈائجسٹ لا کر دیں پھر بتاؤں گی۔“ روانہ کیا۔

”دیکھو تم مجھ سے دھوکا تو نہیں کرو گی؟“ شاہ میر نے تنبیہی انداز میں پوچھا۔

”بالکل نہیں۔“ روانے اطمینان سے جواب دیا۔

”وعدہ کرو۔“ شاہ میر نے اپنا ہاتھ پھیلایا۔

”وعدہ!“ روانے اس کا ہاتھ تھام کر یقین دلایا۔

”ٹھیک ہے، میں ابھی ڈائجسٹ لے کر آتا ہوں۔“ وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

”بھائی سمو سے بھی لائے گا۔“ پوریج میں اسے ردا کی آواز آئی اور اس نے فوراً نکل جانے میں عافیت جانی ورنہ ردا کا فرما کر ریکارڈ بٹاتا ہی رہتا۔

وہ واپس لوٹا تو ردا لاؤنج کے دروازے پر ہی اس کی منتظر تھی۔ ڈائجسٹ دیکھ کر وہ تیزی سے لپکی مگر شاہ میر نے ہاتھ اٹھا کر لیا۔

”بھائی دو ناں۔“ ردا نے اچک کر لینے کی کوشش کی۔

”ایسے ہی دے دوں۔ پہلے تم مجھے وہ سبائٹک نیوز سٹاؤ پھر ملے گا۔“ ردا کی سائیڈ سے نکل کر وہ اندر داخل ہو گیا اور صوفے پر بیٹھ کر ڈائجسٹ مضبوطی سے ہاتھوں میں پکڑ لیا۔

”پہلے دو پھر بتاتی ہوں۔“ روانے کہا۔

”آں ہاں، پہلے خبر سٹاؤ۔“ شاہ میر نے اطمینان سے کہا۔

”یہ دو گے تو سٹاؤں گی ناں آپ کی خبر کا تعلق بھی اس سے ہی ہے۔“

”کیا.....؟ میرا تعلق اس ڈائجسٹ سے اور وہ بھی خواتین کے۔“ وہ حیران ہوا۔

”تمہارا مسئلہ خواتین ہی ہیں۔“ روانے کہا۔

”خواتین نہیں، صرف خاتون۔“ اس نے عج کی۔

”ایک ہی بات ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولی۔

”ایک ہی بات نہیں ہے ڈیئر سسٹر، تمہیں تو میرے

ناور خیال کا علم ہے ناں کہ جس سے محبت کروں گا اس سے شادی کروں گا۔ اگر میں نے خواتین سے محبت کر لی تو شادی بھی خواتین سے کرنی پڑے گی۔“ خواتین پر زور دیتے ہوئے اس نے بے چارگی بھرے انداز میں کہا۔

”مجھے لگتا ہے آپ سننا ہی نہیں چاہتے میں جاری ہوں۔“ ڈائجسٹ نہ ملنے پر ردا کافی ناراض ہو گئی تھی مگر اس کی دھمکی کا رگر ثابت ہوئی۔ شاہ میر نے فوراً اس کا ہاتھ پکڑ کر سامنے اٹھایا۔

”تم تو ناراض ہو گئیں، یہ تو ڈائجسٹ مگر اپنا وعدہ یاد رکھنا۔“ روانے بے تابی سے ڈائجسٹ کھولا اور ورق اٹھنے لگی۔

”اتنی توجہ سے اگر اپنی کتابیں پڑھو تو ذیل ایم اے کروں۔“ شاہ میر نے اس کی بے تابی پر چوٹ کی۔

”ادب والوں کے لیے مشکل ہی کافی ہے۔“ وہ بھی کم نہ تھی۔

وہ مسکرائے لگی تھی۔ شاید اسے اپنا مطلوبہ صفحہ مل گیا تھا۔ شاہ میر نے بھی اوپر سے جھانکا آخر ایسی کیا چیز ہے جس کے لیے وہ اتنی بے تاب ہو رہی تھی۔

”آخر اس میں ہے کیا؟ مجھے تو لفظوں کی ریل پیل کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا۔“ شاہ میر نے پوچھا۔

”ہاں تو اب سنو۔“ ردا اس کی طرف متوجہ ہوئی اور ایک صفحہ پلٹا۔

”یہ دیکھو، اس نے صفحے کی طرف اشارہ کیا اور ساتھ ساتھ شاہ میر کو کچھ بتانے لگی۔ جس کو سن کر شاہ میر کی آنکھیں جھپکے لگیں۔

”بہن ہو تو تم جیسی۔“ وہ خوشی سے چلایا پھر دونوں سموسوں سے انصاف کرنے لگے۔

☆☆☆

”پیاری مس دنیا

آپ اتنی خوبصورت ہوں گی میں نے تو خیال میں بھی نہیں سوچا تھا۔ جمیل سی خوبصورت آنکھیں، نازک بینی سیاہ زلفیں اور سب سے بڑھ کر گلاب کی پتھریوں سے نازک لبوں کی یہ دلکش ہنسی۔ دیکھتے ہی میرے دل کی ساری گھنٹیاں بج اٹھیں۔ آنکھوں میں ہزاروں محبت کے دیے روشن ہو گئے ہیں۔ میں نے تو ماں کو فوراً بتا دیا کہ اس

دن کی آخری چوہدرانی تم ہی ہو گی۔ تمہیں حاصل کرنے کے لیے میں آگ کا دریا بھی پار کر لوں گا۔ چوہدری ہندو خان ایک بار جو چڑچڑاہٹ سے کہتا ہے اسے حاصل کر کے دیتا ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں روک سکتی تم کو میری ہی سمجھو۔ میرا ارادہ تو ڈائریکٹ ملنے کا تھا مگر دوست دلاور خان کہتا ہے کہ تمہیں پہلے بتا دوں تاکہ تم کی پیاری پیاری کرلو۔ کل بننے کو تمہارے گھر ملاقات چوہدری شاہ نواز خان

تیسری دفعہ خط کو پڑھتے ہوئے اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے اور دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا جیسے ابھی باہر نکلتے گا۔ وہ تو ویسے بھی خاصی ڈر پوک اور نرم دل تھی۔ اس نے خط نے تو اس کے اوسان خطا کر دیے تھے۔ اسے سانس نہ رہا، وہ احموس ہو رہا تھا۔ تنقیدی اور تعریفی خط تو روز موصول ہوتے تھے مگر اس قسم کا خط پہلی بار مل رہا تھا۔

چوہدری شاہ نواز خان نام ہی اتنا خوشنما تھا۔ بندے کا تو دل بھی نہیں سکھ سکتی تھی۔ چوہدریوں کے متعلق جو کچھ اس زمان رکھتا تھا اسے ڈرانے کے لیے وہی کافی تھا۔ جب اس نے اپنا ایڈریس ڈائجسٹ میں دیا تھا تب دادو جان سے اسے منع کیا تھا مگر اس نے ان کی بات کو بے پروائی سے اٹھا لیا تھا۔ اس لیے کہ کسی بھی فن تنقید اور تعریف ہی کا نتیجہ ہے پھر اس نے سوچا تھا کہ ڈائجسٹ تو خواتین ہی کی چیز ہے۔ وہی خط لکھیں گی مگر اس خط نے تو اس کے دل کو روشن کر دیے تھے اگر وہ واقعی آ گیا تو..... اس تو اس کے سوچنے کی ہمت نہیں تھی اس میں۔ ”اور اگر دادو کو برا چل گیا تو..... یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کسی لڑکی نے اس کی ہمت اس نے دل کو کھلی دی ہے ناں، یہی بات ہو کسی لڑکی نے شرارت کی ہو گی ورنہ کسی چوہدری کے ہاتھ وقت کہاں کہ وہ خواتین کے رسالے پڑھتے اور

دنیا..... دنیا! آپ کی آواز آئی اور قدموں کی آواز سے لگ رہا تھا کہ وہ اسی طرف آ رہی ہیں۔ وہ اس سے چوکی۔ خط ابھی تک ہاتھ میں تھا۔

”دنیا! کب سے بلا رہی ہوں کیا کر رہی ہو۔“ دروازے کا ہینڈل تھام کر انہوں نے اندر جھانکا۔ اسی پل وہ خط لکھنے کے نیچے گھسیڑ کر سیدھی ہو بیٹھی تھی۔

”وہ میں..... میں.....“ ذہن ابھی تک الجھا ہوا تھا اس لیے بولنے کے بجائے اس نے بیڈ پر پلٹ کر خطوط کی طرف اشارہ کیا۔

”اچھا تو خط پڑھے جا رہے ہیں۔“ وہ اندر داخل ہوئیں۔ ”تمہیں اپنی تعریفیں کروانے کا کچھ زیادہ شوق نہیں ہو گیا۔“ انہوں نے ایک خط اٹھا کر پڑھتے ہوئے کہا۔

جس میں لکھا تھا کہ آپ کے ناول تو خوبصورت ہوتے ہی ہیں مگر آپ خود تو اتنی پیاری ہیں جیسے کوئی پری۔ اس دفعہ ڈائجسٹ میں دنیا کی تصویر شائع ہوئی تھی اس لیے بہت سے خط میں اس کی تعریف لکھی ہوئی تھی۔

”سنیں تو آئی.....“ خط کا کونا ٹکے کے نیچے سے نظر آ رہا تھا۔ اسے کچھ سوچ نہیں رہا تھا کہ کیا جواب دے کوئی اور وقت ہوتا تو اپنی تعریف پڑا کر کہتی کہ کیا میں اس تعریف کے قابل نہیں ہوں..... واقعی وہ بہت خوبصورت تھی۔ بڑی بڑی غزالی آنکھیں جن پر سیاہ پلکیں سایہ لگ چکی تھیں۔ گلاب کی پتھریوں سے نازک گلابی ہونٹ، ستواں ناک اور سب سے بڑھ کر اس کے گالوں میں پڑتا ڈھیل۔

”اوہ ہاں.....“ ایک اور خط کی طرف بڑھتا ہاتھ روک کر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ”میں تو بھول ہی گئی۔ دادو جان چائے پر انتظار کر رہی ہیں۔ اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ تم ان فضول کاموں میں مصروف ہو تو خوب عزت افزائی کریں۔“ سنبھلنے لگی کھڑی پر نگاہ ڈالی۔ چار بجے کر پانچ منٹ ہو چکے تھے۔ جس کا واضح مطلب چائے تھا۔

”میں واقعی بھول گئی۔ آپ چلیں میں ابھی آئی۔“ دنیا نے خطوط دیکھتے ہوئے کہا۔

”فورا آ جاؤ کہیں پھر نہ پڑھنے بیٹھ جانا۔“ اس نے سارے خط لکھنے کے دراز میں رکھے۔ خوبصورت ہینڈ رائٹنگ میں لکھا وہ خط چھاننے لگی تھی مگر پھر کچھ سوچ کر الماری میں رکھ دیا اور منہ دھو کر باہر لان میں آ گئی۔

”آئیں تعریف لائیں مہارانی صاحبہ جلدی آ جایا



کریں تاکہ خدام کو انتظامی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔“ دادو جان اسے دیکھتے ہی اپنے خاص لکچے میں بولیں جو وہ اس وقت اپنا ہی تھیں جب کوئی بات ناگوار لگتی تھی۔

”دادو جان میں پڑھ رہی تھی۔ پڑھنے میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔“ ندیانے فوراً صفائی پیش کی۔

”کیا پڑھ رہی تھیں آپ؟“ دادو جان نے عینک کو صحیح کرتے ہوئے گھورا۔

”دادو جان انگلش کا مضمون یاد کر رہی تھی۔“ اس نے جھوٹ بولا کیونکہ اگر دادو جان کو پتا چل جاتا کہ وہ خط پڑھ رہی تھی تو خوب ڈانٹ پڑتی تھی۔

”یہ تمہارا انگلش کا مضمون ہمیشہ چائے کے وقت پر ہی کیوں ہوتا ہے۔“ اس بات کا کیا جواب دیتی بس مسکرا کر رہ گئی۔ ”اگر آئندہ یہ مضمون چائے کے وقت آیا تو پھر چائے کے بجائے اسے ہی گھول کر پینا۔“

”جی دادو جان آئندہ دیر نہیں ہوگی۔“ اس نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

”ماشا اللہ کتنی سعادت مندی ہے میری۔“

”دادو جان اب بس بھی کریں۔“ آخر ندیا کو کہنا ہی پڑا کیونکہ جب دادو جان انتہائی عزت کے ساتھ بے عزتی کرنی نہیں تو اسے مطمئن نہیں ہوتی تھی۔

”اچھا ملکہ عالیہ، ہم بس کرتے ہیں آپ چائے لیجیے۔“ دادو نے کہا۔

”دادو جان.....! اب کی بار وہ روہانی ہوگی۔“

”اچھا..... اچھا اب رونے مت لگ جانا، چلو چائے پیو۔ اب کے دادو نے بھر درست کیا کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ وہ ابھی رونا شروع کر دے گی اور پھر کئی دن تک منہ بنائے رکھے گی جو وہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔

وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان ہو جانے والی وہ بار بار دل کو یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ یہ کسی لڑکی کی شرارت ہوگی مگر نہ جانے کیوں دماغ ایک ہی بات پر اٹک گیا تھا کہ ”اگر یہ سچ ہوا تو..... اگر وہ کل بچھڑ گیا تو.....؟“ اور یہ ایسے سوالیہ جملے تھے جو دل کی تسلی کا کوئی جملہ پورا نہیں ہونے دیتے تھے اگر سمیٹنے کی آخری تاریخ ہوتی تو وہ ایک نوٹ شائع

کر دیتی کہ اس کا ایڈیٹر تبدیل ہو گیا ہے اس طرح شاید جان چھوٹ جاتی مگر آج تو اس تاریخ تھی اور اسے لگ رہا تھا کہ مستقبل کی یہ دس تاریخ آئندہ کے ماضی میں بدترین تاریخ ہوگی۔

”ہائے اللہ، میں نے لکھنا کیوں شروع کیا اگر لکھ ہی لیا تھا تو شائع کیوں کر دیا اگر یہ بھی ہو گیا تھا تو پھر چ کیوں شائع کر دیا۔ کاش میں نے دادو کی بات مان لی ہوتی۔“ وہ خود کو کوس رہی تھی۔ سوچ سوچ کر دماغ پیٹ رہا تھا کہ کل کیا ہوگا۔

”اللہ میاں جی مجھے معاف کر دیں، میں نے دادو جان کی بات نہیں مانی تھی۔ اللہ میاں جی یہ کسی لڑکی کی شرارت ہو اگر واقعی کوئی چوہدری ہے بھی تو..... اس کی جیب کا تار پتھر ہو جائے۔ اسے پلیریا ہو جائے۔ اس کی فصلوں میں امریکن سنڈیوں کا حملہ ہو جائے اور وہ انہی میں مصروف ہو جائے۔ کچھ بھی ہو جائے مگر وہ کل یہاں بلکہ یہ بھی یہاں نہ آئے۔“ وہ عشاقی نیاز کے بعد بڑے خشوع و خضوع سے دعائیں مانگ رہی تھی حالانکہ انہیں یہ بددعا نہیں لیکن اس کی طرح معصوم تھیں۔

”حیرت ہے، یہ آج اللہ میاں سے کیا مانگا جا رہا ہے؟“ آئی بی کب سے اس کے اٹھے ہاتھوں، بند آنکھوں اور پٹے ہونٹوں کو دیکھ رہی تھی۔

”کچھ بھی نہیں۔“ اس نے آواز پر فٹ سے آنکھیں کھولیں اور ہاتھ گود میں رکھ لیے۔

☆☆☆

ساری رات وہ صبح سے سو نہیں سکتی تھی۔ اگر دادو کو آکھ لگ جاتی تو خواب میں بے ڈھنگی جسامت والا چوہدری شاہنواز آ جاتا۔ بڑی بڑی مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا۔ صبح کے قریب اس کی آکھ لگتی تھی۔ آئی بی نے نماز کے لیے جگایا مگر وہ ابھی نہیں تھی۔ اس پریشانی میں وہ ایک لکھی جانا بھی بھول گئی تھی۔ اس کے خیال میں سر سیر دنیا کی خوفناک ترین چیز تھے۔ کم از کم وہ تو صرف ان سے دل تھی اور ان کی وجہ سے پریشان رہتی تھی۔ بچتا بھی ستن رٹ لو اگر کہیں ایک لفظ بھی انکے تو سادے کیے کرتے پر پانی پھر جاتا مگر چوہدری شاہنواز کے خط نے اس کے

دل کی تڑپ کر دی تھی۔ جس شخص کے الفاظ سے وہ اتنی بے پروا ہو گئی تھی، اس سے ملنے پر کیا حال ہوگا۔ تقریباً دس بجے وہ بیدار ہوئی تھی۔ شب بیداری اور پریشانی کی وجہ سے دماغ سن ہو رہا تھا۔ دادو اور آئی بی جن میں مصروف تھی۔ ندیانے ایک کپ چائے بنائی اور باہر برآمدے میں دادو اماں کے تخت پر بیٹھی۔ لیکن سے برتنوں کے اٹھا کر آواز میں آ رہی تھیں مگر اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔

”ہریانے کے نیچے آج جیسی کر دو۔ کسٹرز میں ڈال دو۔ کوفٹوں میں مرچیں تیز رکھنا۔ کباب بعد میں فرما لی کر لیں گے۔“ دادو جان مسلسل آئی بی کو ہدایات دے رہی تھیں۔ ندیانے نظر میں گیٹ پر بھار بھی نہیں اگر رات آتے وہ آگیا تو کسی نہ کسی طرح اسے گیٹ سے ہی بھی بھیج دوں گی۔“ انکھوں کو ایک دوسرے میں پھنسانے بہت اچھے ذہن کے ساتھ تھی تھی۔ اس بات کا نوٹس نہیں لیا تھا کہ دادو جان اور آئی بی یہ انتہام کس لیے کر رہی تھیں۔ نہ ہی وہ اٹھ کر پکین میں تھی۔ حالانکہ پہلے وہ آئی بی کچھ بنا رہی ہوتی تھیں تو وہ بہانے بہانے سے اس کے چکر لگاتی رہتی تھی اور بہت سی چیزیں کھا جاتی تھیں۔ صبح تو پریشانی میں کچھ سوچ ہی نہیں رہا تھا۔ کبھی اٹھ کر ضروری انداز میں ٹہلنے لگتی اور کبھی پھر بیٹھ جاتی۔ دادو نے اس کے انداز پر دھیان نہیں دیا تھا مگر آئی بی جن کے گلاس ڈرو سے مسلسل نوٹ کر رہی تھیں۔ کام تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ دادو جان نوازل پر سنی کے لیے اپنے کمرے میں چل گئیں۔ آئی بی راستہ تیار کر رہی تھیں جب تیل ہوئی ندیا گیٹ کی طرف دوڑی۔

”جی کون؟“ اس نے پوچھا۔

”شاہ!“

”دیکھیے شاہنواز صاحب آپ ابھی یہاں سے جا چکے ہیں۔ میں آپ سے نہیں مل سکتی۔ اوہ، میں نہیں جانتی..... اصل میں آپ کو جن سے ملنا تھا وہ یہ گھر آئے۔“

”اگر آپ اور شفٹ ہو گئے ہیں۔ آپ یہاں سے فوراً جا چکی ہیں۔“ اس نے شاہ کو بولنا شروع کر دیا تھا اور

”اگر آپ یہاں سے فوراً جا چکی ہیں۔“ اس نے شاہ کو بولنا شروع کر دیا تھا اور

”اگر آپ یہاں سے فوراً جا چکی ہیں۔“ اس نے شاہ کو بولنا شروع کر دیا تھا اور

”اگر آپ یہاں سے فوراً جا چکی ہیں۔“ اس نے شاہ کو بولنا شروع کر دیا تھا اور

”اگر آپ یہاں سے فوراً جا چکی ہیں۔“ اس نے شاہ کو بولنا شروع کر دیا تھا اور

”اگر آپ یہاں سے فوراً جا چکی ہیں۔“ اس نے شاہ کو بولنا شروع کر دیا تھا اور

”اگر آپ یہاں سے فوراً جا چکی ہیں۔“ اس نے شاہ کو بولنا شروع کر دیا تھا اور

”اگر آپ یہاں سے فوراً جا چکی ہیں۔“ اس نے شاہ کو بولنا شروع کر دیا تھا اور

”اگر آپ یہاں سے فوراً جا چکی ہیں۔“ اس نے شاہ کو بولنا شروع کر دیا تھا اور

”اگر آپ یہاں سے فوراً جا چکی ہیں۔“ اس نے شاہ کو بولنا شروع کر دیا تھا اور

”اگر آپ یہاں سے فوراً جا چکی ہیں۔“ اس نے شاہ کو بولنا شروع کر دیا تھا اور

”اگر آپ یہاں سے فوراً جا چکی ہیں۔“ اس نے شاہ کو بولنا شروع کر دیا تھا اور

باہر کھڑے شاہ میر کو کیا سمجھا آتی۔

شاہ میر نے پھر سے نیم پلیٹ کو غور سے پڑھا اور دل میں سوچا۔ ”شاہد باگل خانے آگیا ہوں۔ حیرت ہے دو گھنٹے میں گھر چھوڑ کر چلے گئے، ابھی دو گھنٹے پہلے ہی تو دادو جان کو اپنے آنے کی اطلاع دی تھی۔“

”کون ہے ندیا؟.....؟“ آئی بی بھی آگئی تھیں۔

”کوئی نہیں، کاشی تھا اپنی امی کا پوچھ رہا تھا۔“ اس نے جھٹ سے جھوٹ گھڑا۔ باہر کی خاموشی سے اس نے سمجھا کہ شاید شاہنواز چوہدری چلا گیا ہے۔ ”آئیں چلتے ہیں۔“ دونوں نے قدم آگے بڑھائے مگر نیکل ایک بار پھر جچی تھی۔

”میں دیکھتی ہوں۔“ آئی بی کہتی ہوئی مڑیں اور ندیا کا دل اچھل کر قحط میں آگیا تھا۔ آئی بی نے گیٹ کھولا۔

”السلام علیکم، بھی اچھا سلوک کرتے ہیں آپ لوگ مہمانوں کے ساتھ.....“ اس نے دیکھا کوئی کہنے کے ساتھ ہی اندر داخل ہوا تھا اور اچھا خاصا ڈیسٹ بندہ جو کہیں سے بھی چوہدری نہیں لگتا تھا۔ اس نے نور اور ڈوڑ لگائی اور کچن میں آ کر ساس لیا۔ گلاس وٹو سے اس نے جائزہ لیا۔ آئی بی اور وہ نور دار باتیں کرتے اندر آرہے تھے۔

”اندرا چلتے ہیں ناں۔“ شاہ میر کو تخت پر ہی نیم دراز ہوتے دیکھ کر آئی بی نے کہا۔

”نہیں ابھی یہاں ٹھیک ہے۔“ اس نے بالوں کو سیٹ کیا اور سیدھا ہو بیٹھا۔ ”دیسے آئی بی مجھے ابھی اطلاع کی تھی کہ آپ لوگ نہیں اور شفٹ کر گئے ہیں۔“

تعارف کا مرحلہ طے ہو چکا تھا اور اب وہ انہیں انتہائی بے تکلفی سے آئی بی کہہ رہا تھا۔ ”دیسے یہ مجھے کون کون جو مجھے منزل سے بھٹکا رہی تھیں۔“ آئی بی کو گیٹ پر ندیا کے اتنی دیر کھڑے ہونے کی وجہ اب سمجھ میں آئی تھی۔ اسی نے شاہ میر سے مذاق کیا تھا۔

”ندیا..... ندیا!“ انہوں نے اسے پکارا۔

”جی آئی۔“ اس نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”باہر آؤ۔“

”یا اللہ خیر۔“ بات کا انداز اب اسے کچھ کچھ غور ہا

ماہنامہ پاکیزہ

241

جنوری 2008

کر دیتی کہ اس کا ایڈیٹر تبدیل ہو گیا ہے اس طرح شاید جان چھوٹ جاتی مگر آج تو اس تاریخ تھی اور اسے لگ رہا تھا کہ مستقبل کی یہ دس تاریخ آئندہ کے ماضی میں بدترین تاریخ ہوگی۔

”ہائے اللہ، میں نے لکھنا کیوں شروع کیا اگر لکھ ہی لیا تھا تو شائع کیوں کر دیا اگر یہ بھی ہو گیا تھا تو پھر چ کیوں شائع کر دیا۔ کاش میں نے دادو کی بات مان لی ہوتی۔“ وہ خود کو کوس رہی تھی۔ سوچ سوچ کر دماغ پیٹ رہا تھا کہ کل کیا ہوگا۔

”اللہ میاں جی مجھے معاف کر دیں، میں نے دادو جان کی بات نہیں مانی تھی۔ اللہ میاں جی یہ کسی لڑکی کی شرارت ہو اگر واقعی کوئی چوہدری ہے بھی تو..... اس کی جیب کا تار پتھر ہو جائے۔ اسے پلیریا ہو جائے۔ اس کی فصلوں میں امریکن سنڈیوں کا حملہ ہو جائے اور وہ انہی میں مصروف ہو جائے۔ کچھ بھی ہو جائے مگر وہ کل یہاں بلکہ یہ بھی یہاں نہ آئے۔“ وہ عشاقی نیاز کے بعد بڑے خشوع و خضوع سے دعائیں مانگ رہی تھی حالانکہ انہیں یہ بددعا نہیں لیکن اس کی طرح معصوم تھیں۔

”حیرت ہے، یہ آج اللہ میاں سے کیا مانگا جا رہا ہے؟“ آئی بی کب سے اس کے اٹھے ہاتھوں، بند آنکھوں اور پٹے ہونٹوں کو دیکھ رہی تھی۔

”کچھ بھی نہیں۔“ اس نے آواز پر فٹ سے آنکھیں کھولیں اور ہاتھ گود میں رکھ لیے۔

☆☆☆

ساری رات وہ صبح سے سو نہیں سکتی تھی۔ اگر دادو کو آکھ لگ جاتی تو خواب میں بے ڈھنگی جسامت والا چوہدری شاہنواز آ جاتا۔ بڑی بڑی مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا۔ صبح کے قریب اس کی آکھ لگتی تھی۔ آئی بی نے نماز کے لیے جگایا مگر وہ ابھی نہیں تھی۔ اس پریشانی میں وہ ایک لکھی جانا بھی بھول گئی تھی۔ اس کے خیال میں سر سیر دنیا کی خوفناک ترین چیز تھے۔ کم از کم وہ تو صرف ان سے دل تھی اور ان کی وجہ سے پریشان رہتی تھی۔ بچتا بھی ستن رٹ لو اگر کہیں ایک لفظ بھی انکے تو سادے کیے کرتے پر پانی پھر جاتا مگر چوہدری شاہنواز کے خط نے اس کے

ماہنامہ پاکیزہ

240

جنوری 2008



تھا۔ جسے وہ چوہدری شاہنواز سمجھ کر اول بول گئی تھی وہ کوئی اور تھا شاید یہ سب اہتمام اس کے لیے ہی ہو رہا تھا۔ دروازے پر پہنچ کر اسے اپنے حلیے کا خیال آیا۔ بانی تو سب ٹھیک تھا مگر جوتے..... نظر پیروں پر پڑی تو جوتے غائب تھے۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی مگر کہیں سے دریافت نہ ہوئے۔ ”ادوہ.....“ یاد آنے پر اس کے منہ سے نکلا۔ ایک جوتا تو وہ گیٹ کی طرف دوڑتے ہوئے پہن ہی نہیں سکتی تھی اور تخت کے پاس ہی رہ گیا تھا اور دوسرا شاید وہاں ہی کی دوڑ میں گیٹ کے پاس رہ گیا تھا۔

”ندیا.....!“ آئی کی آواز بھر سے آئی۔

”اب کیا کروں؟“ اس نے سوچا۔ ”چلو ایسے ہی چلتے ہیں وہ کونسا کسی ریاست کا شہزادہ ہے۔“ دل کڑا کر گئے آخر وہ باہر آ ہی گئی۔ شاہ جو سر سے پاؤں تک جائزہ لینے کا عادی تھا پہلے ہی سر طے میں حیران ہوا اس کو تنگے پاؤں دیکھ کر حیرانی میں دوسری نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔ وہ انتہائی مصحوبیت لیے سر جھکا کھڑی تھی۔

”شاہ میرے تم نے کیا کہا ہے؟“ آئی نے پوچھا۔

”وہ آئی اصل میں..... میں۔“ اب انہیں کیا بتانی کہ اس نے یہ سب شاہ میرے نہیں شاہنواز سے کہا تھا۔

”سوری.....“ کوئی جواب نہ سن پڑا تو منہ بنا کر اتنا ہی کہہ ڈالا۔

”جوتے کہاں ہیں تمہارے؟“ آئی نے بھی شاہ میرے کے بعد اس جائزہ لیا۔

”وہ رہے۔“ وہ ذرا غصے سے بولی۔ آئی جو ایک اجنبی کے سامنے ڈانٹ رہی تھیں۔

”جوتے پہنچو اور میری بات سنو۔“ آئی کہتی ہوئی ڈر تک لینے کے لیے کچن میں چلی گئی۔ ایک جوتا تو وہ پہن آئی مگر دوسرے کا مسئلہ تھا۔ یہ تو وہ دیکھ چکی تھی کہ دوسرا جوتا اس اجنبی کے دونوں پاؤں کے درمیان پڑا تھا بلکہ اس کا پاؤں اس کے اوپر ہی تھا اور وہ اجنبی ندیا کی موجودگی سے بے نیاز باہر لان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ تخت کے قریب آئی اور بیٹھ کر ہاتھ سے جوتا پکڑنا چاہا مگر اس پر تو ابھی بندے کا بھاری بھر کم بوٹ والا پاؤں تھا۔ اس نے تھوڑا کھینچا بھی مگر جوتا پھر بھی نہیں نکلا تھا۔

”یکسکیڈری..... میرا جوتا.....“ اس نے شاہ میرے سے کہا مگر وہ بدستور باہر نکلنے کے مشغلے میں مگن تھا۔ ”جوتا چھوڑ دیں۔“ اس نے دوبارہ کہا۔

”جی مجھ سے کچھ کہا.....؟“ اب کی بار وہ چپکا۔

”نہیں، آپ کے سر سے۔“ اس کی بے نیازی پر ندیا کا بارہ ہانی ہو گیا تھا۔ غصے میں عین سختی وہ اندر چلی گئی۔

”ایک تو میں شاہنواز کی وجہ سے پریشان تھی اور اب یہ شاہ میر صاحب اب یقیناً یہ داد کو بتائے گا اور داد پھر سے ادب تیز پر ایک لمبا پنچر دینے کے ساتھ ساتھ عزت افزائی بھی کریں گی۔“ اس نے سوچا۔ ”بھار میں جاؤں دونوں۔ شاہنواز اور شاہ میر۔“

☆☆☆

”کب واپس آ رہے ہو؟“ وہ لان میں کھڑی کین کی کرسی پر بیٹھا آذر سے موبائل پر بات کر رہا تھا لیکن اس کی تمام توجہ پودوں کو پانی دیتی ندیا پر مرکوز تھیں۔

”یار جلدی آؤ، تمہارے لیے ایک بہت بڑی خوشخبری ہے۔“ شاہ میر نے جان بوجھ کر آواز اونچی رکھی۔

”دوست بھی بہرے بنائے ہوئے ہیں۔“ ندیا کی بڑبڑاہٹ بڑی واضح تھی جو اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر گئی۔

”یار آہستہ بول، بہر انہیں ہوں میں۔“ اگلے پل آذری کی آواز اس کی مسکراہٹ کو مقیم میں بدل گئی۔

”خوشخبری تو سناؤ۔“ آذر کو اس کا لہجہ جس میں جتا کر رہا تھا۔

”ایک لڑکی ہے۔“ شاہ میر نے معنی فخری سے ندیا کو دیکھا۔

”کہاں.....؟“ آذر کو اس کی آدمی بات سے ہمیشہ ہی کوفت ہوتی تھی۔

”میرے سامنے۔“ شاہ میر کی مسکراہٹ اس کی گہری تھی۔ شاہ میر کی بات پر ندیا کا دل بڑی زور سے دھڑکا اور اس نے پلٹ کر شاہ میر کو غصے سے دیکھا۔

”جو مجھے بہت غصے سے دیکھ رہی ہے۔ اس لیے بعد میں بات کروں گا۔“ ایک توقف سے شاہ میر نے

کامل کی۔ اس کی آنکھوں میں شرارت رقصا تھی۔ ندیا نے غصے میں سارا پانی شاہ میر کی طرف اچھال دیا۔

”پاؤں پختی ہوئی اندر بھاگ گئی۔ شاہ میر کو لگا کہ اس پانی کی بوندیں نہیں گلاب کی چٹاں نچھاور کر دی گئی ہوں۔“

”یار، اس لڑکی سے مجھے محبت ہونے لگی ہے۔“ شاہ میر پھر سے آذر سے جو گفتگو تھا اور یہ اس کا پہلا جملہ تھا۔

☆☆☆

دو دن گزر چکے تھے اور چوہدری شاہنواز کا خوف کسی حد تک کم ہو چکا تھا۔ البتہ شاہ میر سے وہ ابھی تک ڈھانسی اور اس سے اس نے کوئی بات چیت نہیں کی تھی۔

گیارہ بج رہے تھے۔ آج صبح وہ در سے جا گئی کیونکہ پچھلے دو دن سے اکیڈمی سے چھٹی کی تھی اور بہت سا کام اکٹھا ہو گیا تھا اس لیے وہ رات دیر تک پڑھتی رہی تھی۔ اب وہ لاؤنج میں بیٹھی ناشتا کر رہی تھی۔ دادو جان، شاہ میر اور آئی باہر بازار گئے تھے۔ شاہ میر کی امی نے وہاں سے اس کو حلوالے کو کہا تھا۔ دادو جان اور آئی رواد کے لیے ٹکٹ لینے گئی تھیں۔ ناشتے کے برتن کچن میں رکھ کر جائے ٹکٹ لے کر وہ لاؤنج میں آئی تھی کونوں کی نکل ہوئی اس وقت وہ بڑے خوشگوار موڈ میں تھی جو ادھر کا ”مہندی“ گنگنا تے ہوئے اس نے ریوڑاٹھا تھا۔

”ہیلو جی، مجھے مس ندیا سے بات کرنی ہے۔“

”جی بات کر رہی ہوں۔ آپ کون؟“ بھاری بھر کم لہجہ سن کر اس کا دل دھڑکا اٹھا تھا۔

”میں چوہدری شاہنواز خان ہوں۔“ وہی خوشگوار لہجہ..... اس کے سارے خدشے درست ثابت ہوئے تھے۔

”آپ خاموش کیوں ہو گئیں شاید ناراض ہو گئی ہوں مجھ سے..... میں وعدہ کر کے آیا ہوں۔“ وہ بڑی باہر رانی تو ہر اچھے موقع پر ڈرامے کرنے لگتی ہے۔

خوشگوار لہجہ اس کے کھانسنے کے ساتھ ڈال لیا تھا۔ اس کے ساتھ اسپتال میں خوار ہونا پڑا پر آپ ناراض نہ ہیں۔ میں سبیں آپ کے شہر میں ہوں۔ جلد ہی ملنے

آؤں گا۔“ ادھر سے کیا بولا جا رہا تھا اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ اسے اپنا سانس رکنا محسوس ہو رہا تھا۔ کوئی بھی لفظ کہے بغیر اس نے ریوڑاٹھا دیا اور وہیں نیچے بیٹھ کر رونا شروع کر دیا۔ جس خطرے کو ٹکٹا محسوس کر رہی تھی وہ پھر سے سر پر آ کھڑا ہوا تھا۔

چند لمحے بعد نوں پھر رخ اٹھا تھا۔ وہ ایک دم سے اٹھی اور ریوڑاٹھا کر چھ کر بولی۔

”شاہنواز صاحب میں آپ سے بات نہیں کرنا چاہتی اگر تم نے دوبارہ نوں کیا تو.....“

”میں شاہ میر بات کر رہا ہوں۔“ اس کی بات کاٹ کر کہا گیا تھا، وہ ساکت کھڑی رہ گئی۔ ”وہ اس کے جملے کا کیا مطلب لے گا۔ اگر اس نے دادو کو بتا دیا تو..... اگر اس نے دادو سے دریافت کیا کہ شاہنواز کون ہے؟“ وہ سوچے جا رہی تھی۔

”دادو جان نے کہا ہے کہ آپ سے پوچھ لوں کہ کوئی چیز تو نہیں تھی۔“ اس کی خاموشی پر پوچھا گیا تھا۔

”جی نہیں۔“ بڑی مشکل سے وہ دو لفظ بول پائی تھی اور شام تک تیز بخار میں تپ رہی تھی۔

☆☆☆

شاہ میر کو گھر سے آئے سات دن ہو گئے تھے۔ چار روز تو اس نے گاؤں میں گزارے تھے۔ سارا حساب کتاب چیک کر کے رقم وصول کی تھی اور اس رقم کو ٹریولنگ چیک میں تبدیل کروا لیا تھا۔ یہاں آئے اسے تیسرا دن تھا۔ رضا صاحب جب بھی گاؤں آتے یہاں ضرور آتے تھے۔ سبز حیدر دادو جان ان کی سگی چنگی تھیں۔ ندیا اور سنعیہ کو ردا سے بڑھ کر چاہتے تھے۔ احمد خان کی موت کے بعد سے اب تک رضا صاحب نے ندیا اور سنعیہ کا ہر طرح سے خیال رکھا تھا۔ دادو جان نے ندیا اور سنعیہ کے رشتے کی ذمہ داری بھی انہیں سونپ دی تھی البتہ وہ اپنی ذمہ داری بخوبی نہاٹنا چاہتے تھے۔ سنعیہ کے لیے وہ کئی ایک اچھے رشتے دیکھ رہے تھے جب کہ ندیا کے لیے وہ شاہ میر کا ساتھ سوچ رہے تھے اور ان کی سبز بھی اس فیصلے سے سوئی حد متفق تھیں۔ اب شاہ میر کو یہاں بھیجے کا مقصد بھی بطور خاص یہی تھا



کہ وہ دنیا کو دیکھ لے۔ اسے لگا جیسے اس کی تلاش ختم ہو گئی ہو۔ اسے یہاں آنا بہت اچھا لگا تھا۔ وہ جان بوجھ کر دنیا کو تنگ کرتا اور اس کی جستجو ہٹ پر محظوظ ہوتا۔

”ہائے.....“ اس کا بخار کئی حد تک کم ہو چکا تھا وہ دل ہی دل میں شاہ میر کی شکر گزاری کی کہ اس نے داد و اور آ پی سے شاہنواز کا ذکر نہیں کیا تھا اگر ایسا کیا تو یقیناً داد و اور آ پی اس کے متعلق ضرور پوچھتیں۔ اب اس نے خود ہی چوہدری شاہنواز سے نیٹے کا فیصلہ کیا تھا کسی حد تک اس نے دل سے خوف کم کر لیا تھا۔

”آخر ہے تو انسان ہی ناں اب فون آئے گا تو میں اسے سمجھا دوں گی وہ یقیناً ناں لے گا۔ یہی سوچ کر اس نے دل کو ٹپکی دی تھی۔ ڈائجسٹ کی ایڈیٹر کا فون بار بار آ رہا تھا کہ ناؤں بھجواؤ۔ سو آج وہ کاغذ قلم سنبھال کر ہار سنگھاری بل کے نیچے آ بیٹھی تھی۔

”کیا کر رہی ہیں؟“ شاہ میر کی اچانک آمد اور ایک دم سے بولنے پر وہ بری طرح ڈر گئی تھی اور دنیا کے اس طرح ڈر جانے پر وہ زور سے ہنسا۔

”کپڑے دھو رہی ہوں۔“ اس کی ہنسی دنیا کو تپا گئی تھی۔

”اچھا میرا خیال تھا آپ کچھ لکھ رہی ہیں۔“ وہ بہت بے تکلفی سے اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

”مرثیہ لکھ رہی ہوں۔“ دنیا اس پر گہری نظر ڈال کر بولی تھی۔

”آں ہاں، آپ مرثیہ مت لکھیں ایسا کریں کہ قصہ دیکھیں اور بادشاہ حضور کے حضور پیش کر کے انعام حاصل کریں۔“ شاہ میر شاہانہ انداز میں کالر اکڑا کر بولا۔

”آپ زیادہ خوش نہ ہوں میں اپنے انعامات میں فقیروں کو شامل نہیں کرتی۔“ اس سے پہلے کہ شاہ میر جواب دیتا۔ داد و جان برآمدے سے آتی نظر آئیں، ساتھ کاشی بھی تھا۔

”اوو، آپ کی پوتی تو بہت ذہین ہے۔“ ان کے قریب آ جانے پر شاہ میر ایک نظر دنیا کے خوبصورت چہرے پر ڈال کر بولا اور دنیا تو فوراً اٹھ کھڑی ہوئی کہ

”نہایت آذر کے آ جانے سے کچھ وقت اچھا کٹ جاتا تھا۔ اس بوریٹ سے تنگ آ کر وہ ماما کے سر پہنچ گئی تھی۔ وہ خود بھی بہت اداس ہو گئی تھیں۔

”آجائے گا دو چار دن رہ کر۔“ روا کو تنگ کرنے کے لیے وہ بے پروائی سے بولیں۔

”کیا دو چار دن.....؟“ روا نے ہنسی سے آنکھیں پھیلائیں۔ ”ہرگز نہیں، میں ابھی فون کرتی ہوں اور دنیا سے کہتی ہوں میرے بھائی کو فوراً واپس گھر بھجواؤ۔“ روا نے کہا۔

”دنیا کیا واپس بھجوائے گی اب تو دنیا خود یہاں آنے کی تیاری کرے گی۔“ ماما تصور میں کچھ سوچ کر مسکرا کر بولیں۔

”دنیا، پلیز یہاں آؤ، یہ راستہ بناؤ میں ذرا آنا گوندھ لوں۔“ آ پی نے کچن میں سے کہا تھا۔ دنیا کچن کی طرف جاتے جاتے پٹی فون کی بیل ہو رہی تھی۔

”میں نے پہچان لیا آپ دنیا ہیں ناں۔“ دوسری طرف سے چوہدری شاہنواز کی آواز آتی۔

”کیا حال ہے آپ کا چوہدری صاحب؟“ ”دنیا، کون ہے؟“ ”دنیا جو کہ دل میں شاہنواز سے بات کرنے کے لیے الفاظ ترتیب دے رہی تھی آ پی کے استفسار پر پریشان ہو گئی۔

”کوئی نہیں آ پی، راناگ نمبر ہے۔“ کہتے ہوئے اس نے ریسیور رکھ دیا۔

”مما بھائی کو واپس بلائیں ناں۔“ وہ تو وہیں کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ آج پورے دس دن ہو گئے ہیں۔“ روا تقریباً رو دیے ہوئے نکلی ویسے بھی شاہ میر اس سے صرف دو سال بڑا تھا اور دونوں میں خوب دوستی تھی۔ بچوں کی طرح لڑائی جھگڑا کرنا ان کا معمول تھا اور اس لڑائی جھگڑے سے بہن بھائی کی محبت میں اضافہ ہی ہوتا تھا۔

اس کی غیر موجودگی کو بہت محسوس کر رہی تھی۔ پہلے بھی جب بھی شاہ میر اپنے دوستوں کے ساتھ کسی ٹرپ وغیرہ پر جاتا تھا روا کی توجہ ان پر رہتی آتی۔ اب جو مذاق وہ بے تکلفی سے شاہ میر سے کر لیتی تھی ماما بابا سے تو نہیں کر سکتی تھی۔ ان دس دنوں میں وہ شاہ میر کے لیے بہت اداس ہو گئی تھی۔ بیوروٹی سے واپس آ کر سارا دن بورنگز روتا

”مما جانی اتنی خوبصورت مسکراہٹ، ضرور کوئی بات ہے مجھے بھی بتائیں۔“ روا کے دل میں کھد بد ہونے لگی تھی۔

”آذر نے تمہیں نہیں بتایا ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”کیا.....؟“ روا نے حیرت سے پوچھا۔

”یہی کہ شاہ میر نے اسے فون پر کہا ہے کہ دنیا سے اچھی لگنے لگی ہے۔“ وہ بولیں۔

”کیا؟“ روا خوشی سے صحیح مار کر ان سے لپٹ گئی۔ ”اتنی اچھی خبر اور شاہ میر کے بچے نے مجھ سے پھسپائی۔ آئے تو سہی دیکھیں میں کیا حشر کرتی ہوں اس کا۔“ ولی خوشی کا عکس اس کے چہرے پر واضح تھا۔

”بیس شاہ میر واپس آ جائے تو میں اور تمہارے بابا جا کر بات طے کر آئیں گے۔“ انہوں نے کہا۔

”ہائے ماما کتنا مزہ آئے گا۔“ روا خوشی سے معمور لہجے میں بولی۔

”بیس بالکل ابھی آیا ہوں۔“ ڈائجسٹ نہیں کی چیز کھینچ کر وہ بیٹھے ہوئی بولا۔ ”لیکن آپ کس کا ذکر کر رہی تھیں اور رد صاحبہ کیوں گنہگار ہو رہی ہیں نہیں ان کے تو کوئی.....“ آذر نے شرارت سے روا کے سرخ چہرے پر نظر ڈالی۔

”بیٹا جی آپ اپنی فکر کریں۔ شاہ میر کی بات طے ہو جائے تو پھر تمہارا بھی کوئی بندوبست کرنی ہوں۔ تمہاری ماما کا روز فون آتا ہے کہ ایک بہو میرے لیے دیکھ رکھو۔ میں نے تو انہیں کہہ دیا ہے کہ بس اگلے ماہ شاہ میر اور آذر دونوں ہی کو کسی کے پلو سے باندھ دیں گے۔ ہاں، ایک خصوصی رعایت ہے تمہارے لیے اگر کوئی پلو والی آپ کو پسند ہے تو بتا دو پھر گلہ مت کرنا۔“ وہ بولیں۔

”ارے آنٹی کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ یہ کوئی عمر ہے میری شادی کی..... آذر گڑ بڑا گیا تھا۔

”ہاں ہاں ای یہ کوئی عمر ہے ان کی شادی کی۔ ابھی تو کھیلنے کودنے کے دن ہیں۔ ابھی تو یہ فیڈر میں دووہ پیتے ہیں۔“ روا نے فوراً بدل لیا تھا۔ آذر اس کی بات پر بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔

☆☆☆

دنیا اس وقت بڑے خوشگوار موزوں میں ایزی چیئر پر بیٹھی نیم جازی کا ناؤل ”شاہین“ پڑھ رہی تھی۔ کتنے دن ہو گئے تھے اسے کوئی اچھی کتاب پڑھے۔ چوہدری شاہنواز، سرسیر اور شاہ میر تینوں کی وجہ سے وہ پریشان تھی۔ چوہدری شاہنواز کا خوف قدرے کم ہو چکا تھا۔ سرسیر ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد آ گئے ہوئے تھے سو بے فکری ہی سے فکری تھی۔ وہ گیا شاہ میر تو اسے کل واپس ملے جانا تھا مگر ایک بات اسے اب سمجھن میں ڈالے ہوئے تھی کہ وہ آخر شاہ میر کی وجہ سے کیوں پریشان ہے۔ وہ جب بھی سامنے آتا وہ خود کو کہیں اور مصروف ظاہر کرتی مگر ایسا ہوتا نہیں تھا۔ وہ آ پی یا دادو سے بات کر رہا ہوتا تو دنیا کی ساری توجہ اس کی طرف ہوتی تھی مگر بظاہر وہ کسی اور کام میں مگن رہتی اور جب وہ اس سے بات کرتا تو وہ خود بخود اس کی ہر بات کا الٹا جواب دیتی۔ وہ اپنے ہی

”بیس بالکل ابھی آیا ہوں۔“ ڈائجسٹ نہیں کی چیز کھینچ کر وہ بیٹھے ہوئی بولا۔ ”لیکن آپ کس کا ذکر کر رہی تھیں اور رد صاحبہ کیوں گنہگار ہو رہی ہیں نہیں ان کے تو کوئی.....“ آذر نے شرارت سے روا کے سرخ چہرے پر نظر ڈالی۔

”بیٹا جی آپ اپنی فکر کریں۔ شاہ میر کی بات طے ہو جائے تو پھر تمہارا بھی کوئی بندوبست کرنی ہوں۔ تمہاری ماما کا روز فون آتا ہے کہ ایک بہو میرے لیے دیکھ رکھو۔ میں نے تو انہیں کہہ دیا ہے کہ بس اگلے ماہ شاہ میر اور آذر دونوں ہی کو کسی کے پلو سے باندھ دیں گے۔ ہاں، ایک خصوصی رعایت ہے تمہارے لیے اگر کوئی پلو والی آپ کو پسند ہے تو بتا دو پھر گلہ مت کرنا۔“ وہ بولیں۔

”ارے آنٹی کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ یہ کوئی عمر ہے میری شادی کی..... آذر گڑ بڑا گیا تھا۔

”ہاں ہاں ای یہ کوئی عمر ہے ان کی شادی کی۔ ابھی تو کھیلنے کودنے کے دن ہیں۔ ابھی تو یہ فیڈر میں دووہ پیتے ہیں۔“ روا نے فوراً بدل لیا تھا۔ آذر اس کی بات پر بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔



زین ہونے پر ہر لگائی۔

”ایک ایم بی اے اور دوسری ایم بی بی ایس کر رہی ہے لیکن آپ نے تو کہا ہے کہ وہ دونوں بہت ذہین ہیں۔“ شاہ میر بولا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا۔ ایم بی اے اور ایم بی بی ایس کم عقل لوگ کرتے ہیں۔“ ندیا غصے سے بولی۔  
”دیکھیں محترمہ، شادی کم از کم عقل والا کام نہیں ہے۔“ شاہ میر اس کے غصے سے بے نیاز تھا۔

”شادی..... اس میں شادی کا کیا ذکر؟“ ندیا کی آنکھوں میں حیرت لکڑے لیے لگی۔

”شادی ہی کا تو ذکر ہے۔ ایم بی اے یعنی میاں بیوی اکیلے اور ایم بی بی ایس یعنی میاں بیوی بچوں سمیت۔“ شاہ میر کی بات پر نہی بے اختیار ان کے لبوں پر آگئی تھی اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”یہ ہنسنے ہوئے کتنی پیاری لگتی ہے۔“ شاہ میر نے اس کے صبح کے اجالے کی طرح کمرے سے چرے پر نظر ڈال کر بوجھا۔ چمکدار سیاہ غزالی آنکھیں ہنسنے سے نم ہو گئی تھیں۔

”آپ آنسکریم کھانے چلیں گی۔“ کچھ پل اس کے ساتھ گزارنے کی خواہش میں دل جاگئی تھی۔  
”دادو سے میں پوچھ چکا ہوں۔“ اس کے بولنے سے پہلے ہی شاہ میر نے کہا۔

”تو پھر چلیں۔“ ندیا کچھ سوچ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ شاہ میر نے آپنی سے بھی کہا مگر انہوں نے معذرت کر لی۔ سورج الوداع کرشمیں بکھر رہا تھا۔ ندیا کی دہکتی رنگت سورج کی کرنوں میں نہا کر اور چمکنے لگی تھی۔ مارکیٹ دس منٹ کی داک پر تھی۔ شام کا وقت ہو چلا تھا خوب گہما گہما تھی۔ شاہ میر کو ندیا کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتا اچھا لگ رہا تھا جبکہ ندیا کا دل اداس سا ہو گیا تھا۔ غروب ہوتے سورج کی طرح اسے اپنا دل بھی تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

”آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں؟“ شاہ میر نے اس کے چپ چپ روپ پر نظر جمائی۔

”نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ اس پل اس کا

دل تھا کہ وہ شاہ کو شاہنواز کے متعلق بتا کر اپنے دل کا بوجھ ختم کر لے مگر وہ ایسا نہ کر سکی۔ شکر یا اسٹیک بار کی مشہور شاہنواز تھی۔ سوشا میر اسے وہیں لے آیا تھا۔ سورج اپنی کرشمیں سمیٹ چکا تھا۔ البتہ اقی پر بالکی سی رہتی باقی تھی۔

”شاہ میر، پلیز گھر چلتے ہیں آپ پیک کر والیں یا کرکھالیں گے۔“ ندیا اس کے برابر ہی کھڑی تھی۔ شاہ کے باہر چھوٹے سے لان میں رکھی چیز زبردستی میں سے ایک کے پاس وہ کھڑے تھے۔ وہ اس کے آؤٹس کریم کا کھد کر ندیا کے لیے چیز ہٹا رہا تھا کہ اس کی مدھم سی آواز سنائی دی اور شاہ میر کو آواز کچھ رازی ہوئی محسوس ہوئی۔ اقی کی سرخی پیلاہٹ میں بدل چکی تھی اور ندیا کی رنگت اس سے کہیں زیادہ زرد ہو رہی تھی۔

”کیا ہوا ندیا، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ شاہ میر پریشان ہو گیا تھا۔ اسے لگا جیسے وہ اس کے پیچھے چھپنا چاہ رہی ہو۔  
”پلیز ندیا کیا ہوا ہے آپ کو؟“ وہ اس کے لیے پر گھبرا گیا تھا۔

”کچھ نہیں، پلیز گھر چلتے ہیں۔“ وہ سہمی نظروں سے شاہ کے سامنے بے ٹریک پر دیکھتے ہوئے بولی۔ شاہ میر نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا اور ندیا کی پریشانی کی ساری وجہ سمجھ گیا۔ جب میں بڑی عجیب سی شکل کا آدمی بیٹھا تھا۔ لال چمکتی آنکھیں فاصلے سے بھی واضح نظر آ رہی تھیں۔ اور خوف کا بڑی بڑی ٹل ٹلانی ہو چکی تھیں، ندیا شاید اسے دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ شاہ میر نے اسے مسکرایا۔ لڑکے کو دکھانا ڈر اور اور ایک پیک لانے کے لیے منٹ کر کے وہ واپس ہو لیے۔ ندیا بار بار منٹ منٹ کر رہی تھی۔

”اگر آپ کو کوئی پرالہم ہے تو مجھ سے شیئر کر سکتی ہیں۔“ راستے میں اس نے ندیا سے کہا۔

”نہیں، نہیں پرالہم تو کوئی نہیں ہے۔ مغرب ہو گئی ہے اس لیے پریشان ہوں دادو جان انتظار کر رہی ہیں۔“ اس نے فصول سا بہانہ بنایا۔ حالانکہ پریشانی

اس کے چہرے پر کوئی اور داستان سنار ہی تھی۔  
”جیسے آپ کی مرضی۔“ شاہ میر نے کندھے اچکائے۔

”آپ یہ لے جائے مجھے کانگ کارڈ خریدنا تھا یا وہی نہیں رہا۔ میں نے کراچی آتا ہوں۔“ گیٹ پر پہنچ کر شاہ میر نے شاہنواز کو کھنکھایا۔ دادو اور بی مغرب کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ اس نے شاہ سے آنسکریم نکال کر قرینچ میں رکھی۔ وضو کر کے وہ نماز کے لیے کھڑی ہوئی تھی کہ فون کی بیل بجلی جانماز کا کوٹا موڑ کر وہ لاؤنج میں آئی۔

”ہیلو۔“  
”مس ندیا ابھی شاہ پر آپ کے ساتھ کون تھا؟“ دوسری طرف کی گرجدار آواز نے اسے سہا کر رکھ دیا۔

”دیکھیے شاہنواز صاحب میری زندگی میں دخل مت دیجیے۔ آپ کے لیے اچھا نہیں ہوگا اور جو کوئی بھی ہے آپ کو مطلب نہیں ہونا چاہیے۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ..... میرے فیاسی ہیں اور اگر دوبارہ آپ نے مجھے ڈسٹر ب کیا تو بہت برا ہوگا آپ کے لیے اور آپ.....“

”مس ندیا میرا نام چوہدری شاہنواز خان ہے اور چوہدری شاہنواز جو چیز ایک بار پسند کر لے وہ اس کی ہو جاتی ہے۔ دیکھ لوں گا آپ کے فیاسی کو۔“ ندیا میں نہ جاننا تھی ہمت کہاں سے آگئی تھی کہ اس نے بڑے غصے سے چوہدری شاہنواز کو جواب دیا تھا لیکن اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی شاہنواز نے پہنچ دیتے لہجے میں کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔ ”اوہ میں نے یہ کیا کر دیا۔“ ندیا کی نظروں میں وہ جیپ والا شخص آ گیا۔ ”نہیں وہی تو.....؟“ اسے اللہ مجھے اس مشکل سے نکال، میری مدد کر۔“ نماز پڑھ کر وہ بڑی عاجزی سے رو کر دعا مانگ رہی تھی۔

☆☆☆

ماما دادو اور آڈر کی بے تحاشا فون کالز پر آخر کار

”میں نے کہا، کیا ہم دوستی نہیں کر سکتے؟“ شاہ میر نے پھر سے جملہ بڑھایا۔  
”دوستی اور آپ سے.....؟“ کتاب کے گلابی صفحوں پر ایک تصویر ابھری تھی۔ اس نے کتاب بند کر کے شاہ میر کو دیکھا۔ ایک خیال اس کے ذہن میں آیا۔ ضرورت کے وقت تو گدھے کو بھی باپ بنایا جاسکتا ہے۔ اسے اپنا لکھا ناول یاد آیا جس میں ہر سونے دن سے بچنے کے لیے اپنے کزن کو اپنا فیاسی ظاہر کیا تھا۔  
”ہاں، کیوں نہیں، بالکل ہو سکتی ہے۔“ انکار کرتے کرتے وہ اقرار کر گئی۔  
”مجھے پتا تھا آپ ضرور دوستی کر لیں گی۔“ شاہ میر مسکرا کر بولا اور ندیا اس کے پریقین لہجے پر چل کر رہ گئی۔

”آپ مجھے بتائیں کہ میرے علاوہ آپ کی کتنی دوست ہیں؟“ شاہ میر نے پوچھا۔  
”دو ہیں۔“ ندیا نے جوابا کہا۔  
”اچھا کیا کرتی ہیں؟“ شاہ میر نے جیسے انٹرویو کا آغاز کیا۔  
”پڑھتی ہیں۔“ ندیا نے کہا۔  
”کیا پڑھتی ہیں؟“ وہ وکیل کی طرح جرح کرنے لگا تھا۔

”ایک ایم بی اے کر رہی ہے اور دوسری ایم بی بی ایس۔“ ندیا نے ان کی شاندار تعلیم بیان کر کے ان کے



شاہ میر نے ایک فتنے کے بعد واپس کا رخ سربانہ  
 ہی لیا۔ دادو اور آبی کو تو ایک ہی فتنے میں اس نے اپنا  
 گرویدہ بنالیا تھا۔ وہ دونوں اس کی واپسی پر بہت اداس  
 تھیں۔ وہ خود بھی تو بہت افسردہ تھا مگر اس کا دل کسی اور  
 کے چہرے پر اداسی دیکھنے کا خواہش مند تھا مگر اسے بڑی  
 مایوسی ہوئی وہاں تو اطمینان ہی اطمینان تھا۔ البتہ وہ  
 خلاف معمول چپ بھی اس نے کوئی یا طنزیہ بات  
 بھی نہیں کی تھی۔ شاہ میر کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔  
 ”میں پھر آؤں گا۔“ ایک فقرہ چپ کے شاہ میر  
 کے لبوں سے نکلا تھا اور اس نے دنیا کی آنکھوں میں  
 انتظار کا ستارہ بن کر چمکتے دیکھا تھا۔ گھر میں اس کے لیے  
 ایک بمبائیک نوز منتظر تھی جس نے سارے ستارے  
 ریزہ ریزہ کر دیے تھے۔  
 ”ہم نے تمہارا رشتہ طے کر دیا ہے۔“ وہ صبح گھر  
 پہنچا تھا اور سارا دن سو کر گزارا تھا۔ شام کو چائے پر خاصا  
 اہتمام تھا۔ چائے پی کر اس کا ارادہ آذر کی طرف جانے  
 کا تھا۔ ماما کے جملے پر سب کچھ بھول گیا۔  
 ”کیا.....؟“ وہ حیرت سے جھمبہ ہی تو بن گیا۔  
 ”یعنی آپ نے مجھ سے پوچھے بغیر میرا رشتہ طے کر  
 دیا ہے۔“ اس نے کپ میز پر چٹا۔ محبت کی ناؤ ڈوبتی نظر  
 آرہی تھی۔ پہلے تو محبت ہو ہی نہیں رہی تھی اور اب اگر  
 کچھ بات بنتی نظر آرہی تھی تو اس کے پانے کی راہیں  
 مسدود کی جارہی تھیں۔ ابھی دن میں ہی تو خواب میں  
 اسے نہایت نظر آئی تھی اور مامیہیر سے پہلے ہی خواب توڑ  
 رہی تھیں۔  
 ”تم سے کیا پوچھتی ہمیشہ کی طرح انکار کر  
 دیتے۔“ ان کے سکون میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔  
 ”لیکن ماما میں کوئی لڑکی نہیں ہوں۔“ اس نے  
 جیسے کوئی نئی اطلاع دی۔  
 ”تو پھر.....؟“ انہوں نے جیکسی نظروں سے  
 دیکھا۔  
 ”تو یہ کہ میں اب انکار کر دوں گا۔ خود ہی جائے گا  
 بارات لے کر۔“ اس کے اکھڑے لہجے پر وہ بھی غصے میں  
 آ گئیں۔

”شاہ میر بہت بدتمیز ہو گئے ہوتے۔ بات کرنے کی  
 تمیز نہیں ہے۔“ ان کے تپتے موڈ کو دیکھ کر وہ بھاگی  
 طرح بیٹھ گیا۔  
 ”ماما آپ ردا کی شادی کر دیں۔“  
 ”تم سے پوچھ کر نہیں کروں گی۔ تم اپنی تیاری  
 کرو۔ فردری کی جنٹیلٹی ہے صرف ایک مہینہ زندہ کیا  
 ہے۔“  
 ”مجھے نہیں کرنی شادی۔“ کرسی کو ٹھوکر مار کر وہ  
 ہٹ دھرمی سے بولا۔  
 ”شادی تو تم کرو گے جیسے تاریخ کو اور وہاں ہی  
 جہاں ہم نے طے کی ہے۔“  
 ”ماما آپ کچھ بھی کر لیں میں شادی نہیں کروں  
 گا۔“ ان کے فیصلہ غونسنے پر وہ چڑ گیا۔  
 ”کیسے نہیں کرو گے۔ بات کرنی ہوں تمہارے  
 باپ سے۔“ نیکل ڈالیں اپنے لاؤنگے۔ ذرا تمیز نہیں  
 بات کرنے کی۔ ماں سے بحث کرنے لگا ہے۔ ”نئے  
 سے تیز آواز میں کہتی ہوئی وہ اندر چلی گئیں۔ بابا کا  
 حوالہ سن کر وہ بالکل ہی مایوس ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ  
 ماما، بابا کی عدالت میں اپنا مقدمہ پیش کریں اور فیصلہ  
 حسب معمول اس کے خلاف ہو جاتا اور وہ ہمیشہ کی طرح  
 ”لیکن بابا“ جیسے دو لفظا احتجاج کے طور پر استعمال کر کے  
 مقدمہ ہار جاتا اس نے فوراً اپنے وکیل صفائی آذر کو فون  
 کیا۔ اور وکیل صفائی بوتل کے جنن کی طرح حاضر تھا۔  
 شاہ میر نے تمام حالات و واقعات آذر کے گوش گزار کر  
 کے اسے ماما کو راضی کرنے بھیجا اور خود ساری کارروائی  
 سننے کے لیے دروازے سے کان لگا کر کھڑا ہو گیا۔ دلائل  
 بیانات کی بھرپور آوازیں گونجتی رہیں اور پھر ٹیکٹ  
 خاموشی چھا گئی جیسے اندر کوئی ہو ہی نہ۔ اس نے حیرت  
 سے دروازے کو دیکھا مگر جن تو تھا نہیں کہ دروازے کے  
 پار بھی دیکھ لیتا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ کان کو ابھی سے  
 خوب ہلایا اور پھر سننے کی کوشش کی۔ سرگوشیاں اور دلی  
 دلی ہنسی سنائی دی مگر بات کیا تھی سمجھ نہ آئی۔ دروازہ  
 ایک جھٹکے سے کھلا اور شاہ میر گرتے گرتے پچھا تھا آذر  
 چمکتا دیکھا چہرہ لیے باہر نکلا۔ شاہ میر کے پاس سے بول

”کیا جیسے اسے دیکھا ہی نہ ہو۔ تہایت اسٹائل سے  
 ہونے پر بیٹھ گیا۔ شاہ میر یوں نظر انداز کیے جانے پر  
 غلامی گھر وقت کا تقاضا تھا کہ گدھے کو باپ بنا لیا  
 ہے۔“  
 ”کیا فیصلہ ہوا.....؟“ آذر کے قریب آ کر اس  
 کے بے تاب سے پوچھا۔ جواب میں آذر بڑی اداس  
 نظر کیا کہ اس کے سفید دانت جگمگاٹے۔  
 ”وہ نہیں مان رہے؟“ شاہ میر کو آگ لگ گئی۔  
 ”اس لیے یہ بیٹنی نکل رہی ہے۔“ وہ غصے میں  
 اندر پر چڑھ دوڑا۔  
 ”دیکھو میرے بھائی، ماں باپ کی بات مان لو۔“  
 آذر نے اطمینان سے کہا۔  
 ”تمہیں اس لیے نہیں بلایا کہ تم مجھے نصیحتیں کرنے  
 کو۔“ وہ چیخ کر بولا۔ جواب میں آذر کے چہرے پر  
 دلی مسکراہٹ تھی۔ کوئی ایسی بات ضرور تھی جو شاہ میر کو  
 ہنسنے پر مجبور کر گئی۔ ایسی خوبصورت مسکراہٹ آنکھوں  
 سے کچھ پالنے کی خوشی جھلک رہی تھی۔  
 ”تمہیں کیا کوئی قانون کا خزانہ مل گیا ہے جو یوں  
 آذر سے پیٹ کا اشتہار بن رہے ہو۔“ شاہ میر نے چڑ کر  
 کہا۔  
 ”یہی سمجھ لو۔“ مسکراہٹ بدستور لبوں پر تھی۔  
 ”دیکھو سیدی سیدی بات کرو ورنہ سارے دانت  
 آڑوں گا۔“ شاہ میر کو غصہ آنے لگا تھا۔  
 ”یہ تمہاری ان کی تصویر ہے۔ اتنی خوبصورت کہ  
 کیسے ہی بے ہوش ہو جاؤ گے۔“ آذر نے کوٹ کی  
 بے سے تصویر نکال کر اس کی آنکھوں کے سامنے  
 رکھی۔  
 ”مجھے نہیں دیکھنی۔“ احتجاجا اس نے آنکھیں تختی  
 بند کر لیں مگر ایک جھٹک آنکھوں میں آن گئی تھی۔  
 ”نہ پٹ سے آنکھیں کھولیں۔“  
 ”کیا.....؟“ وہ واقعی بے ہوش ہونے کو  
 تیار نہ تھی۔ آبی نے کہا ہے کہ تصویر دیکھا کر تمہاری  
 دل لے لوں اگر تمہیں پسند نہیں تو وہ انکار کر دیں گی۔  
 ”آہ آہیں اپنا ہونہار سپوت ساری دنیا سے عزیز

ہے۔“ اس نے سارے جملے میں انکار پر زور دیا۔ شاہ  
 میر ایک لمحہ ضائع کیے بغیر بولا۔  
 ”نہیں، نہیں میں بھلا ماما کی بات کیسے ٹال سکتا  
 ہوں۔ میں تو مشرقی لڑکا ہوں جو ماں باپ کہیں چپ  
 چاپ مان لوں گا۔“ ڈیو میسی کی اہمیت آج واضح ہوئی  
 تھی۔  
 ”تمہاری“ ”ہاں“ تو میں آبی تک پہنچا دوں گا مگر  
 پہلے تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔“ آذر بولا۔  
 ”ایک کام میں تو ساری عمر تمہاری غلامی پر تیار  
 ہوں۔“ شاہ میر نے کہا۔  
 ”اس کی ضرورت نہیں۔ اصل میں تمہیں میرے  
 لیے بات کرنی ہے۔“ آذر لڑکیوں کی طرح شرمایا۔  
 ”تمہارے لیے بات مگر کیا.....؟“ شاہ میر نے  
 حیرت سے پوچھا۔  
 ”بہت کھانا شخص ہے صرف اپنی مطلب کی بات  
 سمجھ آتی ہے۔ اس کے لیے۔“ آذر نے تصویر ایک بار  
 پھر اس کے سامنے کی۔ دنیا کے ساتھ چمکتے چہرے والی  
 آبی تھیں۔  
 ”یہ سہیہ ہے جس کی تلاش میں آٹھ سال سے کر  
 رہا ہوں۔“ آذر کی بات پر شاہ میر خوشی سے چیخ پڑا۔  
 ”ساری بات سمجھ آ گئی۔“ شاہ میر آذر سے پٹ  
 گیا تھا۔  
 ”آبی وہ لڑکی ہیں اور تم میرے ہونے والے  
 آپا.....“ شاہ میر کچھ کہتے کہتے رگ لگا۔  
 ”اُردو لٹریچر رکھ کر کبھی تم مذکر مونث کے ایسے  
 صیغے بولو گے۔“ اس کے آپا کہتے پر آذر بے ساختہ ہنسا  
 تھا۔  
 ”میرا مطلب تھا کہ ہم دونوں ایک ہی گھر جائیں  
 گے۔“ خیال سے سر جھکاتے ہوئے پھر بولا۔  
 ”ہم دونوں نہیں..... وہ دونوں ایک گھر میں آئیں  
 گی۔“ آذر نے پھر صبح کی۔  
 ”وہی، وہی اچھا زیادہ مودب بننے کی ضرورت  
 نہیں۔ یاد کرو میں نے کہا تھا کہ میری محبت سے زیادہ  
 خوشی تمہیں ہی ہوگی، کیا تاراجی جملہ تھا۔“ شاہ میر نے یاد



”یہ تو ج ہے۔“ آذر نے اعتراف کیا۔ زندگی نے اس کے گرد خوشیوں کے ڈھیر لگا دیے تھے۔

☆☆☆

تمہیں کیسے بتا دوں تم میری منزل ہو جنہیں دیکھا نظر نہ لے دی معصوم سادل ہو عالمگیری کی خوش و شگ آواز پورے کمرے میں بکھری رہی تھی۔ اس نے ہنوں کی مدد سے سر پر نکائے بھاری بھر کم کا مدار روپے کی اوٹ سے کمرے کا جائزہ لیا۔ روا آئنی اور ڈھیروں خواتین کا جھوم ابھی ابھی اس کے کمرے سے نکلتا تھا اور ان سب کے جانے پر اس نے کئی گھنٹوں بعد اب سکون کا سانس لیا تھا۔ نیوب لائٹ کی روشنی میں ہر چیز جگمگ رہی تھی۔ بڑا خوبصورت ماحول تھا۔ ڈارک براؤن گھر کا کارپٹ وال ٹو وال بچھا تھا۔ دیواروں پر لائٹ براؤن پینٹ کیا گیا تھا اور دیواروں پر چابجا گلاب کے سرخ و سفید پھول چسپاں کیے گئے تھے۔ بیڈ پر سفید بیڈ شیٹ تھی۔ جس پر گلاب کی پتیوں سے دائرہ بنایا گیا تھا۔ بیڈ کے دائیں طرف دیوار کے ساتھ ڈریسنگ ٹیبل تھی اور ساتھ ہی کمپوٹر رکھا تھا۔ اس کی نظریں پھر ڈریسنگ ٹیبل پر آ جی گئیں۔ آئینے میں اس کا عکس واضح تھا۔ ڈارک میرون اور گولڈن لہنگا چوٹی، نفیس طلائی زیورات اور مہارت سے کیے گئے میک اپ نے اس کے حسن میں چار چاند لگا دیے تھے۔ یہ سب اس کی جلدی ہو گیا تھا کہ اسے اب تک یقین نہیں آ رہا تھا۔ شاہ میر کی واپسی کے ٹھیک تین دن بعد اس کی امی اور درواہ، انگل رضا کے ساتھ اس کے لیے شاہ میر کا رشتہ لائے جسے دادو اور آبی نے باہم مشورے سے نہ صرف فوراً منظور کر لیا بلکہ تاریخ بھی طے کر دی گئی تھی۔ یعنی فردری کی پچیس اور آج ٹھیک ایک ماہ بعد ندیا احمد خان، ندیا شاہ میر بن کر یہاں آ چکی تھی۔ وہ بھی ابھی اتنی جلد شادی پر راضی نہ ہوئی اگرچہ پدری شاہنواز نے اس کی زندگی میں بے سکونی نہ پیدا کر دی ہوئی۔ اس نے دل کھول کر دل ہی دل میں چوہدری شاہنواز کو گالیوں سے نوازنا تھا۔ ”آبی اتنی خوبصورت لگ رہی تھیں اور آذر بھائی کتنی

شاندار پریشانی کے مالک ہیں۔“ آبی کے خیال پر اس کے لبوں پر مسکراہٹ رہی تھی کچھ یا لینے کی خوشی تبصرہ بن کر ان کے ماتھے پر کھجی تھی۔ آنکھوں میں خواب کی تعبیروں کی روشنی تھی۔ ”یا اللہ! آبی..... ہمیشہ خوش رہیں۔“ ندیا نے جسے دل سے دعا کی۔ دادو کے بارے میں وہ بہت فکر مند تھی مگر اب ٹیبل ہو گئی تھی کہ آذر بھائی اور ان کی امی نے دادو کو اپنے ساتھ انگلینڈ جانے پر راضی کر لیا تھا۔

مبارک ہو تم کو یہ شادی تمہاری سدا خوش رہو تم دعا ہے ہماری دوسرا گانا شروع ہو چکا تھا۔ وہ اپنے خیالوں سے چوکی۔ کمرے میں انہیں فون کی بیل گونج رہی تھی۔ اس نے حلائی نظروں سے کمرے میں دیکھا۔ بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر سی ایل آئی سیٹ رکھا تھا۔ ٹیبل سلسل ہو رہی تھی۔ سو بائبل کا نمبر تھا۔

”ہیلو.....!“ ندیا نے ذرا پیچھے کھسک کر ریسپونڈ اٹھایا۔

”مس ندیا تم نے اچھا نہیں کیا یہ۔ میں ایک ہفتے کے لیے امریکا گیا تھا تم نے کچھ ہی بدل لیں لیکن دیکھ لو میں بھی اس وقت تمہارے گھر میں موجود ہوں اور تمہارے اس دولہا کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں ابھی آ رہا ہوں تمہارے پاس۔“ جواب میں بھاری بھر کم ڈرا دیے والی آواز تھی۔ ندیا کے ہوش و حواس جیسے ساتھ چھوڑ گئے ہوں۔ ہلدی کے مانند زرد رنگت اور خود وہ خزاں رسیدہ پتے کے مانند کا پتے لگی تھی۔ آنے والے لمحوں میں جو قیامت اٹھنی تھی اس نے اس کے ذہن کو منجمد کر دیا تھا۔ دھماکے سے ٹھٹھنے والے دروازے نے اس کے اعصاب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ قیامت خیز لمحوں سے بچنے کے لیے اس نے دونوں ہاتھوں سے پیرہ ڈھانپ لیا۔

”یہ چوہدری شاہنواز خان کون ہے؟“ اس نے قریب سے ایک ٹوک وار آواز ابھری۔ ندیا نے جھٹ سے ہاتھ ہٹائے۔ اس کے بالکل قریب شاہ میر کھڑا تھا۔ لائٹ گولڈن راسک کی کام والی شیرانی اس پر خوب ج

ی تھی۔ گھنیرے بال، چوڑی پیشانی، ہلکے گلابی بھرے ہونٹ اور سب سے بڑھ کر اس کی ہیزل براؤن آنکھیں۔

”ندیا! شاہ میر تو بہت پینڈم ہے۔“  
”واہ بھی دو لمبے دو لمبے دو لمبے والاروپ آیا ہے۔“  
”چاند سورج کی جوڑی لگے گی۔“ ندیا کی جھٹوں نے ندیا کے کان میں کئی سرگوشیاں کی تھیں مگر شاہ میر کی آنکھوں میں غصے کی اتنی آمیزش تھی کہ ایک بل بھی اس کی طرف نہیں دیکھ پائی تھی۔ سانس لینے کو آستین کم پڑنے لگی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ ابھی اسے رک جائے گا۔

”میں نہیں جانتی۔“ وہ جیسے کسی کنویں سے بولی۔  
”رہا شاہ میر کو اس بل نہ پیا رہے پناہ پیا آ رہا۔“  
”جانتی تو تم ہو..... شاہ میر اس کے سامنے بیڈ پر بیٹھا تھا۔ اس کی گھڑی حالت دیکھ کر اسے ترس آنے لگا۔

”تمہیں میں نہیں جانتی۔“ اس نے پُر زور تردید سے بھرا ہوا اور حیرت سے شاہ میر کی طرف دیکھا کیونکہ اس کے بار اس کے لہجے میں ذرا غصہ نہیں تھا بلکہ اسے شرح اطمینان محسوس ہوا تھا۔

”جانتی نہیں ہو تو پھر شادی کیوں کی؟“ وہ اس کی بات سے محفوظ ہوا۔ مسکراتی آنکھوں کا ساتھ لب بھی رہے تھے۔

”شادی!“ ندیا نے زیر لب دہرایا وہ کچھ کچھ ہنس پاری تھی۔ ڈر، خوف کی جگہ اب حیرت اس کی دھڑکیوں میں بکھری رہی تھی۔

”ڈیر واٹف، اصل میں آپ کے سر تاج شاہ میر کا ہی عرف عام میں چوہدری شاہنواز خان شاہ میر نے سر جھکا کر کہا۔ ایک بل کو تو ندیا کی آنکھیں کچھ نہیں آیا تھا۔ بات کا اندازہ کچھ، کچھ ہو گیا تھا۔

”اب ذہن نے ساری بات واضح کی تو وہ ایک دم چیخ ماری۔“  
”کیا؟“ آپ..... آپ..... چوہدری شاہ میر.....  
”غصے میں وہ پوری بات نہیں کر پاری تھی۔ شاہ

میر اس کی بلند ہالچ پر گھبرا کر اس کی طرف بڑھا۔ ”کیا کر رہی ہو۔ آہستہ بولو سب لوگ جمع ہو جائیں گے کہ دولہا کے سر پر ہیگ تو نہیں نکل آئے جو وہیں صاحبہ یوں چلا رہی ہیں۔“ شاہ میر نے غصے سے لال ہوئی ندیا کو ٹھنڈا کرنا چاہا مگر وہ تو اس وقت بالکل آؤٹ آف کنٹرول ہو گئی تھی۔

”تمہیں ہوں گے اکٹھا تو میں خود سب کو بلاؤں گی۔“ انتہائی غصے میں کہتی ہوئی وہ دروازے کی طرف دوڑی۔ شاہ میر چملاٹ لگا کر اس سے پہلے دروازے کے پاس جا پہنچا تھا۔

”دیکھو ندیا..... پلیز میری بات تو سنو.....“ ندیا نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی۔

”تمہیں سننا مجھے کچھ بھی، ہٹ جائیں میرے راستے سے میں سب کو بتاؤں گی۔“ اپنی اتنی پریشانی اور ذہنی کوفت کا سوچ کر ندیا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

”دیکھو ندیا، میں نے سوچا اگر مجھ سے تمہاری شادی ہو جائے تو تمہیں یونیورسٹی میں ایڈمٹن مل جائے گا۔“ اپنی دانست میں شاہ میر نے بہت بڑا جواز پیش کیا۔

”سری نہیں جاری تھی میں یونیورسٹی میں ایڈمٹن کے لیے۔“ شاہ میر کے انتہائی بودے جواز پر اسے آگ ہی تو لگ گئی پھر وہ وہ مڑی روانی سے روکنے لگی۔ ”سری اتنی دور..... لیکن کوئی بات نہیں اگر تم کہو تو میں تمہیں سری میں بھی ایڈمٹن دلوا دوں گا لیکن پلیز تم خاموش ہو جاؤ۔“ اس قسم کی صورت حال سے پہلی دفعہ واسطہ پڑ رہا تھا اور شاہ میر کو مجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ اسے کس طرح ہینڈل کرے۔

”فضول باتیں مت کریں میرے ساتھ۔ میں ابھی آئی، انگل کو بتاؤں گی کہ اتنا بڑا دھوکا کیا ہے آپ نے میرے ساتھ۔“ اونچی آواز میں واضح دھمکی دی۔ ”تمہیں آگے سے..... ندیا نے شاہ میر کا بازو پکڑ کر ہٹانا چاہا مگر ایک چھٹ کو تو جوان اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ طاقتور تھا۔ وہ اسے ایک آنچ بھی ڈھیرا دھرنے نہ سکی۔



## دیا جلائے رکھنا

کیے بغیر سو نہیں سکتی تھی۔ اور لیس کے کپڑے صوفے پر پڑے تھے۔ موزے قالین پر، والٹ اور بے شمار کاندات ڈریسنگ ٹیبل پر۔ اور لیس میں ذرا بھی سلیقہ نہیں تھا۔ ان کے آفس سے آتے ہی اچھا خاصا سجا

نتاشا کو فیڈ روے کر اس نے رضا کا بولی فارم اور لیس کے آفس جانے والے کپڑے استری کر کے مارا کمر اکھرا ہوا تھا وہ بہت جھک چکی تھی پھر بھی اپنی عادت سے مجبور تھی کہ کمرے کو صاف

### نگہت اعظمی



”یعنی صلح ہو گئی۔“ شاہ میر نے رسالہ پھر پکڑوں

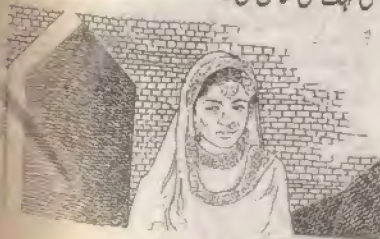
پر اچھال دیا اور خوشی سے بولا۔

”جی نہیں، ناول کا اینڈ یہ نہیں تھا۔“ وہ کہتی ہوئی پھر جا کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”لیکن ہماری زندگی کے ناول میں اینڈ صلح ہی ہو گا۔“ کہتا ہوا وہ بھی اس کے پیچھے بیڈ روم میں آ گیا اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ندیا کے چہرے پر نظر ڈال کر اس نے اچانک ہنسنا شروع کر دیا۔

”اب کیا مصیبت ہے؟“ شاہ میر کو اس طرح ہنسنے دیکھ کر وہ جھجلا اٹھی۔ اس نے بے دلی سے اپنے پر نظر ڈالی مگر اپنے نظر آتے عکس کو دیکھ کر وہ بھی ہنسنے پر مجبور ہو گئی۔ رونے کی وجہ سے کاہل پھیل کر گالوں تک آ چکا تھا اور آنسو ہاتھوں کی پتیلیوں سے صاف کرنے سے کاہل، بلیش آن اور آن کی شید وکس ہو کر ایک نئے رنگ کی شکل میں پورے چہرے پر پھیل چکے تھے۔ صرف لب اسٹیک بھی جو قدرے بہتر حالت میں تھی۔

”یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔“ ندیا مصنوعی ناراضی سے منہ پھلا کر بولی۔ بیڈ پر کھڑی گلاب کی چٹیاں منہ میں سمیٹ کر اس نے شاہ میر پر اچھال دیں اور شاہ میر نے ان پتیوں کی مہک اپنی سانسوں میں اتار لی۔ ندیا منہ دھو کر آ چکی تھی۔ اس کا گلابی حسن شبنم میں نہائے پاکیزہ پھول کے مانند لگ رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ بڑی دلیری سے شاہ میر سے لڑ رہی تھی اور اب اسے شاہ میر سے ڈھروں شرم آ رہی تھی۔ مارے گھبراہٹ کے اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔ طمائی اور نازک کالج کی چوڑیوں کی جلتے رنگ آئیں۔ ای جلیترنگ میں شاہ میر اور ندیا کی خوشبو کی کنک اور گلابوں کی مہک بھی شامل تھی۔



اگلا لمحہ اس کے لیے بہت حیرت ناک تھا۔ ”خاموش ہو جاؤ۔ اب ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو گلا دبا دوں گا۔“ اس نے شاہ میر کو ہمیشہ مسکرا کر نرمی سے بات کرتے دیکھا تھا اور اب جو اچانک وہ انتہائی غصے میں شیر کے مانند دھاڑا، وہ جہاں بھی وہیں سہم کر رہ گئی۔

”شاہ میر آپ.....“ سہمے ہوئے لہجے اور بے یقینی آنکھوں میں لیے اس نے کچھ کہنا چاہا مگر شاہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

”منا نہیں تم نے خاموش رہو، کسی نے تمہیں شوہر کی عزت کرنا نہیں سکھائی۔ آج سے زبان چلائے جارہی ہو۔“ غصے سے چپکئی آنکھیں اور دل دہلا دینا والا لہجہ۔ ”چلو بیڈ پر بیٹھو جا کر۔“ وارکاری گر ہوتا دیکھ کر وہ اسی لہجے میں بولا۔ ”منا نہیں تم نے؟“ ندیا کو اسی جگہ حیرت سے بہت بنا کھڑا دیکھ کر وہ پھر گر جا۔ ندیا نے فوراً اس کے حکم کی تعمیل کی۔

”خاموش بیٹھی رہو یہاں، میں ابھی آتا ہوں اگر ذرا سا بھی شور کیا تو تاج کی ڈتے دار تم خود ہو گی۔“ سختی سے کہتا ہوا وہ بیڈ روم سے ملحقہ ڈریسنگ روم میں گھس گیا۔ ندیا کے ذہن میں خیال لپکا وہ دبے پاؤں چل کر ڈریسنگ روم کے دروازے میں جا کھڑی ہوئی۔

”ارے کہاں گیا۔“ یہیں تو رکھا تھا میں نے کہیں روانہ نہ گئی ہو۔“ کپڑوں کے ڈھیر میں وہ کچھ تلاش کر رہا تھا۔ آخر اسے مطلوبہ شے مل ہی گئی۔ اس ماہ کا ڈائجسٹ اس کے ہاتھ میں تھا اسے جھٹ سے کھولا اور مطلوبہ صفحہ کھولنے لگا۔ ندیا کی طرف اس کی پشت تھی۔

”اس کے بعد ہیرو نے کہا تھا کہ.....“ ندیا کی آواز پشت پر سن کر وہ جھٹکے سے پلٹا اور ڈائجسٹ والا ہاتھ اپنے پیچھے کر لیا۔

”کیسی مطلب.....؟“ شاہ میر نے اپنے لہجے میں غصہ سمونے کی ناکام کوشش کی۔

”مطلب یہ کہ یہ ناول میں نے لکھا ہے اور میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ اس کے بعد کیا ہوا تھا۔“ ندیا نے کچھ نکلی اور کچھ غصے میں جواب دیا۔



سنو راہوا کرا کھاڑ خانہ بن جاتا۔ کل رضا کا ٹیٹ تھا۔ اس کا بیک کھلا ہوا تھا اور ساری کتابیں، کاپیاں بیڈ پر بکھری پڑی تھیں۔ اس نے بڑی مشکل سے ٹیٹ کی تیاری کی تھی، وہ دن میں سو یا نہیں تھا اس لیے اس وقت اسے شدید نیند آرہی تھی۔ ناشائذ رہتے ہی سوچتی تھی۔

دونوں بچوں کے سونے کے بعد اس نے کمرے کی صفائی شروع کی۔ بیڈ پر بکھری ہوئی کتابیں، کاپیاں سمیٹ کر بیک میں ڈالیں۔ اور بیس کے کپڑے اور موزے ملے کپڑوں کی جالی میں رکھے۔ ڈریسنگ ٹیبل پر پڑی ہوئی چیزوں کو سینٹا، تینا شادو سال کی ہونے والی تھی۔ اسے کاسٹیکس کی چیزوں سے بڑا عشق تھا۔ ڈراما مونیو ملتا وہ ساری چیزیں بھیر دیتی۔ حالانکہ اب تو اس نے میک اپ کی بیشتر چیزیں اندر رکھ دی تھیں۔ ڈریسنگ ٹیبل کو صاف کرتے ہوئے نظر آئے پڑی اور آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر اس کا دل ڈول گیا۔ ایک عجیب سا احساس زیاں اس کے اندر سراپت کر گیا۔

”یہ میں ہوں۔“ آئینہ حقیقت بیان کر رہا تھا۔ ”سناؤ لارنک، فریبی مائل جسم، چھوٹا قد، بھرے ہوئے بال، ننگے کپڑے۔“ بھابی ٹھیک ہی کہتی ہیں کہ میں اپنے آپ پر بالکل توجہ نہیں دیتی تھی تو میں اور بیس کے مقابلے میں کتنی بڑی بڑی لگنے لگی ہوں۔ اور بیس تو اب بھی کتنے اسٹارٹ اور فریش ہیں اور اسی لیے شاید..... اس کے دل میں کہیں کا خاسا چھپا۔ وہ پہلے تو ایسی نہیں تھی۔

شادی سے پہلے وہ کتنی دل ڈریڈ تھی۔ اپنے آپ کو کتنا مین ٹین رکھتی تھی۔ سناو لے اور چھوٹے قد کے باوجود اس کی شخصیت بے حد جاذب نظر تھی لیکن اب تو ایسا لگتا تھا جیسے اسے کسی چیز سے کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی۔ ہر وقت کام، کام اور صرف کام۔ وہ کلوہو کے ٹیل کی طرح صبح سے شام تک کام میں جتی رہتی۔ صبح جیسے تیسے تیار ہو کر بینک جاتی۔ گھر سے نکلے نکلے ہزاروں کام جان پر سوار ہوتے۔ بھی کام کرنے والی اماں جی کو دوپہر کے کھانے کی ہدایت دیتا۔ بھی اور بیس کو کسی کام

کے بارے میں بتاتا۔ کبھی گھر سے نکلے ہوئے ناشائذ کرنے لگتی۔ اپنی گاڑی وہ خود ڈرائیو کرتی تھی۔ گاڑی کے نکالنے سے پہلے اس کا پانی تو آکس چیک کرنا۔ اکثر راستے سے گیس بھی ڈلوانی پڑتی۔ گھر سے بینک جاتے ہوئے تو راستے میں ٹریفک کا زیادہ رش نہیں ہوتا تھا کیونکہ اسے نو بجے بینک پہنچنا ہوتا تھا لیکن واپسی میں اتنا رش ہوتا کہ اسے گھر آتے آتے پورا ایک گھنٹا ٹک جاتا۔ وہ عام طور پر چھ بجے تک ہی گھر پہنچ پاتی تھی، پھر گھر پہنچتے ہی دونوں بچے اس سے لپٹ جاتے اور مستقل اسے مصروف رکھتے۔

”مما مجھے فریج فرائز بنا کر دیں۔“ کبھی رضا کی فرمائش ہوتی اور کبھی ناشائذ کرتی کہ اسے گود سے نہ اتاریں۔

اور بیس اپنا برنس کرتے تھے۔ وہ رات گئے تک گھر آتے۔ اماں جی دونوں وقت کا کھانا پکاتی تھیں اور اس کے آنے تک بچوں کو سنبالتیں۔ جب وہ گھر آ جاتی تو وہ چلی جاتیں۔ وہ سارا دن نوکری کر کے اتنا ٹھک جاتی تھی کہ اسے بچوں کو سنبالنا بہت مشکل لگتا تھا۔ بچے اس کے بینک سے آنے کے بعد اس کی جان کو چنے چنے رہتے۔ اسی لیے اسے اپنے آپ پر توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں ہوتی تھی۔ اس کے لیے تو بازار جانا، کپڑے خریدنا، انہیں روزی کو دینا ہی جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔ اتنا وقت ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ پارلر جا سکے اور ڈھنگ سے میئر کٹینگ کروا سکے۔ چہرے کا فیشل کروائے یا کم از کم آئی پروڈی بوائے۔ کاسٹیکس کا سامان ختم ہو جاتا تو خریدنے کے لیے وقت ہی نہیں ملتا۔ بقرعید آنے والی تھی اور اس نے ابھی تک اپنے کپڑے نہیں بنوائے تھے۔

زندگی کتنی مصروف ہے۔ ایک لمحہ بھی اپنے لیے نہیں ملتا۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر دیکھ لیا۔ ہاتھوں میں روکھے اور بے جان ہو رہے تھے۔ جلد بھی خراب ہو گئی تھی۔ پہلے وہ بچنے میں ایک بار ضرور ان سے منہ صاف کرتی تھی پھر بینک سے آ کر اوروہ سے ضرور منہ دھوتی تھی۔ اسی وجہ سے اس کے رنگ میں ب

دھنک تھی لیکن اب تو.....؟  
”میں کتنی بڑی لگنے لگی ہوں میری عمر کی ساری عورتیں مجھ سے کتنی چھوٹی نظر آتی ہیں۔“ عامرہ کی شادی کو چھ سال ہو گئے ہیں اور وہ آج بھی کتنی فریش اور بیک لگتی ہے جب کہ میری شادی کو صرف آٹھ سال ہوئے ہیں، ایسا لگتا ہے جیسے برسوں گزر گئے۔ اصل میں اور بیس کو بھی تو کوئی شوق نہیں۔ کبھی تعریف نہیں کرتے، کبھی کوئی گفت لا کر نہیں دیتے۔ انہیں تو ایک ملازمہ مل گئی ہے جو گھر میں کما کر بھی لائے گھر کو بھی سنبھالے اور ان کے بچوں کی دیکھ بھال بھی کرے۔ اپنے آپ پر کڑے کڑے اسے اور بیس پر غصہ آنے لگا۔

”جو شوہر اپنی بیویوں کا خیال رکھتے ہیں وہ بیویاں بھی کس قدر تروتازہ اور کھلی نظر آتی ہیں اور جو بیویاں شوہروں کی بے توجہی کا شکار ہوں وہ کتنی بھیجھی اور پژمردہ لگتی ہیں۔“ اس نے پھر اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا۔ ”میں بھی ان ہی عورتوں میں شامل ہوں جو شوہروں کی بے توجہی کا شکار ہوتی ہیں۔“

رات کے دس بج چکے تھے اور اور بیس ابھی تک بیڈروم میں نہیں آئے۔ وہ جب آفس سے آئے تھے کپڑے تبدیل کرنے اور اوپر آئے پھر شاور لے کر نیچے چلے گئے۔ فائزہ ٹی وی لاؤنج میں ہی تھی۔ وہ دونوں جب سے ٹی وی لاؤنج میں باتیں کر رہے تھے۔

فائزہ اور بیس کی خالہ زاد بہن تھی۔ وہ ماں باپ کی ایکوٹی بیٹی تھی۔ جب وہ میٹرک میں تھی تو باپ کا انتقال ہو گیا۔ جب سے وہ اور اس کی ماں بھیر مر دے مہارے کے تبارہ رہی تھیں۔ گھر اپنا تھا جس کا اوپر کا حصہ ان لوگوں نے کرائے پر اٹھا دیا تھا۔ فائزہ نے انگلش میں ایم اے کر کے ٹیکن ہاؤس جوائن کر لیا تھا۔

پچھلے سال اور بیس کی خالہ کا انتقال ہو گیا تھا جس سے بعد فائزہ بالکل تنہا رہ گئی تھی۔ شروع شروع میں تو اسے دارخوائن آ کر رہتی رہی لیکن کوئی کب تک کس کے ساتھ رہ سکتا ہے؟ پھر کچھ عرصے تک کرائے داروں کے ساتھ مہارے پر رہتی رہی لیکن پھر کرائے داروں سے کسی حد پر جھگڑا ہو گیا اور ان سے گھر خالی کر دیا گیا۔ کچھ تو

فائزہ ویسے ہی زبان کی بہت تیز تھی، کچھ تنہا رہنے اور حالات کی وجہ سے اس کا مزاج تکلیف دہ حد تک اکڑ ہو گیا تھا۔ وہ کسی کا لحاظ کیے بغیر جو منہ میں آتا سنا دیتی۔ اس وجہ سے اس کی شادی بھی نہیں ہو پا رہی تھی اور گھر میں تنہا رہنے کی وجہ سے خود غرض اور مقلبی لوگ مکان کے لاؤنج میں اس کے گرد جمع رہنے لگے تھے۔

ایک دن اور بیس اپنی ماں اور فرحت کے ساتھ اس کی خیریت دریافت کرنے اس کے گھر گئے تو وہ بہت اداس اور ڈپر لہندھی۔

”میرا دل چاہتا ہے میں خود کشی کر لوں۔ اس طرح کی ذلت بھری زندگی سے تو موت بہتر ہے۔“ وہ اتنی پریشان تھی کہ خالہ کے گلے لگتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ خالہ سے بہت محبت کرتی تھی جب کہ خالہ اور اس کی ماں میں ساری زندگی کبھی نہیں بنی۔ وہ اور اس کی ماں بیویوں کے لحاظ سے سارے خاندان میں سب سے خوشحال تھے جب کہ اور بیس کے والدین سفید پوش مڈل کلاس طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔

”تم ایسا کرو گھر کو بند کر کے کچھ دن کے لیے ہمارے یہاں چلو۔“ اور بیس کو اس کے اس طرح رونے پر بے حد دکھ ہو رہا تھا۔

”ہاں اور کیا..... اس طرح تو اکیلے رہتے تم بیمار ہو جاؤ گی۔“ فرحت نے بھی اور بیس کا اشارہ پا کر اسے گلے لگا کر کہا۔

”میرا تو اس دنیا میں کوئی بھی نہیں رہا۔ مجھے تین دن سے بخار ہے اور کوئی انتائیں جو مجھے ایک گلاس پانی پلا سکے۔“ وہ ان لوگوں کی ہمدردی پا کر اور زیادہ ہلکتے لگی۔

”تم کسی کو اپنا سمجھو تو بات ہے۔ میں نے تو آپا کے چہلم کے دوسرے دن ہی تم سے کہا تھا کہ ہمارے ساتھ چلو گھر تم راضی نہیں ہوئیں۔“ اور بیس کی امی کو بہو کے سامنے فائزہ کی باتیں کچھ اچھی نہیں لگیں اسی لیے انہوں نے انتہائی صاف گوئی سے اسے ہی مورد الزام ٹھہرایا۔

”خالہ امی آپ کو تو معلوم ہے اس وقت پیپا کے



سارے رشتے دار جمع تھے، میں کیسے ان سب کو چھوڑ کر آپ کے ساتھ جاسکتی تھی۔ "فائزہ نے اپنی غصائی چیخ کی۔

"یہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو اس وقت تو تمہارا جانا مناسب نہیں تھا لیکن اب تمہارا اس طرح اکیلے رہنا بھی مناسب نہیں۔ تم ایک دو روز میں اچھی طرح سوچ لو۔ ابھی فی الحال امی تمہارے پاس رہیں گی۔ میں اور فرحت روزانہ آتے رہیں گے۔" اور یس نے مشورہ دیا۔

"میرا خیال ہے اس گھر کو کرائے پر اٹھا دیا جائے اور تم ہمارے ساتھ رہو۔" فرحت نے ایک دم ہی وہ بات کہہ دی جو امی اور اور یس کہنا تو چاہ رہے تھے مگر کہہ نہیں پارہے تھے۔

"میں ابھی اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میں نہیں سمجھتی کہ میرا اس طرح آپ کے گھر میں رہنا مناسب ہوگا۔" فائزہ کو یہ سب سن کر خاصی ڈھارس سی ہوئی کہ ابھی وہ بالکل تباہ نہیں ہے۔

"اس میں نامناسب کچھ نہیں ہے۔ اس وقت خاندان میں اور یس سے زیادہ تمہارا کوئی قریبی عزیز نہیں اور پھر میرے اور امی کے ہوتے ہوئے کسی کو کچھ بھی کہنے کی جرات نہیں ہو سکتی۔" فرحت نے اپنی عادت کے مطابق کھل کر بات کی۔ وہ بہت صاف گو اور کھلے دل کی مالک تھی۔

"ٹھیک ہے بھابی میں سوچوں گی۔" فائزہ نے ٹالنے والے انداز میں کہا لیکن ایک مہینے مسلسل اور یس اور فرحت کے سمجھانے کے بعد وہ بالآخر اس بات پر راضی ہو گئی اور اپنا گھر کرائے پر اٹھا کر اور یس کے یہاں شفٹ ہو گئی۔

فرحت نے تو یہ سب انتہائی ٹیک دلی اور ہمدردی سے کیا تھا لیکن اسے ایسا لگا جیسے ساری دنیا اس کے خلاف ہو گئی۔ سب سے پہلے تو اس کے اپنے گھر والوں نے اسے سرزنش کی۔

"کمال ہے اتنی سمجھدار ہو کر تم نے اتنی بڑی حماقت کا ثبوت دے دیا۔ بھلا ایسے بھی کوئی کرتا ہے اس

قدر خوبصورت جوان جہان لڑکی کو گھر میں رکھ لیا جب کہ تم صبح سے شام تک گھر سے باہر رہتی ہو۔" امی نے سنا تو کھٹے بھرتک اسے پھجور دیتی رہیں۔

"زمانہ اتنا خراب ہے اور تم نے آنکھوں پر پٹی باندھ لی ہے۔" بھابی نے بھی اپنی رائے دینی ضروری سمجھی۔

"مردوں کا کیا بھروسہ، لاکھ وہ خالہ زاد ہو لیکن بھلا کوئی غیر شادی شدہ لڑکی کو اس طرح گھر میں رکھتا ہے۔" اس کی ساری کونکیز اس کی عقل پر ماتم کر رہی تھیں۔

"پھر میں کیا کرتی۔ ایک بن ماں باپ کی بیٹی کو اکیلے گھر میں چھوڑ دیتی۔" ہر بات کے جواب میں وہ یہی کہتی۔ حالانکہ فائزہ کے آنے کے بعد اس کے گھر کے ماحول میں بڑا فرق آ گیا تھا۔ شروع کے چند دن تو اس کی دلداری میں گزر گئے۔ امی اور اور یس اس کا بہت خیال رکھتے تھے لیکن تھوڑے دنوں بعد انی اور اس میں سرد جنگ جاری ہو گئی۔ دونوں ہی زبان کی تیز

تھیں۔ امی ڈاڈا راسی بات پر پرانی باتیں چھیڑ دیتیں۔ انیس بہن سے بے شمار شکایتیں تھیں جو بہن کے مرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوئی تھیں۔ وہ جب بھی ان باتوں کا ذکر کرتیں فائزہ سے برداشت نہیں ہوتا۔ وہ ترکی۔ ترکی جواب دیتی جو امی کو بہت ناگوار گزرتا۔ ایسے وقتوں میں اس کی یوزیشن بڑی آکروڑ ہو جاتی، نہ وہ امی کی طرف

واری کر سکتی اور نہ فائزہ کا ساتھ دے سکتی تھی۔ وہ عام طور پر خاموش ہی رہتی۔ اور یس، فائزہ کا بہت خیال رکھتے تھے بلکہ جب امی اور فائزہ میں بحث ہوتی تو وہ ہمیشہ فائزہ کی طرف داری کرتے۔ بھی بھارتو اسے اور یس کا اتنا خیال کرتا تھا جتنیں لگتا تھا۔

فائزہ کے اس کے گھر میں آنے کے چند ماہ بعد امی کو بھی بیٹھے بیٹھے ہارٹ ایک ہوا اور وہ اسپتال جانے سے پہلے ہی اللہ میاں کے یہاں چلی گئیں۔ اور یس ماں کے مرنے کے بعد بالکل ہی کم ہمو کر رہ گئے۔ اپنے وقت میں فائزہ نے ان کا بڑا ساتھ دیا۔ وہ دونوں ب۔ بھی بیٹھے امی ہی کی باتیں کرتے رہے اور وہ ان دونوں

کے درمیان اپنے آپ کو بے مصروف ہی سمجھنے لگتی۔ کبھی تو وہ ان کی باتوں میں شریک ہو جاتی اور کبھی صرف ان کی باتیں سنتی رہتی۔ اس کا دل عجیب عجیب سا ہونے لگا اور وہ وہیں بستر پر بیٹھ کر رونے لگی۔

"کیا بات ہے۔۔۔۔۔ خیریت؟" اور یس کمرے میں داخل ہوئے تو اسے روتا دیکھ کر ایک دم گھبرا گئے۔

"کچھ نہیں بس ویسے میرا دل گھبرا رہا تھا۔" "طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" اور یس کی دجلوئی پر اس کا دل ٹھہر سا گیا۔

"ہاں میں ٹھیک ہوں۔" "مخل میں تم ٹھیک بھی بہت جاتی ہو۔ کچھ دن کی پچھتی کر لو گھر میں آرام کرو۔"

"آج کل چھٹی کہاں ملے گی پھر ایک ہفتے بعد تو بفر عید ہے۔" "ہوں۔"

"فائزہ جاگ رہی ہے کیا؟" اس نے اپنے لہجے کو برعکس خوشگوار بناتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں آج وہ بہت ڈپر لگتی تھی۔ آج خالو جان کی برسی تھی۔"

"مجھے تو پتا ہی نہیں تھا۔" وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہو گئی۔

"تم تو آج دینک سے آنے کے بعد نیچے ہی نہیں اتریں۔" اور یس کا لہجہ خاصا اکھڑا ہوا تھا۔

"کھل رضا کا ٹیٹ ہے میں اس کی تیاری کروا رہی تھی۔"

"وہ فاتحہ کے لیے بریانی لے کر آئی تھی۔ اس نے تمہیں آوازیں بھی دیں لیکن تم کھانے کے لیے بھی نہیں اتریں۔"

"تو وہ مجھے اوپر آ کر بتا دیتی۔" اس کے لہجے میں شکایت درآئی۔

"تمہیں ان باتوں کا خیال رکھنا چاہیے، ہم اسے اپنے گھر لے کر آئے ہیں ہمیں اس کا خیال رکھنا چاہیے۔" اور یس نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"میں حتی الامکان کوشش کرتی ہوں کہ اسے میری

کسی بات سے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔" "میں جانتا ہوں تم بہت تشاؤہ دل کی مالک ہو لیکن پھر بھی کبھی کبھار تم سے زیادتی ہو جاتی ہے۔" "ٹھیک ہے میں آئندہ خیال رکھوں گی۔" اسے اور یس کے اس طرح کہنے پر بہت غصہ آیا لیکن اس نے اس وقت بات بڑھانا مناسب نہ سمجھا اور اپنی غلطی تسلیم کر کے خاموش ہو گئی۔



"فائزہ تمہیں یاد ہے ایک دفعہ جب ہم لوگ ماموں صاحب کے گھر سے واپس آ رہے تھے تو امی کے پیچھے ایک بھیز لگ گئی تھی۔" اور یس نے کوئی پرانا قصہ چھیڑا۔ وہ سب رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ آج فائزہ نے اور یس کی فرمائش پر رزکی کو کھنے بنائے تھے جس کی تعریف میں اور یس زمین آسمان کے قلابے ملا چکے تھے۔

"اور یس وہ سین بھی کوئی بھول سکتا ہے، خالہ امی دائرے کی صورت میں دوڑ رہی تھیں اور بھیزان کے پیچھے پیچھے۔" فائزہ نے بے ساختہ ہنستے ہوئے وہ واقعہ دہرایا۔ وہ دل کھول کر ہنس رہی تھی اور ہنسنے کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں می آگئی تھی۔ گلابی سوٹ میں اس کی گوری چٹنی رنگت دمک رہی تھی۔ اور یس بھی ہنستے ہوئے اسے دیکھ رہے تھے۔

"اور مزے کی بات یہ کہ کوئی بھیز کو روکنے کی کوشش بھی نہیں کر رہا تھا اور سب ہنس رہے تھے۔" اور یس نے مزید لقمہ دیا۔

"بھیز والا بھیز کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا اور چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ بی بی رک جاؤ یہ بھیز کچھ نہیں کہے گی۔" ویسے تو امی سے چلا نہیں جاتا تھا اور اس وقت ان کی کیا اسپڈ تھی۔ وہ دونوں اس قصے کو یاد کر کے خوب قہقہے لگا رہے تھے اور وہ کوشش کے باوجود بھی ان کی باتوں میں شامل نہیں ہو پا رہی تھی۔

"رضا ڈھنگ سے کھانا کھاؤ ورنہ میں تھپڑ مار دوں گی۔" اس نے جھنجھلا کر رضا کو ڈانٹا تو فائزہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔



”بھابی اے بھوک نہیں ہوگی میں نے تھوڑی دیر پہلے ہی اسے سیزا بنا کر دیا تھا۔“  
”تم نے تو ماشا اللہ سے پورے کچن کا چارج ہی سنبھال لیا ہے۔“ اوریس نے پھر فائزہ کی انحرافیت کی۔

”میں نے کوئٹہ کی کلاسز لی ہیں نا۔“  
”پھر تو ہمارے عیش ہو گئے۔ شکر ہے اماں بی کے پکائے ہوئے کھانوں سے جان چھوٹے گی۔“  
”پتا نہیں آپ لوگ اماں جی کے ہاتھ کے کچے ہوئے کھانے کیسے کھا لیتے ہیں، ان کے ہاتھ میں تو ذرا بھی ذائقہ نہیں۔“

”کیا کریں پسند تو ہمیں بھی نہیں ہیں بس مجبوری ہے۔“ اوریس کے اس جملے پر وہ حیرت زدہ رہ گئی۔ اس سے پہلے تو وہ اماں جی کے پکائے ہوئے کھانوں کی بڑی تعریف کیا کرتے تھے۔

”تمہارے ہاتھ میں بالکل اسی کے ہاتھ کا سامرہ ہے۔“ اوریس کی اس تعریف پر فائزہ کھل اٹھی اور وہ سر سے پاؤں تک سلگ کر رہ گئی۔  
”پتا نہیں مجھ سے کہاں غلطی ہوئی ہے۔“ کھانے کی ٹیبل صاف کرتے ہوئے وہ مسلسل یہی سوچ رہی تھی۔

”بھابی آج اسکول میں میٹنگ ہے میں لیٹ آؤں گی۔ آپ اوریس سے کہہ دیجیے گا کہ مجھے لیتے ہوئے آئیں۔“ فائزہ خوشبوؤں میں بھی لائٹ فیروز کی کلر کا کلف لگا کر بڑے کاسوٹ پہنے کچن کے دروازے پر کھڑی تھی۔

اس نے بڑے اہتمام سے میک اپ کیا تھا اور لائٹ فیروز کی جیولری پہنے ہوئے بے حد حسین لگ رہی تھی۔ اس کے سامنے وہ احساس کمتری کا شکار ہونے لگی۔  
”آج اس نے بینک سے چھٹی کی تھی اس لیے گھر پر ہی تھی اور گھر ہی کے کپڑوں میں ملیں تھی۔“  
”بھابی آپ اپنا بالکل خیال نہیں رکھتیں کل میں آپ کو پارلر لے کر جاؤں گی۔“ فائزہ یہ کہہ کر آگے بڑھ

گئی اور وہ خواہ مخواہ ماسی پر برس پڑی۔  
”ستم کس طرح صفائی کرتی ہو۔ دروازوں کے پیچھے دیکھو کتنے چالے لگے ہیں اور اپنا طیلہ دیکھو تمہارے کپڑے کتنے میلے ہو رہے ہیں لگتا ہے برسوں سے تم نے پانی کی غسل نہیں دیکھی۔“

”کیا کریں باجی، ایک ہفتے سے ہمارے علاقے میں پانی نہیں آ رہا ہے۔“ ماسی نے شرمندہ ہو کر اپنی مجبوری بتائی تو اسے اپنے اس طرح غصہ کرنے پر ندامت ہوئی۔

”اچھا، اچھا آج میں نے اسی لیے چھٹی کی ہے تاکہ اپنی گمرانی میں صفائی کرواؤں۔ تین دن بعد عید ہے اور مجھے بے شمار کام کرنے ہیں۔“  
”باجی ایک بات کہوں آپ برا تو نہیں مانتیں گی۔“ ماسی کو اس کے لہجے کی نرمی سے تھوڑا حوصلہ ہوا۔  
”کیا بات ہے؟“

”باجی آپ اپنا بالکل خیال نہیں رکھتیں۔ فائزہ بی بی کو دیکھیں کتنا سحر کے رشتی ہیں اور کتنی خوبصورت لگتی ہیں، آپ بھی فائزہ بی بی کی طرح رہا کریں۔“  
”اچھا اچھا زیادہ باتیں بنانے کی ضرورت نہیں۔ تم اپنا کام کرو۔“ ماسی تو دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوئی اور وہ سارا دن اپنے آپ سے الجھتی رہی۔ اسے عید کی تیاری کرنی تھی، گھر کو صاف کرنا تھا، مصالحے تیار کرنا تھے۔ برتن نکالنے تھے لیکن وہ سارے کام چھوڑ کر اپنے آپ میں لگ گئی۔ اس نے بہت دن بعد اپنے بال ڈائی کیے، چہرے کو امین سے صاف کیا اور نہادھو کر لائٹ پنگ ٹرکا کا کفن کا سوٹ پہن کر تیار ہوئی تو اسے اپنا آپ بہت فریض لگنے لگا لیکن شام کو جب اوریس فائزہ کو لیتے ہوئے گھر آئے تو اوریس نے اس کی تیاری کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا بلکہ ہنسا سے کھیلنے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔

”کیا کہیں جانا ہے کیا؟“  
”نہیں تو۔۔۔۔۔“ وہ چپ سی ہو گئی۔  
”بھابی آپ یہ کھرتہ پیتا کریں اس سے آپ کا کاپیکیشن اور ڈارک لگتا ہے۔“ فائزہ نے انتہائی صاف

اس سے ایسے کہا کہ وہ چور سی ہو گئی۔ اس نے چور چور سے اوریس کی طرف دیکھا، وہ ہنسا کو ہنسانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ انہوں نے فائزہ کی بات کی ہی نہیں یا سن کر ان سی کر دی۔ وہ کڑھتی ہوئی چائے پینے کچن کی طرف چل دی۔

”فائزہ بھی اپنے آپ کو جانے کیا سمجھتی ہے۔ سارا رنگ کیا صاف ہے کھس ہے جیسے حسینہ عالم۔“ وہ دل ہی دل میں اسے ہزاروں صلواتیں دے رہے تھے کہ اب تلنے لگی۔

وہ چائے اور کباب برائی میں سجا کر لاؤنج میں آئی اور دونوں کی بات پر ہنس ہنس کر بے حال ہو رہے تھے۔

”اوریس آپ نے بھابی کو یہ لطیفہ سنایا ہے۔“  
”یہ تو مجھے ایس ایس ایم ایس سے آج ہی موصول ہوا

ہے۔“  
”ویسے اوریس آپ کا جواب نہیں آپ کی کمپنی میں تو کوئی بور ہو ہی نہیں سکتا، بھابی بہت خوش قسمت ہیں۔“ فائزہ کے لہجے میں خاصا رنگ وسد تھا۔  
”پتا نہیں کون خوش قسمت ہے، میں یا وہ؟“

اوریس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا یا اسے محسوس ہوا کہ وہ ٹھنڈی سانس بھر رہا ہے۔

”آپ نے مجھے کا انتظام کر لیا؟“ اس نے اوریس کو پچائے تھاتے ہوئے کہا۔

”اوہ، اچھا ہوا تم نے یاد دلادیا، میں ابھی کمال کو برنگ کرتا ہوں وہ اپنے لیے خریدنے جائے گا تو ہمارا بکرا بھی لے آئے گا۔“ اوریس نے چائے تپائی پر رکھ کر سوبائل کا نمبر ملایا۔

”بھابی کل آپ نے ضرور پارلر جانا ہے، میں خود

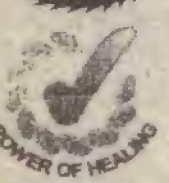
ریک۔ یورپ۔ برطانیہ اور برصغیر پاک و ہند کے مشہور معالج کی جدید حیرت انگیز تحقیق

# LACO RIGHT “لیکورا رائٹ”

AN EXCELLENT HERBAL FOOD SUPPLEMENT

جسمانی، روانی، جسمانی، طبیعت، جسمانی کمزوری، پنڈلیوں میں درد، قیض، خواتین کی اکثریت آج کل اس مرض میں مبتلا ہے۔ لیکن فطری شرم و حیا اور مرض کو معمولی سمجھ کر علاج پر توجہ نہیں دیتیں۔ اگر اس مرض کا علاج بروقت نہ کیا جائے تو اس سے ضعف اعضائے اور دیگر شکایات کے باعث استقرار حاصل کی قابلیت نہیں رہتی اور شادی کی عمر یعنی اولاد جیسی نعمت سے محروم ہو جاتیں ہیں۔

Price  
£ 39.99



برائے رابطہ

HERBAL RIGHT UK LTD

228 MOSTON LANE, MOSTON  
MANCHESTER UK M40 9NS  
PH / FAX: 0161-2052118  
E-mail: syedherblist@yahoo.com



آپ کے ساتھ جاؤں گی اور اپنی مرضی سے آپ کی ہیکر کلنگ کرواؤں گی۔ آپ کو دیکھ کر تو کوئی کہہ ہی نہیں سکتا کہ آپ ہیکر میں آفسر ہیں۔“ فائزہ کے اس طرح کہنے پر وہ جل کر خاک ہو گئی۔

لوگوں کی جالا کیوں کو نہیں سمجھتی۔ لوگ مجھے کتنا سمجھاتے تھے، بھالی جانتے پتھر دیتی تھیں، صائمہ اور سب کا لکڑی سے مجھے کتنا خبردار کیا تھا گرمیوں میں نے تو خود ہی اپنے پاؤں پر کبھاری ماری پر میں کیا کرتی۔ میں کس طرح ایک بے جان ماں باپ کی بچی کو دنیا میں لے کر آئے لیے چھوڑ دیتی۔ اس کے اندر سے کہیں نیکی کی آواز ابھری تھی۔

جب اس کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ  
 کیا سارا راستہ اللہ کا راستہ ہے لیکن جو خدا کے نیک  
 سے ہوتے ہیں انہیں خدا خود ہدایت کرتا ہے اور ان  
 کے اندر کی روشنی انہیں وہ راستہ دکھاتی ہے۔ ہمیں  
 ہے کہ ہم خدا کے نیک اور پرہیز گار بندے بن  
 سکیں۔ ہر سال ہم جو حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کی یاد  
 کرتے ہیں اس کا یہی مقصد ہے کہ ہمارے دلوں میں وہ  
 نیک بندگی پیدا ہو کہ ہمیں خدا کے سوا کسی اور کی پروا نہ  
 کی اور کا خوف نہ ہو۔ ہمیں صرف اور صرف اپنے  
 کی خوشنودی کی فکر ہو اور اس کی رضا کے لیے ہم  
 سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہ کریں۔  
 وہ وہیں صوفی پر بٹھ گئی۔ وہ تقریر سنتی جا رہی تھی  
 اسے لگ رہا تھا کہ اس کے اندر دیکھتے ہوئے لاوے  
 شدت کم ہو رہی ہے۔

”فائزہ اپنی دوست کے یہاں تیار ہونے گئی ہے، میں خاندان میں گوشت تقسیم کر کے اسے لیتا ہوا آؤں گا۔ تم اور بچے تیار رہنا۔“ وہ جسے صراط سے گزر رہی تھی جو بال سے زیادہ بار یک اور تلوار سے زیادہ تیز تھا۔



”ظاہر ہے، وہ سسرال میں رہ ہی نہیں سکتی۔“  
”کیوں؟“

”تمہیں نہیں معلوم وہ کس مزاج کی لڑکی ہے۔ یہ تو تمہارا ہی حوصلہ اور صبر تھا جو تم نے اس قدر خوش اسلوبی سے اس کے ساتھ گزارا کیا تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو یہ گھر میدان کارزار بن جاتا۔“ اور میں نے یہ بیانیہ کر وہ خود کو ہواؤں میں اڑاتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

”خدا کرے وہ اپنے گھر میں خوش و آداب رہے۔“

”آمین! آج میں بہت خوش ہوں۔ خدائے  
میرے کاندھوں سے بہت بڑا بوجھ ہلکا کر دیا۔ خدا  
کرے وہ جلد از جلد رخصت ہو کر اپنے گھر جائے۔ جس  
دن وہ اپنے گھر جائے گی اس دن میں سکون کی نیند  
سکوں گا۔“

”خیر وہ اتنی پیاری ہے کہ اس کا شوہر تو اس کے  
پاؤں دھو دھو کر رہے گا۔“

”تمہاری یہ سوچ بالکل غلط ہے، اگر ایسا ہوتا تو ساری دنیا کے مرد صرف خوب صورت عورتوں سے شادی کرتے اور گھروں میں خوب صورت عورتیں ہی آباد ہوتیں۔“

”میں تو ہمیشہ اس کے سامنے احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتی تھی۔“

”حالانکہ اگر تم اپنے آپ کو میری نظروں سے  
دکھو تو مجھ تم سے زیادہ خوبصورت کوئی اور عورت نظر  
نہیں آتی۔ تمہارے اندر جو نیکی کا دیا روشن ہے اس نے  
تمہاری ظاہری شخصیت کو اتنا مکمل، مجھ پر اور روشن بنادیا  
ہے کہ میں چاہوں تو بھی میرے قدم بہک نہیں  
پائیں۔“ اور یس کے ان الفاظ پر اس نے ان کی  
آنکھوں میں جھانکا تو وہاں سچائی کے نور کے سوا کچھ اور  
نہیں تھا۔

واقعی اللہ اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے بڑا  
محبت کرتا ہے اور اس کی نیکی کو رایگان نہیں ہونے دیتا۔  
اس کا دل اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہو گیا۔

نے کروایا تھا۔ اسے تو ہونٹ جا کر ہی پتا چلا کہ سارا اہتمام فائزہ کی منگنی کے لیے کیا گیا تھا۔ اس کی منگنی اور بیس کی کوششوں سے اس کے دوست کے ساتھ ہو رہی تھی۔ اسے اس نے نہیں بتایا کہ اور بیس کے دوست کے والدین گاؤں میں رہتے تھے اور وہ اتنی آزاد خیال لڑکی کو کہہ بنانے پر راضی نہیں تھے لیکن اس کے دوست نے بڑی مشکل سے اپنے والدین کو راضی کیا تھا اور عید سے تین دن پہلے ہی یہ رشتہ پکا ہوا تھا پھر اور بیس کو یہ بھی احساس ہونے لگا تھا کہ وہ کسی غلط فہمی کا شکار ہو گئی ہے۔ وہ اس چٹوٹن کوں بنوائے کر رہا تھا اور ایک دم ہی اس کی غلط فہمی دور کر کے اسے سر برازد دینا چاہتا تھا۔

”آپ کو ایسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آپ نے اتنی بڑی بات مجھ سے چھپائی۔“ اسے جب ہوٹل جا کر اصل بات کا پتا چلا تو اسے بہت برا لگا۔

”تم یہ بتاؤ تم اس وقت کتنی خوش ہو؟“  
 ”اگر آپ مجھے گھر میں بتا دیتے تو میں اور زیادہ  
 خوش ہوتی اور میری عید تو نہ خراب ہوتی۔“

”عید کا کیا ہے، جب میاں بیوی راضی ہوں تو ہر دن عید اور ہر رات شب برات ہوتی ہے۔“ اور لیس نے شوخی سے مسکرا کر کہا۔

”اگر مجھے پتا ہوتا تو میں اچھی طرح تیار تو ہو جاتی۔“

”تم تو اس تیاری میں بھی ستم ڈھا رہی ہو۔ کیا مزید جان سے مارنے کا ارادہ تھا۔“ اور نیس نے دھیسے سے کہا تو اسے لگا جیسے اس کے چاروں طرف بہار کا موسم آ کر گھبرا گیا ہو۔

”لوگو! تو اچھا ہے لیکن لڑکے کے والدین گاؤں میں رہتے ہیں بھلا فافہ لڑکوں میں کیسے رہے گی؟“ وہ فلتشن سے واپس آ کر اپنے بیڈ روم میں آئے تو اس نے انہی رائے کا اظہار کیا۔

”یہ بات طے ہو چکی ہے۔ فائزہ اور محمود شہر میں رہیں گے۔“

”اس کا مطلب ہے فائزہ سسرال میں نہیں رہے

شائستہ زریں

مطمئن ہونے کے سبب ان کی خواہش ہی یہ ہوتی ہے کہ  
اب اس سے پہلے کہ سال گزرے  
وہی لیکریں وہی ستارہ  
میری لکیروں میں قید کر دو  
لیکن جو آنے والے سال سے کئی اُمیدیں باندھ  
لیتے ہیں اور ستاروں کی چال پر یقین بھی رکھتے ہیں  
انجانے میں اپنے ستارے سے بہت سی توقعات باندھ  
لیتے ہیں ایسے میں خود بخود یہ دعا لایوں پر پھر جاتی ہے کہ  
نذرِ نجات کو کوئی کچھ کسی کے پاس آئے  
خدا کرے یہ نیا سال سب کو اس آئے

آمین

نئے سال کی نسبت سے جہاں بہت سی توقعات، آرزوئیں اور دعا میں ہمارے ساتھ سفر کرتی ہیں وہاں نئے سال سے منسوب کوئی بھی شعری تخلیق ہمارے شاعرانہ ذوق کی تحسین کرتے ہوئے ہمیں اپنی جانب متوجہ بھی کر لیتی ہے۔

اب کے برس کچھ ایسا کرتا  
اپنے بچپل بارہ ماہ کے، دکھ کا اندازہ کرتا  
سادہ ان ایک کاغذ لے کر بھولے سرے مل لکھ لیتا  
پھر اس میں ایک، ایک پل کا ایک، ایک موڑ احاطہ کرتا  
ساری صبحیں حاضر رہتا، ساری شامیں پاس بلا تا  
اور علاوہ ان کے دیکھو

ہمارے موسمِ دھیان میں رکھنا  
اک، اک بادِ گمان میں رکھنا

1940

رختِ سفر باندھتا سالِ رواں برق رفتاری سے  
 ہے سال کی سمت رواں دواں پکار رہا ہے کہ  
 جب بھی فرصت ملے تو گوشہٴ تنہائی میں  
 یادِ ماضی کے پرانے گوشوارے دیکھنا  
 اور اگر یہ حساب سال بھر کا ہو اور برس کی آخری  
 رات بھی تو سنے سال کا سورج طلوع ہونے سے پہلے  
 خود اقسائی کے عمل سے گزرنے والوں کی قوتِ فکر ہی  
 کس قوتِ عمل بھی بیدار ہو جاتی ہے۔ ایسے میں اوروں  
 سے اور خود اپنے آپ سے کیے جانے والے وہ وعدے  
 اور عہد بہت سناٹے ہیں جو دانستہ یا نادانستہ کھینچ لیں  
 کہ جس شاعر کا یہ خیال روشنی دکھا رہا ہے کہ

کس مذہب میں ہے نئے سال کی دلچسپی  
جو کھو جائے اس کا غم نہ کرو چاہا ہے اس کا عہد کر  
نہیں کچھ حاصل محرومیوں کے شمار سے  
گزرے غموں کو بھول کر نئی خوشیاں تلاش کر  
نشانہ نو کی بازیافت کا عمل آسان بھی ہے اور مشکل  
مگر اگر ہمارے مضمر مقصد میں ہے کہ ہم نے کچھ بھی غلط نہیں کیا  
اور آسانی ہی آسانی ہے۔ کیسے وعدے اور عہد وفا نہ  
کرنے کی صورت میں ان کی تعمیل کی خواہش اور کوشش  
میں مشکل ضرور پیش آسکتی ہے لیکن جب یہ مرحلہ طے  
کرنے کی اہمگ شدت اختیار جائے تو از خود پیاس کے  
دول جھینے اور اس کے جلو چھلنے لگتے ہیں۔ ہاں کچھ ایسے  
بھی لوگ ہوتے ہیں جو اپنی خوشیاں اور مسرتیں اپنے  
انھوں کی لکیروں میں تلاش کرتے ہیں بلکہ حال سے



پھر جتنا قیاس لگنا  
گرتو خوشیاں بڑھ جاتی ہیں  
تو پھر تم کو میری طرف سے  
نیا سال مبارک ہو  
اور اگر تم بڑھ جائیں تو  
مت بیکار تکلف کرنا  
میری خوشیاں تم لے لینا  
مجھ کو اپنے غم دے دینا  
اب کے برس کچھ ایسا کرنا  
حسب روایت پاکیزہ کے  
سال نو نمبر کے لیے ہم نے ایک  
سروے رپورٹ کا اہتمام کیا اور

سروے میں شریک خوانین سے معلوم کیا کہ  
۱: جانے والے سال نے آنے والے سال کے  
لیے کیا پیغام دیا؟

۲: جو وعدے اور عہد آپ ۲۰۰۷ء میں پورے نہ  
کر سکیں نئے سال میں ان کی تکمیل کا ارادہ ہے؟  
۳: نئے سال میں آپ کو اپنے ”ستارے“ سے  
کون سی توقعات ہیں؟ کیا وہ آپ کے حق میں جھللائے  
گا؟

۴: نئے سال کے لیے آپ کی دعا کیا ہے؟  
۵: نئے سال کی مناسبت سے کوئی شعری تخلیق نذر  
قارئین کریں؟

### شگفتہ یاسمین

میزبان مینا بازار پی ٹی وی کراچی سینٹر

۱: جو غلطیاں ۲۰۰۷ء میں سرزد ہو گئیں انہیں  
دہرانے کے بجائے ان کو دور کرنے کی کوشش کریں کہ  
ہرگز راہ وادن ہمیں جو سبق دے رہا ہے اگر ہم اس کو ہمیں  
سمجھ پارہے تو اس کا مطلب ہے کہ ہم وقت ضائع کر  
رہے ہیں۔

۲: اللہ کا شکر ہے کہ جو میری کمینٹ تھیں ۲۰۰۷ء کی  
وہ میں نے پوری کی ہیں اور انشاء اللہ ۲۰۰۸ء کی تمام  
کمینٹ بھی پوری کروں گی۔



۳: میرے حساب سے میرے ستارے نے خوب  
چمکنا شروع کر دیا ہے۔ اب یہ دیکھتے ہیں کہ لوگوں کو یہ  
چمک کب دکھائی دیتی ہے، کہتے ہیں کہ آپ اگر غنی ہیں  
اور آپ نے درست راستوں کا انتخاب کر لیا ہے تو  
ناکامی نہیں ہوگی بیشک یہ راستہ مشکل ہوتا ہے لیکن اگر  
نیت اچھی ہے تو اس میں مزہ بھی بہت ہے۔ سو مجھے نئے  
سال میں بھی اپنے ستارے سے بہت اچھی توقعات ہیں  
وہ اس برس بھی میرے حق میں ضرور جھللائے گا۔

۴: اللہ تعالیٰ میرے والدین کو تندرستی کے ساتھ  
لمبی عمر دے اور میں نے ماضی میں جو سخت محنت کی ہے  
اور اب بھی کر رہی ہوں اس کا بہترین صلہ دے، آمین!  
۵: وہ جس کے ہونے سے زندگی نئے سرائی ہے  
اسے کہنا کہ بیشکی جنوری بھر لوٹ آئی ہے

### مسز گوہر نذر

معلمہ لٹل وڈ اسکول

۱: میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے۔۔۔۔۔  
۲: میرا اپنے آپ سے عہد یہی ہے کہ اپنے  
پروردگار سے دوستی کا رشتہ مضبوط کیا جائے۔ جو ہم  
ملازمت پیش وقت کی کمی کے باعث نہیں کر سکتے۔ اللہ  
تعالیٰ اس نئے سال کو سب کے لیے مبارک کرے اور ہم  
بھی اپنے وعدے کا پاس رکھیں، انشاء اللہ۔۔۔۔۔  
۳: میرا ستارہ جدی ہے ۲۰۰۸ء میں مجھے اس سے

تو ہمیں ایسی بہار دے  
غم کے حضور سے نکال  
اور نگر نگر نکھار دے

آمین

### شہزادی زرتاشیہ

معاون ضیاء اعوان

تنظیم وکلاء برائے انسانی حقوق علمی برادری

۱: کامیابی اور ترقی کے لیے صرف قسمت پر بھروسہ  
نہ کریں بلکہ خود بھی جدوجہد کریں، اتنی کہ منزل خود آپ  
کو پکارا رکھے۔

۲: کچھ وعدے اور عہد ہیں جو پورے نہ ہو سکے  
لیکن انشاء اللہ نئے سال میں یہ عدا مت اب میرے حصے  
میں نہیں آئے گی اور میں بہت جلد اپنے سارے وعدے  
اور عہد پورے کروں گی۔

۳: میرا ستارہ اسد ہے۔ ستارے کبھی مدھم پڑتے  
ہیں تو کبھی ان کی روشنی بڑھ جاتی ہے، یہی ان کا کام  
ہے۔ ماضی میں جن پریشان کن حالات کا سامنا  
کرنا پڑا، مجھے یقین ہے کہ اب ان میں بہتری آئے گی  
اور میرا ستارہ خوب خوب جھللائے گا۔

۴: اللہ پاکستان کو اپنی امان میں رکھے اور ہمارے  
سیاستدانوں کو توفیق دے کہ آپس کے اختلاف بھلا  
کر ملک کی سلامتی کے لیے کام کریں۔ اللہ پاک



بہتری کی توقعات ہیں اور انشاء اللہ یہ میرے حق میں  
بہتر ہوگا۔

۵: یا الہی! اب کے برس  
تو ہمیں ایسی بہار دے  
پھول کھلیں امیدوں کے سبکی

وہ سدا بہار دے  
اتنا ہے میری تجھ سے  
اے میرے پروردگار  
کہیں خوش حملے ہوں

آہ و زاری نہ ہو  
بڑاؤں کے نکتے سر نہ ہوں  
قیصوں کی آہیں نہ ہوں  
توبیجی نہیں نہ ہوں  
سکنتی بیٹیاں نہ ہوں  
بے بس بھائی نہ ہوں  
ماکھ کے زندہ لاشے نہ ہوں  
یا الہی! اب کے برس





وعدہ ہی کیا جو وفا نہ ہوا۔

ارم سحر آفتاب  
رائٹر، معلمہ

۲: وعدے تو خود سے بہت کیے ہیں..... ان میں سے کچھ تو ۲۰۰۷ء میں پورے ہوئے اور کچھ تکمیل کے مراحل میں ہیں۔ اب صرف کوشش ہے، ارادہ ہے، منزل کو پانے کی جستجو ہے..... دیکھیے کہاں تک اپنے ارادوں میں کامیابی حاصل کرتی ہوں اور خود سے کیے وعدوں کو پانے تکمیل تک پہنچانی ہوں۔ ویسے بھی وہ

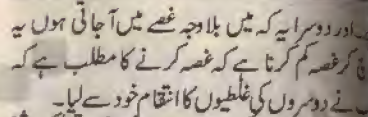
۵: نیا سال تمہارے لیے خوشیوں کا کھوارہ ہو  
نئے سال میں کوئی درد نہ تمہارا ہو  
جو خواب دیکھو تعبیر اس کی پاؤ  
ہر آن زندگی ایک چمکتا ستارہ ہو

مفلحہ رحمن

طالبہ شعبہ ابلاغ عامہ جامعہ کراچی

تویننی رپورٹر اے آر وائی ون ورلڈ

۱: پچھلے سال نے مجھے اتنے پیغام دیے کہ اگر لکھا شروع کروں تو آپ کا رسالہ بھر جائے گا مگر میری ڈھٹائی دیکھیے کہ اتنے پیغامات اور سبق ملنے کے باوجود سدھری نہیں اور ابھی تک ویسی کی ویسی ہی ہوں۔ ۲۰۰۷ء نے بہت سے مواقع پر بہت اچھے اچھے پیغامات دیے اور سبق سکھائے۔ ان میں سب سے اہم یہ تھا کہ زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے کوئی منزل متعین کریں اور اس منزل کو پانے کے لیے بھرپور جدوجہد کریں۔ ارادے نیک اور چست ہوں اور تمام منزل کی جانب اٹھ جاؤں تو بیشک اللہ کی مدد بھی آجالی



۲: دے دیے تو میں کسی سے وعدے نہیں کرتی لیکن میں  
 کی طرح دل میں رادے ضرور کرتی ہوں کہ ایسا کام  
 ان کا فی الجوہر پھر کریں اور اس پھر میں آدھے  
 اہم ہو جاتے ہیں خیر اس وعدے کو نبھانے کے  
 لئے کوشش ابھی بھی جاری ہیں۔

۳: میں برج پر یقین رکھنے کے بجائے اللہ تعالیٰ پر  
یقین رکھتی ہوں کہ سارا اختیار تو اللہ کے پاس ہے  
اور غرہ تو لوگوں کو بوقوف بنانے کے جھکندے ہیں۔

۳: نئے سال کے لیے ڈھیروں دعا میں ہیں کہ  
ہمارے ملک اور ایمان کو سلامت رکھے اور پاکستان  
پر جو ان اپنی طاقت کو بھجائے۔ ایسے کہ بجائے اس  
قبل اس پر حاوی ہو وہ مستقبل کو اپنے اختیار میں  
لے، آمین۔

دے نئے چراغ ہمیں راستہ دکھاتے ہیں  
بدھن نگاہ اٹھے پھول مسکراتے ہیں

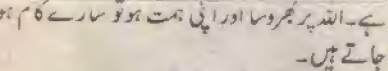
وریشہ زہرا ٹیچر

لٹل وڈ اسکول گلشن کیمپس

۱: اے نئے سال مجھے اُمید ہے کہ تو امن و آشتی کا

۲۰۰۷ء میں ہم نے بہت سارے عہد اور وعدے کیے تھے لیکن ان کو ہم پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا سکے۔ جس کی وجہ خوابوں کی دنیا میں بسرا ہے اور عملی اقدام سے گریز ہے۔ اے نئے سال ہم تجھ سے وعدہ کرتے ہیں کہ اس سال ہم عملی اقدام زیادہ کریں گے اور خواب و خیال کی حسین دنیا سے باہر نکل آئیں گے۔ اور وہ سارے کام جو پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکے ان کو محنت اور اللہ کے بھروسے پر پورا کریں گے۔

۳: توقعات انسان کو صرف اور صرف اپنے رب سے رکھنی چاہیے۔ چاند تاروں اور اس کی چمک دمک کی دنیا میں صرف وہ لوگ رہتے ہیں جنہیں اپنے عمل اور اللہ پر بھروسہ نہیں ہوتا، اس لیے اشارہ پر بھروسہ کرنا بے وقوفی



۴: ایسا رہنا ملے جو خود بھی احکام خداوندی سے واقف ہو اور ان پر عمل کرتا ہو اور لوگوں کو اندھیرے سے اُجالے کی راہ دکھائے، آمین!





۵: اب کے برس کچھ ایسی تدبیر کرتے ہیں  
مل کر ایک شہر محبت تعمیر کرتے ہیں  
خزاں کی اجازت میں نہ آئیں اگلے برس  
اس بہار رُت کو ذخیر کرتے ہیں

### مریخہ منظر

طالبہ انٹرن سائنس سال اول  
گورنمنٹ پی آئی بی گرلز کالج

۱: جی ہاں، وقت اور زندگی کو زیادہ بہتر انداز سے  
رہنا ہے، انشاء اللہ میری پوری کوشش ہوگی کہ میں  
پیش بھی کروں۔  
۲: میری کوشش تو یہی ہوگی کہ ضرور پورے کروں  
اللہ بہت جانتا ہے۔



سی کامیابیاں حاصل کروں۔  
۲: انشاء اللہ ضرور پورے کروں گی۔ نئے سال  
کے لیے بھی عہد ہے کہ میٹرک میں بہت اچھے نمبروں  
سے کامیابی حاصل کروں گی اور اس کے لیے پہلے سے  
زیادہ محنت کروں گی۔

۳: کیوں نہیں! ضرور جھللائے گا، میرا ستارہ جو  
ہے اسے تو جھللاتا ہی ہے۔ میں بہت پر اُمید ہوں کہ  
بہت سی خوشیاں اور کامیابیاں مجھے ملیں گی۔

۴: اللہ میرے وطن پر اپنا کریم کرے۔ مجھے اور  
میرے گھروالوں کو اپنی امان میں رکھے اور میٹرک میں  
میرا شاندار رزلٹ آئے، آمین!

۵: پھر نیا سال آیا ہے

ایسے میں  
خوشیوں کے بیش بہا  
خزانے لگائی  
مرست بھری میری آنکھیں

کہہ رہی ہیں

اے دوست

اٹھا کر چلیں، مغربی طاقت ہم کو زیر نہ کر سکے، آمین!  
۵: نہ تو شب و روز ہی بدلے ہیں نہ حال اچھا ہے  
کس برہمن نے کہا تھا کہ یہ سال اچھا ہے  
مہ وش اکرم طالبہ

بی بی اے سال دوم، جامعہ کراچی

۱: ہر جانے والا سال آنے والے سال کے لیے



دنیا کو ہے اس مہدی برحق کی ضرورت  
ہو جس کی نگاہ عالم افکار دو عالم  
۵: اک سحر ایسا محبت کا لگایا جائے  
جس کا ہمسائے کے آنگن میں بھی سایہ جائے

### شازیہ اکرم

مونٹیسوری ٹیچر ہیپی ہوم اسکول

۱: جو غلطیاں اس سال ہوئیں وہ آنے والے سال  
میں نہ دہرائی جائیں بلکہ ان کو سدھارا جائے تاکہ آنے  
والا سال سکون اور خوشیوں سے گزرے۔

۲: پھر پور کوشش ہوگی کہ جو وعدے ۲۰۰۷ میں  
پورے نہ کر سکی وہ نئے سال میں ضرور پورے کروں اور  
یہ بھی عہد کروں گی کہ ایسے وعدے نہ کروں جو پورے نہ  
کر سکوں اور پھر دل پر ایک بوجھ بن کر نہ رہے کہ ایسا  
کیوں ہوا۔

۳: میں ستاروں پر یقین نہیں رکھتی کیونکہ یہ  
ستارے دل کو دھوکا دینے کا طریقہ ہے۔ ستارے بھی  
اللہ کے بنائے ہوئے ہیں۔ میں ہر بات کی توقع اللہ  
سے رکھتی ہوں۔

۴: جو لوگ پریشان ہیں اللہ ان کی سب  
پریشانیاں دور کرے جو ناراض ہیں آپس میں راضی ہو  
جائیں، سارے ملک میں امن قائم ہو بحیثیت مسلم ہم سر



تاریخ رقم کرتا ہے۔ ۲۰۰۷ میں سیاسی، سماجی، معاشی طور  
پر لوگ متاثر ہوئے ہیں سو اس سال نے آنے والے  
سال کو یہ پیغام دیا ہے کہ ذرا سنبھل کر، زندگی انمول  
ہوتی ہے لہذا لوگ خوشیوں کی تلاش میں ہیں۔ اس لیے  
تم اچھا سال بن کر آنا۔

۲: انشاء اللہ ضرور پورے کروں گی اور نئے سال کے  
لیے بھی میرا عہد ہے کہ زیادہ سے زیادہ محنت کر کے بہترین  
کامیابی حاصل کروں اور اللہ نے جو مجھے خالق و ملاحظہ دی ہے  
اسے ملکی فلاح کے لیے بھی استعمال کروں۔

۳: جہاں تک ستاروں کی بات ہے تو میں ستاروں  
پر بالکل یقین نہیں رکھتی کہ غیب کا حال تو صرف اللہ ہی  
بہتر جانتا ہے اور اپنے رب پر بھروسہ ہے کہ کہنے والے  
سال کو میرے لیے بہت اچھا بنائے گا۔

۴: دعا یہی ہے کہ نئی نسل، ہم نو جوان اپنے ملک  
کے لیے کچھ ایسا کر سکیں کہ دنیا یاد رکھے، انشاء اللہ۔

۳: ستاروں کا نیا اعتبار..... میں تو انہیں باطل  
سے باقی پھر ان سے کیا توقع رکھوں؟ ہاں اللہ سے  
ہے کہ مجھے بہت سی نئی خوشیاں دے گا، آمین!  
۴: اللہ تعالیٰ یہ سال خیر و عافیت سے گزار دے،

۵: کچھ خوشیاں کچھ آنسو دے کر ٹال گیا  
جیون کا ایک اور سنہرا سال گیا

### رمشا سیف

میٹرک سائنس کراچی پبلک اسکول

۱: اور زیادہ محنت اور لگن سے کام کروں اور بہت



نیا سال مبارک ہو

قارئین! جانے والے سال پر ہی کیا منحصر ہے سچ تو یہ ہے کہ ہر جانے والا دن بھی آنے والے دن کے لیے کوئی نہ کوئی پیغام دے ہی جاتا ہے بات صرف اسے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی ہے اور جب معاملہ گئے برس کے نئے سال کو دیے جانے والے پیغام کا ہو تو مجموعی صورتِ حال کے پیشِ نظر یہ شعرا اپنے حصار میں لے لیتا ہے۔

عجز کو اخلاص کو اپنا حیت کو پیار کو  
آؤ دھوئیں گمشدہ تہذیب کے آثار کو  
۲۰۰۷ء کے خساروں میں سے ایک بڑا خسارہ  
ہمارا اپنی اقدار اور تہذیب و روایات سے دوری کا بھی  
ہے۔ بلاشبہ کسی بھی ملک کی ترقی، فلاح و بقا میں اس کا  
تہذیبی ورثہ جو مثبت سوچ کا مظہر ہو اہم کردار ادا کرتا  
ہے۔ ہم انجانے میں اپنی تہذیب سے دور ہوتے  
جارہے ہیں ماضی میں جو وہاں ہو ا پر اب تو یہ سوچ کر  
جینا ہے کہ

نئے سال کے نئے خواب ہیں، نئے موسموں کے گلاب ہیں  
یہ محبتوں کے چراغ ہیں انھیں نظروں کی ہوا نہ دے  
اخلاق کی پاسداری ہماری روایات کا خاص حصہ  
ہے اور اس میں بہت اہمیت ایفائے عہد کو حاصل ہے۔  
کیا ہی اچھا ہو جو ہم کیے وعدے اور عہد نباہنے کو اپنا  
شعار بنالیں ورنہ نئے برس پھر وہی پچھتاوا ہمیں ستائے  
گا کہ

جانے کن عجمتوں میں رہتے ہیں  
آنکھ جھپکی نہیں نیا سال آ گیا  
نئے سال کے آغاز سے ہی بعض لوگ اپنے برج  
کی سالانہ کارکردگی جاننے کے لیے بے چین رہتے ہیں  
اور ان میں سے کچھ تو اسی کی روشنی میں ہی اپنا لائحہ عمل  
مرتب کرتے ہیں۔ غالب نے کہا تھا کہ  
دیکھئے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض  
ایک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے  
جوستاروں کی چال پر یقین رکھتے ہیں وہ اسی

پر تکیہ کر لیتے ہیں لیکن کثیر تعداد ایسے افراد کی ہے  
جوستاروں کی چال کو مشکوک جانتے ہوئے اسے قابلِ  
توجہ و اعتبار نہیں سمجھتے ان کا ایمان ہے کہ قسمت بنائے  
بگاڑنے کا اختیار صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے  
اور سروے کے بیشتر شرکانے اللہ ہی سے توقعات باندھی  
ہیں، بیشک وہ خالق کائنات ہے سو اس کے حضور ہماری  
دعا بھی یہی ہے کہ

خدا یا سال! نو آئے کرم کا سماں بن کر  
اٹھے سورج سحر کو رجتوں کا ترجمان بن کر  
ہر ایک موسم جو اس میں آئے ہو سکھ چین کا موسم  
چمن میں تازگی ہو، منہ دھلائے پھول کا شبنم  
اور ان خوش رنگ ساعتوں میں جہاں انہوں کا،  
دوستوں کا قرب ہمارے لیے فرحت بخش ہوتا ہے وہاں  
کوئی نہ کوئی شعری تخلیق ہماری بہترین رفیق بھی ثابت  
ہوتی ہے۔

وہی موسم ہے  
بارش کی ہلکی  
پیڑوں میں چھن چھن گونجتی ہے  
ہری شاخیں  
سنہری پھول کے زیور پہن کر  
تصور میں کسی کے مسکراتی ہیں  
ہوا کی اوزنی کارنگ پھر ہلکا گلابی ہے  
شنا سا باغ کو جاتا ہوا خوشبو بھرا رستہ  
تمہاری راہ تکتا ہے  
طلوع ماہ کی ساعت  
تمہاری منتظر ہے  
نیک تمناؤں کے ہمراہ  
نیا سال مبارک ہو  
میری اور ادارہ پاکیزہ کی جانب سے تمام قارئین  
کو نیا سال نئی انگلیوں، نئی آرزوؤں اور ان کی تکمیل کی  
دعا کے ساتھ مبارک ہو۔



# شہزادی

نبیلہ قرعبا سی



## آپس کی بات

اکٹھ ہوتا یوں ہے کہ جو ادیب، شاعر یا فنکار ہے وہ اپنے علاوہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا، عموماً وہ اپنی شاعری اپنی تحریر، اپنی صلاحیتوں اور خوبیوں کا ذکر چاہتا ہے۔ کوئی اور آگے بڑھ جائے یہ بات اس کو کچھ بھائی نہیں۔

قرعلی عباسی، میرے شوہر عجیب و غریب عادات کے مالک ہیں۔ جہاں کسی میں تھوڑی سی بھی ادب و شاعری کی سوچ بوجھ اور دلچسپی نظر آئی اسے باور کراتے ہیں کہ اس میں ایک بڑھیا شاعر، عمدہ ادیب اور بڑا کالم نگار چھپا ہے، اسے بس راستے ملنے کی دیر ہے اور یہ راستہ قرعلی عباسی اسے دکھانے میں تن، من، و دھن سے لگ جاتے ہیں۔ کوشش کرتے ہیں کہ وہ شخص جلد از جلد نام کا لے، مستند ادیب، شاعر بن جائے نہ صرف یہ بلکہ اس کا دیوان یا افسانوں کا مجموعہ بھی چھپ جائے۔ اس سلسلے میں صاحب معاملہ کی ہر ممکن عملدرآمد نامی بھی کرتے ہیں اور کتاب کی پوزٹر کرانے سے لے کر پبلشر کے نام، پتے

”کیوں نہیں ہر شخص کی زندگی، اس کا سفر ایک ایک لمحہ، ایک ناول ہوتا ہے جس میں لوگ، بڑھنے والے اپنے اپنے انداز سے اپنی جیاں ڈھونڈ لیتے ہیں۔ بس بات پیش کرنے کی ہوتی ہے لکھنا تو شروع کیجیے۔“

اب ہم قرعلی عباسی کو کسے سمجھاتے کہ ہم میں وہ نہیں ہے کہ ان کی طرح ظلم اٹھاتے ہی لفظوں کی

سہرت دھنک ہمارے لئے بکھر جائے۔ لندن عالمی اردو کانفرنس، برطانیہ، کینیڈا سے وقت نکالنے والے سب بڑے اخبار اردو نامہ کی سب سے منعقد کی گئی تھی۔ دنیا سے اردو سے محبت کرنے والے یہاں آئے

اور فون نمبر تک مہیا کرتے ہیں اور کتاب چھپ کر آنے سے پہلے اس طرح خوش ہوتے ہیں جیسے ان کی اپنی کتابوں کی پخت چلی کیشنز کی مالک فرست میں اضافہ ہو گیا ہو..... وہ ایسے ہی دوسروں کو روح رواں عذرا رسول بڑھتا دیکھ کر خوش ہونے والے ہیں۔ ایسے لوگ کتنے ہیں۔ کانفرنس کے ایک دن میں ڈائجسٹوں کے ایک دن وہ اچانک بولے۔ ”آپ کو بھی تو لکھنے میں انہوں نے اتنی کھانے کا شوق تھا؟“

”جی.....!“ ہم نے مختصر ترین جواب دیا۔ ”تو پھر اب کیوں نہیں لکھتیں، افسانے لکھنے کی بات کے لوگ قائل ہو گئے۔“ ہمیں افسانے کہانیاں پڑھنے کا شوق ہے، لکھنے کا نہیں۔ ہم نے وضاحت کی مگر وہ بھی ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھے بولے۔

”تو پھر ایسا کریں اپنی یادیں تازہ کر لیں۔“ سوانح حیات لکھیں۔“

”کیا.....؟“ ہم بری طرح چونک گئے۔ ”جی ہاں۔“

ہماری حیات میں یا ہماری یادوں سے کسی اور کو کیا دیکھ سکتے ہیں؟

”تو کیا ہوا، اب لکھیں۔“ اور ہمیں قرعلی عباسی کی

بات یاد آگئی۔ ”لکھیں..... اب لکھیں۔“ جنوری 2007ء میں ہم لوگ نیویارک سے کراچی آئے تو مصروفیت بے انتہا ہماری بھی تھی اور عذرا رسول کی بھی، بلکہ عذرا کو شدید بخار اور فلو نے گھیر رکھا تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے قرعلی عباسی اور ہمارے لیے ایک پرنٹ کلف نشست کا اہتمام کیا، اس نشست میں ان کی چیدہ چیدہ رائےز بھی موجود تھیں۔



جن سے ملنا بے حد خوشی کی بات تھی۔ عذرا کے ساتھ پاکیزہ کی ایڈیٹر انچم انصار اور دلکش کی ایڈیٹر زہرا ہمت اصغر بھی اہتمام و انتظام میں مصروف تھیں۔ اس نشست کے



اختتام پر ادارے کی جانب سے قمر علی عباسی کو شیلڈ اور کیش پرانز بھی پیش کیا گیا، مجھے عذر آنے لیک بہت خوبصورت سوٹ تجھے میں دیا اور بولیں۔ ”نیلو سے تو ہم نے کہا تھا کہ ہمارے لیے لکھیں یہ بھی ہماری رائٹر ہوتیں تو رائٹر کی شیلڈ ہم انہیں بھی دیتے۔“

انجم انصار بولیں۔ ”ہاں، ہاں کیوں نہیں آپ لکھیں، اب لکھیں۔“

نزدت اصغر کا بھی اصرار ہوا۔ ”آپ لکھیں۔ دل چاہا ان سے کہیں ”برڈس یوٹو“

جب اتنے عزیز اتنے پیارے لوگوں کا اتنا اصرار ہو تو آپ تو خوش قسمت ہوئے۔ اس خوش قسمتی میں اضافہ اس وقت اور ہو جائے اگر پڑھنے والوں نے میری چند لائنوں کو بھی پسند کر لیا، پسند آئے تو اس کے ذمے دار قمر علی عباسی، عذرا رسول، انجم انصار، نزدت اصغر اور نہ پسند آئے تو مجھی۔۔۔

نام کا مرحلہ فوراً سامنے آ گیا۔ یادیں، سوانح حیات جو بھی ہے اس کا کوئی عنوان تو ہونا چاہیے، میرے بیٹے وجاہت علی عباسی نے کہا۔ ”نام کچھ ایسا ہو کہ فوراً اندازہ ہو جائے کہ کس شخصیت کی یہ یادیں ہیں۔ آپ کا سیریل شہزادی اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی لوگوں کے ذہنوں میں روز اول کی طرح تازہ ہے، جو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، ریپٹ ٹیلی کاسٹ اور U-tube پر دیکھ کر جانتے ہیں کہ نیلو فر عباسی ہی شہزادی ہیں۔“

آپس کی باتیں، دل کی باتیں کیا بھی ختم ہوئی ہیں۔ ان کا کوئی سرا نہیں، نہ شروع ہونے کا اور نہ ختم ہونے کا یہ تو راز سے راز تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اب دل کی باتیں آپ سے انہی صفحات پر ہوں گی ”شہزادی“ کی صورت میں انشا اللہ!

شہزادو

موسم دلوں میں اترتے ہیں، انسان خوش ہو تو ہر طرف بہا رہے اور او اس ہے تو۔۔۔

دل تو میرا اداس ہے ناصر شہر کیوں سامیں سامیں کرتا ہے

ہندوستان کے علاقے اتر پردیش (لوہی) میں موسم اپنی توانائیوں اور دلکشی کے ساتھ اپنے رنگ دکھاتے ہیں۔ سادان آتا ہے تو ایسی جھب کے ساتھ کہ بندوں میں جھولے پڑ جاتے ہیں۔ چوہوں پر کڑا ہریاں چڑھ جاتی ہیں اور صدائیں گونجنے لگی ہیں۔

اماں میرے باوا کو بھیجی کہ سادان آیا سردیاں آتی ہیں تو دانت سے دانت بجا دی ہیں اور گرمیوں میں تو پسینہ چوٹی سے ایزی تک بہہ آ رہا ہے۔

جون 1919ء کی بات ہے۔ یہ مہینہ اپنی قنات اور حرارت بکیر کر ختم ہو رہا تھا کہ اس کے آخری دن 30 جون کو شیلڈ اعظم گڑھ کے ایک قصبے ”زرولی“ میں شفاعت احمد خان کے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ آج ان کے یہاں پہلا بیٹا پیدا ہوا تھا۔ اعظم گڑھ کے لوگ علم و ادب اور عقل و فضیلت میں ایک مقام رکھتے ہیں شاید اسی لیے اس بچے کو ”علیم“ کا نام دیا گیا۔ علیم الدین خان۔

شفاعت احمد خان اور ان کی بیوی رسول باندی کے یہاں علیم الدین خان کی پیدائش کے بعد ایک اور بیٹا شہاب الدین خان اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں اور گھر انا ایک مکمل خاندان بن گیا خوشیوں مسرتوں اور بچوں کے تہمتوں سے بھر پور۔

شفاعت احمد خان ایک بڑے رئیس زمین دار تھے اس لیے علیم الدین خان۔۔۔ کی پرورش اسی طرح ہوئی جس طرح ایک ایسے گھرانے کے بچے کی ہوتی چاہتی تھی۔ لاڈ پیار ناز و فریاد لیکن علم اور تربیت پر بھی کیا توجہ یہی وجہ تھی کہ چھوٹی سی عمر میں قرآن پاک کے کوارے حفظ کر لیے۔

شفاعت احمد خان کا رنگون میں بہت بڑا بڑس تھا جب علیم الدین خان اسکول جانے کی عمر کے ہوئے ان کے والد انہیں اپنے ساتھ رنگون لے گئے اور پھر سینٹ پال اسکول میں داخل کروا دیا۔ یہاں ان کے جوہر کھلے نہ صرف پڑھائی میں اول بلکہ غیر اعلیٰ سرگرمیوں میں آگے آگے آئے۔ کل ایشیائی بنیادوں

پیننگ کے مقابلے میں علیم الدین خان کی بنائی پیننگ کو اول قرار دیا گیا اور فریم سے نکال کر چانچ کر تصدیق کی گئی کہ یہ ہاتھ سے بنائی اور رنگ بھری گئی ہے۔ چھٹی ہوئی تصویر نہیں کسیرے سے۔ کھیل کے میدان میں بھی یہ اول تھے۔ ہاکی کے بہترین سینئر فارورڈ۔ ہائی جپ، پول جپ اور سوئٹری دوڑ میں کوئی ان کا تہ مقابل نہ تھا۔ سوئٹری ریس میں ان کی رفتار کو دیکھ کر اسٹڈیم میں موجود لوگ کہتے۔ ارے یہ لڑکا دوڑ نہیں اڑ رہا ہے۔

یہ تمام مقابلے کل ایشیائی بنیادوں پر ہوتے تھے۔ ہر اچھا اور بڑا اسکول یہ چاہتا تھا کہ یہ ہونہار طالب علم ہمارے اسکول میں آ جائے۔ سینٹ پال سے سینٹ کیریلز کا نوینٹ گئے جہاں ”نمایاں طالب علموں“ کی تختی پر آج بھی ان کا نام کندہ ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ایسے اسکولوں میں داخلہ ملنا اور پڑھنا ہی ایک اعزاز تھا اور علیم الدین خان نے زندگی میں ایسے بہت سے اعزاز حاصل کیے۔ ان دنوں لکھنؤ کا کرچن کان ایک نامور اور مستند درگاہ تھی۔ ان کے والد چاہتے تھے اعظم گڑھ اور لکھنؤ کی تہذیبوں کا نگہار ان کے بیٹے میں نظر آئے۔ یہ شہر تہذیب و تمدن، علم و ادب اور روایات کی بستی تھے اس ہونہار طالب علم نے اس کے سارے رنگ اپنے اندر سمو لیے اس ماحول میں تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت بھی تھی۔ یونیورسٹی کی تعلیم کے لیے علیم الدین خان نے الہ آباد یونیورسٹی کا انتخاب کیا۔ اس شہر کو اعزاز حاصل تھا کہ یہاں آزادی ہند کی تحریک کے ایک جوشیلے کارکن پنڈت جواہر لعل نہرو رہتے تھے جن کی رہائش گاہ الہ آباد یونیورسٹی کے نزدیک ہی تھی۔ علیم الدین خان بھی وطن کی آزادی کے خواہشمند تھے اور اس سلسلے میں انہوں نے پنڈت جواہر لعل نہرو اور ان کی بہن وجے لکشمی پنڈت کے ساتھ بڑھ چڑھ کر کام کیا۔ یہ جنگ آزادی تھی جس میں ہر نوجوان ایک سپاہی تھا۔ جب جنگ جیتی جاتی ہے تو اس کا سارا سہرا کامنڈر کے سر ہوتا ہے۔ سپاہی گناہم رہتا ہے۔

الہ آباد یونیورسٹی میں ہر استاد اپنی ذات میں ایک ادارہ تھا۔ ان میں سے بیشتر کا خیال تھا کہ علیم الدین

خان جیسا طالب علم ایک جوشیلہ لیزر، ایک ممتاز شاعر اور بے مثال ادیب بنے گا اور ایسا ہوا بھی۔ وہ جتنی خوبصورت اردو لکھتے تھے اتنے ہی جامع انداز میں انگریزی زبان میں بھی اظہار خیال کرتے، اعظم گڑھ کی مٹی لکھنؤ کے ماحول اور الہ آباد کی تعلیم و تربیت نے ان کو ادب کے کونے میں داخل کر دیا۔

الہ آباد یونیورسٹی کے ایک استاد ڈاکٹر اعجاز حسین نے اپنی کتاب ”یادیں“ میں ممتاز طالب علموں کا ذکر کرتے ہوئے علیم الدین خان کا ذکر بڑی محبت سے کیا ہے۔

الہ آباد یونیورسٹی سے جب فارغ التحصیل ہو کر یہ واپس اعظم گڑھ آئے تو والد کی خواہش تھی کہ یہ ان کے بزنس میں ہاتھ بٹائیں، ان کے والد کارکن میں بھاگنے والے گھوڑوں کا بزنس تھا۔ رنگون برما میں علیم الدین خان جنگ آزادی کے سپاہی تھے وہ ملک و قوم کے لیے لڑنا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک جہالت سے زیادہ انسان کا کوئی دشمن نہیں تھا انہوں نے اپنے طور پر فیصلہ کیا کہ وہ علم کو پھیلانے کے لیے اپنی زندگی وقف کر دیں گے، والد نے یہ سنا تو سمجھا پاپلے اپنے گھر، خاندان اور شہر کی طرف توجہ کریں لیکن انہوں نے کہا پورا ہندوستان میرا گھر ہے اگر یہاں علم کی روشنی پھیل جائے تو میرا گھر بھی روشن ہو جائے گا۔ ایک دن اخبار میں آرمی انجکیشن کو رکھی آسامیاں نکلیں، انہوں نے درخواست دی، انٹرویو ہوا اور یہ منتخب ہو کر فتح گڑھ چھاؤنی کے آرمی اسکول میں ہیڈ ماسٹر کی پوسٹ پر تعینات ہو کر کام کرنے لگے۔ یہ خواہش تو پوری ہوئی، کتابیں ان کی زندگی میں یوں داخل ہوئیں کہ پڑھاتے پڑھاتے اور کتابیں پڑھتے خود بھی لکھنے لگے، ان کا زیادہ تر رجحان تنقید کی طرف تھا۔

فتح گڑھ میں علم و ادب کی فضا تھی، شہر میں نوجوان ادیب، شاعر، نقاد مل جیسے تھے شعر و ادب کی مجلسیں، مجلسیں، تنقیدی نشستیں ہوتیں اور پھر ان نوجوانوں نے مل کر ایک ادبی انجمن کی بنیاد رکھی جو نہایت فعال ثابت



ہوئی یہاں سے نو آموز اور ابھرتے ہوئے نوجوان آئندہ چل کر بلند پایہ ادیب و نقاد ثابت ہوئے۔

فتح گڑھ میں ایک بڑی جوبلی تھی اس کا دروازہ اتنا وسیع تھا کہ اس میں سے ہاتھی گزر سکتا تھا۔ یہ احسن منزل تھی جہاں ایک ہنسا بستا خاندان رہتا تھا۔ پانچ بیٹے، تین بیٹیاں اور بہت سے دوسرے فرشتے دار احسن منزل کو خوشیوں کا گہوارہ بنائے ہوئے تھے، اس گہرانے کے سراسر محمد احسن فرخی کا تعلق فرخ آباد سے تھا۔ اور نگ زیب کے پڑپوتے اور مثل شہبشاہ فرخ سیر کے نام پر یہ شہر بسایا گیا تھا۔

محمد احسن کا گھریلو کاروبار تھا، اسی لیے انہوں نے آنے والے وقت کو بچپان لیا تھا۔ خاندان کی مخالفت کے باوجود انہوں نے اپنے تمام بچوں کو تعلیم دلوائی حالانکہ اس وقت مسلمان گہرانے کی لڑکیوں کا اسکول جانا پسندیدہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ محمد احسن کی بیگم تادر جہاں لکھنؤ سے بیہ کر آئی تھیں اور خود بھی تعلیم یافتہ تھیں، تعلیم کی اہمیت کو سمجھتی تھیں اس لیے میاں بیوی نے مل کر اپنے بچوں کو ہر ممکن تعلیم دلوائی تاکہ بدلتے وقت کے ساتھ وہ شانہ بشانہ چل سکیں۔

محمد احسن کے تمام بچے خوش شکل اور ذہین تھے لیکن ایک بیٹی اقبال جہاں کو حسن و ذہانت قدرت نے دل کھول کر عطا کی۔ ایسی کہ جو دیکھ لے وہ اندکی تعریف ضرور کرے جو ساری دنیا کے حسن اور خوبصورتی کا خالق ہے۔

اقبال جہاں نہ صرف حسین و ذہین تھیں بلکہ اخلاق اور عادات میں بھی ایسے انسان کم کم ہوتے ہیں۔ نہ اپنے حسن پر نازاں نہ اپنی ذہانت پر غرور، سلیقہ مند ایسی کہ سلائی، کٹائی اور نٹے پھانوں میں ماہر، عید، بقرعید جب جوبلی کی ڈیوڑھی میں درزی پیشیں رکھ کر بیٹھے اور خاندان کے افراد کے کپڑوں کی تیاری ہوتی تو یہ بھی کسی درزی سے سوئی ہاتھ میں لے کر کہتیں۔ ”دیکھیں ہم بھی درزی ہیں۔“

اقبال جہاں کو ہزاروں اشعار پوری پوری نظمیں

اردو، فارسی کی از بر تھیں۔ اسکول میں وہ اپنی استانیوں کی پسندیدہ شاگرد تھیں۔

محمد احسن کے سب سے بڑے بیٹے اسلم فرخی تھے۔ نہایت ذہین اور فعال نوجوان، علم و ادب اور شاعری سے گہرا لگاؤ۔ یہ ایک ادیب و شاعر کی حیثیت سے ابھر رہے تھے، شہر میں قائم ہونے والی نوجوانوں کی ادبی تنظیم کے بانیوں میں سے تھے۔ جس کی نشستوں میں باقاعدگی سے شرکت کرتے۔ یہیں ان کی ملاقات علیم الدین خان سے ہوئی جو ہم ذوق اور ہم خیال ہونے کی وجہ سے دوستی میں تبدیل ہو گئی۔

بڑا بیٹا ہونے کے ناتے اپنے گھر، خاندان اور بہنوں کی شادی بیاہ کے معاملات میں اسلم فرخی اپنے آپ کو اپنے والد کے ساتھ برابر کا ذمہ دار سمجھتے تھے۔ جب گھر کی بڑی بیٹی اقبال جہاں سترہ برس کی ہوئیں اور ان کی شادی بیاہ کی بات چیت شروع ہوئی تو اسلم فرخی کی نظر انتخاب ذہین اور پڑھے لکھے نوجوان علیم الدین خان پر پڑی۔ اسلم اور اقبال ان دو بہن بھائیوں میں دوستانہ بھی بہت تھا اور ایک دوسرے کے جذبات اور خیالات کو سمجھتے بھی خوب تھے۔ اسلم فرخی جانتے تھے کہ ان کی بہن روشن خیال، پڑھی لکھی اور علم و ادب کی دلدادہ ہیں اور ان کے لیے ایک صاحب علم اور وسیع النظر شخص کا زندگی بھر کا ساتھ ضروری ہے۔ کہاں یونی (اتر پردیش) کا مشرقی حصہ اعظم گڑھ اور کہاں فتح گڑھ، فرخ آباد۔ مگر یہ سچ ہے کہ جو بڑے آسمانوں پر بیٹے ہیں اس لیے علیم الدین خان، فرخی خاندان کے داماد بن گئے۔ یہ پاکستان بننے کے بعد کی بات ہے۔

پاکستان وجود میں آچکا تھا اور اپنے وطن کی محبت میں سرشار مملکت اسلامی کے شہری کہلانے کے تھاخر کے ساتھ جینے کے لیے ہزاروں لوگ روزانہ ہجرت کر کے ہندوستان سے پاکستان کا رخ کر رہے تھے۔ پاکستان بنانے، پاکستان حاصل کرنے کے لیے کتنے لوگوں نے اپنی جان کے نذرانے پیش کیے، کتنے بھرے ٹرے خاندان اجڑ گئے۔ کتنے باپ اور بھائیوں نے اپنی

نظروں کے سامنے اپنی ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کو اجڑتے دیکھا اور کتنی ماں اور بہنوں نے اپنے کڑیل پس اور بھائیوں کو ذبح ہوتے ان کے جوان جسموں سے خون کے فوارے اچلتے دیکھے، کتنی گودیں اجڑ گئیں کتنی ماؤں کے لال نظروں سے ایسے اوجھل ہوئے کہ پھر بھی نہ پلٹ سکے جو گہرانے ہندوستان میں جدی پشتی ہیں تھے، جن کی جوبلیوں کے دروازوں پر ہاتھی جھومتے تھے وہ پاکستان آ کر کہیں دو کمروں کے فلیٹ تو کہیں ٹین کی چادروں والے کوارٹرز اور کہیں جمہوریوں، کیمپوں میں پناہ گزین ہوئے۔ جن کی بیٹیاں ڈولی میں بٹھتی تھیں تو کہاں اپنے منہ پر پردہ ڈال لیتے تھے وہ بغیر دوپٹے نیچے چڑھ کر سرور میں خاک، حسرت و یاسیت کا مریخ بنی کیمپوں، کیمپوں اپنے پیاروں کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ آج اتنی دہائیاں گزرنے کے بعد بھی ان میں سے بہت سے لوگ زندہ ہیں۔ ان کی یادداشتیں بھی صحیح کام کر رہی ہیں۔ ان کے پاس بیٹھ کر ان سے یہ سچی کہانیاں سنیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اپنا وطن اپنی آزادی کس جدوجہد کی قربانیاں دے کر حاصل ہوتی ہے..... جن پہ گزری ہے جن پر گزرتی ہے وہی جانتے ہیں وہی محسوس کر سکتے ہیں ورنہ جن کے دل میں گداؤ نہیں جن کی روح آزادی اور ملکیت کے جذبے سے سرشار نہیں ان کو یہ احساس کہاں ہو سکتا ہے۔ انسان کی معمولی سی چیز بھی کھو جانے تو نظریں اسے تلاش کرتی رہتی ہیں۔ برصغیر کے مسلمانوں کا تو بہت کچھ کھو گیا تھا، لٹ گیا تھا، تباہ و برباد ہو گیا تھا۔ نہ صرف گھر بار، روپیہ پیسہ، سب سے بھارے اور عزیز رشتے..... آنکھوں کے سامنے کٹ گئے، مر گئے، کھو گئے تھے۔ ان تمام سانحوں، غموں، دکھوں اور آنے والے زمانے کی بے یقینی کی کیفیات کے باوجود ایک جذبہ پایا تھا جو ان سب کو توانائی، خوشی اور عزم سے سرشار رکھے تھا۔ آزادی..... اپنا وطن..... دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کا شہری ہونے کا اعزاز و فخر..... اس جذبے سے سرشار محمد احسن کے سب سے بڑے بیٹے اسلم فرخی پاکستان آ گئے یہاں کے حالات کا جائزہ

لینے۔ حالات کچھ بہت زیادہ امید افزا تو نظر نہیں آتے لیکن ”اپنا وطن“ والا جذبہ ہر چیز پر حاوی تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ پاکستان سے ہندو اور ہندوستان سے مسلمان اپنے اپنے گھر، کاروبار چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ کراچی میں ہندوؤں کے بڑے بڑے مکانات اور بنگلے مع ساز و سامان کے خالی پڑے تھے۔ موقع سے فائدہ اٹھانے والے لوگ اس وقت بھی جی بھر کر فائدے اٹھا رہے تھے۔ مال غنیمت سمجھ کر ان خالی مکانوں، بنگلوں، بلڈنگوں پر قبضہ کر رہے تھے۔ اسلم فرخی بھی نہایت آسانی سے یہ سب کچھ کر سکتے تھے لیکن ان کی تربیت اور فطرت ایسی تھی کہ بغیر اپنی محنت اور جدوجہد کے کسی کی مجبوری کا فائدہ اٹھانے کا سوچتے۔ انہوں نے پاکستان چوک کے علاقے میں واقع ایک ایسی بلڈنگ کا انتخاب کیا جس کا ہندو شیخ رحیمی رام موجود تھا اور کچڑی وصول کر کے فلیٹ ماہانہ کرایے پر دے رہا تھا۔ اسلم فرخی نے پاکستان چوک کے علاقے کا انتخاب اس لیے کیا کہ اس کے نام کے ساتھ ”پاکستان“ لگا تھا دوسرے یہاں اسکول، کالج بڑی تعداد میں تھے بلکہ شہر کے تمام نامی گرامی تعلیمی ادارے بالکل اسی چوک کے اطراف میں یا چند منٹ پیدل کے فاصلے پر تھے۔ ڈی جے سائنس کالج، این ای ڈی انجینئرنگ کالج، ڈاؤ میڈیکل کالج، ایس ایم آرٹس کالج، ایس ایم سائنس کالج، ایس ایم لا کالج، گورنمنٹ کامرس کالج اور سب سے بڑھ کر سندھ مدرسہ ہائی اسکول اور کے ایم ای مشن روڈ پر واقع اسکول جہاں کا اعزاز یہ ہے کہ وہاں بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پاکستان چوک پر اس وقت ایک بہت بڑی اور عالی شان بلڈنگ تھی ”پرنس کونسل“۔ یہی منزل عمارت پرنس کونسل لاہور کی کی تھی جس کے ہر فلور پر ہزاروں کی تعداد میں کتابیں تھیں۔ بچوں کی کتابوں سے لے کر آرٹس سائنس، انجینئرنگ، میڈیسن کیا علم کا خزانہ وہاں موجود نہیں تھا۔ اسلم فرخی کے لیے یہ اجتہادی خوشی اور اطمینان کی بات تھی کہ ان کے چھوٹے بہن بھائی آئیں گے تو ان اداروں



سے ان کتابوں سے بہ آسانی فیضیاب ہو سکیں گے۔ وہ واپس ہندوستان گئے اور جب دوبارہ پاکستان واپس آئے تو ان کے..... ساتھ والد، والدہ، مائی، رشتے کی بہن، باجی آپا، چار بھائی اور دو بہنیں تھیں۔

محمد احسن کھاتے پیتے متمول گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ خاصی جائیداد چھوڑ کر آئے تھے لہذا اس کا کلیم بھرا جس کے نتیجے میں کھاراد کے علاقے میں ایک بہت بڑی زمین الاٹ ہو گئی۔ اس زمین پر کچھ کمرے بھی بنے ہوئے تھے، یہاں محمد احسن نے مشینیں نصب کروا کر ایک کارخانے کی بنیاد رکھی۔

اسلم فرخی کو ریڈیو پاکستان میں ملازمت مل گئی۔ ریڈیو میں ملازمت کا مطلب ہوتا تھا پڑھے لکھوں کی صحبت میسر آتا۔ ایسی شخصیات سے تعلق کہ جو نہ صرف آپ کے علم اور وسعت نظر میں فروغ کا باعث بنتے بلکہ آپ کی تربیت اور شخصی نکھار میں اپنی امدادگار ہوتے۔ ان میں سے ہر شخص اپنی ذات میں انجمن تھا۔ اسلم فرخی نے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور باقی بہن بھائیوں کی بھی پڑھائی کا سلسلہ دوبارہ جوڑا۔

علیم الدین خان اپنی اہلیہ اقبال جہاں کے ساتھ ہندوستان (فتح گڑھ یو پی) میں رہ گئے تھے۔ ان کے خاندان میں ایک نئے مہمان کی آمد، آمد تھی اور پھر اللہ تعالیٰ نے ایک بیٹی کی شکل میں انہیں اولاد کی نعمت سے نوازا۔ وہ دونوں بے حد خوش تھے۔ انہوں نے اس کا نام رکھا نیلوفر۔ نیلوفر علیہم خان۔

وقت کے ساتھ ساتھ اقبال جہاں کی شدید خواہش تھی کہ اپنی بیٹی کو اپنے والدین اور بھائی بہنوں کو دکھائیں۔ ان لوگوں کی بھی پاکستان میں یہی خواہش تھی کہ جلد از جلد بچی سے ملیں کہ وہ اس خاندان کی پہلی نواسی تھی۔ پاکستان جانا اتنا آسان نہ تھا، علیم الدین خان کی فوج کی نوکری۔ ان کے والد کی لمبی چوڑی زمینداری، وسیع و عریض کاروبار، زمین، جائیداد جس کے وارث علیم الدین خان اور ان کے بھائی شہاب الدین خان تھے۔ علیم الدین کے پاکستان ہجرت کرنے

کی صورت میں ان کے والد کی آدمی جائیداد اور زمین بچن سرکار ضبط ہو جاتی، اتنی بڑی زمینداری، جائیداد اور کاروبار چھوڑ کر شفاعت احمد خان پاکستان ہجرت کرنے پر تیار نہ تھے۔ نیا ملک، نئی زمین نہ جانے وہاں کے حالات کیسے ہوں؟ زمین دار، جاگیردار آسائشوں کے عادی..... تخی اور مشکلات کے بارے میں سوچتے بھی ڈرتے تھے۔ وہ تو علیم الدین خان کو بھی اس سوچ سے باز رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ”تمہاری بیٹی بھی ہو گئی ہے۔ یہاں مکمل آرام و آسائش سے لپے کی نئی جگہ لے جا کر مشکلات میں ڈالنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا کی ہے تم کو یہاں.....“ مگر پاکستان اور آزادی نہ صرف علیم الدین خان کا خواب تھا بلکہ انہوں نے اس کے لیے جدوجہد بھی کی تھی یا قاعدہ تحریک میں حصہ لیا تھا۔ جوش و خروش سے نعرے لگاتے تھے ”لے لے کر ہیں گے پاکستان، بٹ کے رہے گا ہندوستان“ تن، من، دھن سے اپنی سرزمین پر بسنا چاہتا تھا۔ اسی جذبے کی شدت تھی کہ وہ خاموشی سے ہر چیز سے دستبردار ہو کر اپنی بیوی اور چند ماہ کی بیٹی کو لے کر پاکستان آ گئے۔ اسی فلیٹ میں جہاں ان کی بیوی اقبال جہاں کا پورا کنبہ رہائش پذیر تھا۔ ان لوگوں نے ان کا خوشدلی سے استقبال کیا خاص طور سے نیلوفر کا جس کو وہ سب پیار سے نیلو پکارتے تھے۔

یہ سب خوش تھے، مطمئن تھے۔ نہ جگہ کی تنگی کی شکایت نہ اپنی کوٹھیں، چولپوں کو چھوڑ کر آنے کا مال۔ مسرور تھے ایک آزاد اسلامی مملکت کے شہری ہونے پر، آج سوچیں تو تصور نہیں آتا کہ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں مختلف عمروں، مختلف مزاجوں کے اتنے سارے افراد کا گزر بسر نامول انداز میں کیسے ہوتا تھا اب جب کہ گھروں میں ڈرائنگ، ڈائننگ، لاونج اور کئی ٹی وی رومز ہوتے ہیں وہاں ایک دوسرے سے عجیب سی بیواری اور کوفت کی کیفیت طاری رہتی ہے۔

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں

## بہنوں کی محفل

انجم انصار

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ جان، بہنو! السلام علیکم رحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانہ عالم کو جو بدبخشا اور درود و سلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

\*\*\*

نیا عیسوی سال آپ سب کو مبارک ہو۔ خدا کرے یہ سال تمام مسلمانوں کے لیے خوشیوں اور شادمانیوں کی ایک نئی بارخیزم کرنے کا موجب بنے، آمین ثم آمین!

ہماری یہ ہمیشہ سے خواہش رہی ہے کہ اس محفل میں آپ کے خطوط ایسے دلچسپ اور قریے، قاعدے والے ہوں کہ ان کو پڑھ کر سب کے من سے بے اختیار ”واہ“ نکلے۔ اس لیے اب آپ مزید کم کس کس محفل میں شریک ہوں کہ آئندہ اسے سب سے بہترین خط پر شمیم فضل خاں کی کتاب تحفے میں بھیجی جائے گی۔ شمیم، بہن کی دلچسپ اور مزے دار کتاب ہے اس پہنچ چکی ہے بلکہ کتابیں پہنچ چکی ہیں جو ہر ماہ اس، بہن کو دی جائے گی جس کا تبصرہ بہت اچھا ہوگا۔ ہاں طویل طبع لکھنے سے پرہیز کریں آپ کا تبصرہ کالی کے دو صفحات سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔

گزشتہ ماہ میں نے بزم پاکیزہ کے سوالات کے ہمراہ شناختی کارڈ یا کانج یا اسکول کارڈ بھیجنے کے لیے کہا تھا..... بہن سی بہنوں نے خطوط کے ہمراہ بھی کارڈ بھیجے ہیں۔ خطوط کے لیے اس قسم کی کوئی شرط نہیں ہے..... دراصل حافظ علویے والے چاہتے ہیں کہ ان کا خطوط پاکستان میں ہر بہن کے گھر جائے۔ اس لیے اب آپ خوب مختارے وار سوالات بھیجیں۔

نیلوفر عباسی شوبز کے حوالے سے ایسی شخصیت ہیں جو کل بھی پسندیدہ تھیں اور آج بھی ہیں..... ان کی شخصیت میں خود کار اور محکمیت ہے..... اس کی سب سے بڑی وجہ ان کے اپنے خاندان کے اثرات ہیں..... نیلوفر کی آپس کی باتیں آپ اب باقاعدگی سے پڑھیں گی..... اور یقیناً نیلوفر کے ساتھ ساتھ آپ کی بہت سارے لوگوں کے بارے میں معلومات بھی پڑھیں گی..... یہ پہلی قسط کیسی رہی؟ اس بارے میں اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔

\*\*\*

نئے عیسوی سال کا یہ پہلا شمارہ ہے۔ آئیے پہلے دو شریف پڑھ لیں (جو نماز میں پڑھا جاتا ہے) ابھی پڑھ لیں۔

\*\*\*

مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ، بہنوں کی تازہ سرگرمیاں

\*\*\*

معروف ادیب اور جاسوسی جلی کشنر کے جنرل منیر جناب اقلیم علیم کے بیٹے بلال کی شادی افشین کے



ساتھ خیر دھونی کے ساتھ ہوئی۔ (بے حد مبارکباد)

ۛۛ پاکیزہ کی مقبول اور محبوب مصنفات ناہید سلطانہ اختر اور شیریں حیدر ان دنوں ٹی وی کے مختلف چینل کے لیے سیریل لکھ رہی ہیں۔ (ماشاء اللہ)

کرکٹ کے حوالے سے معروف شخصیت جناب منیر حسین کے بیٹے اور شمعینہ منیر کے بھائی اختر کی شادی نازلی کے ساتھ سترہ دسمبر کو کراچی میں ہوئی۔ انیس دسمبر کو گولف کلب ڈی ایچ اے میں ویدہ ہواجس میں کرکٹ اور صحافت کے لوگوں نے بھی شرکت کی۔

ۛۛ گزشتہ دنوں شاعرہ اور افسانہ نگار ربیعی احمد کی بہن شاہانہ احمد کی شادی محمد سلطان کے ہمراہ مقامی لان میں ہوئی۔ (بے حد مبارکباد)

ۛۛ جاسوسی پبلی کیشنز سے وابستہ محمد اختر بیگ کی بہن شمعینہ نازی کی شادی محمد عمران کے ساتھ 24 نومبر کوئی ہوئی۔ (بے حد مبارکباد)

ۛۛ ماہنامہ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار اور شاعرہ رابعہ اسلم وڑائچ رحیم یار خاں کی شادی چار جنوری کو عمران کے ساتھ ہو رہی ہے۔ (بے حد مبارکباد)

ۛۛ پاکیزہ کی مستقل قاری عائشہ شکیل کی شادی تنویر اقبال سے 17 دسمبر کو خوب دھوم دھام سے ہوئی۔ (بے حد مبارکباد)

ۛۛ پاکیزہ کی مستقل قاری بہن ریمیا اور انیلا کے بڑے بھائی نوفل پرویز اقبال کی شادی کنول سے خوب دھوم سے ہوئی اس شادی میں شرکت کرنے کے لیے انیلا نوید اور فہدہ بی سے کراچی آئے۔ (بے حد مبارکباد)

ۛۛ شاعرہ یاسمین کنول راجپوت، پسرور کے بیٹا ہوا ہے جس کا نام محمد عبداللہ رکھا گیا ہے۔ (مبارکباد) پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار اور شاعرہ یاسمین کنول، پسرور کا پہلا شعری مجموعہ ”خاشا جب کلام کرتی ہے“ شائع ہو گیا ہے۔ خوبصورت سرورق صفحات 144 اور قیمت صرف 200 روپے ہے۔ کتاب منکوانے کا ایڈریس یہ ہے۔ مقصود پبلشرز، سرور مارکیٹ، اردو بازار۔ لاہور

ۛۛ پاکیزہ کی مستقل قاری آمنہ مشیر، نیویارک کی بیٹی غزل مشیر کی شادی 29 دسمبر کو تیسرے چھٹائی سے ہو رہی ہے۔ غزل نیویارک سے رخصت ہو کر ورجینا جا رہی گی۔ (بے حد مبارکباد اور بہت ساری دعائیں)

ۛۛ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار اور شاعرہ عالیہ طاہرہ ربیعی، لاہور کے بھائی حماد رضا کی شادی عدیلہ ضیا کے ساتھ 25 دسمبر کو سرگودھا میں خوب دھوم دھام سے ہوئی۔ (مبارکباد)

ۛۛ افسانہ نگار فرحانہ ناز ملک، ڈیرا غازی خان کے آٹھ سالہ بیٹے ملک دانیال نے قرآن پاک پڑھ لیا ہے۔ اس خوشی میں انہوں نے اس کی آئین کی تقریب کی۔ (ماشاء اللہ) فرحانہ ناز ملک کے حوالے سے دوسری خوشخبری یہ ہے کہ ان دنوں وہ ایم اے کا امتحان دے رہی ہیں۔ (ماشاء اللہ)

ۛۛ ہماری نئی افسانہ نگار طاہرہ حسین کی والدہ ان دنوں بستر علالت پر ہیں ان کی صحت یابی کے لیے ضرور دعا کریں۔

ۛۛ سینئر قلم کار ایم۔ کے صوفیہ، کراچی ان دنوں علیل ہیں ان کی صحت یابی کے لیے دعا کے لیے التماس ہے۔

ۛۛ حیدر آباد کی ایک بزرگ شخصیت جناب عبدالخالق کی صاحبزادی نگہت انتقال کر گئیں۔ ان کے لیے ایک بار سورۃ اخلاص پڑھ کر مغفرت کی دعا کریں۔

ۛۛ ۛۛ ۛۛ

کچھ نسیم آمنہ شاہ، کراچی سے۔ ”میں نے سوچا کہ آیا یہ بلا اختتام کو پہنچے پھر خط لکھوں گی۔ اتنی معلوماتی

حادثہ کن تحریر تھی کہ تعریف کے الفاظ نہیں ہیں۔ ساتھ ہی جکے جکے انداز کی گھریلو باتوں کی وجہ سے دلچسپی کا عنصر آخر تک برقرار رہا۔ یقیناً اسے ”رہنما عمر“ کے طور پر سنبھال کر رکھا جاسکتا ہے۔ پاکیزہ میں ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے ناہید سلطانہ اختر کا ناول پڑھتی ہوں۔ ہوا، ریت اور آنگن میں اس بار جو ہوا وہ غیر متوقع نہیں تھا۔ جیسا کہ ارفع کے سرالمیوں کا رویہ تھا۔ شادی سے پہلے ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ تیل منڈھے چڑھنے والی نہیں ہے۔ حیرت ہے کہ ارفع کے والدین اتنے سمجھدار اور بھانڈا دیہ ہونے کے باوجود یہ سامنے کی بات نہیں دیکھ سکے۔ بہر حال اگر یہ شخص ایک کہانی ہے تو یونانی اتار چڑھاؤ کے ساتھ ہی آگے بڑھتی ہے اور اگر حقیقی واقعے پر مبنی ہے تو بھلا اقتدار سے زیادہ در آدروں کو ہے، دیکھیے آگے کیا ہوتا ہے۔ امر تیل بھی اچھا ناول ہے۔ لگتا ہے اس میں زندگی کی مزید تلخ حقیقتیں سامنے آئیں گی۔ سائرہ عارف کے خواب آنکھیں، خواہش چہرہ نے یہ تجسس مزید بڑھا ڈالا کہ ایسے نامساعد حالات میں شمعینہ نے کیونکر اپنا مقام حاصل کیا۔ صائغہ اکرم کے ناول میں انسانی رشتوں کی کھلی باغیالی پر حیرت بھی ہوئی، افسوس بھی ہاں مگر یوں بھی ہوتا ہے آدرا کے جال تو ہونا ہی تھا۔ روحی بھابی کا کردار کسی نفسیاتی کی کا شکار تھا۔“ (آمنہ بہت عرصے بعد آئیں۔ تبصرے کے لیے ممنون ہوں)

کچھ عالیہ حرا، کراچی سے۔ ”آپ کی کامرے کا سفر نامہ تو اس قدر مکمل اور جامع ہے کہ بس! پہلے سے زیادہ متاثر کن ہے پڑھ کر دوبارہ پڑھنے کی خواہش ہوتی ہے۔ خاص طور پر اکتوبر کی قسط بہت جاندار تھی میں نے دوسرے پڑھی۔ تمام قارئین بہنوں کا شکریہ جو میری تحریر کو اتنا پسند کیا۔ یہ آپ لوگوں کی محبت ہے جو وقت اور محبت مجھے دیتے ہیں۔ بے حد شکریہ..... فصیحہ آصف خان اور عرشہ آپ دونوں کو سلام خلوص محبت، خدا کرے اس سال آپ کی تمام دعاؤں پوری ہوں، آمین۔ شیریں حیدر اتنے آسودہ آئی آپ بس بھی کریں اور ناہید سلطانہ اختر آپ کو کیا ہو گیا اتنی جن انگلیں سمجھدار اور پیاری ارفع کے ساتھ آپ کیا کر رہی ہیں۔ کہانی بننے کے لیے آپ نے اس کی سمجھداری کو ہی کھن گنگا دیا یا یہ طے تھا کہ بس..... ایسی ہونا ہے۔ شائستہ زریں بھی کبھی مجھے بھی یادوں میں یاد رکھا کریں۔ عالیہ حرا کے نام سے نہ کبھی مسرتیم کے نام سے ہی کہیں۔ سعدیہ ہاشم جے حد مبارک، امی کی طبیعت کیسی ہے۔ بہت سلام کہتا اور کہاں غائب ہو جاتی ہو۔ شاعری میں نکھار آتا جا رہا ہے۔ یہ محبت کا کمال ہے یا نکھار ایمن کا۔ رخ چوہدری تم تو بس اب تبصروں اور روداد کی نذر ہو جاتی ہو۔ کہاں ہے تمہاری فکر کاریاں۔ عزیزہ سید سلام قلم۔ سچ آپ کے قلم کی فکر کاریاں پڑھ کر اپنا قلم..... قلم کرنے کو دل چاہتا ہے۔ کتنی صفائی کیا فصاحت و بلاغت ہے۔ عذرا آپ کی اور تمام قارئین پاکیزہ کو نیا سال مبارک ہو۔“ (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

کچھ فاخرہ گل، امی ٹی بیوٹی کیلنک والوں نے تو خدا کا شکر ادا کیا ہو گا کہ سردیاں آئیں کیونکہ بارہ مہینے اس میں مالٹے کے چھلکوں کا ماسک ہی بتایا جاتا ہے حتیٰ کہ جون جولائی کے شمارے میں بھی۔ جلتہنگ میں پاگل کون نہیں اب تک کا آخری پسر ڈپر ہٹ خاکہ رہا (میری نظر میں) اور پڑھنے کے بعد میں نے سوچا کاش ایک دو سطریں ہر جگہ کے لیے مختص کر کے اس میں سے بھی پاگل چھائی کیے جاتے۔ عالیہ طاہر کی خوشخبری کا انتظار ہے۔ میری طرف سے ایڈوائس مبارکباد پاکیزہ میں اب تک فرخ اور نگین کی کی محسوس ہوتی ہے۔ ناہیدہ آئی کو دیکھنے کا بے حد اشتیاق ہے اس قدر خوبصورت لکھتی ہیں کہ مجھے ان کی تعریف میں استعمال ہونے والے الفاظ بھی بے بایاں لگتے ہیں۔ شیریں آئی کا بھی جواب نہیں لیکن ان کی نوے فیصد کہانیوں میں اسپتال کے تکلیف دہ مناظر کی تفصیل ضرور بیان کی جاتی ہے۔ بہر حال ہر بات سے قطع نظر وہ کھشتی بہت اچھا ہیں۔ بزم پاکیزہ یکسانیت کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔ عالیہ حرا نے دیے کی لو کے ذریعے بہت سوں کو ایک بہترین روشنی دکھائی۔ سائرہ عارف کے ناول کی ایڈوکن شمعینہ لکھاتے ہوئے بتاتی ہے کہ تقریب کی کوریج بعد میں ٹی وی پر بھی دکھائی جائے گی لیکن میں اس کے ایوارڈ لے کر نیچے اترتے ہی مبارکبادوں کے فونز آنا عجیب لگا۔ اگر کوریج براہ راست ہو رہی ہو تو اچھے کی بات



نہیں لیکن سب کا عین وقت پر فون کرنا..... نسیم نیازی سے کہنا ہے کہ حرف کی شاعری جیسے ہی دیکر اسے وقت پلیر ان کے درم اور تو ان کا بھی خیال رہیں کیونکہ بعض اوقات وہ شاعری سے زیادہ نثر کا تاثر دینے لگتی ہے۔ نوشین ناز نے روایت پر قرار رکھتے ہوئے بہترین لکھا۔ امرتیل کا ٹیچو بڑا فاسٹ ہے اور مزہ دیتا ہے۔ ماہ رخ ضرور دلی کا کردار ادا کرے گی۔ صائمہ اکرم کا محبت اب نہیں ہوگی موضوع کچھ اتنا منفرد نہیں تھا لیکن لکھا اچھا کیا ہے اور امید ہے اگلا حصہ مزید دلچسپی لے ہوگا۔ سیز گرل جیسی اسٹوری پا کیزہ میں دیکھ کر حیرت ہوئی۔ طاہرہ جمیل کو بھی مزید محنت کی ضرورت ہے۔ کم از کم اس افسانے سے تو یہی تاثر ابھرا ہے۔ اسماعیل کے افسانے میں جب کہ اس کی ماں اس کے بولنے کی قوت سے محروم ہونے کا جاننے کے باوجود بھی نکاح کی تاریخ طے کرنے آئی تھیں اور پھر فاران کی ماں کے آنے پر نو آسرینڈر کرنا کچھ بات نہیں بنی۔ ویسے ٹاپک خاصا ڈیفریٹ تھا۔ نسیم افضل جی کا افسانہ اچھا تھا لیکن فیاض جیسے چپ کپ بندے کے ساتھ تو..... سعد یہ رئیس کی گاؤں کی گوری بھی اچھا تھا۔ واقعی ظاہری تاثر اکثر غلط ثابت ہوتا ہے۔ سرفرازے میں پیسے دینے والا واقعہ بڑا مزہ دے گیا۔ سروے بالکل پور تھا۔ عائش کی منہ دکھائی مزے کی تھی۔ شیریں حیدر بلیک اینڈ وائٹ تصویر میں بھی ناگس لگیں۔ بہنو کی محفل میں، انسانوں میں (مثلاً صائمہ اکرم نے اس دفعہ) اشار چلس کا اتنا حوالہ دیتی ہیں کہ اوہنے لگی ہوں بھی سوہتی ہوں میں بھی وہ سب ڈرامے دیکھوں کہ آخر چین کیا بلا جو سب نے ایک استعارہ ہی بنا ڈالا ہے۔“ (فاخرہ..... آپ کی رائے پہنچانی جا رہی ہے)

کچھ رابعہ فیاض قادری، کراچی سے۔ ”اس دفعہ کا پاکیزہ ملا۔ تین وجوہات کی بنا پر قلم اٹھانے پر مجبور ہوئی۔ نمبر ایک ناہید سلطانہ کا ہوا ریت اور آنگن جو خراماں خراماں آگے بڑھ رہا تھا۔ اس میں جھکا اس وقت لگا جب ارفع کو طلاق ہوگئی حالانکہ یہ تو طے تھا جس طرح کی حرکتیں ارفع کی تھیں اس کا انجام یہی ہونا تھا مگر بہت جلدی ہو گیا جب دو انسان شادی کے بندھن میں بندھے ہیں تو دونوں فریق پر بے حد ذمے داریاں آن پڑتی ہیں پھر جب ایک فریق صحیح طرح نہ چلے تو اس کی ذمے داری خود بخود دوسرے فریق پر آ جاتی ہے۔ زندگی کی گاڑی میں ڈھیلن لانے کے لیے کسی ایک کو ذمے داری سنبھالنی پڑتی ہے۔ یہاں بھی یہی واضح تھا کہ ارفع کو بھی یہ سنبھالنا ہے پھر کیسے ممکن تھا کہ اس کی بے بسی کو اس کے سرال والے نظر انداز کر دیتے۔ میں ان تمام لڑکیوں کو جو شادی کے بندھن میں بندھے والی ہیں یا نئی ہی شادی شدہ ہوئی ہیں۔ ایک مشورہ ضرور دوں گی کہ کبھی اپنے دل کے جذبات کو دل میں بند کر کے مٹ رکھنا۔ شادی کے رشتے میں اظہار بڑا معنی رکھتا ہے۔ آپ لا کھا اپنے جیون ساتھی کا خیال رکھیں، اپنے ہر عمل سے اس کا اظہار کریں مگر زبان سے اظہار ضرور کریں کیونکہ یہ بے حد ضروری ہوتا ہے کہ تجدید و فاداحت ہوئی رہے۔ دل کا حال صرف اللہ جانتا ہے۔ بندوں کو بتانا پڑتا ہے یہی وجہ ہے کہ ارفع فیکر ہوتے ہوئے ہم سزاوار نمبر کی اب اگر کوئی یہ کہے کہ کبھی ہماری عادت ایسی نہیں ہے تو جان لیں شادی نام ہی تبدیلی کا ہے اور اس میں زیادہ تبدیلیاں عورت کو ہی اپنے اندر باہر لانی پڑتی ہے۔ اب جب سیر دو پر آتے ہیں۔ آنٹی یہ کیا، آیا ہے بلاوائی جلدی ختم کر دیا۔ ہم تو حیران رہ گئے اس میں جس طرح آپ نے تمام مساجد کے بارے میں مختصر مگر جامع انداز میں بتایا وہ قابلِ تحریف لگا مگر اس کا اختتام دل کو افسردہ کر گیا۔ آخری اور تیسری وجہ پڑھنے میں پرچنی مصنفات نمبر تھا مگر اس میں ہمارا نام تو تھا ہی نہیں۔“ (ہیں! کیا تم نئی مصنفہ ہو؟)

کچھ عالیہ طاہر ریاضی، لاہور سے۔ ”عالیہ حراجی نے بہت زبردست لکھا۔ ساریکالوجسٹ کے ہاتھوں ایک اچھے اچھے کیل کو سنوارنے کا احوال بیان کر کے عالیہ جی نے نئی کیلو کے چھوٹے موٹے الجھاوے دور کر ڈالے ہوں گے اگر کوئی اپنا حاکم کرنا چاہے تو..... صائمہ اکرم اپنی تحریر کی ابتدائی سطور سے ہی قاری کو جھجھک میں جکڑ لینے کے فن سے آگاہ ہوتی جا رہی ہیں۔ یقیناً کچھ کاشت سے انتظار ہے۔ فوزیہ فرخ کا افسانہ بہت عام سا لگا۔ نسیم افضل خاتون کے حسب معمول بہت اچھا لکھا..... انہوں نے یہ ”جملہ“ بالکل درست لکھا کہ جس بندے کو اظہار کرنا نہ آئے اسے محبت کرنے کا بھی کوئی فن

نہیں۔ سعد یہ رئیس نے عشق کا ایک کڑوا پہلو دکھایا..... ایک تلخ رخ جدھر بہت کم دھیان دیا جاتا ہے بلکہ پھلکی تحریر بھی اچھی لگی..... طاہرہ حسین جو غالباً نیو انٹری تھیں۔ سیز گرل مختصر ترین افسانہ اچھا لکھا۔ اسما قادری اور سائرہ عارف کی تحریروں نے یقیناً مجھے پڑھ کر پھر تبصرہ کریں گے اور جناب جو سب سے زبردست تحریر رہی وہ نوشین ناز آخر کا افسانہ ہے خوش رہو تیرا دل پارہا دل ڈن ڈن ٹوٹیں جی ویل ڈن..... بہت ہی شاندار لکھا۔ آیا ہے بلاوا مسکون تو ہے ہی مزید معلوماتی ہوتا جا رہا ہے آج کل پا کیزہ اور دلکش ہر طرف عائش صاحب کی بڑی دھوم مچی ہوئی ہے۔ عقلی کی نظم کے ساتھ ہونے والی بیکری پر آپ کے تبصرے نے بہت لطف دیا۔ مٹی تو ہمیں ہے تماشا آئی۔ نسیم پر دین کے خط کے جواب میں آپ کی رسائی کی طور پڑھ کر بھی مجموعہ کلام کے نام پر آپ کا تبصرہ..... آپ برا حال ہو گیا مٹی سے۔“ (پسندیدگی کا شکریہ)

کچھ شگفتہ شفیق، کراچی سے۔ ”خوبصورت ناسٹل اور مچھی ہوئی تحریروں سے سجا ہوا نئی مصنفات نمبر بہت زیادہ پسند آیا۔ دھوپ، بادل اور بوندیں بہت ہی زیادہ اچھا لگا۔ ٹھیک ہی لکھا ہے۔ سیکندہ فرخ نے کہ جب بھی کوئی اپنے ساتھی کو صرف اپنا پابند کرنا چاہے تو پہلے اپنے بے راہ روی کی طرف بڑھتے ہوئے قدم روک لے کیونکہ یہ تو حالاتِ عمل ہے کہ حساب پورا ہو کر ہی رہتا ہے۔ صائمہ اکرم کا ناولت محبت اب نہیں ہوگی، اختتام کو پہنچا۔ یہ ناولت بھی زبردست رہا۔ نیر شفیقت کا در خواب وا کرے کوئی بھی پیارا افسانہ تھا۔ آیا ہے بلاوا بڑھ کر کس دل سے یہ صدا آتی ہے کہ ہمارا بلاوا بھی وہاں سے جلد دوبارہ آئے کہ دل اب وہاں جانے کے لیے بے قرار بہت ہے۔ شیریں حیدر کا دل امرتیل بہت ہی پسند آ رہا ہے۔ اس ناظر ظہر کے بارے میں زبردست کر دلی لگی ہے۔ کاش کہ شیریں اس میں نام نہاد جہادی کیپٹن کا ذکر ضرور لکھیں جہاں گمراہ کن پروپیگنڈے کے ذریعے یہ جلتے پھرتے خودش بمبار تیار کیے جا رہے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو معلومات ہو سکیں۔ باقی مستقل سلسلے بھی اچھے تھے۔ اس بار خوبصورت شاعر احمد اسلام احمد کی خوب شاعری پڑھنے کو ملی جو کہ بہت خوب تھی۔ میری طرف سے تمام قارئین کو بھی نیا سال اور برصغیر کی مبارکباد۔“ (آپ کی رائے پہنچانی جا رہی ہے)

کچھ ذاکر ممتاز ضیا، ماہر امراض خواتین ضیاء الدین اسپتال، کراچی سے۔ ”مجھے کچھ کہنا ہے کہ لیے میرا خیال تھا کہ لکھنے کے لیے اتنا مواد تھا کہ لکھوں لیکن داد و نیاز پڑی ہے جنہیں کہ تم نے سورہ صود کی ایک ایسی آیت مبارکہ کا انتخاب کیا جس نے تقریباً ہر مسئلہ کو حل کر لیا۔ اللہ تعالیٰ جزا دے، آمین۔ انوہ ناہید ارفع کے ساتھ وہ سب کچھ کروادیا آپ نے جس کا خدشہ تھا۔ آپ بہت اچھی رائٹر ہیں مگر میرا خیال ہے کہ ارفع کا رد یہ بھی سسرال والوں کے ساتھ مناسب تھا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ چولوگ نوکری پریشانی سے شادی کے خواہش مند ہوں ان کی کیا خواہشات ہوں گی اور انکو قاتل انہوں نے اس کا اظہار بھی کیا۔ بے شک ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کی ذات کو اہمیت دی جائے مگر یہ تو ان کو زندگی کے وقت ہی سوچنا چاہیے تھا اور پھر شادی کے بعد تو اس جیسی لڑکی کو اندازہ ہو جانا چاہیے تھا کہ سسرال والوں سے خاؤ آرائی مٹھنی پڑے گی جو تک تنہا نہیں اور سسرال والوں کے کام آنے کے لیے جو مضبوط بندوی وہ کر رہی تھی، کاش اس کا کھڑا سا اظہار بھی کر دیا ہوتا۔ اندھا دھند دولت کمانے والوں کے لیے عالیہ حراجی نے اچھی کہانی لکھی ہے۔ عالیہ کچھ لوگوں کو عقل آ جائے کہ پیسہ ہر چیز کا بدل نہیں ہوتا اصل اہمیت انسانی جذباتوں کی ہے مگر کہانی جیسے معالج آج کیاں؟ سنور گئے سب کے لیے میں کہوں گی کہ اللہ کی ہرمانی سے سنور گئے سب۔ نوشین ناز آخر کی کہانی پر کا تبصرہ دوں۔ ایسے نازک وقت جب تمام عالم اسلام اور پاکستان لب و لہجہ ہیں۔ انہوں نے بھی نام نہاد ملاؤں کی طرح کیا، اس خاص طبقہ کی طرف اشارہ کیے بغیر بھی وہ اس موضوع پر لکھ سکتی تھیں۔ ایسے ہمدرد اور مشفق مالک نے اشتقاق کو اتنا لے جانے ہی کیوں دیا جب کہ وہ اس کی خصوصی کفالت بھی کر رہے تھے اور اس کی تبدیلی خیالات سے بھی واقف تھے۔ شیریں حیدر ایک نو جوان بیوہ کی مشکلات کو بہت اچھے انداز میں اجاگر کر رہی ہیں۔ فاخرہ گل کی بلکی پھلکی اچھی لکھی۔ صائمہ اکرم اچھے موضوع پر اچھا لکھ رہی ہیں۔ سیز گرل کو اگر آخری مگر ہر مصیبت زدہ سیز گرل کو ان کی ہیروئن



کی طرح شارٹ کٹ کی خواہش نہیں ہوگی اور نہ ہی ایسے مواقع اتنی آسانی سے ملتے ہیں۔ اسمگل کی کہانی عام سی ہے شکر ہے کہ فاران کی گویائی جانے کا سبب ایک حادثہ تھا ورنہ اگر وہ پیدا نہ ہوگا تو نقص بچوں میں بھی ہونے کا چانس زیادہ ہوتا۔ طلال کے موسم بیت گئے اچھی تحریر ہے۔ سعد یہ رئیس کی گاؤں کی گوری میں ان کے ہر دے کے کچھ زیادہ ہی تیزی و دکھائی شادی میں ورنہ دوسرے گاؤں کی ساتوئی کے علاوہ بھی اور جہاں تھے بہر حال، بلکی پھلکی تحریر ذرا اچھی لگی۔ آیا ہے بلا واسطہ دفعہ حاجیوں کی بہت رہنمائی کرے گا۔ اس کو پڑھ لگتا ہے ہم بھی وہاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایک دفعہ یہ سعادت نصیب کرادے۔ سب یادیں تازہ ہو جاتی ہیں اور دل دوبارہ زیارت کے لیے تڑپ جاتا ہے۔ انجمن شکر یہ تم نے وہاں میرا نام لے کر دعا کی اب دعا کریں مجھے دوبارہ یہ سعادت نصیب ہو۔ علی اور شائستہ کے شوہر کو جو سعودیوں نے ریال دیے اس کا ہمیں بالکل اندازہ نہ تھا۔ ہاں البتہ ان کی مہمان نوازی کے ہم بھی جزے لے لے چکے ہیں بلکہ وہاں تو ہر شخص ہی مہمان نوازی کے موڈ میں ہوتا ہے۔ رمضان صاحب اور ان کی بیگم کو عائش کی پیدائش مبارک ہو۔ تم نے اور رنے نے اچھی کوریج کی ہے۔“ (شکر یہ)

کچھ ایسے عندلیب، سلاوولی سے۔ ”محترمہ نسیم نیازی کو دیکھنے کی آرزو مدت سے تھی سو پوری ہوئی۔ ڈینٹ سی پر سٹائی ہے۔ میں انہیں عرصہ دراز سے جانتی ہوں۔ تقریب کی روداد پڑھی بہت اچھی تھی اس لیے آپ سب کی باتیں رمضان بھائی صاحب کی میزبانی سب کچھ اچھا لگا۔ خواتین کی خریداری کے کمالات تو عینے کا قائل نہیں تھا یہ تو عام سی باتیں، واقعات، حالات سب کے تقریباً سبکی ہوتے ہیں۔ عذر دراصل کی یہ بات مجھے بڑی پیاری لگی۔ (مجھے اپنی رائٹر کو نمایاں کر کے زیادہ خوشی ہوئی ہے) بالکل رائٹر تو رسالے کی جان ہیں ان کی محنت اور پیاری پیاری سبق آموز تحریروں سے رسالہ ساتویں آسمان کو چھو رہا ہے۔ صاحبہ اکرم، کوئل ستار (نور مساند) یہ محفل ہمارا گھر ہے، ہم اپنے تجربات، خیالات بل بیٹھ کر شکر کرتے ہیں جو میرا تجربہ تھا نیچر کے لی ہوئے متعلقہ لکھا جو آپ کے تجربات ہیں میں ان سے بھی متفق ہوں۔ کوئل بہن ہم کیسے اپنی بہنوں سے ناراض ہو سکتے ہیں بلکہ ہم سب کو ایک دوسرے کے خیالات صبر و تحمل سے سننے چاہئیں۔ ایک ما بعد انجم آپ کی گھر جمع ہوتے ہیں مجھے اچھا لگتا ہے۔ پیاری بہن نوشین ساجد نوشی سرگودھا، آپ سلاوولی آئیں مجھے بھی دکھ ہوا نہ لے گا۔ کاش کوئی رابطہ ہوتا تو میں اپنے کچے سے گھر میں آپ کو اچھی سی چائے پلاتی، کھانا بناتی آپ کے لیے۔ آپ سرگودھا میں ہوتی ہیں، میں ہر دفعہ دو چکر لگاتی ہوں علاج کے سلسلے میں۔ شاید میں ہی آپ سے کوئی راہ نکال لوں ملنے کی ویسے میں بہت سادہ مزاج سی لڑکی ہوں۔ جلیغ تک میں ہشتے بھوت تحریر پسند آئی۔ ناہید آپ کی یہ کیا غضب کر دیا۔ اربح کے آشیانے کو آگ لگا دی۔ ویسے آپ اب بھی اکثر گھروں میں بیٹی کو رخصت کرتے وقت بھی نصیحت ہوتی ہے کہ بیٹی اب وہی تمہارا گھر ہے بس جنازہ ہی لے لے گا لیکن اب وہ حال ہی نہیں رہے۔“ (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

کچھ سعد یہ ہمارے سرگودھا سے۔ ”ناٹل گرل کی نکھی نظروں کا اور اسید عادل کے آ پار ہو گیا۔ نیلا اور کالا دونوں ڈریسز بد دوست تھے۔ ادارے کا ایک ایک لفظ کھرا لگا۔ واقعی آج کل کے نوجوان کھائی سے بچ کر کنوئیں میں خوشی سے گر رہے ہیں۔ ناہید سلطانہ کے قلم سے نکلا معاشرتی ناول ہوا، ریت اور آنگن ازدواجی تعلقات اور اس کے اتار چڑھاؤ کی غمازی کرتا ہے اور گھر بیٹو سیاستوں کی وجہ سے اچڑنے والے گھروں کی عکاسی بہت عمدگی سے کر رہا ہے۔ واقعی یہ دنیا منافقوں کی ہے۔ اربح کی چھوٹی سی غلطی کی اتنی بڑی سزا اس معاشرے کے لیے تازہ بانہ ہے عراکیت شکایت ہے کہ کہانی کا ٹیپو بہت سلو ہے یہ قسط بھی طلاق پر ہی غمخیز رہی پلیر کہانی کو ڈرا تیز کریں۔ سیکین فرنگ کی تحریر دھوب، بادل اور پوند میں بھی از دو اجیات پر ہی تھی۔ رعنا کوڑی کی پہلی تحریر متاثر کر گئی۔ محبت اب نہیں ہوگی جس محبت تو پھر ہوگی عروج کو حنا سے ہاں روحی اور ڈر کا انجام صحیح ہوا۔ جیسی کر لی ویسی بھرنی۔ پاکیزہ ڈائری اس دفعہ غضب کی تھی لہر وغل ٹکینے کی طرح فٹ تھی۔ بہنوں کی محفل بھی خاصی دھواں دھاری ہاں سرگرمیاں تو اس دفعہ ہمیں زہرہ

نہ لگیں۔ شیریں حیدر ہماری طرف سے مبارکباد کا گلدستہ قبول کریں اور آپ بھی میری دوست صاحبہ خان مردان کو برا سلام پہنچادیں۔“ (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

کچھ فریدہ خانم، لاہور سے۔ ”فریدہ فری صاحبہ کی رائے کا بے حد شکر یہ دیے فون پر تو وہ مجھے عظیم اور بڑی شاعرہ کہتی ہیں اور میری شاعری کی بے حد دیوانی ہیں۔ میری نظموں کا انہوں نے اپنے پاس رکھا رکھا ہوا ہے۔ حیرت ہے کہ ایسی یکسانیت کی شکار شاعری کو وہ کیوں اتنا سنبھال کر رکھتی ہیں؟ ویسے فریدہ فری کو چاہیے کہ وہ اپنی شاعری پر بھی نظر ثانی ضرور کریں کہ وہ خود کیا سمجھتی ہیں؟ اپنے محبوب سے کسی کو بھی شکوہ ہو سکتا ہے اور اس کا اظہار جرمندہ اپنے انداز سے کرتا ہے اور جہاں تک مرگئی، پاگل ہوئی تو ان الفاظ میں انہیں کون سا لفظ عجیب لگا، میں سمجھ نہیں سکی۔ میری شاعری پاکیزہ کے علاوہ مختلف ماہناموں، انٹرنیٹ اور اخبارات میں بھی آتی ہے، وہاں سے تو ایسی کوئی شکایت نہیں آئی۔ بہر حال میں ہرگز کوئی بہت بڑی شاعرہ نہیں ہوں، میں تو ابھی خود کھینے کے مکمل میں ہوں، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مجھے میرے مقاصد میں کامیاب کرے، آمین! اللہ تعالیٰ آپ کو صحت والی لمبی زندگی عطا کرے، آمین، میں نے اپنی رائے کا جواب دیا تھا۔ یقیناً آپ ماسٹ نہیں کریں گی۔“ (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

کچھ فرحانہ ناز ملک، ڈیرا غازی خان سے۔ ”عاوت کے ہاتھوں مجبور ہو کر بہنوں کی محفل کھنگالی جو ہمیشہ کی طرح ٹانٹ تھی۔ طاہرہ پردین آرائیں کا خط پڑھ کر احساس ہوا کہ انہوں نے قائل توجہ باتیں لکھی ہیں۔ طاہرہ جی..... اس خوبصورت اندازِ نیاں کے ساتھ انسانہ نوعی کے میدان میں بھی انٹرو ہو جائیں۔ مجھے مزید بات کرنی ہے اپنے ناول جن گھر جانا ہے کے متعلق سب سے پہلے تو ان بہنوں کی تہ دل سے مشکور ہوں جنہوں نے پسندیدگی کی سند عطا کی۔ بچ بتاؤں تو حوصلہ مزید بڑھا ہے جن بہنوں نے تنقید کی اسے بھی لائق غور جانا۔ نوخیز انجم نے لکھا تھا کہ یوں روڈ پر اماں کا بیٹوں کو دھوکے مارنا عجیب لگا۔ آپ کا اعتراض سرا آٹھوں پر لکھتے وقت تو احساس نہیں ہوا مگر آپ نے توجہ دلائی تو انفسوس ہوا کہ نہ کتنی پھر بھی..... بعض اوقات مزاح لکھنے کی کوشش میں قلم سے ایسے واقعات ہو جاتے ہیں جو حقیقت میں رونما نہیں ہو سکتے۔ جیسے کہ سب کام میں حقیقی زندگی سے برعکس مزاح ڈال کر ناظرین کو ہنسانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح مزاحیہ تحریر لکھنے میں نادانستہ رائٹر کا قلم غیر حقیقی سا ہو جاتا ہے۔ امین عندلیب آپ نے تو بلا جواز ہی میرے بے چارے ناول کا تپا پانچ کیا۔ میں نے اپنے ناول میں کہیں بھی نہیں لکھا تھا کہ نیچر زکا انداز کھنگو کیا ہوتا ہے؟ میں نے اپنے این سی سی کے انٹرکٹرز کا لب دلچہ جوں کا توں دکھانے کی کوشش کی اور کانچ کے یہ واقعات میری حقیقی زندگی سے نکدہ ہوئے تھے۔ رضیہ سلطانہ گوندل..... کوئی شک نہیں ڈی جی خان کی گجوریں بہت مشہور ہیں لیکن جناب..... ہم فریڈ ز اور کرزنز کا فکلی ڈائی خیال ہے کہ ہمارے شہر کا حسن بھی بہت مشہور ہے جو جملہ میرے ناول میں سرخام نے اٹنی کوچا نہ نہ پنے کے جواب میں کہا۔ یہی جملہ ایک لاہور ہے میری دوست سے کہا تھا کہ جو حسن و خوبصورتی میں زیبا بہتیار سے بھی دس قدم آگے ہے۔ فیصد ڈیر آپ نے بالکل درست پچانا۔ گاؤں کی زندگی بھی تجرباتی اور مشاہداتی دکھائی۔ آپ سب بہنوں کی تعریف و تنقید سربانے سے کم نہیں، یہ ساتھ ہے تو لکھاری کا قلم حق رہتا ہے۔ امید ہے آپ کی محبتیں میری ہم قدم رہیں گی۔ آج کل پاکیزہ کی جان ناہید سلطانہ اختر کا ناول بنا جا رہا ہے۔ کیا خوبصورت اندازِ نیاں اور کہانی ہے..... محتاج جیسے شوہروں کو تو لائن وار کھڑا کر کے کھانگوف سے اڑا دینا چاہیے۔ طلاق کے بعد ناہید جی نے جو کچھ دکھایا۔ وہ جسم میں خشنی دوڑا گیا۔ اربح کا قلم اپنے دل کی گہرائیوں تک سوس کیا۔ خدار اربح کی بھابی کو برے انجام تک پہنچائے گا۔ یہی نہیں سارے فدا کی جزیریں حیدر بھی پیچھے نہیں رہیں۔ ماہاکار دار متاثر کن ہے۔ شیریں جی ماہاکا بھی زندگی کی خوشیوں پر حق ہونا چاہیے۔“ (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)



کچھ پروفیسر عابدہ خان، ایسٹ آباد۔ ”میں چونکہ اس مہینے کے آخر میں کافی لمبے عرصے کے لیے بیٹی کے پاس کیلنڈر لیا جا رہی ہوں لہذا سوچا جانے سے پہلے ایک خط اور لکھ دوں۔ اس وقت ہوا، ریت اور آگن سے ابتدا کروں گی جو ہمیشہ کی طرح ناہید سلطانہ کا ایک بہترین ناول اور اعلیٰ ادب کا نمونہ ہے۔ پلاٹ، کردار نگاری، مکالمے، واقعات کا تسلسل، شستہ اور شائستہ زبان جو کہ انگریزی و ہندی کی غیر ضروری الفاظ سے پاک ہے۔ جزئیات نگاری غرضیکہ ہر لحاظ سے ایک منفرد تحریر ہے لیکن مہتاب اور اس کی ماں بہنوں کا ارفع جیسی مہذب اور رکھ رکھاؤ والی لڑکی کے ساتھ بدتمیز یا بد اخلاقی، بستی، جنگ آمیزی کی آخری حدوں کو چھوٹا ہوا رویہ جو کہ طلاق پر پہنچ ہوتا ہے، ناقابل برداشت اور ناقابل فہم ہے۔ پورے تناظر میں دیکھتے ہوئے یہی نتیجہ اخذ کر سکتی ہوں کہ اس سارے لمحہ بد سے بدتر اور بدترین حالات کی ذمہ داری ارفع کے والدین اور بہن افزا پر عائد ہوتی ہے۔ مہتاب کی والدہ اور بہنوں کا رویہ بلکہ خود مہتاب کی بھی یہ شرط کہ وہ ملازمت پیش لڑکی سے شادی کرے گا۔ اس خاندان کی لالچ، خود غرضی اور کمپنی فطرت کو شروع ہی سے خود کو زور و روشن کی طرح عیاں کر دیتا ہے۔ ارفع کسی پر ایسا بوجھ تو نہ تھی جو اس کے اپنوں نے ہی سارے شواہد سے چشم پوشی کر کے اسے زبردستی تنہم میں جھونک دیا جب کہ بہ آسانی اس قابل قدر رہی تو اس اذیت ناگ انجام سے بچا یا جاسکتا تھا لہذا میں یہ سمجھتی ہوں کہ یہ ناہید سلطانہ آخر کا ان روایت پسند، موم کی ناک مکھنے والے ناخلف لوگوں کو کبھی نہ سمجھ کر انہیں سر آکھوں پر بٹھانے اور ان کے آگے بے چوں و چرا کچھ جانے والے والدین کے نام ایک واضح پیغام ہے کہ جب بچیاں اپنی قسمت کے فیصلے تجربہ کار، جہادیدہ بزرگوں کے ہاتھ میں دے دیتی ہیں تو انہیں اس حق کو بہت احتیاط اور دور اندیشی سے استعمال کرنا چاہیے۔ آگے کا میں کچھ نہیں کہہ سکتی اس لیے کہ شاید اعلیٰ اقطاب میں نہ پڑھ سکوں۔ شیریں حیدر کا امرتیل بھی ایک مربوط اور عمل ناول ہے جو قاری کی دلچسپی پر قرار رکھے ہوئے ہے۔ آپ بیٹی کے ہر اے میں لکھا گیا ہے ناول اپنی جزئیات، جذبات اور کردار نگاری کے سبب کئی رد واد کا ناظر قائم کرتا ہے۔ زبان، لب و لہجہ سادہ اور سہل ہے اور حتیٰ الامکان انگریزی، ہندی کے بے حجاب استعمال اور لغویات سے پاک ہے۔ امید ہے کہ بقیہ ناول، افسانہ نگار نکس اور بچیاں ان ناول نگار بہنوں سے اچھی روایات اور پسندیدہ طرز تحریر اپنانے کا سبق سیکھیں گی۔ اسی حوالے سے بیٹی صاحبہ اکرم سے کہنا ہے کہ تمہاری اکثر تحریریں نہایت دلچسپی کا ناظر دیتی اور مجھے پسند ہیں لیکن نامعلوم کیوں بھی تم کچھ ایسا لکھ دیتی ہو کہ وہ پھر اور عامیانہ پن کا ناظر دیتا ہے۔ مثلاً نومبر کے شمارے میں محبت اب نہیں ہوگی کا پہلا حصہ کچھ ناگواری کا احساس دلاتا ہے۔ خاص طور پر اس کے آخری دو پیرا گراف جن کی اتنی چھوٹی تفصیل میں جانے کے بجائے، تم اپنا مطلب ایک جملے میں ادا کر سکتی تھیں اور قاری کو سمجھنے میں کوئی وقت نہ ہوتی۔ یہ میں اس لیے بھی کہہ رہی ہوں کہ تم بھی میری ہم پیشہ ہو۔ استاد کا پیشہ بہت منفرد پیشہ ہے اور اپنے ہزاروں شاگردوں کے لیے استاد ایک روشن چمکتا ستارہ ہوتا ہے۔ جس سے وہ رہنمائی حاصل کرتے ہیں اور ایک استاد کا ساری زندگی کا حاصل شاگردوں کی عزت اور روحانی محبت ہی ہوتی ہے اس لیے میری تمہیں یہی مخلصانہ نصیحت ہے کہ اپنے شاگردوں کے لیے ایک قابل قدر و احترام استاد بن کر اپنے کردار کو ایک نمونہ بنالو۔ امید ہے تم نے برا نہیں مانا ہو گا میری بات کا۔ ان کے علاوہ تین مختصر افسانے بھی نکش تحریر ہیں۔ فاخرہ گل کا شیل سے آگے تمنا سے باہر۔ شمیم فضل خاتون کا ملال کے موسم بیت گئے اور سعد بن ریس کا گاؤں کی گوری ایک عام کمزوری یا رجحان جس کی طرف میں توجہ دلانا چاہا رہی ہوں وہ ہے انگریزی کے الفاظ کا بے حجاب استعمال بعض اوقات تو یہ اردو میں انگریزی ہی لکھی ہوتی ہے۔ اگر اردو زبان کو آپ برقرار رکھنا چاہتی ہیں تو اس رجحان کی حوصلہ شکنی کرنی ہو گی۔ یہ سراسر جہالت اور غلام ذہنیت کی عکاسی ہے اگر بھی آپ نے ضیائی الدین کو بولتے سنا ہے تو وہ جب انگریزی بولتا ہے تو کوئی انگریزی بھی اس کی برابری نہیں کر سکتا لیکن جب اردو بولتا ہے تو محال ہے انگریزی کا ایک لفظ بھی استعمال کرے اور ہم میں انگریزی پر عبور نہ اپنی زبان اردو پر۔ جسے انگریزی بولنے لکھنے کا اس قدر شوق ہو وہ بڑی خوش

ہے اس زبان میں بولا لکھا کرے لیکن خدارا اردو کی ناک محبت توڑے۔ جد ہے کہ اردو کے روزمرہ عام فہم الفاظ کی جگہ بھی انگریزی کے الفاظ غلط انداز میں محسوس کیا جاتا ہے جیسے بون (چراغی) روم (کمر) نیبل (میز) چیر (کرسی) واش روم (غسل خانہ) قادر (والد) ایڈمنٹ (داخل) ایڈیشن (داخل) ٹائم (وقت) اسٹاک (ذخیرہ) سوئٹ (پیارا) فلور (حکمان کی منزل) روڈ (سڑک) لیکن (گلی) اور ان گنت ایسے الفاظ جن کے ہم البدل اردو کے الفاظ نہ صرف آسان عام فہم بلکہ خوبصورت بھی ہیں۔ قارئین کا اس قدر زیادہ قیمتی وقت لینے پر معافی چاہتی ہوں۔ بشرطہ زندگی انشاء اللہ کافی عرصے بعد ملاقات ہوگی، اللہ حافظ۔“ (عابدہ آغا نیعلی تبر کے لیے لکھ کر ہوں)

کچھ افشاں کوثر، کراچی۔ ”ہوا، ریت اور آگن کی اس قسط میں جو کچھ ہوا اس کا اندازہ گزشتہ قسط سے ہو رہا تھا۔ واقعی ارفع کے ساتھ جو کچھ ہوا بہت ہی برا ہوا اللہ سب لڑکیوں کو ایسے حالات سے بچائے۔ مہتاب جیسے لوگ بڑے لکھے جاہل ہوا کرتے ہیں اور وہ ارفع جیسی قابل اور سوئٹ لڑکی کے قابل بھی نہیں ہوتے۔ اب لگتا ہے ارفع کی شادی بالآخر صدمہ صاحب کے بیٹے سے ہی ہوگی۔ اللہ کرے یہ اس کے حق میں بہترین ہو۔ آیا ہے بلا دابے شک ایسی تحریر ہے جسے پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ ہم بھی اس بیان کردہ منظر میں کہیں نہ کہیں موجود ہیں۔ آپ کے لکھنے کا انداز اتنا سادہ اور دلنشین ہے کہ مجھے جیسی کم فہم بھی اسے بہ آسانی سمجھ لیتی ہے۔ پتا نہیں کیوں آپ کی ہر تحریر سے عجب سی انیسٹ محسوس ہوتی ہے۔ شاید میں آپ سے بہت متاثر ہوں اس لیے اپنا نہیں کیا۔ آپ سے اکثر ملنے کا سوچتی ہوں پھر مت نہیں ہوتی۔ اب سوچا ہے پائیزہ کی سالگرہ کے موقع پر اگر آپ نے اجازت دی تو ضرور آؤں گی۔“ (گڑیا تم سالگرہ سے پہلے بھی آ سکتی ہو)

کچھ خاکہ مدینہ، پنجاب۔ ”خدا رسول ہمیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ قیصرہ حیات پیدا ہی معصنہ ہیں۔ تمہیں سیمہ کی تحریروں کا اوڑھنا بچھونا محبت ہوتی ہے۔ حمزہ سیدی کی تحریر تباہ خزانے کی طرح ہوتی ہے۔ سراجہ حبیب حساس ادیبہ ہیں۔ ناہید سلطانہ آخر باریک بین ہیں۔ شیریں حیدر کی تحریر بھی آسان پر بھی زہین پر اور بھی پاتال میں پہنچ جاتی ہے۔ بشری سرور، سیمہ مناف، لیلیٰ مروج اور زہمت شانبہ حیدر بھی اچھا لکھتی ہیں۔ صاحبہ اکرم اور فاخرہ گل کی تحریر بھی کبھی اچھی ہوتی ہیں۔ باہی اپنی کتابوں کے نام بھی لکھ دیا کریں۔ ہاں، باہی آپ مجھ سے دوستی کریں گی خط کا جواب ضرور دیجئے گا کہ میں نے خط بہت مشکلوں سے پوسٹ کر دیا ہے۔“ (خوش آمدید..... خاکہ مدینہ کو تو سب اپنی آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ دوستی لازمی ہوگی)

کچھ رابعہ خالدہ، کراچی۔ ”ناکسل بہت حسین لگا سب سے پہلے ہوا، ریت اور آگن کی تیرہویں کڑی پڑی۔ ارفع اور اہل خانہ کے احساسات بہت خوبصورتی سے بیان کیے گئے۔ بہت دل دکھا، سکندہ فرخ کی دھوپ، بادل اور یونیس بہت منفرد انداز بیان اور حالیہ دور کی عکاسی کرتی، اچھی کاوش تھی۔ اساتذہ قاری، کارواں اپنا پھر بھری تہدید دیے گئیں۔ عائشہ خان وعدہ ہے تم سے اچھی کاوش تھی۔ اچھی ہلکی پھلکی تحریر نازنہ گیلانی اندھیری رات میں جگنو بہت اچھی کی سائزہ عارف خواب آنکھیں خواہش چہرے لا جواب قسط آخر میں پھر وہی لکھی کا احساس، رعنا کوثر، بحر نیکراں بھی خوب تھی۔ رتن اشپی، بس ایک قدم سبق، صاحبہ اکرم، محبت اب نہیں ہوگی بہت خوبصورتی سے کہانی کو سمیٹا گیا۔ اتنا عمدہ صاحبہ ہی لکھ سکتی تھیں۔ شرفقت در خواب واکرے کوئی پڑھ کر احساس ہوا تو جوان نسل کافی سے زیادہ ہی ہوشیار ہوتی جا رہی ہے۔ شائستہ زریں، عکس تیرا ہے تو سہا لب جو میرا ہے بس ٹھیک ہی لگا۔ فیروزہ عطاری بھلا کب وقت ٹھہرا ہے۔ واقعی صبر کا فیصلہ ماننے والے کبھی ناخوش نہیں رہتے۔ امرتیل شیریں حیدر تو بھی راتوں میں بہت خوش اسلوبی سے کہانی کو سننے سننے موڑ دے رہی ہیں۔ پانچویں کڑی بھی کافی دلچسپ تھی۔ اگلی قسط کا بھی سے انتظار ہے۔ سدرہ نسیم تیرے نام کی خاطر سبق آموز بھی آیا ہے بلا و امیر یقین مانے کی بار پڑھا اور شادی سے پہلے اپنا پہلا جہاد آگیا۔ کتنی دیر آنکھیں پرہم رہیں۔ اتنا اچھا، اتنا پیارا سفر خاتم کو بار بار اپنے گھر کے دیدار سے نوازے، آمین۔“



خانی ہر مسلمان کو بیت اللہ ضرور دکھائے۔“ (پیاری بہن خوش آمدید، اللہ تعالیٰ آپ کی اور تمام مسلمانوں کی یہ مراد ضرور پوری کرے)

✉ آمنہ، ایم، لاہور۔ گڑیا تمہارا تفصیلی خط پڑھا ہے تم بے حد کمزور دل کی لڑکی ہو اور بے حد حساس بھی ہو اس لیے ہر بات کو بے حد محسوس کرتی ہو اگر تمہیں شوگر نہیں ہے تو صبح، شام ایک ایک چمچہ شہدور و دشریف پڑھ کر ضرور کھایا کرو۔ روحانی مشورے میں سے کوئی وعادہ کچھ کر پڑھو سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔۔۔ خدا نخواستہ تمہارے ساتھ کوئی بھی ایسی بات نہیں ہے جس سے دل کو جلا یا جائے۔

✉ غزالہ عزیز، کراچی۔ آپ کا افسانہ میں نے دلکش میں دے دیا ہے، وہاں شائع ہو جائے گا۔ رہی بات آپ کی ناراضی کی وہ انشاء اللہ رفع کر دی جائے گی۔

✉ رخسانہ امجد، ملکوال۔ گڑیا تم خیریت سے تو ہونا تمہارے مہیاں جی کی اب طبیعت کیسی ہے؟  
✉ راجہ اسکرم وڑائچ، رحیم یار خان۔ اپنی شادی کی رو داد خود لکھ کر بھیجنا۔۔۔۔۔ یا اگر صائمہ اکرم تمہاری شادی میں

بہنوں کی محفل میں سارے خطوط اچھے تھے مگر طاہرہ پر دین آرائیں نے کچھ عجیب سا تجویز کر کے تلاش رفیق حیات کے حوالے سے ذاتی تجربات کی فرمائش کی ہے۔ لڑکیاں اگر اپنی عمر کی بنا پر کچھ شوخی اپنی تحریر میں لے آتی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہرگز اخذ نہیں کیا جانا چاہیے کہ انہیں رفیق حیات کی تلاش ہے۔ میں طاہرہ پر دین کے تبصرے اور تجویز سے بالکل متفق نہیں۔ جلیز تک حسب معمول ہٹ کے تھا۔ بہت بہت پسند آیا۔ میرا انتخاب میں سارے انتخاب اچھے لگے۔ میں اکثر سنگتانی ہوں سدرہ قسم اور زریں آفتاب کے انتخاب کردہ اشعار دل کو بھائے۔“ (شکریہ)

✉ فرح بخاری، یو ایس اے۔ خوش آمدید، آپ کا افسانہ قافلہ اشاعت ہے۔ آپ اپنے دیگر افسانے اور ناول ہمیں ضرور بھیجوائیں۔

✉ سیدہ نیناں عروج، ساہیوال۔ خوش آمدید آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔ مختصر افسانے ہمیں بھیجے ضرور شائع ہوں گے۔ قسط دار ناول ہم بطور خاص اپنی مصنفات سے کھواتے ہیں۔ اس لیے آپ نے جو ناول کی پہلی قسط ہمیں بھیجی ہے اسے ہم شائع کرنے سے قاصر ہیں۔

✉ فریدہ بانو، لاہور۔ خوش آمدید آیا ہے ملاو کی دسبر کے شمارے میں آخری قسط تھی۔۔۔۔۔ بہت جلد کتابی صورت میں آنے والا ہے۔ مزید اضافے کے ساتھ۔۔۔۔۔ وہ اس لیے کہ پاکیزہ میں مجھے اپنے نواسوں، نواسی کی باتیں لکھتے ہوئے عجیب سا لگتا تھا کہ کہیں کوئی یہ نہ سمجھے کہ چونکہ ایڈیٹر ہیں اس لیے اپنے بچوں کی باتیں لکھ رہی ہیں۔ ہاں، کتاب، میں نے جو اضافہ کیا ہے۔ وہ اپنے بچوں کی مزے مزے کی باتیں بھی لکھی ہیں۔ جیسے ہم الملوہ ہوئی میں ٹھہرے تھے۔ یہ مک کا اچھا خاصہ مشہور ہوئی ہے۔ عظمیٰ کا چھوٹا بیٹا علی۔ ہر ایک کو یہی بتاتا تھا کہ ہم لوگ الملوہ ہوئی میں ٹھہرے ہیں۔ ہمارا الملوہ بہت اچھا ہے وغیرہ وغیرہ۔

✉ فیروزہ بیگم، کراچی۔ اللہ تعالیٰ آپ کی طبیعت، ہوش ٹھیک رکھے کہ آپ کی بے لوث دعاؤں کی مجھے واقعی بے حد ضرورت ہے۔ میرا ناول کب شروع ہوگا۔ اس بارے میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔ فی الحال پاکیزہ میں ہمارے جو ناول چل رہے ہیں۔ وہ میرے ناول سے بھی بہت اچھے ہیں۔ ناہید سلطانہ اختر، شیریں حیدر، سائرہ عارف اور اما قادری بھی ہماری بے حد اچھی رائٹرز ہیں جن پر مجھے بے حد فخر بھی ہے۔ اس ماہ کی قسطیں کس غضب کی ہیں پڑھ کر رائے دیجئے گا۔

✉ عائشہ چندا، لاہور۔ اپنا غصہ تھوک دو۔ بزم پاکیزہ کے لیے نئے سوالات بھیجو۔ ایک ساتھ بہت سارے سوالات بھی بھیج سکتی ہو۔ حافظہ کا لمبائی حلوے کا انعام براہ راست انعام یافتگان کو بھیجا جا رہا ہے۔

کچھ کمیر احمد فاروق، اسلام آباد سے۔ ”سب سے پہلے آیا ہے ملاو میں آپ کے عمر کے قسط پڑھی۔ میں آج سے سات سال پہلے کی تھی۔ بچ گاڑی کے ساتھ یہ فیملی مجھ سے بھی نگرانی تھی میں نے ان صاحب کو بے حد ڈانٹا بھی تھا۔۔۔۔۔ وہ ابھی تک وہیں ہیں پڑھ کر ہنس بھی آئی۔ پہلے صائمہ اکرم کی تحریریں پسند نہیں آتی تھیں مگر اب بہت اچھی لگتی ہیں۔ برو فیصر عابدہ خان کا تبصرہ پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے میں نے لکھا ہو۔ وہ میرے دل کی بات سچائی سے کہتی ہیں۔ عالیہ حرائی کی تحریروں میں طوالت بے جا لگتی ہے۔ شیریں حیدر کے ناول کی یہ قسط بہترین رہی۔ ناہید سلطانہ اختر بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ نئی مصنفات بزم پڑھ کر مزہ آیا۔ عظمیٰ آفاق سے کہتا ہے کہ پاکیزہ کے لیے کچھ لکھیں ان کے تبصرے اور رپورٹنگ بہت دلچسپ ہوتی ہے۔ (کمیرا خوش آمدید۔۔۔۔۔ تبصرے کے لیے ممنون ہوئی)

کچھ مسز محمد علی، پنجاب سے۔ ”جلیز بارکسی ڈائجسٹ میں خط لکھ رہی ہوں۔ ایک غریب فیملی سے تعلق رکھتی ہوں۔ گھر کے بکھیرے، پریشانیوں، مسائل استے زیادہ ہیں کہ کبھی عمرہ کرنے کا خیال تک نہیں آیا۔۔۔۔۔ بخدا یہ آپ سے سچ کہہ رہی ہوں کہ آپ کے عمرے کا سفر نامہ پڑھ کر میرے دل میں یہ خواہش ہوئی کہ میں بھی عمرے پر جاؤں۔۔۔۔۔ یہ تحریر کی خوبی ہے کہ لوگوں کے دلوں میں وہ خواہش بیدار کرے جو ایک مسلمان کی آن اور شان ہے۔ اللہ

## اگر آپ کو

### جاسوسی سسٹم سے سرگرمی

کے حصول میں وقت پیش آ رہی ہے یا آپ کو اپنے علاقے کے بک اشال سے کوئی شکایات ہیں اور آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو اس کو پن کر کر کے روانہ کریں یا فکس کریں۔ (جس پرچے کے بارے میں شکایات ہوں اس پر دائرہ بنا دیں)

- (1) نام۔
- (2) پتہ۔
- (3) ٹیلی فون نمبر۔
- (4) بک اشال کا نام پر پتہ، فون نمبر۔
- (5) قریب ترین بک اشال کے نام، ٹیلی فون نمبر۔

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

شرع عباس: 0301-2454188

بدل الدین کولیشن منیجر 5804200 5386783- 5802552 فکس نمبر 5802551

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز - C-63، سیمینٹیشن ویس ہاؤسنگ اتھارٹی تین کورنگ روڈ، کراچی

E-mail: jdpgroup@hotmail.com







# جلیترنگ

انجم انصار

غلط فہمی

گھٹتہ جو اکوٹی بہن تھی..... اسے اپنے بھائی کے جانے کا از حد رنج تھا۔

اسے ایک چپ سی لگ گئی تھی۔

یا تو اپنے بھائی کے بارے میں یا لگوں کی طرح باتیں کرتی یا اس کی تصویریں دیکھتی رہتی..... یا پھر وہ انہیں یاد کر کے روئی رہتی۔

بہنوں کو بھائیوں سے کس قدر محبت ہوتی ہے اس کا اندازہ کوئی بھائی لگا ہی نہیں سکتا۔ مگر گھٹتہ کا بھائی اس سے بے حد قریب تھا اور وہ اس قدر کرم مزاج مزاج کا حامل تھا..... کہ اپنی بہن کو ہر وقت ہنساتا رہتا تھا۔

ایسے میں بھائی سے ملتی جلتی شبیہ اخبار میں نظر آتی یا بی وی پر یا پھر راہ چلتے..... تو اس کا ان پر بار بار نظر ڈالنے کو جی چاہتا۔

پہلے فلمیں دیکھنے سے اسے چڑھتی مگر جب عامر خان میں اسے اپنے بھائی کی شبیہ نظر آئی تو وہ اس ہیرو کی فلمیں بڑی باقاعدگی سے دیکھنے لگی تھی۔

بنو! پاکا بھی یہی خیال تھا کہ عامر خان کی فلمیں دیکھ کر ایسا ہی لگتا ہے کہ ان کا بیٹا امریکا کے بجائے بانی وڈ چلا گیا ہے۔

یہ انہی دنوں کی بات ہے یونیورسٹی میں گھٹتہ کا بیٹا نیا ایڈیشن ہوا تھا..... ایک صبح وہ یونیورسٹی جاری تھی پوائنٹ میں حاضری تھا۔

لاابالی لڑکے ہر اسٹاپ پر چڑھنے والوں کی حاضری لے رہے تھے۔

چچلی غیر حاضر

مولی حاضر سامیں

شاہجہم غیر حاضر

کدو حاضر جناب

بھوت لبیک

ٹوہانچہ غیر حاضر

بچی غیر حاضر

شریر لڑکوں کی جملے بازیاں پوائنٹ میں تھیں کہ پھول کھلا رہی تھیں کہ اچانک گھٹتہ کی نظر ایک لڑکے پر پڑی۔

یہ دیکھ کر وہ تھیری رہ گئی کہ وہ لڑکا ہو، ہوا اس کے جی جیسا تھا۔ اس قدر بھی مشابہت ہو سکتی ہے وہ ایک لڑکے کے لیے چکرا سی گئی۔ دوبارہ دیکھا وہ اپنے ساتھی کی بات پر مسکرا رہا تھا۔

اللہ مسکراہٹ کا انداز بھی بالکل وہی تیسری بار نہ ہے ہوئے بھی ایک اچھٹی سی نظر ڈالی..... وہ بھی شاید سے ہی دیکھ رہا تھا..... جیسے ہی گھٹتہ نے اسے پھر دیکھا..... ان صاحب نے اپنی بائیں آنکھ انتہائی ناشی سے دبا دی۔

”آف، مارے رنج کے اس کی آنکھوں میں آنسو مچے۔ دل چاہا کہ اس کے منہ پر تھوک دے۔

وہ ان کے بھائی جیسا تو بالکل بھی نہ تھا۔

\*\*\*

کھری کھری

سلطوت کے گھر میں امیرانہ ٹھاٹ اور اسلامی لباس پہنے ہوئے تھے جیسے تارگی میں کھٹا پس اور اس برابر کی رہی ہوئی ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے لوگ جب بھی کوئی اچھی مثال دینا چاہتے تو ان کا نام بڑے فخر سے لیا کرتے۔

مگر یہ اس وقت کی بات تھی جب ان کے بیٹے نے تھے اور وہ جو انٹ فمیلی سسٹم میں رہتی تھیں..... اس سسٹم میں کتنی ہی خامیاں کیوں نہ ہوں وہ سے بڑے ریلے کے اوپر بند ہاتھ رکھتا ہے۔

اکیلے گھر میں رہنے کا خمار جب چڑھا..... تو ان کی مایاں علیحدہ ہو گئی لے کر شفقت ہو گئے اور سلطوت نے بے حساب سے فرینڈ شپ کے تحت سوشل ورک کرنے لگائی۔ بہت سے لڑکے لڑکیوں کے رشتے انہوں نے کر دوائے۔

مظلوم خواتین پر ڈھیر سارے فیجز لکھے..... ان کو دل کی دھچکیں دیتے ہوئے اپنی بڑی بڑی تصاویر عمارت میں لگوا گئیں۔

اب ان کے گھر کے ماحول سے اسلامی رنگ اڑا تھا..... اور امیرانہ ٹھاٹ پر دکھائے اور مکاری کے دکھ ساتھ چھپور پن کی چھاپ علیحدہ لگ چکی تھی۔

جب ان کے بیٹے فرحان کی شادی کا وقت آیا تو انہوں نے اپنے احباب میں سے ایک ایسی لڑکی کا انتخاب کیا..... جس کی فیملی کے پاس اتنی دولت اور جائیداد تھی کہ ان کا بیٹا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے بھی بیٹھا رہتا تو اس کی کئی نسلیں پرورش پا جاتیں اور جب انہوں نے اپنے لاڈلے سپوت سے نجات بھرے لہجے میں کہا۔

”بیٹے سونے کا چھچھو لے کر تم ضرور پیدا ہوئے ہو مگر میری یہ خواہش ہے کہ تمہاری زندگی سونے کی کان میں گزرے..... اس لیے میں تمہارے لیے ایک ایسی لڑکی کا انتخاب کیا ہے کہ تم اپنی ماں کی پسند پر داد دو گے۔“

”ماما..... میری پسند آپ کی پسند سے میل نہیں کھاتی..... میں نے اپنا جیون ساتھی چن لیا ہے۔“ وہ بیل کم چلاتا ہوا بے پروائی سے بولا جیسے کہہ رہا ہو آج موسم میں کتنی زیادہ ہے۔

”چن لیا ہے.....؟“ انہیں غصہ ہی تو آ گیا۔

”فرحان تم اپنی جھلی پیچو..... نسیم بیگم کے ہاں بہت جاتے ہو..... ان کی مونو سی خالدہ کو پسند کر لیا ہوگا جو اپنے باپ کے کیئرنگ کے کاروبار کی نگرانی کر رہی ہے اور خوب مزے مزے کے کھانے پکانے بھی سیکھ گئی ہے..... اسی نے حلق سے دل تک کا راستہ طے کیا ہو گا۔“ سلطوت نے نہرا لگا۔

”جی نہیں..... آپ بڑی پیچو پر بہتان مت دھریں۔“

”اچھا تو..... پھر تمہارے باپ کی سوتیلی بہن ناصرہ کی سوکھی زرینہ نے تمہیں ششے میں اتارا ہو گا۔ جب سے وہ ستار بجاتا سیکھی ہے..... ہاکی کی طرح کھیلنے سے لگا کے تاروں پر ٹن ٹن کرنا ہی جانتی ہے اور جب کسی کو متاثر کرنا ہو تو بھرے ہوئے کیسٹ کا تین دبا دیتی ہے..... جب تو اس کے ستار سے ایسے ایسے جھرنے بہتے ہیں کہ ایک مرتبہ تو میں بھی مد ہوش ہوئی تھی..... وہ تو اس کی ایک ٹیکلی نے مجھے سرگوشی سے بتایا..... کہ ایسا اس نے آپ کو متاثر کرنے کے لیے کیا ہے ورنہ زینہ کو کچھ بجاتا نہیں آتا ورنہ میں تو زینہ پر اچھی خاصی سمجھتی تھی



تھی۔ وہ تو اس کی سہیلی کو مجھ پر رحم آگیا ورنہ میری آنکھیں تو اس کی بلائیں لے رہی تیں مگر سہیلی کی بات سن کر تو میرے ہوش ہی اڑ گئے۔ ”حد ہو گئی ہے۔۔۔۔۔۔ لوگ جوان بیٹوں کی ماؤں کو کس کس انداز سے گھیرا کرتے ہیں۔ پتا نہیں ناصرہ کو کیسے یہ پتا چلا کہ کسی زمانے میں مجھے ستار بجانے سے دیوانگی کی حد تک رغبت رہی تھی۔ اس نے وہی داؤد مجھ پر بھی آزمایا۔“

”آف ماما۔۔۔۔۔۔ آپ تو پریشان ہونے میں کمال رکھتی ہیں۔“

”بیٹا کیا یہ پریشانی کی بات نہیں ہے کہ تم نے مجھے بتائے بغیر اپنا جیون سا سچی منتخب کر لیا ہے اور میں اس کے بارے میں جانتی تک نہیں ہوں۔“

”ای آپ جس انداز سے زریبہ کے بارے میں سوچ رہی ہیں وہ بالکل غلط ہے۔ بیوی۔۔۔۔۔۔ زریبہ کے بارے میں تو میں نے کبھی نہیں سوچا، خواب تک میں نہیں لایا اس کو اور سب سے بڑی بات وہ پڑھی لکھی جاہل ہے۔۔۔۔۔۔ کوئی بات بھی اس سے کروں تو پہلے وہ شرابی ہے اور پھر کہتی ہے اسی سے پوچھ کر بتاؤں گی، بالکل نہیں کی۔ اس پر اس کے بال کتنے لمبے ہیں۔ بالکل چڑیل سی لگتی ہے۔۔۔۔۔۔ وحشت ہوتی ہے جب اس کا آدھا چہرہ بالوں سے ڈھکا ہوا دکھاتا ہوں۔۔۔۔۔۔ بے وقوف کو پتا ہی نہیں کہ آج کل لمبے بالوں کا فیشن نہیں ہے۔“

”پھر کون ہے وہ مکتوبی۔۔۔۔۔۔“ سطوت کا مارے غصے کے برا حال تھا۔ بیٹے کی بے قوفی کی وجہ سے ہاتھ سے کروڑوں روپے جانے کا نقصان اٹھدہ دکھ دے رہا تھا۔

”سوئیڈی ڈی آپ کو بے حد پسند آئے گی ماما۔۔۔۔۔۔ وہ جب سے مجھے ملی ہے کچھ اچھا نہیں لگتا۔“

”یہ ڈی بھلا کیا نام ہوا۔۔۔۔۔۔؟“ وہ غصے سے بولیں۔

”نام تو اس کا ذکیہ ہے مگر گھر میں اس کو سب ڈی کہتے ہیں۔۔۔۔۔۔ اور وہ ہے بھی تو اسے ٹو ڈی ماہر۔ تیرا کی بھی جانتی ہے اور گھڑ سواری بھی۔“

”ہم دونوں جمنائی ہیں، دونوں کے اشار، کلرز،

سیزن، ڈشز سب ایک جیسی ہیں اور میری بات اتنی مانجی ہے کہ اسے نیوزی لینڈ پسند نہیں۔ مگر جب میں نے اس سے کہا کہ مجھے نیوزی لینڈ پسند ہے تو اس نے کہا کہ یہ کٹری مجھے بھی پسند ہے۔ وہ نیٹنگل سے نفرت کرتی ہے مگر جب میں نے اس سے کہا کہ میں تمہیں اپنی ماما خاندانی بریلیٹ شادی میں دوں گا تو اس نے کہا کہ فرحان اب میں چوڑیوں سے کبھی نفرت نہیں کروں گی۔۔۔۔۔۔ ماما اس کو کہتے ہیں ڈی، ہم آج بھی۔۔۔۔۔۔ اب شادی کے لیے اس سے زیادہ ہم آج بھی بھلا کہیں ہو سکتی ہے۔ فرحان ہر شاعر سے لکھ میں ماں سے پوچھ رہا تھا۔

”مگر یہ پگلو تمہیں ملی کہاں؟ کس نے تمہارا تعارف کروایا اس شخص سے۔“

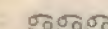
”ماما۔۔۔۔۔۔ اسے لک کہتے ہیں۔ ایک دن میں اپنے دوست کی آنی ڈی پر چینگ کر رہا تھا۔۔۔۔۔۔ تو ڈی سے میری دوستی ہو گئی۔۔۔۔۔۔ حالانکہ اس وقت وہ لڑکے کے نام سے چیٹ کر رہی تھی اور میں لڑکی بنا ہوا تھا۔

اور سطوت آرا اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھامے اب اس تصویر کو دیکھ رہی تھیں جس میں فرحان اپنے کندھے پر ڈی کو بٹھائے کھڑا تھا۔

”اچھی ہے ناں۔۔۔۔۔۔ ڈی۔۔۔۔۔۔“ وہ پوچھ رہا تھا۔

میرے دوست کہتے ہیں ایٹور یا اور ابھیٹک کی جوڑی ہے۔۔۔۔۔۔ ایک فلم میں ابھیٹک کا بھی ایسا ہی پوز تھا ایٹس کے ساتھ۔۔۔۔۔۔ فرحان ہنستے ہوئے ماں کو بتا رہا تھا۔

اور سطوت کی اس وقت اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اپنے بیٹے کو کھری کھری سناسکین کے بعض اوقات دل کی باتیں دل ہی میں داب لیتی پڑتی ہیں کہ اس میں ہی فریقین کا بھلا ہوتا ہے۔



### ایک خط

”پارے میاں جانی  
سچیاں محبتاں!  
آپ تو گھر آتے ہیں تو اپنی ماں بہنوں میں

مصرف ہو جاتے ہیں کہ مجھ سے بات کرنے کا نام ہی نہیں ملتا۔۔۔۔۔۔ آفس جاتے ہیں تو وہاں افسرانہ اکثر اتنی بادہ آ جاتی ہے کہ بیوی کا فون سن کر چپڑا سی سے کھلوا دیتے ہیں کہ صاحب اس وقت بہت زیادہ مصروف ہیں گھر میں بات کرنے کا ٹائم نہیں ہے۔

اس لیے آج آپ کو آپ کے دفتر کے ایڈریس پر دیکھ رہی ہوں۔

نیا سال شروع ہونے والا ہے۔۔۔۔۔۔ میری بھابی کی بہن جب نجوی کے پاس گئی تھی تو وہ مجھے بھی لے گئی تھی۔۔۔۔۔۔ اس نے ہزار روپے تو مجھ سے بھی ضرور لیے مگر باتیں اتنی اچھی بتائی ہیں کہ آپ بھی خوش ہو جائیں گے۔

اس نے کہا کہ یہ نیا سال بیویوں کا سال ہوگا۔۔۔۔۔۔ اس سال شوہر صاحبان اپنی، اپنی بیوی کا حکم مانتے گے۔ ایمان سے میرا دل تو مارے خوشی کے بے حال ہے پندرہ سال شادی کو ہو گئے۔۔۔۔۔۔ آپ نے میری کوئی باتیں بھی نہیں مانی ہوں گی۔ اور اب آپ میری بات مانا کریں گے۔ اللہ کتنا اچھا لگا کرے گا۔

نجوی نے دوسری بات یہ بتائی کہ آپ اس خجال دارے سے نکل کر میرے بیٹے سے قریب مکان میں ملنے لے جائیں گے۔۔۔۔۔۔ سچ میں اپنا مکان ایسا پیارا بٹ کر دوں گی کہ پورا خاندان حیران رہ جائے گا کہ فرخندہ ڈاکر نے کتنا پیارا گھر سجا دیا ہے۔

مجھے نجوی نے یہ بھی بتایا کہ آنے والے سال میں ہیز میں آ جاؤں گی۔

ذکر یقین کرو۔۔۔۔۔۔ جوائنٹ فیملی سسٹم کی ایک بات جو بے حد شاندار ہے وہ یہ ہے کہ اس میں رہنے والا جس شخص کو ذکاوت کا رتبہ ملتا ہے۔۔۔۔۔۔ یعنی اسے کوئی ایسی ٹیوٹ ملتی ہے کہ اس میں رہنا پڑتا ہے۔ اب آپ سے کیا چھپانا۔۔۔۔۔۔

دی وی کے ایک چیلل کے لیے جب اپنا آڈیشن دینا تھا تو انہوں نے مجھ سے پانچ منٹ باتیں کرنے کے بعد ہی کہہ دیا کہ ہم اپنی آئندہ آنے والی سیریل میں سائز ہو کر دیکھ لینے کو تیار ہیں۔۔۔۔۔۔ میں نے کہا پہلے مجھے بتائیے کہ میرا ہیرو کون ہوگا۔ وہ بولے ہیرو مجھے بھی ہو آپ کو اس سے کیا مطلب مگر ہیرو دن تو آپ

ہیں۔ پلیز ڈاکر! اگر تم میرے ساتھ ٹی وی چیلل چلو تو شاید وہ تمہیں بھی لے لیں۔۔۔۔۔۔ اگر ہیرو نہیں لے لیں گے تو کم از کم تمہیں میرا شو فرمایا لگک میں تو ضرور لے لیں گے۔ کم از کم تم میری وجہ سے ٹی وی پر نظر تو آ جاؤ گے۔

ہاں سب سے خاص بات تو میں بتانا ہی بھول گئی تھی۔۔۔۔۔۔ وہ یہ کہ نئے سال میں آپ مجھے زبردست گازی بھی دلوا دیں گے۔

اب آپ گھر آ کر مجھے بتائیے کہ نئے سال میں میرے ارمان کتنے فی صد پورے ہو جائیں گے۔

فقط آپ کی پیاری بیوی فرخندہ ڈاکر!

اور اس شب ڈاکر اپنی بیگ پر آ کر اتنا چٹختے جتنا کبھی وہ پندرہ سالوں میں نہیں چٹختے۔ فرخندہ نے رو رو کر آنکھیں سچا لیں مگر وہ ان کی کسی بات سے اتفاق نہیں کر رہے تھے۔ تھک ہار کر انہوں نے اپنی بھابی کی بہن کو فون کر کے بتایا کہ نجوی نے ان کے بارے میں تمام پیش گوئیاں غلط کی ہیں۔۔۔۔۔۔ نئے سال میں اس کی بتائی ہوئی کوئی پیش گوئی پوری ہوتی نظر آ رہی۔

تب بھابی کی بہن نے بھی آزر دے سے لہجے میں کہا۔

”ہاں! میرا بھی یہی خیال ہے کہ وہ کوئی اچھا والا نجوی نہیں تھا۔ میرے بارے میں اس نے جو بتایا ہے۔۔۔۔۔۔ مجھے بھی بالکل غلط لگ رہا ہے۔“

”خواتن! میرے ہزار روپے ضائع گئے۔“ فرخندہ کو افسوس ہو رہا تھا۔

”پریشان مت ہو، میں اب تمہیں ایک اچھے نجوی کے پاس لے کر چلوں گی۔ وہ پیسے تو زیادہ لیتا ہے مگر اس کی پیش گوئیاں بالکل اصلی ہوتی ہیں۔“

”نہیں مجھی۔۔۔۔۔۔ مجھے تو تم رہنے ہی دو۔۔۔۔۔۔ اس کی پیش گوئیاں کو میرے میاں جی نکل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بیویوں کا سال تو کیا کوئی دن نہیں ہوتا۔ تو ہمارے بارے میں پیش گوئیاں کیسے سچ ہو سکتی ہیں؟“

فرخندہ آزر دے سے لہجے میں کہہ رہی تھیں جسے ان کی بھابی کی بہن سن کر ہاں میں ہاں ملا رہی تھیں۔۔۔۔۔۔ ایسا ہی کچھ ان کے ساتھ بھی تو ہوا تھا۔



## میرا انتخاب

آمنہ حماد

قوموں اور تہذیبوں کے عروج و زوال کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کی دنیا بھی بدلتی رہتی ہے۔ اردو ادب اور شاعری کی تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ اس برصغیر میں منتخب طاؤس اور تاج محل کے معماروں کی سلطنت کا آفتاب روشن رہا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ہر رنگ اپنی کشش کھودیتا ہے اور پرانا ہو جاتا ہے مگر ادب میں ایسا نہیں ہے۔ اس کا اندازہ اساتذہ کے کلام کو پڑھ کر ہوتا ہے۔ فراق گورکھپوری کی یہ غزل بھی کچھ اسی رنگ میں ہے اس کا انتخاب کیا ہے شاذیہ تبصرے نہ کراچی سے۔

### غزل

بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں  
تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں  
جسے کہتی ہے دنیا کامیابی دوائے نادانی  
اسے کن قیمتوں پر کامیاب انسان لیتے ہیں  
طبیعت اپنی گھبرائی ہے جب سنان راتوں میں  
ہم ایسے میں تری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں  
تری مقبولیت کی وجہ واحد تیری رحمت  
کہ اس کو ماننے کی کب ہیں جس کو جان لیتے ہیں  
رفیق زندگی تھی اب اشیاء وقت آخر ہے  
ترا اے موت ہم یہ دوسرا احسان لیتے ہیں  
فراق اکثر بدل کر تجھیں ملتا ہے کوئی کافر  
کبھی ہم جان لیتے ہیں کبھی پہچان لیتے ہیں

\*\*\*

ہماری ہلکتی فضاؤں میں یہ کیسا درد آسا ہے کہ منظر  
لہو لہو ہیں، دل درد سے جو جھل ہیں۔ گلاب چہرے مر جھا  
رہے ہیں۔ ناامیدی، خوف، مایوسی اور بے بسی کی فضا

جتنی آنکھوں کے نیلہ فرداں نہیں  
جتنے چہروں کے مرجان زرداب ہیں  
جتنی سوچیں بھی مشعل بداماں نہیں  
جتنے گل رنگ مہتاب گہنا گئے جتنے معصوم  
رخسار مر جھائے  
جتنی شمعیں بجھیں، جتنی شمعیں جلیں  
سب کو خوشبو بھری زندگی بخش دیں، تازگی  
بخش دیں

بھردیں سب کی رنگوں میں ابھوم پنم  
مٹل ابر کرم رکھ لیں سب کا بھرم  
دیدہ دل کی بے انت شامی میں ہم  
زخم کھائیں گے حسن چمن کے لیے  
انگ مہکائیں گے مٹل رخسار گل  
صرف آرائش بیزہن کے لیے  
مٹکر اکس گے رنگ و دم دہر میں  
اپنی ہنسی ہوئی انجمن کے لیے  
طنین احباب، سرمایہ کج دل، بجز اغیار سہ  
لیں گے  
فن کے لیے

### نظم

آؤ وعدہ کریں  
آج کے دن کی روشن گواہی میں ہم  
دیدہ دل کی بے انت شامی میں ہم  
زیر دامن تقدیر لیں لوح و قلم  
اپنے خواہوں، خیالوں کی جاگیر کو  
فکر کے مو قلم سے تراشی ہوئی  
اپنی شفاف سوچوں کی تصویر کو  
اپنے بے حرف ہاتھوں کی تحریر کو، اپنی تقدیر کو  
یوں سنہالیں گے، مٹل چراغ حرم  
جیسے آندھی میں بے گھر مسافر کوئی  
جتنی آنکھوں کے بوسیدہ قانون میں  
پہرہ داروں کی صورت چھپائے رکھے  
جانے والوں کے، وحشدے سے پیش قدم  
آج کے دن کی دلکش گواہی میں ہم پھر ارادہ کریں  
جتنی یادوں کے خاکے نمایاں نہیں  
جتنے ہونٹوں کے یا قوت بے آب ہیں

### غزل

یہ کس غلش نے پھر اس دل میں آشیانہ کیا  
پھر آج کس نے سخن ہم سے غائبانہ کیا  
غم جہاں ہو، رنج یار ہو کہ دست عدو  
سلوک جس سے کیا ہم نے عاشقانہ کیا  
تھے خاک راہ بھی ہم لوگ تھر طوفاں بھی  
سہا تو کیا نہ سہا اور کیا تو کیا نہ کیا  
خوشا کہ آج ہر اک مدی کے لب پر ہے  
وہ راز جس نے ہمیں رائدہ زمانہ کیا  
وہ جلیہ گر جو وفا جو بھی ہے جفا جو بھی  
کیا بھی فیض تو کس بت سے دوستانہ کیا

\*\*\*

ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں اور جو لوگ  
سر اپا محبت ہیں وہ بے ادبی سے گریز ہی کرتے ہیں۔ یہ  
بات بھی حرف بہ حرف سچ ہے کہ کبھی کبھی واقعی اداس  
ہونے کا کوئی سبب نہیں ہوتا مگر ہماری آنکھیں آنسوؤں  
سے لبریز ہوتی ہیں نہ جانے کیوں..... امجد اسلام امجد نے  
اس نظم میں اس احساس کو نہایت خوبصورتی سے بیان کیا  
ہے اسے منتخب کیا ہے یعنی عمر نے ہری پور ہزارہ سے۔

### نظم

محبت نام کا جواک جزیرہ ہے  
وہاں جانا بڑے تم کو  
ہماری یاد کو بھی ساتھ لے لینا  
سنا ہے اس جزیرے پہ کبھی دوئیں رہتے تھے  
وہ دونوں ایک دوسرے کے دلوں پر راج کرتے تھے  
وہ اک دو بے کی آنکھوں میں اتر کر خواب جیتے تھے  
وفا کے تانے بانے ریختی باتوں سے بنے تھے  
پھر روز اس کی تجدید بھی کرتے تھے  
مگر رُت کے بدلتے ہی ہوا ایسے  
وہ دونوں مختلف ستوں میں چل نکلے  
سنا ہے پھر دونوں کو اک ساتھ نہیں دیکھا  
محبت نام کا جواک جزیرہ ہے  
وہاں جانا بڑے تم کو



کہا جاتا ہے کہ انسان کی تخلیق میں محبت کا رفرما ہے  
..... خدا نے بشر کو محبت سے تخلیق کیا اور اس کے دل میں  
محبت ڈال دی جو کبھی عشق حقیقی تو کبھی عشق مجازی کی  
صورت میں نظر آتی ہے۔ محبت کے اسی تاثر کو لیے  
اراجعفری کی نظم وہ لمحہ جو میرا تھا کا انتخاب کیا ہے ایند  
عندلیب نے سلاوا لی ہے۔

## وہ لمحہ جو میرا تھا

ایک دن  
تم نے مجھ سے کہا تھا  
دھوپ کڑی ہے  
اپنا سایہ ساتھ رکھنا  
وقت کے ترشش میں جو تیرے گل کر برسے ہیں  
زرد ہوا کے پتھر لیے جھونکوں سے  
جسم کا پیچھی گھاٹل ہے  
دھوپ کا جھلک، پیاس کا دریا  
ایسے میں آنسو کی ایک ایک بوند کو  
انساں ترسے ہیں  
تم نے مجھ سے کہا تھا  
سے کی بہتی ندی میں  
لمحے کی پہچان بھی رکھنا  
میرے دل میں جھانک کے دیکھو  
سات رنگوں کا پھول کھلا ہے  
وہ لمحہ جو میرا تھا وہ میرا ہے  
وقت کے پیکل بے شک تن پر آن لے  
دیکھو اس لمحے سے کتنا گہرا رشتہ ہے  
خوشبو بند رہنے کھول رہی ہے  
چاندنی راتوں سا موسم بھی  
گلیاں بھی ہیں شبنم بھی  
یہ سب میرے آئینے ہیں  
اور ہر آئینے میں تم ہو

تو اس تنہا شجر کے پاس بھی جانا  
کہ جس کی ساری شاخوں کے لہا دے پر  
ہر اک جانب ایک نام لکھا ہے  
سنائے لکھنے والا زندگی بھر  
پھر کبھی کچھ نہ لکھ پایا

وہ اپنی انگلیوں پر خون کی مہریں لگا بیٹھا  
مقدور وار کر بیٹھا وہ خود کو ہار بیٹھا  
محبت نام کا جو اک جزیرہ ہے

وہاں جانا بڑے تم کو  
ہماری یاد کو بھی ساتھ لے لیتا  
ہماری یاد بھی دھوپ میں چھاؤں کی صورت ہے  
یہ ماضی کے کسی معصوم سے گاؤں کی صورت ہے



شوق ہو لیکن ہو تو انسان اپنی بیشتر خواہشات کی تکمیل  
کر لیتا ہے اسے سب کچھ حاصل ہوتا ہے مگر پھر بھی کچھ کمی  
لگتی ہے۔ کچھ لوگ اس کمی سے واقف نہیں ہوتے اور چند  
لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس بات سے آگاہ ہوتے  
ہیں کہ زندگی میں انہیں کیا ملا اور کس چیز کی کمی رہی۔ جون  
ایلیا کی یہ غزل اسی احساس کی ترجمانی کرتی ہے۔ اسے  
منتخب کیا ہے۔ اترالارد نے اسلام آباد سے۔

## غزل

نہ ہم رہے نہ وہ خوابوں کی زندگی ہی رہی  
گماں گماں سی مہک خود کو ڈھونڈتی ہی رہی  
حریم شوق کا عالم بتائیں کیا تم کو  
حریم شوق میں بس شوق کی کمی ہی رہی  
پس نگاہ تغافل بھی ایک نگاہ کہ تھی  
جو دل کے چہرہ خسرت کی تازگی ہی رہی  
بدل گیا سبھی کچھ اس دیا پرودش میں  
گلی بھی جو تری جاں وہ تری گلی ہی رہی  
تمام دل کے محلے اجڑ چکے تھے مگر  
بہت دنوں تو پلہی ہی رہی، خوشی ہی رہی  
سناؤں میں کسے افسانہ خیال ملال  
تری کمی ہی رہی اور مری کمی ہی رہی



# میں اکثر نگہاتی ہوں

صغریٰ زیدی

پہلا انعام یافتہ شعر

☆ نازیہ کنول نازی..... بھانگر

کہاں سے لاؤں ہنر اب اسے منانے کا  
کوئی جواز نہ تھا اس کے رشتہ جانے کا  
محبوں میں سزا بھی مجھے ہی ملنی تھی  
کہ جرم میں نے کیا رابطہ بڑھانے کا

دوسرا انعام یافتہ شعر

☆ ثانیہ..... لاہور

کتی وگلش ہے اُس کی خاموشی  
ساری باتیں فضول ہوں جیسے

تیسرا انعام یافتہ شعر

☆ پروین اختر..... حیدرآباد

اک عمر جو کانے کی طرح جھتی رہی ہے  
درپردہ اسی بات کا اظہار کیا ہے  
کافی ہے شہادت کے لیے اس کا مکرنا  
قاتل نے بھی جرم کا اقرار کیا ہے  
☆ زاہدہ رزاق..... فیصل آباد

ہوتا نہیں ہے ختم قیل آس کا سفر  
پاؤں کٹے ہوئے ہیں مگر چل رہے ہیں لوگ

☆ بشریٰ باجوہ..... اوکاڑہ

دُس گیا اسے بھی شاید بھر کا ناگ  
لہجہ تھکا ہوا ، چہرہ بھی زرد تھا  
جی تھی جذبول پہ کچھ برف اور  
کچھ اس کے شہر کا موسم بھی سرد تھا  
☆ فرزانہ قمر..... لاہور

گلاب لکھوں کے محل پہ کیلئے بچپن  
پلٹ کے آ کہ میں تجھ سے شرارتیں مانگوں  
☆ ایس ماسن..... ٹکوال

کس سوز میں ڈھلتے ہیں آلام محبت کے  
چل کر تو ذرا دیکھو دو گام محبت کے  
کتنا ہے جگر ان میں ہر لکھ مگر پھر بھی  
بے کیف نہیں جاتے ایام محبت کے  
☆ ناہیدہ..... کراچی

بات جو دل میں دھڑکتی ہے محبت کی طرح  
اس سے کہنی بھی نہیں اس سے چھپانی بھی نہیں  
☆ فاخرہ جبار..... راولپنڈی

لب خاموش سے اظہار تمنا چاہیں  
بات کرنے کو بھی تصویر کا لہجہ چاہیں

تو چلے ساتھ تو آہٹ بھی نہ آئے اپنی  
درمیاں ہم بھی نہ ہوں یوں تجھے تنہا چاہیں  
☆ نفاخر..... خانیوال

صلیب وقت پہ میں نے پکارا تھا محبت کو  
مری آواز جس نے بھی سنی ہوگی ، ہنسا ہوگا  
☆ عمرین..... چکوال

رکھ اپنے پاس اپنے منہ و مہر اے فلک  
ہم خود کسی کی آنکھ کے تارے ہیں ان دنوں  
اس عشق نے ہمیں ہی نہیں معتدل کیا  
اس کی بھی غلّ مڑائی کے چرے ہیں ان دنوں  
☆ سائرہ رانی..... خانیوال

میں سوچتا ہوں شہر کے پتھر سیٹ کر  
وہ کون تھا جو راہ کو پھولوں سے ڈھک گیا  
☆ نگہت..... اسلام آباد

کیسا اس نفرت کے سناٹے میں گھبراتا ہے دل  
اسے محبت کیا ترے ہنگامہ آرا سو گئے  
☆ بشریٰ سلیم..... کوڑی

راہ تاریک سہمی پھر بھی ملے گی منزل  
صرف ایک عزم کی تبدیل جلا دی جائے  
☆ صدف..... حیدرآباد

جو فضل خواب کی تیار ہے تو یہ جانو  
کہ وقت آگیا پھر درد کوئی بونے کا  
☆ مائرہ ریاض..... لاہور

میں آئینہ ہی نہیں عکس بھی ہوں لیکن تو  
وہ روشنی ہے جو دامن کشا گزر جائے  
☆ ایک خواب مری خود فریب آنکھوں میں

اگر یہ خواب مری روح میں اتر جائے  
☆ عائشہ چندا..... لاہور

اپنے دھوکے کو چھوڑ گیا آسمان پر  
کہتے ہوئے دیے میں غرور اتہا کا تھا  
☆ رابعہ رحیم..... خانیوال

ہے درنجی وہی اور گداگر بھی وہی ہیں  
اس شہر غریباں کے مقدر بھی وہی ہیں

اب بچ کے کہاں جاؤ گے اس شہر غضب میں  
اندر بھی وہی لوگ ہیں باہر بھی وہی ہیں  
☆ حناستین..... لاہور

سندروں سے بہت دیر گفتگو مت کر  
یہ لکھ نہ جائیں تری زندگی میں پیاس بہت  
☆ واجدہ واجدہ..... کراچی

اک نام کیا لکھا ترا ساحل کی ریت پر  
پھر عمر بھر ہوا سے میری دشمنی رہی  
☆ ملیحہ نعیم..... پشاور

ہم حقیقت کو نہیں جان سکیں گے ہرگز  
دل نے آنکھوں سے نکالا ہی نہیں خوابوں کو  
☆ مسفرح احمد..... لاہور

عجب یہ زندگی کی قید ہے دنیا کا ہر انسان  
رہائی مانگتا ہے اور رہا ہونے سے ڈرتا ہے  
☆ میمنہ عزیز..... کراچی

ہے یہ بھی بچ کہ ترے سامنے مجھے برسوں  
کوئی رفیق ، کوئی کام بھی نہ یاد آیا  
☆ جھوٹ یہ بھی نہیں ہے تجھے جو دیکھا کل

تو کتنی دیر ترا نام بھی نہ یاد آیا  
☆ شاہینہ ممتاز..... بہاولپور

ہزاروں آنکھ قرباں اس کے افسردہ تبسم پر  
چھپائی مسکرا کے جس نے شدت درد نہاں کی  
☆ نورین نعیم..... کراچی

تو نے دیکھا ہے منڈیروں پہ چراغوں کو فقط  
میں نے جلا ہوا ہر دور میں انسان دیکھا  
☆ رضیہ سلطانہ گوندل..... بھلوال

ترا ہونا ضروری تھا نہ ہونا بھی ضروری تھا  
کسی بھی یاد کا ہستی میں ہونا بھی ضروری تھا  
☆ کمال سنگھ..... راجستھان

کہاں تک سوچتے رہتے اسے شام غریباں میں  
ٹھکن اتنی سفر کی تھی کہ سونا بھی ضروری تھا  
☆ عروہ عابدہ..... راولپنڈی

نیند والوں کو کیا خبر اس کی  
کون جاگا ہے رات بھر تنہا

حافظ سید حسن علویہ ملتان کی جانب سے ہر ماہ پہلے دوسرے اور تیسرے نمبر پر آنے والے بہترین شعروں پر  
انعامات دیے جا رہے ہیں۔ بہترین شعر لکھنے والے اپنا مکمل نام مع پتہ مندرجہ ذیل پر تحریر کریں۔  
نوٹ: انعام یافتہ شخص اپنے شناختی کارڈ یا اسکول کالج کے کارڈ کی فوٹو کا پی نوٹاروان کریں۔ بذریعہ شناخت  
کے انعام روا نہیں کیا جائے گا۔



# پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید



ہر دل کی دھڑکنوں میں شامل ہے نام تیرا  
دیتا ہے جو ہدایت وہ ہے کلام تیرا  
تیری ہی روشنی سے روشن ہے تیری ہستی  
ذہنوں میں جھلکائے ایسا ہے نام تیرا  
سنتی ہے روح جس کو پڑھتی زبان جسے ہے  
جو دل میں گونجتا ہے وہ ہے کلام تیرا  
کوئی شریک تیرا نہ جانی ہے اے خدایا  
لا ریب سے ارفع و اعلیٰ مقام تیرا  
تو نے عطا کیا ہے درد جنوں کنول کو  
کرتی ہے ذکر مولا وہ صبح و شام تیرا۔  
شاعرہ: یاسمین کنول

مرسلہ: ناہید بخت نور، واہ شیش درکس

۱۔ قرآن مجید میں چار فرشتوں کا ذکر نام کے ساتھ آیا ہے۔  
۲۔ ہاروت اور ماروت کا ذکر قرآن مجید کی سورہ بقرہ میں ہے۔  
۳۔ حضرت جبریل کا نام قرآن میں تین مرتبہ آیا ہے۔  
جن مقامات پر حضرت جبریل کا ذکر آیا ہے۔ وہ یہ ہیں سورہ بقرہ آیت نمبر 98، 99 اور سورہ تحریم آیت نمبر 4۔

(۴) حضرت میکائیل کا نام قرآن مجید میں صرف ایک جگہ آیا ہے۔ سورہ بقرہ میں۔

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلاٹوالی



شیخ سعدی شیرازی اپنے والد عبداللہ شیرازی کے

ساتھ سفر میں تھے۔ دوران سفر انہیں سرائے میں ٹھہرنا پڑا۔ رات کو والد نے انہیں تہجد کے لیے اٹھایا۔ تہجد کی نماز کے بعد سوئے ہوئے مسافروں کو کچھ کر آپ اپنے والد سے کہنے لگے۔ ”اگر یہ لوگ مردوں کی طرح سونے کے بجائے اٹھ کر تہجد کی نماز پڑھ لیتے تو ان کے حق میں کتنا اچھا ہوتا؟“ والد نے فرمایا۔ ”تم نے نیند و آرام ترک کر کے تکلیف اٹھائی۔ تہجد کی نماز پڑھی مگر غیبت کر کے اس کا اجر بھی ضائع کر دیا۔ سونے والے کتنے فائدے میں رہے کہ آرام بھی کرتے رہے اور تمہارے تہجد کا ثواب بھی لے گئے۔“

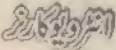
مرسلہ: فیروز عطار، کراچی



ایک مرتبہ نبی کریم کے پاس ایک سائل آیا اس وقت حضور کے پاس کچھ نہ تھا۔ آپ نے فرمایا۔ ”بیٹہ جاؤ، اللہ دے گا۔“ وہ شخص بیٹھ گیا۔ اتنے میں ایک دوسرا آیا پھر تیسرا آ گیا۔ حضور نے ان کو بھی وہی الفاظ کہہ کر اپنے پاس بٹھالیا۔

اتنے میں ایک شخص آیا اور اس نے چار اوقیہ چاندی حضور کی خدمت میں پیش کی۔ حضور نے ایک ایک اوقیہ چاندی ان تینوں سانکوں میں تقسیم فرما کر ایک اوقیہ چاندی کی بابت اعلان کر دیا کہ کوئی ضرورت مند ہو تو آ کے لے جائے مگر اس روز کوئی نہ آیا۔ حضرت عائشہ نے بار بار پوچھا کہ حضور کوئی تکلیف وغیرہ ہے کیا؟ مگر بار بار جواب نہیں میں آیا۔ ”کیا اللہ تعالیٰ کا کوئی خاص حکم آیا ہے؟“ فرمایا ”نہیں“ تو حضور پھر آرام کیوں نہیں فرماتے؟ حضور نے سر ہانے رکھی وہ چاندی دکھائی اور فرمایا۔ ”یہ ہے جس نے مجھے بے قرار کر رکھا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ میرے پاس ہی ہو اور مجھے موت آ جائے۔“

مرسلہ: عالیہ طاہر رفیق، لاہور



بیاری پاکیزہ بہنوں آداب، مجھ سے ملے نام شانکہ  
میں گھر میں سب شہلا اور فریڈ زشہلا کہتی ہیں۔ مجھے  
نہ صرف باجی عظمیٰ (میری کزن) کہتی ہیں۔ پاکیزہ میں  
اپنی عمر سے لکھ رہی ہوں۔ انجم پچھو نے میرا پہلا خط  
لیج کر کہ میری حوصلہ افزائی کی تھی جس کی وجہ سے آج  
پاکیزہ کی تیسرہ نگار ہوں۔ جی بہنو یکم اپریل کو ہم اس  
پیش آئے، بہار اپنے تمام جوہن پر تھی۔ تعلیم میری انٹر  
مڈ میں سب کی لاڈلی ہوں پہلا نمبر میرا ہے۔ مجھ  
نے چھوٹے دو بھائی اور ایک چھوٹی بہن صبا ہے جو قرآن  
حفظ کر رہی ہے۔ امی سے حد سے زیادہ پیار کرتی  
ہوں تو ہر بیٹی ہی ماں سے پیار کرتی ہے۔ لیکن  
میں اپنی ماں کے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتی۔ میں اور  
ای امی بالکل دوستوں کی طرح ہیں، اپنی ہر بات میں  
ماں سے شیر کرتی ہوں۔ خالصتاً گھر بیٹوں کی ہوں۔  
میری روتی بہت اچھی کر لیتی ہوں۔ مغرور لوگ بہت  
سے جلتے ہیں۔ ماں باپ، بہن، بھائیوں سے بہت  
پیار کرتی ہوں۔ لکھی ارم، مدوش، زرتاشہ میری پیاری  
بیلیاں اور کزن ہیں۔ باجی عظمیٰ سے اس طرح پیار کرتی  
ہوں جیسے چھوٹی بہنیں بڑی بہنوں سے کرتی ہیں۔ میری  
ماں پچھو اور چاچو بہت اچھے ہیں۔ میری بڑی پچھو سے  
میری بہت دوستی ہے۔ آئی شکفتہ اور ان کی بیٹی رضاء سے  
بہت پیار کرتی ہوں۔ میوزک بہت شوق سے سنتی ہوں۔  
گائوں سے بھی الماریاں بے حد متاثر کرتی ہیں۔  
کالے کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ کبھی کسی کو دکھ نہیں  
لگتا اپنی باتیں کسی سے کم ہی شیر کرتی ہوں۔ دوستوں  
وہ نہیں بناتی، میری ایک پیاری سی دوست زوبی بھی  
ہے جو مجھے بے حد عزیز ہے۔

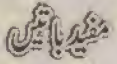
شانکہ انجم، سرگودھا



انجی زرد روت  
چار سوا اپنے  
پر پھیلائے چٹھی ہے  
دیکھ کر کاہینہ تو

اپنے ساتھ لایا ہے  
بجر کے نوے  
بڑے ہی دکھ جانی کے  
درختوں میں کھلے بوٹے  
برف میں دفن ہیں سارے  
کھری گہری جاوہ ہے  
جس میں زندگی کم ہے  
مگر جب برف پھلے گی  
سر دوسم بیت جائے گا  
وقت ایسا بھی آئے گا  
بہاریں بھرے آئیں گی  
خوشیاں گنگنائیں گی  
کھلیں گے پھول الفت کے!

شاعرہ: شکفتہ شفیق  
مرسلہ: نادیہ نگار، ضلع انک



**خواتین حضرات گھر بیٹھے داخلہ لیں**

انگلش لیکچرنگ کورس	انگریزی	ہندو اکانس	پہلا پارک کورس
ریفریکشن لینڈنگ	انگریز	ایک فیشن	الوسوٹنگ
پرائیویٹ لکچرنگ کورس	انگریز	ڈانٹن مین	ڈانٹن ٹیگ
اسکول ٹیگ میٹھ	صاف	ڈانٹن مین	ڈانٹن ٹیگ
اسکول ٹیگ میٹھ	صاف	ڈانٹن مین	ڈانٹن ٹیگ
اسکول ٹیگ میٹھ	صاف	ڈانٹن مین	ڈانٹن ٹیگ
اسکول ٹیگ میٹھ	صاف	ڈانٹن مین	ڈانٹن ٹیگ
اسکول ٹیگ میٹھ	صاف	ڈانٹن مین	ڈانٹن ٹیگ
اسکول ٹیگ میٹھ	صاف	ڈانٹن مین	ڈانٹن ٹیگ
اسکول ٹیگ میٹھ	صاف	ڈانٹن مین	ڈانٹن ٹیگ

اسلام آباد اکیڈمی

1237

جنوری 2008



○ سبز دھنیے کا رس نکال کر منہ کے چھالوں پر لگائیں، چھالے ختم ہو جائیں گے۔

○ اگر ہاتھ جل جائے تو پیاز کے عرق میں نمک ملا کر لگانے سے آرام ملتا ہے۔

○ آنکھوں کی بیماری میں چھلی نہیں کھانی چاہیے۔

○ رات کو سونے سے پہلے دودھ میں زیتون کا تیل ڈال کر بننے سے رنگ نکھرتا ہے۔

○ اگر آپ کے چہرے پر جھریاں ہیں تو رات کو سونے سے قبل ایک پیچ شہد میں یکوں کا رس ملا کر چہرے پر چند روزہ منٹ لگائیں پھر صاف پانی سے چہرہ دھو لیں۔ میں دن تک یہ نسخہ استعمال کریں۔ چہرے کی جھریاں ختم ہو جائیں گی۔

مرسلہ: نزیہ شہزادی نزی، گوجرانوالہ

دیکھو کون سے

رات کے آخر پہر کی قسم

دکھوں سے انسان نہیں مرتا

تم پوچھو آ کر میری خیندوں سے

تیکے کے بھیکے غلاف سے پوچھو

میرے کمرے کی خاموشی سے پوچھو

درو دیوار سے پوچھو

تم پوچھو آ کر میرے من کی شورشوں سے

دشتوں کے غبار سے پوچھو

تم پوچھو اس کہانی سے، معصوم جوانی سے

میرے دل سے پوچھو

تم مجھ سے پوچھو

تم پوچھو درود کی بیکرانی سے

دکھوں سے انسان نہیں مرتا

شاعر، محمد ارشد

مرسلہ: روبینہ سید، کراچی

مختصر کہانی

یاد اس کی ہمیں آتی ہے وہ جو خوشبو میرے آنکھن کی

میرے دل کی جودھڑکن

میرے ہر دن کی سحر ہونٹوں پہ رہنے والی

ہمہ وقت جو ہنسی تھی وہ

ہنسنے ہوئے جدا ہوئی

پل میں ہم سے تھا ہوئی

گلشن میرا ویران کر گئی

جا کے سب کو حیران کر گئی وہ

نارسائی کا دکھ دے کر خالی ہاتھ مگر

پھر بھی..... پھر بھی

سب لے گئی، ایسی کیا خطا ہوئی

کڑی اتنی جس کی سزا ہوئی

مرسلہ: مسز ارشد محمود آسی، اتودالہ

فرصت کے لحاظ سے

”ارے شاکر! تم اپنی بیوی کے ساتھ شاپنگ

کرنے جا رہے تھے..... یہ اچانک فٹ بال کا میچ دیکھنے

کیسے چلے آئے؟“

”ہاں فرید! میں تمہاری بھابی کے ساتھ شاپنگ

کرنے ہی نکلا تھا مگر ایکٹ میں ان کی ایک پرانی سینی

مل گئیں۔ میں نے سوچا جب تک وہ دعا سلام کر لیں

میں اتنے میچ ہی دیکھ آؤں۔“

مرسلہ: باجرہ نواب، کراچی

گیٹوں

سننے آئے ہیں ہم

کہ

بیٹیاں سب کی ساٹھی ہوتی ہیں

تو ایسا کیوں

ہوتا ہے پھر

جب بھی چوما پھلتا ہے تو

بہوئیں ہی کیوں جلتی ہیں





## اچھا سا مزیدار چلباتا ہوا سوال بھیجنے اور حافظ حلوہ کی جانب سے انعامات حاصل کیجیے۔

**نوٹ:** بہنیں سوال بھیجتے ہوئے اپنا مکمل پتہ اور ٹیلی فون نمبر ضرور درج کریں۔ انعام یافتہ بہنیں اپنے شناختی کارڈ یا اسکول، کالج کے کارڈ کی فوٹو کاپی فوراً روانہ کریں بغیر شناخت کے انعام روانہ نہیں کیا جائے گا۔

## بزمِ پاکیزہ

انجم انصار

پہلا انعام یافتہ سوال

☆ ایفہ صدف..... حیدر آباد

س۔ سفید جھوٹ کسے کہتے ہیں؟

ج۔ جو سفید لباس پہن کر بولا جائے۔

دوسرا انعام یافتہ سوال

☆ صائمہ کنول..... سرگودھا

س۔ اگر اس سال ساس اور بہو کے جھگڑے

تھانوں تک پہنچنے لگے تو.....؟

ج۔ پولیس والوں کی توجاہ دینی ہو جائے گی۔

تیسرا انعام یافتہ سوال

☆ عکیمہ ضیاء بخش..... کراچی

س۔ اس کی آنکھوں کا رنگ اور باتوں کے ڈھنگ

بدل گئے..... کس طرح؟

ج۔ اس کے چلن جو بگڑ گئے تھے اس لیے۔



☆ لیلیٰ غزل..... کراچی

س۔ آئے بھی وہ گئے بھی وہ..... آخر کیوں؟

ج۔ نیا نوکر بڑھرا تھا..... کام زیادہ دیکھ کر چلا گیا۔

☆ نوخیز انجم..... جہلم

س۔ کہا جاتا ہے کہ موسیقی روح کی غذا ہے آج کل

کی موسیقی کے بارے میں کیا خیال ہے؟

ج۔ اچھی خاصی سزا ہے۔

☆ امامہ نجم..... حیدر آباد

س۔ دولہا کے سر پر دو پٹا ڈال کر آئینے میں دہن کی

صورت کیوں دکھاتے ہیں؟

ج۔ تاکہ پہلے دل سے ہی وہ ڈر کر رہے۔

☆ فرحت احمد..... کراچی

س۔ شعر مکمل کریں،

آئے موسم رنگیلے سہانے جیا نہیں مانے

ج۔ تو اور نام کر کے ہی آنا ہالہ.....

☆ رابعہ عمر رانی..... ننکانہ صاحب

س۔ وہ اتنے خوبصورت ہیں کہ نظر نہیں ہتی مگر ان

کی ناک.....؟

ج۔ بہت خوف ناک ہے۔

☆ ندا اسکیل..... ملتان

س۔ نئے سال کی کوئی نئی بات؟

ج۔ پرانے سال کی باتیں بھی نئی لگیں گی۔

☆ انیلا شاہین مہک..... گلگت

س۔ اللہ غنی ہے، انسان غنی ہے، دولت پانی ہے

دنیا فانی ہے پھر کیوں انسان دولت کے لیے دھن جالی

ہے؟

ج۔ بیکار کی من مانی ہے۔

☆ بشری باجوہ..... اوکاڑہ

س۔ اس سداون میں وہ کس کو جھولا جھلا میں؟

ج۔ جو ان کے قریب ہوگا۔

☆ منی بیگم..... گوجران

س۔ اگر کسی کا دلیر کھلے میدان میں ہواور بارش کا

طوفان ہوتو..... تو کیا ہوگا؟

ج۔ ظاہر ہے لوگ دیکھیں لے کر بھاگیں گے

..... دولہا، دوہن تو خود بھاگ سکتے ہیں۔

☆ ہاجرہ نواب..... کراچی

س۔ وہ ہر وقت مجھ سے ناخوش رہتے ہیں حالانکہ

بہت کوشش کرتی ہوں مگر ناکام..... آخر کیوں؟

ج۔ آپ ابھی اپنے میاں کو صحیح طرح سے پرکھ نہیں

سکی ہیں کہ ان کی خوشیاں کیا ہیں۔

☆ ساجدہ ظفر..... کمالیہ

س۔ سادون کے اندھے کو ہر ایسی سوچتا ہے، پیلا

کس کو نظر آتا ہے؟

ج۔ ہسنت کے اندھے کو.....

☆ امین رانی..... کمالیہ

س۔ وہ محلے میں اس قدر غیر مقبول کیوں ہے؟

ج۔ اپنی کڑی کھرا کیٹیویری کی وجہ سے۔

☆ ڈاکٹر حفصہ مسعود..... کمالیہ

س۔ سینڈل اور اسکینڈل میں کیا فرق ہے؟

ج۔ اگر شروع میں ہی سینڈل برس جائیں تو

اسکینڈل نہیں بن سکتا۔

☆ فارخہ گل..... اٹلی

س۔ آنٹی ہوائی جہاز میں ہارن کیوں نہیں ہوتا؟

ج۔ ابھی آسمان کی سڑکوں پر اتار دیا نہیں ہے

تا، جب وہاں پر بھی ٹریفک جام ہونے لگے گا تو ہارن ہی

ہارن سنائی دیں گے۔

☆ غزالہ یاسین..... سرگودھا

س۔ تو کہے اگر جیون بھر..... آگے انہوں نے کیا کہا

تھا؟

ج۔ غلام بن کر رہوں گا۔

☆ عرشہ چنید..... کراچی

س۔ بانی میں پنجاب جاری ہوں، بتائیے کیوں؟

ج۔ گھوٹنے کے لیے۔

☆ مکان اقبال خان..... میرپور خاص

س۔ میری نند میرے اچھے کپڑے دیکھ کر کیوں

جلتی ہے؟

ج۔ وہ آپ سے متاثر بھی تو بہت ہے۔

☆ سعدیہ ہاشمی..... سرگودھا

س۔ شادی سے پہلے لڑکا، لڑکی کے لیے جھگڑتا ہے

اور شادی کے بعد؟

ج۔ بیوی سے جھگڑتا ہے۔

☆ رخسانہ..... پنجاب

س۔ وہ اکثر تصویر لیے پھرتے ہیں، بھلا کس کی؟

ج۔ کسی مریض کے انکسے کی ہوتی ہے امداد

حاصل کرنے کے لیے۔

☆ رعنا عالم..... لاٹھھی، کراچی

س۔ طہریہ لہجے میں گفتگو کرنے والے لوگ کیسے

ہوتے ہیں؟

ج۔ بدتمیز اور بد صورت

**الرحمی**  
**دہہ چھتکیں**  
**کیرا ڈسٹ**  
**یون پرانازلہ چنیل مرگی**

**تمام دوائی، ادویات، امراض**  
**کا آسان اور قدرتی حل!**

**سہولیات ڈاکٹرناسٹک**  
**ریجوینیشن**

**لاہور ماڈل الرحمی دہہ کلینک**  
**لاہور میڈیکل سنٹر 25 خلیہ رکن روڈ**  
**سنگھو روڈ میڈیکل سنٹر 10 مین روڈ علامہ اقبال ٹاؤن لاہور**  
**0333-4244727**



# روحانی مشورے

ادارہ

اور اپنا ہر چھوٹے سے چھوٹا کام بھی بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر کریں۔

اس دعا کو پڑھنا اپنا معمول بنالیں۔ یہ نہ صرف ہر پریشانی کا علاج ہے بلکہ آپ کی ہر مراد کو پورا بھی کر سکتی ہے۔ (اگر وہ جائز ہو تو) دعا حسب ذیل ہے جسے آپ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بتا کر نیکی کے کاموں میں شریک ہوں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم O

یا لطیفاً بخلقه یا علیماً بخلقه یا  
خبیراً بخلقه اللطیف بی یا لطیف یا علیم یا  
خبیر O

(نوٹ: انمول خزانے کی یہ دونوں دعائیں قارئین کرام کی فرمائش پر تیسری مرتبہ شائع کی جا رہی ہیں)

مال میں برکت کے لیے

ہمارے پاس مختلف مقامات سے بے شمار خطوط آتے ہیں جن میں لکھا ہوتا ہے کہ ان کے ہاں برکت نہیں ہے۔ کہیں پیسے کی کمی ہے وہاں برکت نہیں ہے اور جہاں پیسے کی زیادتی ہے وہاں بھی برکت نہیں ہے۔ اس ضمن میں، میں اپنے تمام قارئین سے یہ کہنا چاہوں گی کہ ہر کام کرنے سے پہلے پوری بسم اللہ پڑھا کریں۔ گھر میں سلام کو پھیلا میں بلکہ سلام کرنے میں سبقت

انمول خزانہ کی ایک دعا

انمول خزانے کی دعائیں پڑھنے سے بے شمار فوائد اور فضائل حاصل ہوں گے۔ ان دعاؤں کو تمام قارئین کو پڑھنے کی عام اجازت ہے۔ اسے ہر پریشانی کے حل کے لیے پڑھ سکتے ہیں۔ کسی ناجائز کام یا کسی کو تکلیف دینے کے خیال سے ہرگز نہ پڑھا جائے کہ فائدہ نہیں ہوگا۔

اس کے پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے درود شریف کم از کم تین مرتبہ پڑھیے پھر بسم اللہ پڑھ کر ہر فرض نماز کے بعد یہ دعائیں پڑھیں۔

(۱) سورہ فاتحہ (۲) آیت الکرسی (۳) سورہ آل عمران آیت نمبر ۱۹-۱۸ تک (۴) سورہ آل عمران آیت نمبر ۲۷-۲۷ تک (۵) سورہ توبہ آیت نمبر ۱۲۸ سے ۱۲۹ (۶) حادثات سے بچنے کی دعا اللھم انت ربی سے صراط مستقیم تک۔

انمول خزانے کی دوسری دعا

ہر نماز کے بعد ادا دل و آخرو درود شریف کے ساتھ کم از کم تین مرتبہ پڑھیے۔ آپ اس دعا کو اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، سفر کرنے کے دوران، بس میں، اسٹاپ پر، وضو، بے وضو بھی پڑھ سکتے ہیں۔ اس دعا کو پڑھنے کے لیے نماز کی باقاعدگی کرنی ہوگی۔ سلام میں پہل کریں



حاصل کیا کریں۔ آج سے یہ عہد بھی کر لیں کہ فون کرتے وقت آپ پہلو کے بجائے السلام علیکم کہا کریں گے۔ جب آپ اپنے گھر میں داخل ہوں، بے ٹک دس مرتبہ باہر سے گھر آئیں تو ہر مرتبہ گھر میں داخل ہوتے وقت پہلے بسم اللہ پڑھیں پھر ایک مرتبہ سورہ اخلاص پڑھ کر سیدھا پاؤں اندر پہلے رکھیں اور قدم بڑھا کر گھر میں موجود سب لوگوں کو سلام کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ آج ایک بے حد جامع دعا ہم آپ کو بتا رہے ہیں۔

حضرت ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ جس شخص کو منظور ہو کہ میرا مال بڑھ جائے، وہ یوں کہا کرے۔  
اللہم صلی علی محمد عبدک ورسولک وصلی علی المومنین والمومنات والمسلمین والمسلمات O  
(بخاری و ابوداؤد السعید)

**خوبصورتی کے لیے**  
آپ سب ہر نماز کے بعد ایک تسبیح درود شریف اور ایک تسبیح یا جمل کی پڑھ کر شیشہ دیکھا کریں۔

**حصول قوت جسمانی کی دعا**  
سیدنا ابن عباسؓ کہتے ہیں قیہ بن خارق الہلالی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام عرض کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا۔ انہیں خوش آمدید کہا پھر فرمایا۔ ”قیہ! کیسے آتا ہوا؟“

عرض کیا۔ ”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ میری جلد نرم پڑ چکی ہے اور میرے توئی کزور ہو چکے ہیں۔ میں اپنے اہل و عیال کے سلسلے میں کمزور ہو چکا ہوں اور ان کاموں کے کرنے سے عاجز ہو چکا ہوں جو پہلے کیا کرتا تھا، پس مجھے چند کلمات سکھائیے جس سے اللہ مجھے فائدہ پہنچائے اور وہ کلمات مختصر ہوں۔“

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”اے قیہ! جب تم صبح کی نماز پڑھ چکو تو تین مرتبہ یہ کہو۔  
سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم O

(اللہ کی ذات پاک ہے اور اسی کے لیے تمام تعریف ہے۔ اللہ کی ذات پاک اور بڑی ہے اور اسی کے لیے تعریف ہے اور کوئی طاقت اور قوت نہیں مگر اللہ ہی کے ذریعے)

پس جب تم یہ کہو گے تو اللہ کی مرضی سے تم اندھا پن، جذام اور برص سے محفوظ ہو جاؤ گے۔“ راوی کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کہتے جا رہے تھے اور قیہ اسے اپنی انگلیوں پر اشارہ کر رہے تھے۔ (ترمذی)  
نوٹ (تمام قارئین سے کہوں گی کہ تیسرے کلمے کو صبح و شام کم از کم تین تین مرتبہ پڑھنا اپنا معمول بنا لیں)

**ہر بیماری کا علاج**  
اول و آخر تین تین مرتبہ درود ابراہیمی۔ سات مرتبہ سورہ الفاتحہ۔ ایک سو پندرہ مرتبہ یا سلام اور ایک تسبیح (سو مرتبہ) یا حفظ پڑھ کر پانی پر دم کر کے سارا دن وہی پانی پئیں۔ ہر بیماری کا علاج ہے۔

**شادی کے لیے**  
اول و آخر تین تین مرتبہ درود ابراہیمی اور تین مرتبہ سورہ تغابن (اتھائیس وال پارہ گیارہ دن پڑھیں پھر ایک دن چھوڑ کر پھر گیارہ دن پڑھیں۔ انشاء اللہ جلدی اور اچھا رشتہ ملے گا۔ (تین ماہ تک کریں)

**بینائی کے لیے**  
اول و آخر تین تین مرتبہ درود ابراہیمی اور اس میں مرتبہ یا غفور پڑھ کر پانی پر دم کر کے آئیں دھوئی جائیں۔ روزانہ یہ عمل کرنے سے چند ماہ بعد آنکھوں کی روشنی بھی تیز ہوگی اور اس سے متعلق تمام بیماریاں بھی دور ہو جائیں گی۔ انشاء اللہ!  
❖ ❖ ❖

## بیوی کی کلینک

رضوانہ خان

خوبصورتی اللہ کی دین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو خوبصورت بنایا ہے۔ اس حسن کی حفاظت کرنا بے حد ضروری ہے۔ ہر عورت جانتی ہے کہ وہ خوبصورت لگے اور یہ اس کا حق بھی ہے لیکن اس کے لیے تھوڑا سا وقت نکال کر اللہ کی دی ہوئی اس نعمت کی حفاظت کرنا بے حد ضروری ہے۔ پاکیزہ کے ان صفات میں آپ کو گھریلو ٹونک اور جدید تکنیک دونوں ہی ملیں گی جس سے آپ گھر بیٹھے خوبصورت، مزید خوبصورت بن سکتی ہیں اگر آپ مجھ سے براہ راست جواب چاہتی ہیں تو فنانس پر شعبہ بیوی کلینک لکھ کر پاکیزہ کے پتے پر ارسال کر سکتی ہیں۔ نماز کی پابندی کریں اور اپنا دل صاف رکھیں آپ ہمیشہ خوبصورت رہیں گی۔ اس ماہ کچھ بہنوں کے مسائل اور ان کا حل درج ذیل ہیں۔  
ردافاطہ..... کراچی

س: سردیاں آتے ہی میرے پیر خشک اور سیاہی مائل ہو جاتے ہیں۔ ایڑیاں خشک اور بد نما لگتی ہیں۔  
ج: روا، یہ مسئلہ صرف آپ ہی کا نہیں ہے یہ ایک عام مسئلہ ہے۔ سردیاں ہوں یا گرمیاں، بیروں کی حفاظت ہر موسم میں ضروری ہے کیونکہ بد نما پیر پوری شخصیت کا تاثر خراب کر سکتے ہیں۔ سردیوں میں یہ مسئلہ اس لیے بڑھ جاتا ہے کیونکہ فضا میں خشکی بڑھ جاتی ہے اور بیروں کی چلہ خشک ہو جاتی ہے۔ مردہ چلیے کی تہ بیروں پر چم جاتی ہے اس کے لیے چند آسان اور بے حد ضروری نسخے ہیں۔ سب سے پہلے تو بیروں کو ہمیشہ صاف رکھیں۔ روزانہ بیروں کو برش سے یا بازار میں عام ملنے والے جھاوے سے رگڑ کر صاف کریں۔ خاص کر ایڑیوں کو..... برش اس لیے بہتر رہتا ہے کیونکہ اس سے ناخنوں در اس کے ارد گرد جمع خشکی اور میل کی صفائی بہتر طور پر ہو سکتی ہے۔ آپ چاہیں تو ناخن صاف کرنے کے لیے پرانا ٹوتھ برش بھی استعمال کر سکتی ہیں۔ آپ نوکری کرتی ہیں تو کوشش کریں کہ بیروں کو دھوپ اور گرد و غبار سے بچائیں۔ سینڈل کے بجائے جلد کے ہر رنگ موزوں اور جوتوں کا استعمال کریں۔ روزانہ سونے سے پہلے پیر دھو کر کوئی اچھی کریم لگائیں اور موزے پہن لیں۔ اگر موزے پہن کر سونے کی عادت نہیں ہے تو کم از کم دو گھنٹے موزے پہن کر رکھیں اور سونے سے پہلے اتار دیں۔ ہفتے میں ایک دفعہ گھر پر پیڑی کیور کریں۔ اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ آپ پیڑی کیور کی ہفتگی کریمیں اور ٹول کٹ خریدیں۔ طریقہ کچھ یوں ہے کہ ایک ہالٹی میں نیم گرم پانی لیں۔ اس میں آدھا چائے کا چمچ نمک اور ایک بڑا چمچ شیو ڈال کر پانی ہلا لیں۔ میں منٹ اس پانی میں پیر ڈبو کر رکھیں۔ بیروں کو اچھی طرح برش سے صاف کریں۔ نیم گرم پانی سے پیر دھو کر کریم سے بیروں پر مساج کریں اور موزے پہن لیں۔ ایک گھنٹے بعد موزے اتار کر صاف کپڑے سے بیروں کو صاف کر لیں۔ مہینے میں ایک بار کسی اچھے بیوٹی پارلر سے پیڑی کیور بھی کروا سکتی ہیں۔  
کنول راشد، کراچی۔ عمیرہ خان، کراچی۔  
نیہا سومان، کراچی۔ ندا حنیف، کراچی۔ صبا احمد، اسلام آباد۔ شائستہ نظام، حیدر آباد۔  
آپ تمام بہنیں براہ راست جواب چاہتی ہیں اس کے لیے آپ پاکیزہ کے دفتر فون کر کے میرا نمبر لے کر رابطہ کر سکتی ہیں۔ خوش رہیے اور ہمیشہ خوبصورت نظر آئیے، اللہ تمہارا۔



# عید کے پکوان

پاکیزہ بہنیں

## لذیذ چانپ

اشیا کے چانپ، ایک کلو۔ گھی، ایک پاؤ۔ پیاز، ایک پاؤ۔ دہی، ایک پاؤ۔ بجھنے ہوئے پنے، ایک کلو۔ خشک ماش، ایک کلو۔ نمک، حسب ذائقہ۔ مرچ، حسب ضرورت۔ کچا پیٹا، ایک کلو۔ دھنیا، ایک کلو۔ ہری مرچ، چھ عدد۔ زیرہ، ایک کلو۔ کالی مرچ، دس عدد۔ لونگ، چار عدد۔ دارچینی، ایک کلو۔ اورک، ایک کلو۔ بڑی الائچی، چار عدد۔ نمائز، دو عدد۔ سرکہ، تھوڑا سا۔

ترکیب کے چانپوں کو نمک اور سرکہ لگا کر رکھ دیں۔ کالی مرچ، لونگ، الائچی، دارچینی اور لہسن کو بیس لیں اور پلے ہوئے اس سارے مسالے کو دہی میں ملا دیں۔ نمک، بجھنے ہوئے پنے، مرچ، خشک ماش اور پیٹا بھی بیس کر تھوڑا سا پانی ڈال کر خوب اچھی طرح ملا لیں۔ چانپ دہی میں ڈال دیں اور ایک گھنٹے تک رکھا رہنے دیں۔ دہی میں گھی گرم کر کے لچھے دار پیاز تل لیں۔ پیاز کے بعد نمائز اور اورک، لہسن، گھی میں ڈال دیں۔ جب ان کا پانی خشک ہو جائے تو زیرہ ڈال کر بھجھیں۔ نمائز مسالے میں چانپ اور دہی ڈال کر ہلکی آگ پر پکے دیں جب چانپیں گل جائیں اور پانی خشک ہو جائے تو کچھ دیر ان کو اور بھجھیں جب مسالا اچھی چھوڑ دے تو چند منٹ کے لیے ڈسکن لگا کر دم پر رہنے دیں بعد میں تان اور سلا کے ساتھ پیش کریں۔

میونہ عزیز، کراچی

## تنوری تکیے

اشیا کے گوشت کے تکیے پارچے، آدھا کلو۔ پیاز، ایک پاؤ۔ دہی، ایک پاؤ۔ گھی، آدھا پاؤ۔ کچا پیٹا، آدھا پاؤ۔ زیرہ، تل، خشک ماش، ایک کلو۔ چھٹانک، بجھنے ہوئے پنے، آدھا پاؤ۔ لہسن، ایک کلو۔ نمک، حسب ذائقہ۔ سرخ مرچ، حسب ذائقہ۔

ترکیب کے پیاز کے باریک لچھے کا بے اور انہیں تھوڑے گھی میں جل کر لال کر کے نکال لیجئے۔ دیگر تمام مسالے بھی اسی طرح گھی میں تل کر نکال لیجئے۔ اب انہیں پیاز کے ساتھ سل پر باریک بیس لیں پھر ان میں پہلے پیٹا بیس کر ملا لیں پھر پیاز اور مسالے بھی شامل کر دیجئے اب مرکب کو خوب اچھی طرح ملا لیجئے تاکہ اس کے تمام اجزاء خوب اچھی طرح گل مل جائیں۔ اس کام سے فارغ ہو جانے کے بعد اس میں پسی ہوئی اورک، پیا ہوا لہسن، نمک، اور دہی بھی ملا دیں۔ یہ مرکب گوشت کی بوتلیوں پر اس طرح لگائیں کہ بوتلیاں اس میں پوری طرح تھھر جائیں۔ انہیں کم از کم تین گھنٹے تک اسی حالت میں رکھ دیجئے (اس طرح گوشت کے ریشے مسالا جذب کر کے جلد گھٹنے کے قابل ہو جاتے ہیں) پھر انہیں کسی تھالی میں پھیلا کر اوون یا بجھنی یا تنور میں اس طرح دم پر لگا دیجئے کہ تھالی پر ڈھکنے یا سرپوش کی قسم کا کوئی برتن ضرور ہو۔ کچھ دیر بعد اس برتن کو اٹھا کر کھنوں کی حالت کا اندازہ لگائیں۔ اگر سرخی پر آگئے ہیں تو تھالی تنور سے نکال لیجئے اور پراخوں کے ساتھ گرم گرم کھائیں۔

آمنہ، اسلام آباد

## بیف اور پیاز کا سوپ

اشیا کے پیاز، دو عدد۔ چینی، دو چائے کے کچھ۔ کارن فلور، دو کچھ۔ لال مرچوں کی چٹنی، آدھا چائے کا کچھ۔ گائے کا گوشت، ڈیڑھ کلو۔ سویا سوس، ڈھائی چائے کا کچھ۔ پسی ہوئی اورک، آدھا کھانے کا کچھ۔ پانی، حسب ضرورت۔ دبئی ٹھیل آئل، چار چائے کے کچھ۔ نمک، حسب ذائقہ۔

ترکیب کے گائے کا گوشت کے پارچے بنائیں۔ پیاز باریک کتر لیں۔ کارن فلور اور پانی مسالوں کا آمیزہ بنائیں۔ گوشت کے پارچوں کو اس میں شامل کر کے مسالا اس میں لگائیں۔ یہ مسالا تھوڑی دیر تک اس میں رہنے دیں۔ بڑے فرانی بین میں تیل ڈالیں۔ گرم ہونے پر باریک کتری ہوئی پیاز اس میں ڈال کر تین منٹ تک تیز آگ پر فرانی کریں۔ اب اسے پانی میں ایک طرف رکھ دیں اور گوشت کے آمیزے کے ساتھ فرانی بین کے وسط میں ڈال دیں اور اس کے ساتھ ہی حسب ضرورت پانی شامل کر دیں۔ ڈیڑھ منٹ تک تیز آگ پر فرانی کریں اور پھر اسے پانی اور پیاز کے ساتھ ملا کر تین یا چار منٹ پکائیں۔ اب اسے گرم گرم پیش کریں۔

حنا، کوئٹہ

## کچے گوشت کی بریانی

اشیا کے گوشت، ایک کلو۔ چاول، ایک کلو۔ پیاز، ایک پاؤ۔ لال مرچ پسی ہوئی، آدھا چائے کا کچھ۔ بلدی، ایک چوتھائی چائے کا کچھ۔ بڑی الائچی، تین عدد۔ دارچینی، چار نمائز۔ جاوڑی پسی ہوئی، آدھا چائے کا کچھ۔ اورک، ایک چھٹانک۔ لہسن، دو پٹیں۔ دہی، ڈیڑھ کلو۔ ہری مرچ، آٹھ عدد۔ لیون، ایک عدد۔ پیٹا، تھوڑا سا۔ لونگ، چھ عدد۔ چھوٹی الائچی، تین عدد۔ پودینہ، ہرا دھنیا، آدھی آدھی گڈی۔ زعفرانی رنگ، حسب ضرورت۔ نمک، حسب ذائقہ۔

ترکیب کے گوشت صاف کر کے اس میں بڑی اور چھوٹی الائچی بیس کر لگادیں۔ تھوڑی دیر بعد لہسن، پیٹا اور اورک بھی بیس کر لگادیں پھر کسی دبئی میں پیاز باریک کاٹ کر گھی میں براؤن کریں پھر اس میں آدھا مسالا بیس کر اور ہرا دھنیا کاٹ کر ڈال دیں۔ گوشت میں آدھا لیون کا عرق ملا دیں اور حسب ضرورت نمک ڈال دیں۔ اب اس کو دو گھنٹے کے لیے علیحدہ رکھ دیں۔ اس دوران چاول صاف کر کے بھگو دیں اور کچھ دیر بعد دبئی میں پانی ابالیں جب پانی کھولنے لگے تو اس میں چاول اور نمک ڈال دیں، بقیہ ثابت گرم مسالا بھی ڈال دیں جب چاول میں ایک کٹی رہ جائے تو اتار کر چھلنی میں چھان لیں پھر خالی دبئی میں گوشت ڈالیں اور اس پر یہ چاول پھیلا دیں اس کے اوپر پھر گرم مسالا اور براؤن کی ہوئی پیاز اس پر پھیلا دیں اس کے اوپر پھر مزید چاول پھیلا دیں اور زعفران ڈال دیں۔ دبئی پر ڈھکن رکھ کر اس کے کناروں پر آٹا لگا دیں تاکہ اندر کی بھاپ ذرا بھی باہر نہ آئے چند منٹ تک دم دینے کے بعد اتار لیں۔ بریانی تیار ہے۔

صبیحہ علی، کوٹ غلام محمد

## گولا کباب

اشیا کے قیمہ، آدھا کلو۔ کچا پیٹا، دو انچ کا کٹوا۔ لونگ، چھ عدد۔ جاوڑی، دو نمائز۔ خشک ماش، چار کھانے کے کچھ۔ بجھنے ہوئے پنے، پلے ہوئے، چار کھانے کے کچھ۔ ہرا دھنیا کٹوا ہوا، تھوڑا سا۔ اورک، ایک انچ کا کٹوا۔ لہسن، چار جوے۔ بڑی الائچی، دو عدد۔ چھوٹی الائچی، چھ عدد۔ دارچینی، ایک انچ کا کٹوا۔ سرخ مرچ پسی ہوئی، ایک چائے کا کچھ۔ پیاز، ایک عدد۔ نمک، حسب ضرورت۔

ترکیب کے پیٹا بیس کر اور نمک قیمے میں ملا لیں اور تھوڑی دیر کے لیے رکھ دیں پھر اس میں باقی تمام مسالے بیس کر اور ہرا دھنیا، پودینہ اور باریک کٹی



ہوئی پیاز ملا دیں۔ سب کچھ ملانے کے بعد دو گھنٹے کے لیے رکھ دیں پھر بہت ہلکی آگ پر کباب بنا کر فرائی کر لیں اور اس بات کا دھیان رکھیں کہ مسالے پیتے وقت زیادہ پانی نہ ڈالیں۔

شہیدہ مغری، ایبٹ آباد

## دھواں دھنی گوشت

اشیا کچھ گوشت، گائے، بکری، مرغی، ایک کلو۔ پیاز، درمیانے سائز کی تین عدد۔ دہی (زیادہ کھانا نہ ہو) ڈیڑھ کپ۔ اورک، لہسن، پیسٹ، ایک، ایک کھانے کا چمچ۔ چھوٹی الائچی، چار پانچ عدد۔ ہری مرچ، ہرا دھنیا، پودینہ۔ سجاوٹ کے لیے۔ سرخ مرچ، نمک، حسب ذائقہ۔ پیاز دھنیا، ایک چائے کا چمچ۔ تیل، آدھا کپ۔ کوئلہ، ایک درمیانے سائز کا۔ ترکیب کچھ ایک پیاز باریک پیس لیں اور لہسن، اورک، نمک، مرچ اور دھنیا کے ساتھ گوشت میں ملا دیں۔ دہی میں چار پانچ پیالی پانی ڈالیں یہ مسالا ملا گوشت اتنا پکائیں کہ مکھل جائے مرغی میں پانی کی مقدار کم رکھیں۔ گوشت گھنے پراد پر سے تیل ڈال کر اچھی طرح بھون لیں۔ اب دہی میں چنگلی بھرنمک ڈال کر بقیہ پیاز کے گول گول لچھے کاٹ لیں۔ ایک سرونگ ڈش میں پہلے گوشت پھر دہی اور پھر ہرا دھنیا ہری مرچ کاٹ کر ڈالیں اسی طرح تہہ لگاتی جائیں۔ کوئلے کو آگ پر خوب دہکا لیں۔ اب اس ڈش میں روٹی کے ٹکڑے یا پیاز کے اوپر یہ سرخ کیا ہوا کوئلہ رکھ لیں اور اس پر ایک قطرہ تیل ڈال کر ڈش کا ڈھکن بند کر دیں کچھ دیر بعد روٹی اور کوئلہ نکال لیں۔

سہلی، پشاور

## کلیجی

اشیا کچھ کلیجی، آدھا کلو۔ پیاز، دو عدد بڑی۔ نمٹار، دو عدد بڑے۔ دہی، ایک پیالی۔ لہسن، اورک کا پیسٹ، دو کھانے کے چمچ۔ دھنیا پسا ہوا، ایک چمچ۔ ہلدی، آدھا چمچ۔ پسا گرم مسالا، ایک چمچ۔ سوکھی

میٹھی، ایک چمچ۔ تیل، حسب ضرورت۔

ترکیب کچھ کلیجی اچھی طرح صاف کر لیں اور دھو کر رکھ دیں۔ پیاز براؤن کریں اور نکال لیں پھر اس کو دہی، نمٹار کے ساتھ پیس لیں۔ اب تیل میں لہسن اورک کا پیسٹ فرائی کریں پھر اس میں ہلدی دھنیا پسپی پیاز اور کلیجی شامل کر دیں اور خوب اچھی طرح بھون لیں۔ تمخوڑ پانی ڈال کر گھنے دیں۔ گھنے پر اس میں سوکھی میٹھی بھی شامل کر دیں اور بھون کر پسا گرم مسالا اور ہرا دھنیا، ہری مرچ شامل کر دیں۔

صائمہ انظہر، گوجرانوالہ

## مغز

اشیا کچھ گائے، بکرے کا مغز 1 عدد۔ پیاز، دو عدد درمیانے۔ نمٹار، دو عدد۔ گرم مسالا، ثابت تمخوڑا سا۔ بھنا پیاز دھنیا، ایک چمچ۔ ہلدی، آدھا چمچ۔ زیرہ سفید، ایک چمچ۔ نمک، ایک چائے کا چمچ، لال مرچ پسپی ہوئی، دو چمچ۔ ہری مرچ، ہرا دھنیا۔ گارنش کے لیے۔ لہسن، اورک کا پیسٹ ایک چمچ۔ تیل، حسب ضرورت۔ ترکیب کچھ مغز کو صاف کر لیں اور دھو کر رکھ لیں۔ تیل میں پیاز لال کریں پھر اس میں لہسن، اورک کا پیسٹ ڈال دیں۔ ہلدی اور گرم مسالا، دھنیا، نمک، مرچ ڈال کر نمٹار بھی ڈال دیں۔ دو منٹ بعد مغز بھی ڈال دیں۔ مغز بہت زیادہ توڑیں نہیں اچھی طرح بھون لیں۔ آخر میں ہرا دھنیا، ہری مرچ کاٹ کر چھڑک دیں۔

جویریہ علی، میرپور خاص





**نوٹ:** ہومیو پیتھ علاج میں علامات کی بڑی اہمیت ہے، آپ بیماری کے متعلق چھوٹی سے چھوٹی بات بھی ہمیں لکھ کر بھیجیں تاکہ بہتر سے بہتر دوا کا انتخاب کیا جاسکے۔ بہنوں کو باری کے ساتھ جواب دیئے جاتے ہیں۔ بذریعہ ڈاک مشورے کی کوئی فیس نہیں لی جاتی اور دوا میں سمجھانا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ مشترکہ پرہیز زیادہ بخندنی غذا نہیں، بادی اشیاء، ٹھنڈے مشروبات اور بڑا گوشت ہے۔ دن میں 10-15 گلاس پانی ضرور پئیں۔ نوٹ اپنے مسائل کے ساتھ اپنی عمر بھی تحریر فرمائیں۔ تمام خطوط اس پتے پر بھیجیں۔

ہومیو پیتھک ماہنامہ پاکیزہ۔ پوسٹ بکس نمبر 662 کراچی 74200

## ہومیو کلیٹک

ڈاکٹر ارشد قاز

امرافاطہ..... قصور

حل کے آپ نے جو علامات تحریر کی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا معدہ ٹھیک کام نہیں کر رہا ہے۔ آپ ڈاکٹر ولما رشواہی کے دوا L-No-30 Merc کے پانچ پانچ قطرے تھوڑے پانی میں ڈال کر دن میں تین بار پی لیں۔ آپ کے معدے کی تکالیف درست

## ٹوکن برائے ہومیو کلیٹک

فروری 2008

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسکوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مینے بھیجیں اسی مینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نا:

پتا:

ہو جائیں گی۔ منہ سے بدبو آتا بھی بند ہو جائے گی اور دانٹوں میں ٹھنڈا گرم لگنا بھی ختم ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ آپ لہٹک لیبارٹری کی دوا L-No-95 کے پانچ پانچ قطرے تھوڑے پانی میں ڈال کر دن میں تین بار پی لیں۔ بڑے گوشت اور بادی چیزیں استعمال نہ کریں۔

رائل قریشی، نواب شاہ۔ جیلہ نعیم، حسن ابدال حل کے آپ سب نے لکھا ہے کہ بال گرتے ہیں اور ان میں خشکی بہت زیادہ ہے اس کے لیے مناسب نسخہ تجویز کریں۔ آپ سب کی خواہش کے مطابق نسخہ تجویز کر رہا ہوں۔ آپ سب Cinci Hair Oil کا سر پر روزانہ مساج کریں اور اس کے ساتھ ہی مہران ہومیو فارما کا تیار کردہ ہریز شیمپو دھونے کے لیے استعمال کریں۔ انشا اللہ چند روز کے استعمال سے ہی آپ کے سر کی خشکی ختم ہو جائے گی اور بال بھی گرنا رک جائیں گے۔ نمک کا استعمال کم سے کم کریں دپے بھی آئیوڈین ملائیم استعمال کریں۔ کھلی چیزوں کے استعمال سے بھی گریز کریں۔

راجہ اشرف، لاہور..... شیریں بی بی، سوات حل کے آپ سب نے لیکوریا کے لئے مجرب نسخہ تجویز کرنے کی درخواست کی ہے۔ آپ سب کے لیے نسخہ تجویز کر رہا ہوں۔ آپ لہٹک لیبارٹری فرانس کی دوا L-No-20 کی دو دو ٹیبلٹ دن میں تین بار چپا کر کھائیں۔ دو سے تین ماہ تک اس دوا کا مسلسل استعمال کریں اور اس کے ساتھ Toko-40 کپسول صبح شام ایک ایک پانی کے ساتھ کھائیں۔ کھلی چیزوں سے

پرہیز کریں۔ چاول اور بادی چیزوں سے پرہیز کریں۔ دودھ روزانہ پئیں، تازہ سبزیاں اور موسم کے چھل کھائیں۔ اس نسخے کے استعمال سے لیکوریا بھی ختم ہو جائے گا اور کمزوری بھی دور ہو جائے گی۔

نگھام حسین..... پنجند

حل کے آپ نے جو علامات تحریر کی ہیں اس کے مطابق دوا تجویز کر رہا ہوں۔ آپ لہٹک لیبارٹری فرانس کی دوا L-No-2 کے پندرہ پندرہ قطرے تھوڑے پانی میں ڈال کر دن میں تین بار پی لیں۔ اس کے ساتھ Sinuspax-Tab ایک ایک گولی چوس کر کھائیں۔ دو ماہ تک تجویز کردہ ادویات استعمال کرنے کے بعد اپنی کیفیت سے آگاہ کریں۔ ٹھنڈی کھلی اور چکنائی والی اشیاء کا استعمال نہ کریں۔ ٹھنڈے پانی سے غسل نہ کریں اور آئس کریم اور کولڈ ڈرنک کا استعمال بھی نہ کریں۔ آپ ایک ماہ تک یہ ادویات استعمال کرنے کے بعد لہٹک لیبارٹری کی دوا Santaherba کے پندرہ پندرہ قطرے تھوڑے پانی میں ڈال کر تین بار پی لیں، مزید تفصیل کے لیے آپ میرے موبائل پر دن میں دو بجے سے چار بجے تک رابطہ کریں۔

نیل احمد شیخ..... سندری

حل کے آپ نے جو علامات تحریر کیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بے راہ روی کا شکار رہے ہیں جس کے باعث اب آپ کی کیفیت پریشان کن ہے۔ آپ Toko-5 کی ایک گولی روزانہ رات سوتے سے قبل پانی کے ساتھ کھائیں اور اس کے ساتھ لہٹک لیبارٹری فرانس کی دوا Titanium-3X کی ایک ایک گولی دن میں تین بار چپا کر کھائیں۔ کھلی اور تکی ہوئی چیزوں سے پرہیز کریں۔ نماز کی پابندی کریں اور اپنے خیالات کو صاف رکھیں۔ مزید کوئی معلومات درکار ہوں تو آپ میرے موبائل نمبر پر رابطہ کر سکتے ہیں۔

شفیق احمد..... ٹوبہ ٹیک سنگھ

حل کے آپ نے معدے کی خرابی اور لیکوریا اور کمزوری کی علامات تحریر کی ہیں۔ آپ کے لیے نسخہ تجویز

کر رہا ہوں، کم از کم دو ماہ تک اس نسخے کو استعمال کریں اور پھر اپنی کیفیت سے آگاہ کریں۔ آپ لہٹک لیبارٹری فرانس کی دوا L-No-98 کی دو دو گولیاں دن میں تین بار چپا کر کھائیں۔ اس کے ساتھ مہران ہومیو فارما کے Toko-40 کپسول صبح، شام ایک گلاس پانی کے ساتھ کھائیں۔ بادی، مصلے دار دار کھلی ہوئی اشیاء سے پرہیز کریں۔ چائے کا استعمال بھی کم کریں۔ پانی زیادہ پئیں۔ نیند پوری کریں اور کسی بھی قسم کا ذہنی دباؤ نہ لیں۔

نوشاہ خاتون..... ملتان

حل کے آپ نے جو علامات تحریر کی ہیں ان کے مطابق نسخہ تجویز کر رہا ہوں۔ آپ استعمال کریں، انشا اللہ آپ کو اس سے ضرور افادہ ہوگا۔ آپ لہٹک لیبارٹری کی دوا L-No.20 کی دو دو گولیاں دن میں تین بار چپا کر کھائیں۔ اس کے ساتھ L.No-36 کے تین تین قطرے دن میں تین بار تھوڑے پانی میں ڈال کر پی لیں جبکہ سیون ہریٹل فارما کی Breastogen کریم دن میں تین بار مساج کریں۔ آپ ایسی سبزیاں جن میں نمکیات اور پانی زیادہ ہوتا ہے استعمال نہ کریں۔ مثلاً پالک کا ساگ اور بند گو بھی وغیرہ۔ اس کے ساتھ ٹھنڈے مشروبات اور کھلی چیزیں بھی استعمال نہ کریں۔ دودھ کا روزانہ استعمال کریں۔ تین ماہ تک دوا کا مسلسل استعمال کریں اور اس کے بعد مکمل کیفیت لکھ کر آگاہ کریں۔ انشا اللہ آپ کو ضرور افادہ ہوگا۔

بشیر احمد ناردوال..... نورین مجاہد کوئٹہ

حل کے آپ سب نے قد بڑھانے کے لیے نسخہ تجویز کرنے کی درخواست کی ہے۔ آپ سب D.B Height ٹیبلٹ ایک ایک دن میں تین مرتبہ چپ کر کھائیں۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر ولما رشواہی کی دوا Phos-6x کی چار چار گولیاں دن میں تین مرتبہ چپا کر کھائیں۔ یاد رکھیں قد فوری طور نہیں بڑھتا اس کے لیے آپ کو کم از کم چار ماہ تک دوا کھانا پڑے گی۔ ہلکی پھلکی ورزش اپنا معمول بنائیں۔ وقت پر کھانا



کھائیں اور تازہ سبزیاں پھل کھانے میں ضرور شامل کریں۔ روزانہ غسل کریں۔

نوید احمد بہادر۔

حل کے آپ نے پیٹ کی خرابی سینے کی جلن اور گیس کی شکایت کی ہے۔ ہمارے ہاں یہ امراض عام ہیں جس کی سب سے بڑی وجہ بے وقت کھانا بے تحاشا کھانا، مرغن غذاؤں اور چٹ پٹی چیزوں کا استعمال ہے۔ اس کے علاوہ کک وغیرہ اور زیادہ چائے نوشی کی وجہ سے بھی گیس اور معدے کی جلن ہو سکتی ہے۔ ایسے تمام افراد جو ان کیفیات میں مبتلا ہیں وہ لہنگ لیبارٹری فرانس کے L-NO-95 کے پندرہ پندرہ قطرے دن میں تین مرتبہ تھوڑے پانی میں ملا کر پی لیں۔ مرغن ترش اور تیز مسالے دار اشیاء سے پرہیز کریں۔ کھانا وقت پر تناول فرمائیں۔ رات کھانا کھانے کے بعد فوری بستر پر دراز نہ ہوں۔ چائے نوشی بکثرت نہ کریں۔

سحرش فاروقی چکوال۔ مس فردوس۔ گواٹ حل کے آپ سب نے بالوں کے گرنے، سر کی خشکی اور بالوں کے بے رونق ہونے کے بارے میں لکھا ہے۔ آپ سب کے لیے نسخہ تجویز کر رہا ہوں۔ آپ سب مہران ہومیو فارما کا آئل Hair and Fair استعمال کریں۔ ابتدائی طور پر آپ اس آئل کی چھوٹی بیکنگ لے لیں اور بیکٹ میں موجود طریقے کے مطابق استعمال کریں اور اس کے ساتھ ہارٹیشیمو استعمال کریں۔ ہر بار سر دھونے کے لیے آپ یہ نسخہ استعمال کریں انشاء اللہ اس آئل اور شیمو کے کچھ عرصہ استعمال کے بعد آپ کے بال گرنا رک جائیں گے۔ خشکی بھی ختم ہو جائے گی اور بالوں میں چمک بھی پیدا ہو جائے گی۔

مس فردوس صاحبہ آپ کی تجویز ہم نے نوٹ کر لی ہے کسی قریبی اشاعت میں ہم بالوں کے مسائل پر مختصراً لکھنے کی کوشش کریں گے۔

گزار بی بی، حویلی ٹولکھا۔ دیدار حسین، حب بلوچستان

ج کے آپ نے جو علامات تحریر کی ہیں اس کے مطابق دوا تجویز کر رہا ہوں۔ آپ لہنگ لیبارٹری فرانس کی دوا L-NO-2 کے پندرہ، پندرہ قطرے تھوڑے پانی میں ڈال کر دن میں تین بار پی لیں۔ اس کے ساتھ Sinuspax Tab ایک، ایک گولی چوس کر کھالیں۔ دوا تک تجویز کردہ ادویات استعمال کرنے کے بعد اپنی کیفیات سے آگاہ کریں۔ ٹھنڈی، کھٹی اور چکنائی والی اشیاء کا استعمال نہ کریں۔ ٹھنڈے پانی سے غسل نہ کریں اور آئس کریم اور کولڈ ڈرنک کا استعمال بھی نہ کریں۔

روزینہ دلی، حیدرآباد۔ میوند بیگم، بلیر کراچی ج کے آپ سب نے بواہر کے لیے نسخہ تجویز کرنے کی درخواست کی ہے۔ آپ سب ڈاکٹر ولما شواہ کی دوا BIO-NO-17 کی چار، چار گولیاں دن میں تین بار چبا کر کھالیں اور اس کے ساتھ لہنگ لیبارٹری فرانس کی دوا L-NO-104 کے 15-15 قطرے تھوڑے پانی میں ڈال کر دن میں تین بار پی لیں۔ گرم اور بادی چیزوں سے پرہیز کریں۔ گوشت کسی قسم کا نہ کھائیں۔ تازہ پھل اور سبزیاں استعمال کریں۔ جائے کم سے کم استعمال کریں۔ سرخ مرچ کا استعمال بالکل ترک کر دیں۔

شمینہ بلال۔ کوٹ لکھپت ج کے آپ نے جو علامات تحریر کی ہیں، ان کے مطابق نسخہ تجویز کر رہا ہوں۔ آپ استعمال کریں، انشاء اللہ آپ کو اس سے ضرور فائدہ ہوگا۔ آپ لہنگ لیبارٹری کی دوا L-NO-20 کی دو، دو گولیاں دن میں تین، چار بار چبا کر کھالیں۔ اس کے ساتھ L-NO-36 کے بیس، بیس قطرے دن میں تین بار تھوڑے پانی میں ڈال کر پی لیں جبکہ سیون ہرمل فارما کی Breastogen Cream دن میں تین بار مساج کریں۔ آپ ایسی سبزیاں جن میں نمکیات اور پانی زیادہ ہوتا ہے، استعمال نہ کریں۔ مثلاً پالک کا ساگ اور بند گوبھی وغیرہ اس کے ساتھ ٹھنڈے شروبات اور مٹی چیزیں بھی استعمال نہ کریں۔ دودھ کا

روزانہ استعمال کریں۔ تین تا چار دن کا مسلسل استعمال کریں اور اس کے بعد مکمل کیفیت لکھ کر آگاہ کریں۔ انشاء اللہ آپ کو ضرور فائدہ ہوگا۔

شمس بیگم، کراچی۔ علینا فاروقی، فیصل آباد ج کے آپ سب نے وزن بڑھانے اور جسم کو مناسب کرنے کے لیے تجویز نسخہ کی درخواست کی ہے۔ آپ سب مہران ہومیو فارما کے TOKO-40 کپسول صبح شام ایک، ایک سادہ پانی کے ساتھ کھالیں۔ اس کے ساتھ لہنگ لیبارٹری فرانس کا Lehning Tonic ایک، ایک چمچ دن میں تین بار کھانا کھانے سے قبل ایک گلاس پانی میں ڈال کر پی لیں۔ تازہ پھل اور سبزیاں کھائیں۔ مٹی چیزیں استعمال نہ کریں۔ صبح شام سیر ضرور کریں اور دن میں کم از کم 14 گلاس پانی پیئیں۔

نجمت فاطمہ۔ گجرات ج کے آپ نے لکھا ہے کہ بال گرتے ہیں، ان میں خشکی بہت زیادہ ہے، اس کے لیے مناسب نسخہ تجویز کیا جائے۔ آپ اور جتنی بھی خواتین اس مرض میں مبتلا ہیں، کی خواہش کے مطابق نسخہ تجویز کر رہا ہوں۔ آپ سب Cinci Hair Oil کا سر پر روزانہ مساج کریں اور اس کے ساتھ ہی مہران ہومیو فارما کا تیار کردہ ہر بیئر شیمو سر دھونے کے لیے استعمال کریں۔ انشاء اللہ چند روز کے استعمال سے ہی آپ کے سر کی خشکی ختم ہو جائے گی اور بال بھی گرنا رک جائیں گے۔ نمک کا استعمال کم سے کم کریں۔ ویسے بھی آئیوڈین ملا نمک استعمال کریں۔ مٹی چیزوں کے استعمال سے بھی پرہیز کریں۔

عندلیب۔ لاہور ج کے آپ نے اپنے خط میں جسمانی کمزوری اور بالوں کے گرنے کے بارے میں تحریر کیا ہے۔ آپ سیون ہرمل فارما کے تیار کردہ Harmogeen ٹینڈ ایک، ایک دن میں تین بار چبا کر کھالیں۔ اس کے ساتھ لہنگ لیبارٹری کا تیار کردہ Lehning Tonic دن میں تین بار ایک، ایک چمچ تھوڑے پانی

میں ڈال کر کھانے سے آدھا گھنٹہ قبل پی لیں جبکہ بالوں کے لیے آپ Cinci Hair Oil روزانہ رات سونے سے قبل بالوں میں لگائیں اور خوب مساج کریں۔ آپ 8 ہفتے تک مذکورہ نسخے کا باقاعدگی سے استعمال کریں۔ آپ کو انشاء اللہ ضرور فائدہ ہوگا۔

انعم حسن۔ کھاریاں ج کے آپ کے لیے نسخہ تجویز کر رہا ہوں۔ آپ کم از کم دو ماہ تک استعمال کرنے کے بعد اپنی کیفیات سے آگاہ کریں۔ انشاء اللہ آپ کو ضرور فائدہ ہوگا۔ آپ Cinci Acne کریم چہرے پر دن میں کم از کم چار مرتبہ لگائیں اور اس کے ساتھ لہنگ لیبارٹری فرانس کی دوا L-NO-40 کے پندرہ، پندرہ قطرے تھوڑے پانی میں ڈال کر دن میں تین بار پی لیں۔ مٹی ہوئی اور ترش چیزوں کا استعمال بالکل نہ کریں۔ چاول اور بڑے کا گوشت بالکل استعمال نہ کریں۔ پانی کا استعمال زیادہ کریں۔ مزہ دھونے کے لیے بروکس ہومیو لیب کا نیم سوپ استعمال کریں۔

ن، کراچی۔ نجمت، مقام نامعلوم ج کے آپ سب نے جو کیفیات تحریر کی ہیں، ہمارے معاشرے کی بے شمار لڑکیاں اس مسئلے سے دوچار ہیں جس کی سب سے بڑی وجہ ان کی اپنی نادانی اور والدین کی بے پروائی ہے۔ ڈش، کیبل اور انٹرنیٹ نے جہاں اس معاشرے کو فائدہ دیے ہیں وہاں بے پناہ نقصانات سے بھی دوچار کیا ہے جس کے باعث ہمارا معاشرہ بے شمار مسائل سے دوچار ہوا ہے۔ علاوہ ازیں غیر معیاری لڑچکر نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہر ایک بہن بچی کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور ہر برائی سے بچائے۔ آپ سب سچے دل سے توبہ کریں، نماز کی پابندی کریں۔ بے شک نماز بے حیائی سے روکتی ہے اور برائیوں سے بچاتی ہے۔

آپ سب ڈاکٹر ولما شواہ کی دوا Origenum-a کے 10-10 قطرے تھوڑے پانی میں ڈال کر پی لیں۔ اس کے ساتھ BIO





سچی

دین و ایم کی روشنی میں آپ کے دل روشن

ایس۔ ایم۔ قادری

تمام قرآنیں اللہ تعالیٰ جل شانہ وحی مبینہ کو دیا ہیں۔ کہ جس نے ان لکھوں سے اس عالم قانی کو کمال مہربانی سے تخلیق کیا۔ اور اس کا نبی ذات کے نور سے منور کیا ہے۔ اس نے بہترین نذیب اور بہترین رسول عطا کیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مقدس نے انسانی شعور کو ہدایت کی ان بلند یوں کی جانب گامزن کیا کہ جہاں ذات باری تعالیٰ کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ انسان کیلئے آج بھی راہ ہدایت موجود ہے۔ کتاب الہی الہنگ ہمارے روشن مستقبل کی جانب رہنمائی کرتی رہے گی۔ اور اسی طرح سنت رسول کریم ﷺ آج بھی قائم و دائم ہے۔ اور تاقیامت عالم انسانیت کے لئے روشنی کا بیجار ہے گی۔ تو پھر آئے ہم اپنی کوتاہ نظری اور بیماری، غفلت کو سامنا کرتے اور اسوہ حسنہ سے تروتازگی بخشیں اور اللہ عز و جل کے نام سے اپنی عقل و گلوب کو روشن کریں۔ دیکھیں پریشانوں اور مشکلات کے حل کے لئے اس مجدد برحق کی جانب رجوع کریں۔ جو کل عالمین کا رب ہے۔ جس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں جو تکلیف، اقتدار، ترقی، آسائش، شعور، آگاہی اور انسانی ضروریات کے تمام وسائل کا خالق و مالک ہے۔

جناب محترم ایس۔ ایم۔ قادری صاحب معروف روحانی مکارم اسلامہ لکھنؤ کے تعلق و دیگر دینی اور روحانی علوم پر گہری نظر رکھنے والے اہل علم و ادب سالہا سال سے اندرون اور بیرون ملک عوام کو اپنے مشوروں سے مستفید فرما رہے ہیں۔ انتہائی قابل قدر کتب کے مصنف ہیں۔ ان کے کالم ملک کے تمام قومی اخبارات، مجلات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کے ماحول میں علمی و غیر علمی معروف اہل علم، دانشور، پروفیسر، محققین اور اہل سائنس کی شخصیات شامل ہیں۔ اندرون اور بیرون ملک ایک وسیع تر حلقہ محترم ایس۔ ایم۔ قادری صاحب کے مشوروں سے فیضیاب ہو کر سکون اور اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہاں سے امر قابل ذکر ہے کہ ہر سال بارہ سے چند ہزار افراد بزرگ و خرد و کمالات روحانی تحسین اور جسمانی امراض میں شفا کے حصول کے لئے روحانی حاصل کر رہے ہیں۔ یہ طرز امتیاز بھی محترم ایس۔ ایم۔ قادری صاحب کو ہی حاصل ہے کہ وہ علمی ایشیا، عرب ممالک، انڈیا، امریکا اور یورپ میں بسنے والے ہزاروں افراد بھی آپ سے بذریعہ خط و کتابت فیض حاصل کر رہے ہیں۔

ایس۔ ایم۔ قادری صاحب کی شخصیت اس لحاظ سے بھی ممتاز و منفرد ہے۔ کہ ان کے پروگرام لکھنؤ اسلامہ لکھنؤ 1998ء سے لے کر دہلی کاسٹ ہونا شروع ہوئے۔ ان پروگرام کی مقبولیت اور افادیت کا یہ عالم ہے کہ نہ صرف یہ کہ پاکستان میں "ARY" چینل سے آپ کے پروگرام اسلامہ لکھنؤ "کامیابی کا راستہ" ہر جمعہ المبارک کو نشر ہوتا رہا تھا۔ یہی نہیں بلکہ دو ذائد فیاض کسی نہ کسی چینل کے حوالے سے پروگرام اسلامہ لکھنؤ ٹیلی کاسٹ ہوتے رہتے ہیں۔

☆☆☆☆

باپ، ہمارے بھائی کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس چینل کو بہت جلد آسمان کی رفعتیں عطا فرمائے (آمین) ہماری جانب سے چینل کے لئے ایک چھوٹا سا عطیہ ارسال ہے اللہ تعالیٰ ہمارے اس چینل کو ہر قسم کی نظر بد اور حسد سے بچائے۔ میرا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ میرے بچے بہت ذہین ہونے کے باوجود بعض اوقات نیٹ میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ عام حالات میں وہ بہت اچھے

لکھنؤ تیمم۔ کراچی  
○ محترم! انتہائی خوش ہوئی ہے کہ جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی روحانی اور ایمانی قیادت میں علم کا سفر مسلسل آگے بڑھ رہا ہے ماہنامہ اسلامہ لکھنؤ کا مہمانی کا راستہ کے بعد آپ کی جانب سے یہ اطلاع کہ ایک انتہائی خوبصورت، علمی، مہمانی اقدار کے ستونوں پر قائم چینل کا اجراء ہو رہا ہے تو جی جیوں لگا کہ جیسے یہ ہمارے

Oleum-Jac-3x نیپلٹ دن میں تین مرتبہ دو، دو چوس کر یا چبا کر کھالیں۔ اس کے ساتھ L-NO-11 کے 15 قطرے دن میں تین مرتبہ تھوڑے پانی میں ڈال کر پی لیں۔ اس کے ہمراہ برانڈو کریم کا دن میں کم از کم تین بار استعمال کریں۔ انشاء اللہ آپ کو ضرور فائدہ ہوگا۔ ان دواؤں کا استعمال کم از کم دو ماہ کریں۔ تیز مرجع مصلے والی اشیاء، بادی چیزوں اور چٹ پٹی چیزوں سے پرہیز کریں۔ ہماری چند پاکیزہ بیہوشیوں نے معلوم کیا ہے کہ آپ جو ادویات تجویز کرتے ہیں کیا وہ ہر جگہ دستیاب ہیں، اس کے لیے عرض ہے کہ ہومیوپیتھک میں جو نسخہ ہم تجویز کرتے ہیں اس کی ادویات پاکستان کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں بہ آسانی دستیاب ہیں۔ یہ ادویات نہ ملنے کی صورت میں آپ میرے موبائل نمبر 0333-2133099 پر شام 5 تا 4 بجے تک فون کر کے معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔

صیغہ رشید..... سبکی

حل ہے آپ نے لیکور یا کی تکالیف کا لکھا ہے اور مجرب دوا تجویز کرنے کی درخواست کی ہے۔ آپ سب مہمان ہومیو فارماکے Toko-40 کپسول، صبح، شام ایک ایک تازہ پانی سے لیں اور اس کے ساتھ لمبٹک لیبارٹریز فرانس کی دوا L.No-20 کی دودھ گولیاں دن میں تین بار چبا کر کھالیں۔ گرم اور ترش چیزوں سے پرہیز کریں۔ متوازن غذا استعمال کریں۔ تازہ پھل اور سبزیاں استعمال کریں۔

✱

NO-13 کی چار، چار گولیاں دن میں تین بار چبا کر کھالیں۔ اس کے ساتھ TOKO-40 کے صبح شام ایک، ایک کپسول سادہ پانی کے ساتھ کھالیں۔ جب اس نسخے کو چار ہفتے استعمال کر چکیں تو ڈاکٹر و لمار شواہے کی دوا Avena Stiva-q کے 10-10 قطرے دن میں تین بار تھوڑے پانی میں ڈال کر پی لیں۔ ترش چیزوں کا استعمال نہ کریں۔ صبح شام پھل قدری کریں۔ تنہائی پسند نہ بنیں۔ گھر کے دیگر افراد کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا پسند کریں اور خوش رہنے کی کوشش کریں۔

نور بانو، لاہور۔ عبدالباق، چوکی

صبح ہے آپ نے قبض، معدے کی خرابی اور کمزوری کی علامات بیان کی ہیں۔ آپ ڈاکٹر و لمار شواہے کی دوا BIO-NO-4 کی چار، چار گولیاں دن میں تین بار چبا کر کھالیں۔ اس کے ساتھ Carbo Vege-30 کے پانچ، پانچ قطرے تھوڑے پانی میں ڈال کر دن میں تین بار پی لیں۔ اس کے ساتھ سیون ہرمل فارمیسی سوات کی تیار کردہ ٹیبلٹ Harmogeen صبح، شام ایک، ایک گولی چبا کر یا پانی کے ساتھ کھالیں۔ بادی چیزیں استعمال نہ کریں۔ موسم کے تازہ پھل ضرور کھالیں۔ کھانا دقت پر کھالیں۔ چائے کا استعمال کم کریں۔

صائمہ رئیس، میرپور خاص۔ شمشاد بیگم، کوٹ اڈو حل ہے آپ نے چہرے کے کیل جھانپوں کے بارے میں نسخہ تجویز کرنے کی درخواست کی ہے۔ آپ سب بہنیں لمبٹک لیبارٹری فرانس کی تیار کردہ

اہم انتباہ

جملہ اشتہارات (جن کے مندرجات سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں ہوتا) ایک نیٹی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ مشیرین کے لیے ادارے کی معرفت آنے والی ڈاک ضائع کر دی جاتی ہے، قارئین رابطے یا معلومات کے لیے براہ راست مشیرین سے رجوع کریں۔ اس ضمن میں کسی نقصان یا شکایت کی صورت میں جاسوسی ڈائجسٹ جی بی انٹرنیشنل کوئی اخلاقی یا قانونی ذمہ داری نہیں ہوگی۔



نمبر لیتے ہیں مگر جب انہیں یہ بتا دیا جائے کہ آج امتحان ہے ٹیسٹ ہے تو چودہ پانچ نہیں کیوں خوفزدہ ہو جاتے ہیں، اس صورت حال کے لئے کوئی نقش تجویز فرمائیے۔ آپ کی دعاؤں کی طلبگار۔ آپ کی بہن

☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ آپ کو تمام بہن بھائیوں کو اپنی رحمتوں اور برکتوں کے سامنے میں رکھے آپ سب کی حوصلہ افزائی ہے جو کہ اتنا زیادتی پر وحیئت پایہ تکمیل کی جانب رواں دواں ہے۔ آپ سب کی دعاؤں کا بے حد شکریہ۔ آپ کے بچوں کے لئے امتحانی کامیابی اور خیر و برکت کے لئے لوح عطا اور سال کی جاری ہے۔ بروز جمعہ سورہ الجمعہ تین مرتبہ پانی پر دم کر کے پلایا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔

☆ ☆ درخواستیں مطلوب ہیں ☆ ☆

☆ ہمیں اپنے دینی ٹیلی ویژن نیٹ ورک کے بیرون ملک ٹیلی پورٹ کیلئے درخواستیں مطلوب ہیں۔ ویڈیو لائبریرین، آفس اسٹنٹ معقول تنخواہ، رہائش، خوراک مہیا کی جائے گی۔

☆ کیکرہ مین، اسٹنٹ کیکرہ مین، لائٹ مین، کمپیوٹر گرافکس (انیمیشن) (ایڈیٹر) (نان لیٹر) اپنی تازہ تصویر اور مکمل کوائف کے ساتھ رابطہ کریں۔

☆ ☆ بحیثیت ٹی وی نمائندہ اپنا کیریئر بنائیے ☆ ☆

ہمیں اپنے دینی ٹیلی ویژن نیٹ ورک کے لئے ملک کے تمام اضلاع میں مستعد اور فعال نمائندے درکار ہیں۔ جو کہ خدمت خلق کے جذبے سے سرشار ہوں اور اپنے اپنے علاقوں میں جانے پہچانے جاتے ہوں۔ اپنے اضلاع کی دینی، سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں کی کوئٹ کر سکیں۔ اپنی یونین، ضلع، ناؤں اور کونسل کے نمائندوں کے انٹرویوز کر سکیں۔ مکمل اعتماد کے ساتھ اپنی تازہ ترین تصویر اور مکمل کوائف کے ہمراہ رجوع کریں۔

359-B فیصل ناؤں لاہور۔ فون نمبر: 042-5168036

○ سر۔ شیخ پورہ

☆ آپ اپنی صحت کے لئے کسی اچھی لیڈی ڈاکٹر سے مشورہ کیجئے۔ بھائی کے لئے علاج درعقیم کے سلسلے میں دوبارہ میڈیکل رپورٹس کے ساتھ خط لاہور کے پتے پر لکھیں۔

○ صدف جاوید۔

☆ عزیز بہن! دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے شوہر کو ہدایت دے (آمین) آپ بکثرت ”یا عزیز یا قدوس“ پڑھا کریں اول

آخر 11 مرتبہ درود شریف۔ آپ لاہور کے پتے پر براہ راست بھی خط لکھ سکتی ہیں۔ دعاؤں کا شکریہ

○ ر۔ اسد خان و رے

☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ آپ کی ازدواجی نامہواری کو بہتر فرمائے (آمین) از روئے استخارہ اس فیصلے کے نتیجے میں کافی مسائل جنم لیں گے۔ اس لئے بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھائیں بکثرت ”یا ستار“ پڑھا کریں۔ آپ لاہور کے پتے پر براہ راست خط بھیج سکتی ہیں میرا ذاتی فون نمبر 92300-8425381 پاکستانی وقت کے مطابق صبح 10 بجے تا رات 10 بجے تک کال کر سکتی ہیں۔ دعاؤں کا شکریہ

○ ہانیہ آزاد کشمیر

☆ آپ کے معاملات میں خصوصاً بیرون ملک کے سفر میں تاخیر ہے۔ ”یا قاض“ بکثرت پڑھیں نماز کی پابندی کیجئے۔

○ روشنی رحمان۔ سرگودھا

☆ عزیز بہن! اپنا پوسٹل ٹیکس ہوتے بکثرت ”یا داب“ پڑھا کریں۔ حسب توفیق صدقہ دیں۔ اللہ تعالیٰ کر فرمائیں گے۔ انشاء اللہ

عمرہ خاؤن۔ کوٹ عبداللہ لک لاہور

○ محترم! اگر شہر طویل عرصے سے عجیب سی کیفیت رہتی ہے یوں لگتا ہے کہ جیسے کوئی اندر ہی اندر کچھ کچھ رہا ہے گھر میں عجیب قسم کی بدبو کا احساس ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے کاموں میں رکاوٹ پڑتی ہے یوں لگتا ہے کہ جیسے کسی نے ہمیں اندھنی زنجیروں میں جکڑ لیا ہے۔ یہی کی نسبت جہاں ڈیڑھ سال سے طے قی انہوں نے اچانک بغیر کسی معقول وجہ کے رشتے سے انکار کر دیا ہے یا کاندھا چاک کینسل ہو گیا شوہر کا ایکسڈنٹ ہو گیا اور ٹانگیں ٹوٹ گئیں ایک دن اچانک ایسا شارت سرٹ ہوا کہ فریج، ٹی وی، مائیکرو ویو اوون کچھ زرب ہماک سے جل گئے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے ناویدہ بلاؤں نے چاروں طرف سے اپنا حصار کر لیا ہے۔ آپ از روئے استخارہ کچھ ارشاد فرمائیے اور اس صورتحال کا تذکرہ کیجئے۔ بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ سخت قسم کی بندش اور غلطی علم کیا گیا ہے سمجھ نہیں آتا کہ ہم سے کیا گواہ کیا تعمیر ہو گئی ہے جو زندگی یوں مذاہلوں کی لپیٹ میں آگئی ہے۔

☆ عزیز بہن! از روئے استخارہ یہ تحقیق درست ہے کہ آپ کی سبھی سبھی اور ایسی معاملات میں جلا کر دی گئی ہیں۔ سب اس کا ماحول آپ کا کسی خاص معاملے میں انکار تھا بہر کیف ظالم کا قہر اللہ کی

رحمت کاملہ کے آگے کوئی حیثیت نہیں رکھتا ہے آپ ذاتی طور پر مکمل اتار اور متعلقہ نقوش دفن سے منکوا لیں سورہ بقرہ کی تلاوت کثرت سے کیجئے۔ اور گھر میں باقاعدگی سے بیچ وقت اذان اور نماز کی طرف توجہ دیجئے۔ انشاء اللہ حالات میں فرق پڑ جائے گا۔

سہیلہ کریم۔ کراچی

○ محترم! اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ مخلوق خدا آپ کے بنائے ہوئے مختلف سے صحیح اسلامی طریقے سے فیض یاب ہو رہی ہے۔ ہماری توہر سانس میں یہی دعا نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے تمام اہل خانہ دین، ایمان، اور مقامات دنیا ہمیشہ میں عروج پر فائز رہیں کہ جن کے ذریعے ہمارا آپ سے مسلسل رابطہ رہتا ہے۔ میرا ایک مسئلہ یہ ہے کہ میں ہر بات میں بہت جلدی گھبراہٹ ہوں۔ بچوں کو اسکول سے دیر ہو جائے میاں انکر کسی مہمان کو باہر چھوڑنے کے لئے جاؤں، نوکرائی کسی دوسری نوکرائی سے کھر پھس کر یوں تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے کوئی مہاشاں ہو رہی ہے سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ایسا کیوں ہو گیا ہے حالانکہ پہلے تو میں ایسی نہیں تھی۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میری بیٹی کی شادی کا مسئلہ کسی صورت حل نہیں ہو رہا ہے۔ لہذا آپ اس حوالے سے مجھے کوئی نقش یا لوح عنایت فرمائیں۔ گیارہویں شریف کے لئے بھیجیں بڑا مرتبہ درود شریف اس کو میری جانب سے شامل کر لیجئے گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ اپنے حفظ و امان میں رکھے (آمین) آپ کی بہن۔ آپ کے لئے ہمیشہ دعا گو

☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ آپ سب کو بھی ہمیشہ غایت کی چھاؤں میں رکھے (آمین) آپ ہر نماز کے بعد ”یا قوی یا اسلام“ 125 مرتبہ پڑھ کر دعا کر لیا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔ آپ کی کیفیت کے پیش نظر آپ کو لوح اسم ذات ارسال کی جارہی ہے۔ حسب ہدایت استعمال سے آپ کے خوف اور ڈر پریشانی میں کمی آجائے گی۔ انشاء اللہ

مراد بخش۔ کوٹ لودھاراں

○ محترم! میری پریشانی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ میں مستقل مزاج نہیں ہوں دائمی اور غمی بھی ہوں بات بات پر غم کرتا ہوں اور ایمانداری سے اپنا تجزیہ کرو تو آپ کو صاف صاف کہہ دوں کہ میں جلد باز، غصہ و اکیٹ پرور، اور کجس ہوں میری بیوی بہت اچھی ہے میری ساری خامیاں برداشت کرتی ہے لیکن میں اس کے ساتھ بدسلوکی کرتا ہوں پھر بعد میں پچھتا تا ہوں مجھے کوئی ایسا

اسم الہی عطا کریں کہ جس سے میں نرم مزاج، محل مزاج ہو جاؤں میری خامیاں اور اصلاح ہو پاکیں۔ میں نے آپ کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے اس امید پر کہ آپ کے در سے خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا۔ میری مدد کیجئے آپ کا پرستار ذاتی خادم آپ کی نظر کرم کا شستہ سے متنی۔

☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ آپ کی اور ہم سب کی اصلاح فرمائے اور ہماری بھلائی کے راستے کھول دے (آمین) جب انسان کے اندر اصلاح کی خواہش ہو خود کو بدلنے کی بھی آرزو ہو تو اللہ تعالیٰ یقیناً مدد فرماتا ہے آپ کو کشش کریں کہ زیادہ سے زیادہ با وضو رہا کریں اور بکثرت ”یا قدوس“ پڑھا کریں لوح اسم ذات برائے اصلاح اور روحانی ترقی کے لئے ارسال کی جارہی ہے نماز کی پابندی فرمائیں۔

نبیلہ حیدر اکرام۔ حیدر آباد

○ محترم! میں ایک خاص مسئلے میں آپ کی رائے چاہتا چاہتی ہوں۔ کیونکہ اسی مسئلے کے حوالے سے آپ نے ایک بہن کو مشورہ دیا تھا اور اب وہ بے حد مطمئن اور معاشی اعتبار سے آسودہ ہیں اور وہ میری بیوی کی زاد بہن ہیں۔ مسئلہ کچھ یوں ہے کہ میرے والدین کے ترکے سے مجھے آٹھ لاکھ روپے ملے ہیں۔ ہم سوچتے ہیں کہ وہ کسی اچھی جگہ لگائیں جہاں سے ہمیں کچھ مناسب آمدنی مل سکے اور ہمارا سرمایہ بھی محفوظ رہے۔ میرے شوہر اور میرا دونوں کا دل بنک میں انوسٹ سے مطمئن نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ

## ٹوکن برائے مسیحا

فروری 2008ء

اپنا مسئلہ ٹوکن کے ساتھ ارسال کریں ورنہ قابل توجہ نہ ہوگا۔

پورا نام:

مکمل تاریخ پیدائش:

مکمل پتہ:



سود ہے جس کی تاثر برکت ہے اور سب سے بڑھ کر جو اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک قطعاً حرام ہے۔ ہم اس کو ایسی جگہ استعمال کرنا چاہتے ہیں جہاں سے ہم کو اسلامی حلال طریقے سے منافع بھی ملے، اور ہمارا سرمایہ کسی اسلامی کام میں استعمال ہو، آپ ہمیں بھی اس دینی ادارے کا نام بھجوا دیجئے تاکہ ہم اس کے نیک کام میں شریک بھی ہو سکیں اور سرمایہ کاری سے ہمیں بھی منافع مل جائے۔ امید ہے کہ آپ جلد از جلد جواب عنایت فرمائیں گے۔ آپ کی بہن۔ آپ کے لئے دعا گو

بنو عزیز بنین! اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو ہم سب کو استقامت دین عطا فرمائے اور ہم سب کو حلال اور طیب رزق عطا فرمائے (آمین) آپ رزق میں اضافے کے لئے "یا کریم یا غنی" بکثرت پڑھا کریں۔ آپ کو اس ادارے کی تفصیلات بھجوائی جا رہی ہیں۔ دعاؤں کا شکریہ

مریم کوثر۔ اسلام آباد

○ محترم! گزشتہ کافی عرصے سے شدید پریشان ہوں سمجھ میں نہیں آتا کہ کس سے مشورہ لوں، ایک خاتون نے مجھے آپ کا کالم پڑھوایا۔ ایسا لگا کہ جیسے اندر سے میں روشنی ملی میں ایک ملٹی ٹیکسٹ کیٹی کے مقامی دفتر میں کام کرتی ہوں وہاں مجھے ایک کولیک نے پر پوز کیا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کیونکہ میں اپنے بہن بھائیوں کی پرورش کا عزم لیکر گھر سے نکلی تھی اور تیسرے ہی مہینے میں کس طرح اپنے مقصد سے بے وفائی کر سکتی تھی مگر اس کا اصرار بڑھتا ہی گیا پھر ایک وقت ایسا آیا کہ میں اس سے گریز نہ کر سکی اور اس سے اقرار کر بھی لیا مگر میں نے اس کو اپنے سارے حالات بتا دیئے کہ میں تم سے محبت تو کر سکتی ہوں مگر تم از کم مجھے سات سال شادی نہیں کر سکتی۔ کیونکہ اس وقت تک میرے بہن بھائی بڑھ کھ کر کسی قابل ہو سکیں گے اس نے فوراً ہی اس صورت حال کو قبول کر لیا کیونکہ اس پر بھی بہت ڈرے دار ہیں تھیں۔ اور وہ بھی اس سے قبل شادی نہیں کر سکتا تھا اس کے بعد یوں ہوا کہ اس کا ایک دوست آسٹریلیا چلا گیا اور اپنا قلیت اس کو دے گیا کہ تم بہت دور رہتے ہو یہاں رہا کر دو اس طرح تمہیں ہر ہفتے گاؤں آنے جانے سے نجات مل جائے گی وہ بہت خوش ہوا پھر اس قلیت کو میں نے سچا یا سنواریا۔ وہ کہنے لگا مگر مل گیا ہے چاہے عارضی طور پر ہی سہی (یہ عارضی سال کم از کم پانچ سال تھے) ہم لوگ اکثر ویک اینڈ اکٹھا گزارتے اور اس

سے پہلے کہ جذبات کے ہاتھوں کو غلطی کرتے ہم نے ہاتھی رضا مندی سے نکاح کر لیا کیونکہ اگر ہم ایسا نہ کرتے تو شاید گناہ کے مرتکب ہوتے۔ بد قسمتی یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ ایک دن میری والدہ نے مجھے اس کے ساتھ کھوتے دیکھ لیا پھر انہوں نے کوشش کر کے میرا قلیت بھی دیکھ لیا پھر ایک دن وہ قلیت پر آ پھنسیں۔ انہوں نے ہمیں بجیش میاں بیوی دیکھ لیا۔ اب وہ سخت ناراض ہیں انہوں نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔ حالانکہ میں نے اور میرے شوہر نے ان سے پاؤں پکڑ کر معافی مانگی، ہمارے دو تین کو لیک جو اس صورت حال سے واقف تھے انہوں نے نکاح کی کوئی دی، نکاح نامہ دکھایا مگر میری والدہ کی ناراضگی برقرار رہی۔ خدا گواہ ہے کہ اب تک میں نے گھر سے اخراجات میں کوئی کی نہیں کی۔ اور ہمیشہ انہیں پیسے دینے کی کوشش کی۔ مگر وہ مجھ سے پیسے نہیں لیتی ہیں، اس قدر بھگی ترشی میں وقت گزار رہی ہیں کہ کیا بتاؤں آج اس خدا کو لکھنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے کسی گھر میں کھانا پکانے برتن دھونے کی نوکری کر لی۔ میرے چھوٹے چھوٹے بھائی مجھ سے ملنے کے لئے ترستے ہیں۔ مگر ماں کو چھوڑ نہیں سکتے۔ وال غصی کھا لیتے ہیں مگر مجھ سے پیسے لینے کی انہیں اجازت نہیں ہے ماں نے مجھے بہن بھائیوں سے ملنے سے نہیں روکا مگر میں ان سے مل کر کیا کروں جب وہ مجھے ایک گلاس پانی بھی دے نہیں سکتے۔ میرے شوہر نے میری تنخواہ کو بھی ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ کہتے ہیں کہ تم پہ یہ ساری مصیبت میری وجہ سے آئی ہے میں نے اس بات کا وعدہ کیا تھا تمہیں نہیں روکوں گا ملازمت کرنے سے، شروع شروع میں میرا خیال تھا کہ یہ سب خالی دعوے ہیں مگر ہر گزرتے ہوئے وقت ان باتوں میں سچائی بھری ہے۔ میں والدہ کو منانا چاہتی ہوں میں نے نافرمانی کی ہے لیکن کوئی گناہ تو نہیں کیا۔ خدا اور اس کے رسول کے حضور میں گناہ گار نہیں ہوں مگر میری ماں کے پاس میرے لئے سوائے حرف انکار کے کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ سے اس امر کی درخواست ہے کہ کوئی ایسا اسم بتائیے کہ جس سے میری ماں مجھ کو واپس مل جائیں کوئی اور عنایت کر دیں تو بہت ہی مہربانی ہوگی۔ اس کے علاوہ میں چاہتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اولاد کی نعمت بھی عطا فرمادیں۔ آپ کی بیٹی محتاج دعا۔

بنو عزیز بنین! اللہ تعالیٰ آپ پر فضل و کرم فرمائے (آمین)

بنیادی طور پر آپ نے کوئی شرعی اعتبار سے غلطی یا گناہ نہیں کیا مگر آپ نے چونکہ ان کے علم میں لائے بغیر یہ کیا کیا اس لئے ان کی ناراضگی ہوئی دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ آپ کے والد کے انتقال کے بعد انہوں نے تمام توقع آپ سے وابستہ کر لی تھی اس حوالے سے بھی ان کا رد عمل شدید ہوا۔ تاہم خوشی اس امر کی ہے کہ آپ کے شوہر آپ کے معاملات میں آپ کے ساتھ مکمل تعاون کر رہے ہیں آپ ہر نماز کے بعد "یا عزیز یا قدوس" پڑھا کریں 140 مرتبہ۔ اول آخر 11 مرتبہ رد و شریف والدہ کے لئے لوح تحفہ خاص اور اولاد کے لئے علاج در عظیم ارسال ہے دعاؤں کا شکریہ

محمد ادریس۔ راولپنڈی

○ محترم! آج سے 7 سال پہلے میری نوکری بہت اچھی تھی میں نے نوکری چھوڑ کر پر اپنی کا کام شروع کر دیا جس میں، میں نے بہت پیسا کمایا میرا کام زیادہ فالگوں کا ہوا کرتا تھا جتنے لوگوں کو میں نے فالگوں دوائیں تھیں ان کو شروع میں تو منافع ہوا لیکن اب ان فالگوں کے ریٹ کافی کم ہو گیا ہے میں نے بھی جو پیسہ کمایا اس پیسے کی فالگوں خرید لی تھیں۔ اب نہ روزگار اور نہ کوئی سرمایہ ہے کہ کوئی کاروبار سکون میری مدد فرمائیں۔

بنو! یا وہاب یا فاتح" بکثرت پڑھا کریں۔ نماز کی باندی فرمائیں۔ لوح مشتری ارسال ہے۔ حمیرا اشار۔ چوک اعظم

○ محترم! اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میری شادی کو پانچ سال ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک اولاد کی نعمت میسر نہیں آئی ہے۔ شادی کے پہلے سال تین ماہ کے بعد حمل ضائع ہو گیا تھا۔ پھر اس کے بعد آج تک کوئی معاملہ نہیں ہوا ہے۔ جبکہ طبی اعتبار سے ہم دونوں بالکل فٹ ہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ آپ محفل دعا میں ہمارے لئے اولاد کی دعا بھی فرمائیں اور اس حوالے سے مجھے روحانی علاج بھی تجویز فرمائیے۔ آپ کی بیٹی۔ ہمیشہ آپ کے لئے دعا گو

بنو عزیز بنین! اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیشہ آپ کے گھر کو شاد و آباد رکھے (آمین) آپ ہر نماز کے بعد 140 مرتبہ "یا کریم یا سلام یا وارث یا باقی" پڑھ کر دعا کریں اول آخر 9 مرتبہ رد و شریف۔ آپ کی فرمائش پر اولاد و زینہ کے لئے علاج در عظیم ارسال کیا جا رہا ہے۔ دعاؤں کا شکریہ

## شرف ستارگان کی ادوا

اسپتہ نام اور ستارے کے مطابق لوح ہمارا کامیاب دھکیں۔

## لوح شرف مرغ

دل کی گھبراہٹ، ڈپریشن، عروا، امراض، خواہش کے امراض، بخون کی کمی، آسپ سے نجات، افسران یا لای تو جہ اور رجوع خلق کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

## لوح شرف ذہرہ

تحفہ خلق، پسند کی شادی، ڈاکٹر و سکیم، سیاستدان، عورتوں کے امراض، ۱۰ نیز تر و یکورین، مصدروں، خطاطوں اور ادیبوں کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

## لوح شرف عطارد

علی ترقی، محافظہ میں اضافی تعلیم میں کامیابی، یادداشت میں اضافہ، بچوں کا خواب میں ڈر، خراسپور، تجارت اور کیسٹیشن سے منسلک افراد کیلئے تیار کی جاتی ہے۔

## لوح شرف قمر

پرانی جنسائی بیماریاں، نسوانی امراض، تحفہ ترقی، زراعت اور باغبانی کے لئے مفید، سماجی قوتوں میں اضافہ، روحانی علوم میں کامیابی، تحفہ خلق کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

## لوح شرف مہم

ترقی، عروج، تھو، چادو سے حفاظت، روپے پیسے کی آمد، سماجی سرے میں اضافے کے لئے تیار کی جاتی ہے۔ جن کے ذرا پیسے میں جس کمزور ہے ان کیلئے مفید ہے۔

## لوح شرف مشتری

مالی خوش بختی، حصول دولت، آمدنی کے مختلف ذرائع کو ترقی دینا، انصافی اسکیموں میں فائدہ، مستقبل کی بہتری، کیریئر اور ترقی کے استحکام کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

## لوح شرف زحل

کاموں میں رکاوٹ، جاسٹیک کے تنازعات، پرانے امراض، ضدی امراض، محسوس، چادو، آسپ سے نجات کیلئے تیار کی جاتی ہے۔

## لوح شرف سیخ ستارگان

## ساتوں ستاروں کا کیا ہے

خیر و برکت، مالی خوش بختی، تحفہ خلق، مرد اور عورتوں کے پرانے امراض، شادی میں تاخیر اور رکاوٹ، علی ترقی، تعلیم میں کامیابی، گھر بیرو پریشانیوں، چادو، آسپ سے نجات کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

اپنی پسند کی لوح ہوائے کیلئے رابطہ کیجئے۔ B-359 فیس 5168036-5167842



محسن اکبر۔ لیاقت آباد کراچی

○ محترم! کمائی ماہ سے امت کر رہی ہوں کہ آپ کو خط لکھوں مگر بہت نہیں ہو رہی تھی میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے شوہر نے ہمیشہ مجھے دوسرے درجے کی عورت سمجھنے کی محبت اور پیار سے بات نہیں کی، کبھی بھروسہ نہیں کیا۔ میری ساری زندگی کی کمائی چار بچے ہیں جو کہ میاں کے سامنے موم کے تپتے بے رہتے ہیں میرے شوہر مجھے جو ان اولاد کے سامنے بیٹے ہیں اس طرح سمجھ کر کھینچ کر مارتے ہیں کہ بعض اوقات قمیض پھٹ جاتی ہے جو ان اولاد کے سامنے بے عزتی ہوتی ہے۔ مجھے طلاق کا نہیں موت کا خوف طاری رہتا ہے۔ شوہر ایسا جنونی شخص ہے کہ کیا بتاؤں ان کو عورت پر اعتبار ہی نہیں۔ ہمیشہ گندی زبان سے یاد کیا۔ مجھ میں نہیں آتا کہ کس گناہ کی سزا مل رہی ہے۔ کبھی جی چاہتا ہے کہ خود کٹی کر لوں مگر پھر سوچتی ہوں کہ اس حرکت کے بعد اگر خدا مجھ سے روٹھ گیا تو میرا ٹھکانہ کہاں ہوگا؟ بس انہی وجوہات کی بنا پر خود کٹی نہیں کر سکتی۔ چاروں جوان بیٹے، باپ سے خوف زدہ رہتے ہیں بڑے لگتا ہے کہ انہیں غواہوں میں بھی صرف باپ ہی دکھائی دیتا ہے۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ میرا شوہر تشدد سے باز آجائے۔ کیونکہ مجھ میں اب مزید زخم کھانے کی استعداد نہیں رہی ہے اس کے لئے آپ مجھے کوئی تعویذ کوئی دعا بتا دیجئے۔ یہ آپ کا مجھ پر سب سے بڑا احسان ہوگا۔ آپ کی کمیاری بہن۔ ہمیشہ آپ کے لئے دعا گو رہی گی۔

☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کے صبر اور استقامت کی جزا دے گا اور آخرت دونوں ہی جگہ دے گا انشاء اللہ۔ آپ جیسی عورتوں نے ہی ہمیشہ آبرو قائم رکھی ہے۔ درحقیقت جب انسان بچپن سے عورت کا منفی رخ دیکھتا آئے تو پھر اس کا یقین عورت ذات سے اٹھ جاتا ہے آپ کے شوہر کی والدہ کا کردار ان کی نفسیات پر اثر انداز ہوا اور یوں ایک عورت کی فطری دوسری عورت کے لئے سزا بن گئی۔ آپ بکثرت "یا قُدوس" پڑھا کریں۔ آپ کی فرمائش پر لوگ تحیر خاص ارسال کی جا رہی ہے۔ دعاؤں کا شکریہ۔

○ بیٹیس خان۔ واہ کینٹ  
☆ عزیز بہن! شب قدر کے سلسلے میں لکھا گیا خط مجھے 2 دسمبر کو موصول ہوا الحمد للہ شریف کے بعد دونوں مبارک تیرہ، تیرہ مرتبہ پڑھنی ہیں۔ اگر آپ کو جلدی جواب چاہئے تو براہ راست لاہور کے بچے پر خط لکھنے پا کیونکہ خط کا جواب باری

آنے پر ہی دیا جاتا ہے۔

○ رضوانہ۔ کورنگی۔ کراچی  
☆ عزیز بیٹی! ہر نماز کے بعد 13 مرتبہ سورہ الم نشرح پڑھ کر دعا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔ نماز کی پابندی فرمائیں۔

○ محترم! میں اپنے نام اور ستارے کے حساب سے لوح بخوانا چاہتی ہوں۔ میرا ستارہ عقرب تاریخ پیدائش 7 نومبر ہے۔ جس سے میری زندگی میں کوئی دکھ پریشانی نہ آئے اور میں ہمیشہ حسد، جاود، معاشی، حالات سے دوچار نہ ہوں۔

☆ عزیز بیٹی! دکھ، پریشانی، خوشیاں یہ زندگی کا حصہ ہیں۔ کوشش کریں کہ اچھے اخلاق، اچھا برتاؤ اختیار کریں۔ اور اس ذات پاک سے رابطہ رکھیں کہ جس کے بعد کسی اور شے کی ضرورت نہیں رہتی۔ "یا سلام" بکثرت پڑھیں۔ لوح مرخ ارسال ہے۔

عائشہ۔ اوکاڑہ  
○ محترم! میں اپنے گھر میں ذاتی سکون کی خواہشمند ہوں والدہ امراض جگر میں مبتلا ہیں وہ ہر وقت طرح طرح کی پریشانیوں میں گھری رہتی ہیں۔ اور تقریباً ذاتی مرافعت میں چلی ہیں۔ میری والدہ چاہتی ہیں کہ ہم سب بہن بھائی تعلیمی میدان میں کامیاب ہو جائیں اور اپنے اپنے مستقبل میں خوشخبر ہوں۔ میں میری بہن ڈاکٹر بننا چاہتی ہیں مہربانی فرما کہ میں کامیابی کیلئے کوئی لوح تجویز فرمائیں۔

☆ عزیز بیٹی! آپ میں محبت اور دگرگزر کا اختیار کریں۔ سورہ بقرہ کا اکثر قسم کرایا کریں۔ آپ کیلئے لوح سبع ستارگان ارسال ہے والدہ صاحبہ کیلئے اجتماعی میں خصوصی دعا کر دی گئی ہے ان کیلئے لوح شفا ارسال ہے۔ نماز کی پابندی فرمائیں۔

سمیہ۔ لاہور  
○ محترم! آپ کا کالم پڑھا تو مجھے امید نظر آئی میں بہت دگی ہوں تیس سال ہو گئے میری شادی کو حالات خراب سے خراب ہو رہے ہیں نہ گھر نہ نہ بھرت روزگار۔ 5 بچے ہیں سب سکول جاتے ہیں 7 ہزار تنخواہ ہے۔ اتنی تنخواہ میں گزارہ نہ مشکل ہے۔ گھر میں کرائے کا ہے۔ آپ ہمیں کوئی ایسا عقیدہ دیں جس سے ہماری جائز ضرورتیں پوری ہو جائیں۔ تاحیات آپ کی احسان مند رہی گی۔

☆ عزیز بہن! "یا کریم" بکثرت پڑھیں۔ ایک روٹی خیرات کر دیا کریں۔ نقش نامہ ارسال ہے۔ نماز کی پابندی فرمائیں۔

○ فرزانہ شہانہ۔ کراچی

☆ آپ دونوں کے ہاں اولاد کے امکانات ہیں لیکن اس میں سخت طبی نگہداشت کی ضرورت ہوگی "یا کریم" بکثرت پڑھا کریں۔

○ رشتہ۔ میانوالی  
☆ عزیز بیٹی! بار بار عرض کیا ہے کہ پاکیزہ میں خط باری آنے پر شائع ہوتے ہیں، اور جن کے خط شامل ہوتے ہیں ان میں سے کوئی ہمارا رشتے دار نہیں ہوتا۔ اگر آپ ارجنٹ جواب چاہتی ہیں تو براہ راست جوانی لگانے کے ہمراہ B-359 فیصل ٹاؤن لاہور کے بچے پر خط لکھ سکتی ہیں اپنا گھر بٹانے کے لئے عورت کو قربانی دینا ہوتی ہے۔ ہمارا تو آپ کو یہ مشورہ ہے کہ اس مسئلے کو ان کا مسئلہ نہ بنائے اور بھابھی سے کہیں اپنے گھر آجائے۔ اپنے گھر آنے میں کوئی سبکی نہیں ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو، ہم کو صحیح فیصلہ کرنے کی قوت عطا فرمائے (آمین) "یا جامع" بکثرت پڑھیں۔

○ فرزانہ۔ کراچی  
☆ عزیز بیٹی! تعجب کی بات ہے کہ آپ ہمارا کالم کئی سال سے مسلسل پڑھ رہی ہیں اور پھر بھی ایک ایسے عامل کے ہتھے چڑھ گئی ہیں جو اپنا نام ایس۔ ایم۔ قادری بتاتا ہے بلکہ پاکیزہ کا حوالہ بھی دے رہا تھا۔ ہماری تصویر پہچان کے لئے کافی ہے اب اگر پھر بھی آپ کی پہچان میں نہ آئے تو ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ یہاں ہم آپ کو وساحت سے عرض کر دیں کہ کراچی یا پاکستان بھر میں سوائے لاہور کے باقی ہمارا کوئی ذیلی آفس ہے ناسی ہمارا خلیفہ، شاکر دیا بزرگ خود کوئی استاد یا رشتے دار ہے۔ اور ناسی ہم نے اپنا کوئی مزید خاص برطانیہ یا امریکا میں متعین کیا ہے۔ "یا کریم" بکثرت پڑھیں۔

○ کرن عمر۔ نامعلوم شہر  
☆ عزیز بیٹی! بھائی کے لئے "یا رافع" 100 مرتبہ پڑھ کر دعا کریں رشتے کے مسائل کے لئے "یا لطیف یا قاض" 140 مرتبہ پڑھ کر دعا کریں۔ اول آخر 9 مرتبہ درود شریف۔ دیگر مسائل کے لئے آپ براہ راست خط لکھ سکتی ہیں۔ یہی جواب ان تمام بہنوں کے لئے جو براہ راست جواب چاہتی ہیں کہ وہ اپنا خط اور پتہ لکھا ہوا جوانی لگانا ارسال کر دیں۔

ماہ نامی۔ ملتان  
○ محترم! میرا بیٹا شہر کے ایک بہت اچھے سکول میں پڑھتا ہے شروع میں اس کی تعلیمی معاملات سے ہم سب نہایت مطمئن اور خوش تھے لیکن جس سے ان نے اپنی کلاس میں پہلی پوزیشن لی

ہے اس کا چاہا ہو گیا ہے دوسرے یہ کہ وہ اکثر بیچارے لگا ہے مزاجاً چڑچڑاہٹ زیادہ ہو گیا ہے ششماہی رہ پڑش بہت خراب آئی ہے کوئی بہتر مشورہ عنایت کیجئے۔  
☆ عزیز بہن! آپ کے صاحبزادے کی شدید قسم کی نظر لگی ہے آپ صبح وشام 9 مرتبہ آیت الکرسی پانی پر دم کر کے پلائیں منگل کے روز بڑے گوشت کا صدقہ حسب توفیق دیجئے۔ تعلیمی ترقی اور نظربد سے حفاظت کے لئے لوح عطار دار سال کی جاری ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کے بچوں کی حفاظت اور نگہبانی فرمائے۔

نوشابہ۔ کھاریاں  
○ محترم! اگر شش پانچ سال سے ہم لوگ اولاد کے لئے طرح طرح کے علاج دم بھار چھوٹ کر دار ہے ہیں۔ لیکن کہیں سے مراد پوری نہ ہوئی۔ سب نے یہی بتایا ہے کہ کالا جادو ہے کوکہ بندی ہے ستاروں کی نحوست ہے لیکن کوئی اس مسئلے کو حل نہ کر پایا۔ آپ سے درخواست ہے اللہ تعالیٰ کے مقدس اور بابرکت ناموں سے کوئی شافی حل اور عقیدہ تجویز فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو جائے اور اولاد کے لئے کی گئیں دعائیں بار آور ثابت ہو جائیں۔

☆ عزیز بیٹی! اللہ تعالیٰ جل شانہ کی حکمت اور مصلحت کے باعث بعض اوقات اس کی نعمتوں کے حصول میں تاخیر ہو جاتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس کی رحمت آپ پر نہیں ہوگی۔ اس کی تاخیر میں حکمت ہے آپ ہر نماز کے بعد 131 مرتبہ "یا غنی یا دار ثبات" پڑھ کر دعا کیا کریں۔ اول آخر 9 مرتبہ درود شریف بھی پڑھیں اولاد کے لئے علاج درعقیم ارسال کیا جا رہا ہے۔ نماز کی پابندی فرمائیں۔

○ فرزانہ جبین۔ سیالکوٹ  
☆ عزیز بیٹی! آپ کا تفصیلی خط ملا۔ آپ بعد نماز عشاء ایک بار سورہ یوسف پڑھ کر دعا کریں اول آخر 9 مرتبہ درود شریف۔ نماز کی پابندی فرمائیں۔

○ صاحبہ۔ انک شہر  
☆ عزیز بیٹی! آپ روزانہ (ربنا اتانیا الدنیا حسنت و فی الآخرة حسنت و قنا عذاب النار) ہر نماز کے بعد 140 مرتبہ پڑھ کر دعا کریں اول آخر 3 مرتبہ درود شریف۔

○ عزیز فاطمہ۔ گول چوک مردگوا  
☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ آپ کے شوہر کی حاجت عطا فرمائے اور آپ کو صحت کملی عطا فرمائے۔ (آمین) آپ "یا قوی یا سلام"



بکثرت پڑھیں۔ آپ لاہور کے پتے پر براہ راست خط لکھ کر لوح منگوا سکتی ہیں۔ دعاؤں کا شکر یہ

ساجدہ پروین۔ اسلام آباد

○ محترم! میری والدہ نے میری مفتی میرے خالہ زادہ کے قحی مفتی کے بعد وہ لوگ باہر شفقت ہو گئے اس کے بعد سے ان کے مالی حالات میں بہت بہتری آگئی ہے۔ چند ہفتے قبل ان کے کہنے کے مطابق جب ہم نے شادی کی تیاری کے سلسلے میں ان سے بات کرنا چاہی تو انہوں نے نہایت بے رحمی سے کام لیا۔ اور کہا کہ میرے بیٹے کے ابھی تعلیم مرحل میں کم از کم چار سال تو شادی کے لئے سوچا ہی نہ جائے جبکہ اس وقت بھی مفتی کو تین سال کا عرصہ گزر چکا ہے اسی دوران میں یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ امریکہ میں ایک بہت امیر فیملی میں لڑکی دیکھ رہی ہیں۔ میں اور میرے منگیت ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے ہیں ہماری خواہش ہے کہ ہماری شادی ہو جائے مگر میری خالہ کے آگے کسی کی بھی نہیں چلتی ہے میرے خالو دل سے اس رشتے کے حق میں ہیں لیکن خالہ کے آگے دم نہیں مار سکتے ہیں۔ میرے منگیت بھی کچھ نہیں کر سکتے ہیں آپ کا کالم میرے منگیت نے امریکا میں پڑھا تھا اور انہوں نے ہی مجھے آپ سے رابطہ کے لئے کہا ہے ہماری راہ نمائی کیجئے اور اس مشکل سے نکالنے کیلئے کوئی حل تجویز کیجئے ہے حد شکر گزار ہیں گے۔

☆ عزیز بیٹی! اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کو لالچ اور حرص سے محفوظ و مامون رکھے۔ (آمین) ”یا کریم یا سلام یا عزیز یا جامع“ 313 مرتبہ بعد نماز عشاء پڑھ کر دعا کیا کریں۔ اول آخر 11 مرتبہ درود شریف بھی پڑھیں۔ نماز کی پابندی کیجئے لوح تسخیر خاص ارسال کی جارہی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو منزل مراد عطا فرمائے۔ (آمین) نیلوفر۔ کراچی

○ محترم! میری بہن کی شادی ہونے والی ہے مگر بھائی کو کوئی ٹکری نہیں ہے۔ میری شادی ہو چکی ہے لیکن میکے کے مسئلوں کی وجہ سے ذہن ہر وقت پریشان رہتا ہے میں بھی ان کی مدد نہیں کر سکتی آپ مجھے کوئی ایسی دعا بتائیں کہ بھائی کے ذمے داری کا احساس کرے۔

☆ بیٹی! اکثر مسائل کی اصل وجہ ایسی ہی ہے آپ کے گھر میں بھی اگر مالی پریشانی ختم ہو جائے تو حالات بہتر ہو جائیں گے نیت اچھی رکھیں صلہ بھی اچھا لے گا۔ ”یا وہاب“ کا بکثرت درد کریں۔ لوح مشتری ارسال ہے۔

محمد شعیب۔ کراچی

○ میں ایک لڑکی سے محبت کرتا ہوں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں میں نے اپنے گھروالوں کو ان کے پاس بھیجا تھا پہلے تو وہ راضی ہو گئے تھے مگر اب وہ نہیں مانتے۔ کوئی وظیفہ بتائیں کہ میری جلدی شادی ہو جائے آپ کی مہربانی ہوگی۔

☆ بیٹے! ہر نماز کے بعد ”یا کریم یا جامع“ بکثرت پڑھا کریں۔ انشاء اللہ مسئلہ جلد حل ہو جائے گا۔ لوح زہرہ ارسال ہے۔

سردہ خانم۔ دہلی

○ محترم! کسی شام سے میں آپ نے کاروباری ترقی اور خیر و برکت کے لئے لوح مشتری تجویز کی تھی ہمارا یہاں ایک ڈیپارٹمنٹل منسٹر ہے جس کی سیل گزشتہ کئی ہفتوں سے بہت کم ہو رہی ہے ہندوستان سے میری مندرجہ جیرو مشد یہاں تشریف لائے تھے ان سے عرض کیا تھا تو انہوں نے فرمایا کہ آپ کے کاروبار میں کسی نے بندش کی ہے اور نظر لگی ہے۔ انہوں نے ہمیں ایک وظیفہ اور نقش عنایت کیا تھا اس کی برکت سے معاملہ کچھ دن تو ٹھیک رہا مگر دوبارہ وہی صورت حال ہو گئی ہے کچھ ایسا وظیفہ عنایت کیجئے کہ معاشی معاملات مستقل طور پر بہتر ہو جائیں۔ تاکہ ہم سکون سے زندگی گزار سکیں۔ بظاہر بڑانا ہم بڑا کاروبار ہے لیکن عملاً صورتحال وہی ہے کہ قبر کا حال میں مردہ ہی جاتا ہے آپ سے دعاؤں کی درخواست ہے۔

☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ آپ کی اور تمام افراد کی معاشی سرگرمیوں کی حفاظت فرمائے اور اس میں خیر و برکت عطا فرمائے۔ (آمین) سورۃ واقعہ بعد نماز عشاء پڑھنا معمول بنالیں۔ اول آخر 9 مرتبہ درود شریف پڑھیں۔ بکثرت ”یا وہاب“ پڑھا کریں معاشی خیر و برکت کیلئے لوح مشتری ارسال کی جارہی ہے۔

☆ قراءت لغت خواں۔ مقررہ۔ کارلٹن

ہمیں اپنے دینی پمیل کیلئے ایسی خواتین و حضرات کی ضرورت ہے جو تلاوت قرآن، حمد و نعت ریکارڈ کرنا چاہیں۔ ایسے علماء اور خطیب اور اسلامی موضوعات پر سکا رکھنا حضرت بھی تشریف لائیں جو کہ فتن خطابت پر مجبور نہ رہیں۔ اور اپنی تقاریر ریکارڈ کرنا چاہتے ہوں۔ اگر آپ کی اس سے قبل کوئی تلاوت، حمد و نعت، تقریر کسی ٹی وی سے نشر ہوئی ہو تو اس کی بھی CD ہمراہ لائیں۔

برائے رابطہ: ایس۔ ایم۔ قادری۔ B-359 فیصل ٹاؤن۔ لاہور

شہزاد احمد۔ راولپنڈی

○ محترم! اللہ تعالیٰ آپ کو بڑے خیر عطا فرمائے آپ جو دین کی خدمت کر رہے اس کا اجر آپ کو اللہ تعالیٰ ہی دے سکتا ہے لیکن اسماہ الحنفی کے حوالے سے یہ عرض کرنا کہ وہ آیا اس کو دیکھا اس نے فتح کر لیا جس خوبصورتی سلیقے اور اعلیٰ درجے کی طباعت اور نفاست سے آپ اسماہ الحنفی کا مہیا کا راستہ شائع کر رہے ہیں اس نے یہ بات ظاہر کر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمت کرنے والوں کو محنت کرنے والوں کو اجر عظیم عطا کرتا ہے۔ اشرف نڈو انجینی والوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے اتنی تیزی سے کوئی میگزین نہیں دیکھا جو آج ہی فردخت ہو جاتا ہو میں چار میگزین خریدتا ہوں ایک اپنے لئے، اور ایک، ایک احباب کو تحفہ دینے کیلئے مگر اس مرتبہ میرے ایک دوست نے کہا کہ آئندہ سے وہ خود بھی چار میگزین خرید کر تقسیم کریں گے اگر تم خود ایسا میگزین نہیں نکال سکتے تو اپنی ہمت اور استطاعت کے مطابق محترم قادر صی صاحب کا ہاتھ توٹا سکتے ہیں۔ میری، میرے دوست احباب کو طرف سے اس شاندار کامیابی پر مبارکباد قبول فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور بھی بلند یوں سے ہم کنار فرمائے۔ (آمین) اب اصل عرض دعا یہ ہے کہ میری مفتی کو چار سال ہو گئے ہیں مگر لڑکی والے تاریخ نہیں دیتے فضول قسم کی تاویل پیش کرتے رہتے ہیں کوئی ایسی لوح عنایت فرمادیجئے کہ جس کی وجہ سے میری جلد سے جلد شادی ہو جائے آپ کے لئے ہمیشہ دعا گو۔

☆ عزیزم! اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے تمام احباب کو اعمال خیر کی ہمیشہ توفیق عطا فرمائے (آمین) آپ شادی کے لئے ”یا لطیف یا جامع“ بعد نماز عشاء 313 مرتبہ پڑھ کر دعا کر لیں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف بھی پڑھیں۔ آپ کی فرمائش پر لوح زہرہ ارسال کی جارہی ہے دعاؤں اور مجتہدوں کا شکر یہ۔

سجاد احمد۔ راس النہد

○ محترم! اللہ تعالیٰ آپ کو عمر خضر عطا فرمائے۔ اور آپ کو ہمیشہ عروج و ترقی سے ہم کنار رکھے گزشتہ 8 سال سے یہاں ہوں

لیکن کوئی تسلی بخش معاملات نہیں ہو رہے ہیں۔ رزق کا یہ عالم ہے کہ آتا ہے اور خرچ ہو جاتا ہے پس انداز کچھ نہیں ہوتا دو بیٹیاں جوان ہیں ان کی شادیوں کا مسئلہ ہے۔ بیٹے پڑھ رہے ہیں دن رات ایسی فکر میں نیند اڑی جاتی ہے۔ پاکستان میں مکان بنایا ہے لیکن وہ بھی مکمل ہے اس کے لئے ابھی مزید سات آٹھ لاکھ کی ضرورت ہے۔ رشتے میں بھی آجکل انٹینسٹ فکشر انوالو ہو گیا ہے تنگم کی بیماری علیحدہ ہے غریبہ زندگی عجیب سی ہے چینیوں اور دوسروں پر مشتمل ہے میری راہ نمائی کیجئے اور خیر و برکت کے لئے کچھ تجویز کیجئے۔

☆ عزیزم! اللہ تعالیٰ آپ کے اور تمام افراد عالم کے مسائل اور پریشانیوں اپنی رحمت کے طفیل دور فرمائے (آمین) ”یا کریم یا جامع“ بکثرت پڑھا کریں حسب توفیق روز جہ صدقہ دیا کیجئے۔ صدقہ بڑا ہے نماز کی پابندی کیجئے لوح تسخیر ستارگان ارسال ہے تنگم کی بیماری اور شوگر کے لئے لوح شفا اور نقش زعفران ارسال کر دیئے گئے ہیں۔ تنگم سے کہیں کہ ”یا مقیت“ بکثرت پڑھا کریں۔ اللہ تعالیٰ حامی اور ناصر ہو۔

○ س۔ ش

☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو جسرانی اور ایمانی دونوں اعتبار سے بہترین حالت میں رکھے (آمین) آپ صحت کے لئے ”یا کریم یا سلام یا قوی یا مقیت“ 125 مرتبہ صبح، دوپہر و شام پانی پر دم کر کے پی لیا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔ سود کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ وہ منافع جو فکس ہو وہ چاہے کہیں بھی ہو وہ سود ہے لہذا اس حوالے سے احتیاط بہتر ہے۔ آپ سود کی رقم کسی کو بھی دے سکتی ہیں مگر اس میں نیت عد کی ہوگی ثواب کی نہیں۔ باقی تفصیلات آپ اپنے مقامی شہر کے علماء کرام سے لے سکتی ہیں۔ یا براہ راست دفتر بھی فون کر سکتی ہیں۔ دعاؤں کے لئے شکر یہ۔ فون نمبر 042-5168036

○ درویشوار۔ کراچی

ملقات روزانہ صبح 9 مغرب ”جمعتہ المبارک تعطیل“ (براہ راست جواب کیلئے جوابی لفافہ بھیجئے۔)

ایس۔ ایم۔ قادری۔ B-359 فیصل ٹاؤن لاہور۔ فون نمبر: 042-5167842, 5168036

ختم گیارہویں شریف اور اجتماعی دعا ہر انگریزی صبیح کی پہلی اتوار کو بعد نماز عصر تا مغرب منعقد ہوتی ہے



## ☆ پاکستان کا پہلا مکمل رنگین اسلامی میگزین ☆

آسماء الحسنیٰ  
۲۰۰۰ء

## ☆☆ تازہ شمارے کی ایک جھلک ☆☆

”آسماء الحسنیٰ۔ کامیابی کا راستہ“

دنیاۓ اسلام کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا سلسلہ

☆ عاشقہ کی عبادت اور وظائف

☆ سورۃ اخلاص۔ اعلانِ توحیدِ مرک سے خلاص

☆ افکارِ حسینؑ۔ کتابت اور خطبات کی روشنی میں

☆ شہادتِ عظیم کرلا۔ ”آپ کی سہل کھرم نہیں کرتے تھے“

☆ تدم غلامی کا لکھا اور قرآن پاک۔ ایک شاعرِ حقیقی مضمون

خواب اور تعبیر۔ زندگی کی مشکلات اور پریشانیوں کا خواب سے باہمی تعلق

☆ آپ کے لئے ☆ سب کے لئے ☆

سالانہ ہدیہ برائے پاکستان۔ 900/- روپے

پاکستان بھر میں بذریعہ V.P منگوانے کیلئے خط لکھیں یا فون کریں

B-359 فیصل ٹاؤن لاہور۔ پاکستان

فون نمبر: 5168036-5167842

☆ عزیز بھئی! حیرت تو آپ کی والدہ پر ہے پر جو آپ کی شادی ایسے گھر میں کرنا چاہتی ہیں جہاں آپ کی عزت کو ہر طرف سے خطرہ ہے۔ اور جہاں بحیثیت عورت آپ کا جب کوئی احترام رہا تو پھر بہو کے حوالے سے آپ کے ساتھ کیا سلوک ہوگا اللہ تعالیٰ ہمیں برے فیصلوں سے بچائے (آمین) آپ پر نماز گئے بعد ”یا سلام“ 400 مرتبہ پڑھ کر دعا کریں اور بہتر ہے کہ اپنی والدہ کے گھر ہی رہیں۔ اس گھر کو چھوڑ دیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی ہم سب کی بیٹیوں کی حفاظت فرمائے۔ (آمین)

ضروری گزارش

☆ خط لکھتے وقت اپنا نام اور پتہ معہ شہر کے مکمل لکھئے۔ مخفی نام والے خطوط قابل جواب نہ ہوں گے۔ براہ راست جواب کے لئے لکھا ہوا جوابی لفاظی ارسال کیجئے اور ف، ک، ٹائپ کے نام لکھئے۔ گریڈ کیجئے۔ اگر آپ اپنا نام نہ شائع کرنا چاہیں تو فرضی نام لکھ کر واضح ہدایت کر دیجئے۔ فون پر مسئلہ دیکس نہیں کیا جاتا ہے بہتر ہے کہ جوابی لفظ کے ساتھ خط لکھ دیجئے۔ بیرون ملک مقیم بہن بھائی صرف اپنا مکمل پتہ ارسال کریں نہیں جوابی لفظ کی ضرورت نہیں ہے۔

○ فرزات، صاحبہ، شاکرہ فردوس، فائزہ اکرم، ادیبہ انور، باقیس بیگم، شمرہ، سہلی ماجد، عطیہ، روشن آراء، نسرین احمد۔ مقرر شہر

☆ آپ سب نے ختم شریف میں قرآن حکیم، کلمہ شریف، سورۃ ملک، سورۃ یسین، آیت کبریٰ کی جو پڑھائیاں ایصالِ ثواب کے لئے تحریر کئے تھے۔ وہ سب محفل ختم شریف میں حضور اکرم نور مجسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، انبیاء علیہ السلام صحابہ اجمعین، سیدنا غوث الاعظم جملہ مسلمین و مسلمات کیلئے ہدیہ کر دیئے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری کادشوں کو قبول و مقبول فرمائے۔ جو بہن بھائی ایصالِ ثواب حصولِ خیر و برکت کیلئے قرآن حکیم، مختلف سورتیں، کلمہ شریف، درود شریف پڑھتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ ان کی طرف سے ہادی عالم کی بارگاہ میں، بزرگانِ دین کے لئے پڑھائیوں کے ہدیے بھیجے جائیں وہ بذریعہ خط، ٹیلی فون مطلع فرما دیا کریں۔

☆☆☆

اس مرتبہ ختم کیا ہوئے شریف اور اسلامی دعائیں اللہ 6 جنوری بروز اتوار کو منعقد ہوگی۔ تمام بہن اور بھائیوں اور سرمدین سے شرکت کی استدعا ہے۔